عید سروے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 7000 روپے

مستقل سلسلے

اکتوبر 2015
جلد 30 شمارہ 2
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 91 بی، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

دوستی گیلانی

شعاع اکتوبر کا شمارہ عید نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
ایک اور اسلامی سال اختتام کی جانب بڑھ رہا ہے۔ جس وقت یہ شمارہ آپ کو ملے گا، آپ عیدالاضحیٰ کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔
عید کا دن خوشیوں، مسرتوں اور شادمانیوں سے عبارت ہے۔ عیدالاضحیٰ محض خوشیوں بھرا مذہبی تہوار ہی نہیں بلکہ یہ تسلیم و رضا اور عبودیت کی روشن مثال ہے جس کی یاد قیامت تک تازہ کی جاتی رہے گی۔ آتش نمرود سے شروع ہونے والا توکل و بندگی جب عشق کے سانچے میں ڈھلتا ہے تو فرزند کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ تب بارگاہ خداوندی ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ کے درجے پر فائز کرتی ہے اور جب سعادت مندی اور فرماں برداری کا مظاہرہ اسمٰعیل علیہ السلام سے منسوب ہوتا ہے تو عقل فیصلہ نہیں کر پاتی۔

یہ فیضان نظر تھا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

ادارہ شعاع کی جانب سے آپ سب کو عیدالاضحیٰ مبارک۔
قربانی کے سچے جذبے کے ساتھ عید منائیں اور ان لوگوں کو بھی عید کی خوشیوں میں شریک کریں جو یہ خوشیاں حاصل کرنے کی استطاعت سے محروم ہیں کہ عید اجتماعی تہوار ہے اور اس کا مطلب ہی خوشیاں منانا اور بانٹنا ہے۔

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین)

محبتیں اور خوشیاں بانٹنے والے لوگ ہمیشہ دلوں کے مکین رہتے ہیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہو جائیں تب بھی ان کی یادیں زندہ رہتی ہیں۔ انشا جی کے چہیتے بھتیجے، محمود ریاض صاحب کے صاحب زادے اور قارئین کے ذوالقرنین ایسی ہی روشن شخصیت تھے۔ آج دو عشروں سے زیادہ مدت گزر جانے کے باوجود ان کے چاہنے والے انہیں بھول نہ پائے ہیں۔
25 - اکتوبر کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- عیدالاضحیٰ کا خصوصی سروے ۔ عیدالاضحیٰ اور ہم،
- سائرہ رضا کا مکمل ناول ۔ کچھ وقت گزرنے دو،
- مہوش افتخار کا مکمل ناول ۔ جام آرزو،
- صائمہ اکرم، فاخرہ جبیں اور صدف آصف کے ناولٹ،
- مصباح علی، غزالہ کنول، ام ایمان، قرۃ العین خرم ہاشمی اور عاصمہ فرحین کے افسانے،
- رخشندہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- ٹی وی فنکارہ اور ماڈل فضہ علی اور فواد کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

عید نمبر آپ کو کیسا لگا؟ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

رفعتیں تیرے لیے، سب عظمتیں تیرے لیے
خالقِ حرف و بیاں سب مدحتیں تیرے لیے

زندگی تیرے لیے اور بندگی تیرے لیے
اُلفتیں تیرے لیے، سب چاہتیں تیرے لیے

تُو کہ لامحدود ہے، حدِ مکاں بھی تجھ سے ہے
سرحدِ امکاں تلک سب رفعتیں تیرے لیے

عقل حیراں ہے کہ کیسا ہے نظامِ کائنات
اے حکیمِ بے بدل! سب حکمتیں تیرے لیے

میں کہ بندہ ہوں تو پھر بندے کا کیا اختیار
قادرِ مطلق ہے تُو، سب قدرتیں تیرے لیے

حرف سب تیرے لیے ہیں، لفظ سب تیرے لیے
صورتِ اظہار کی سب صورتیں تیرے لیے

ڈاکٹر محمد امین

کہے ہے شوقِ نبی یہ آکر، چلو مدینے چلو مدینے
میں ہوں گا دل سے تمہارا رہبر، چلو مدینے چلو مدینے

صبا بھی لانے لگی ہے اب تو نسیمِ طیبہ، نسیم طیبہ
کہے ہے شوق، اب ہوا میں اُڑ کر چلو مدینے چلو مدینے

شہر شہر کیوں پھرے ہے مارا، جو دونوں عالم کی چاہے دولت
تُو سر قدم ہو کے وِرد یہ کر، چلو مدینے چلو مدینے

یہ جذبِ عشقِ محمدی ہیں، دلوں کو امت کے کھینچتے ہیں
کہے ہے ہر دل جو ہو کے مضطر، چلو مدینے چلو مدینے

جو کفر و ظلم و فسادِ عصیاں، ہر اک شہر میں ہو نمایاں
تو دینِ اسلام اُٹھے یہ کہہ کر چلو مدینے چلو مدینے

رجب کے ہوتے ہیں جب مہینے، بھرے ہیں شوقِ نبی سے سینے
صدا یہ مکے میں کو بہ کو ہے، چلو مدینے چلو مدینے

ہلاکت امڈ آب تو آئی، جو فوجِ عصیاں نے کی چڑھائی
نجات چاہو تو اے برادر چلو مدینے چلو مدینے

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب

ادارہ

میت پر بین کرنا' رخسار پیٹنا گریبان چاک کرنا

اور ہلاکت و بربادی کی بددعا کرنا حرام ہے

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میت کو اس کی قبر میں' اس پر نوحہ (بین) کیے جانے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔"

اور ایک اور روایت میں ہے "جب تک اس (میت) پر نوحہ کیا جاتا ہے (اس وقت تک اسے عذاب دیا جاتا ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

نوحہ' بین کرنے کو کہتے ہیں' یعنی میت کی خوبیوں کا یا اس کے بعد آنے والی متوقع مشکلات کا اونچی اونچی آواز سے ذکر کرکے رونا پیٹنا منع ہے۔

2۔ اس بین کی وجہ سے میت کو اس صورت میں عذاب ہوتا ہے جب وہ اپنے ورثا کو بین کرنے کی وصیت کر گیا ہو یا اس کا اپنا عمل بھی زندگی میں ایسا ہی رہا ہو اور اس کی پیروی ہی میں اس کے گھر والے بھی اس پر بین کریں۔ اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ اس کے برعکس وہ اس سے روکتا رہا ہو لیکن اس کے باوجود گھر والے اس پر بین کریں تو اسے عذاب نہیں ہوگا کیونکہ اس میں اس کی ایما یا تربیت کا دخل نہیں ہے۔ اور قرآن کا فیصلہ ہے "کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔" (بنی اسرائیل 17-15)

ہم میں سے نہیں

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ شخص ہم میں سے نہیں جس نے رخساروں کو پیٹا اور گریبانوں کو چاک کیا اور جاہلیت کے بول بولے۔" (بین کیا۔) (بخاری و مسلم)

فائدہ :

ہم میں سے نہیں' یعنی ہم مسلمانوں کے طریقے پر نہیں۔ جاہلیت کے بول سے مراد وہی بین کرنا ہے' جیسے ہائے میرے شیر' میرے چاند' میرے سہارے' بچوں کو یتیم کر جانے والے' عورتوں کے سہاگ اجاڑ دینے والے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سخت کبیرہ گناہ ہے۔ جس پر اسلام سے نکل جانے کی وعید ہے۔ اس لیے کہ اس میں اللہ کے فیصلہ و قضا پر راضی ہونے کے بجائے اس پر ناراضی اور برہمی کا اظہار ہے۔

نوحہ کرنے والی

حضرت ابو بردہؓ بیان کرتے ہیں کہ (ان کے والد) حضرت ابو موسیٰ (اشعری رضی اللہ عنہ) سخت بیمار ہوئے تو ان پر غشی طاری ہو گئی اور ان کا سر ان کی ایک بیوی کی گود میں تھا' وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ لیکن آپ (بے ہوشی کی وجہ سے) اسے روک نہ سکے۔ جب انہیں ہوش آیا تو فرمایا۔

"میں اس سے بیزار ہوں جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیزاری کا اظہار فرمایا ہے۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عورت سے بیزار ہیں جو نوحہ کرنے والی' (مصیبت کی وجہ سے) سر منڈانے والی اور گریبان چاک کرنے والی ہو۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے جذبہ اتباعِ سنت کا بیان ہے۔

جس پر بین کیا جائے

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جس پر بین کیا جائے تو اس کو قیامت والے دن بین کیے جانے کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :

1۔ یہ عذاب اسی شخص کو ہو گا جو اپنے ورثا کو بین کرنے کی وصیت کر کے گیا ہو گا یا گھر والوں کی تربیت اس انداز سے کی ہو گی جیسا کہ پہلے گزرا۔

عہد

حضرت ام عطیہ نسیبہ رضی اللہ عنہا (نسیبہ نون پر پیش اور زبر دونوں کی طرح مروی ہے) بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کے وقت ہم سے یہ عہد لیا کہ ہم بین نہیں کریں گی۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بین کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کتنا بڑا جرم تھا کہ بیعت کے وقت عورتوں سے بین نہ کرنے کا عہد لیتے تھے۔ صرف عورتوں سے اس لیے عہد لیتے تھے کہ اس کا ارتکاب بالعموم عورتیں ہی کرتی ہیں ورنہ مردوں کے لیے بھی یہ ممنوع ہے۔

عذاب

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عبدالرحمان بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنھم کی معیت میں ان کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ جب ان کے پاس پہنچے تو انہیں بے ہوشی کی حالت میں پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

"کیا ان کا انتقال ہو گیا ہے؟"

انہوں نے عرض کیا: "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! نہیں۔"

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے اختیار رو پڑے۔

جب لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو روتے ہوئے دیکھا تو ان پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تم سنتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسو کی وجہ سے عذاب دیتا ہے نہ دل کے غم کے سبب۔ لیکن وہ اس کی وجہ سے عذاب دیتا ہے..." اور اپنی زبان کی طرف اشارہ فرمایا... "یا رحم فرما (کہ معاف کر) دیتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

اس سے معلوم ہوا کہ حزن و غم کے وقت آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کا نکل آنا یا دل کا غمگین ہو جانا ممنوع نہیں کیونکہ یہ فطری چیزیں ہیں۔ البتہ اگر ایسے موقعوں پر زبان سے جزع فزع کا اظہار کرے گا تو پھر گناہ گار ہو گا اور اگر شریعت کے مطابق زبان سے صرف انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھے گا یا ایسے الفاظ ادا کرے گا جس میں اللہ کی تقدیر و قضا پر راضی رہنے کا اظہار ہو تو مستحق اجر ہو گا۔

2 ۔ مریض کی بیمار پرسی کرنا مستحب اور ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے۔

3 ۔ موقع کی مناسبت سے اسلامی احکام کی تلقین و توجیہ ضروری ہے۔

بین کرنے والی عورت

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بین کرنے والی عورت اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو اسے قیامت کے دن اس طرح کھڑا کیا جائے گا کہ اس پر تار کول کا کرتا اور خارش کی زرہ ہوگی۔" (مسلم)

فائدہ :

اس سے معلوم ہوا کہ بین کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ جس نے توبہ نہ کی اور اللہ تعالیٰ نے بھی معاف نہ کیا تو اسے مخصوص قسم کا عذاب ہوگا۔

مصیبت کے وقت

حضرت اسید بن ابی اسید تابعی' اس عورت سے روایت کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے والوں میں سے تھی۔ اس نے بیان کیا۔

"وہ بھلائی کے کام جن میں آپ کی معصیت نہ کرنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے عہد لیا تھا' ان میں یہ عہد بھی تھا کہ ہم چہرہ نہ نوچیں' ہلاکت کی بددعا نہ کریں' گریبان چاک نہ کریں اور بال نہ بکھیریں۔" (اسے ابوداود نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فائدہ :

یہ سارے کام جاہلیت کے ہیں جو مصیبت کے وقت اس دور کی عورتیں کرتی تھیں۔ مسلمان عورتوں کو ان تمام حرکتوں سے بچنا چاہیے۔

مردے کو تکلیف

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو بھی مرنے والا مرتا ہے تو اس پر رونے والے کھڑے ہو کر کہتے ہیں نہائے پہاڑ! ہائے میرے سردار! یا اس قسم کے اور الفاظ۔ تو اس میت پر دو فرشتے مقرر کردیے جاتے ہیں' وہ اسے سینے پر مکے مارتے ہیں (اور کہتے ہیں:) "کیا تو ایسا ہی تھا؟"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

کفر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دو چیزیں لوگوں میں ایسی ہیں جو ان کے حق میں کفر ہیں' نسب میں طعنہ زنی کرنا اور میت پر بین کرنا۔" (مسلم)

فائدہ :

یہ دونوں چیزیں افعال جاہلیت میں سے ہیں جن کو اسلام نے مٹایا ہے۔ اس لیے ان کا ارتکاب کرنے والا گویا کافرانہ عملوں کو زندہ کرتا ہے۔ آعاذنا اللہ منہ

شیطان کے دوست

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وہ کچھ نہیں ہیں (ان کی باتوں کا اعتبار نہیں۔") انہوں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! وہ بعض دفعہ ہمیں کسی چیز کی بابت بتلاتے ہیں اور وہ بات سچ نکلتی ہے؟"

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ سچی بات' اسے جن (فرشتوں سے) اچک لیتا ہے اور دوست کے کان میں ڈال دیتا ہے' چنانچہ وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا لیتے ہیں۔"

(بخاری و مسلم)

اور بخاری کی ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"فرشتے (اللہ کے احکام لے کر) بادلوں میں اترتے ہیں اور اس بات کا ذکر کرتے ہیں جس کا فیصلہ آسمان میں کیا گیا ہوتا ہے۔ چنانچہ شیطان چوری چھپے اسے سنتا ہے اور کاہنوں کو پہنچا دیتا ہے تو وہ اس کے ساتھ

اپنی طرف سے سو جھوٹ (ملا کر) بیان کرتے ہیں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ کاھن، منجم اور عراف، یہ تینوں تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک جیسے ہیں۔ ان سب کا کام مستقبل کی بابت خبر دینا ہے۔ کاہن کسی جن سے کوئی بات سُن کر لوگوں کو بتلا دیتا تھا جو صحیح ثابت ہوتی تھی کیونکہ شیطان اسے آسمان سے سن کر آتا تھا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جنوں اور شیطانوں کو شہاب ثاقب مارے جانے لگے تب سے وہ یہ باتیں سننے میں بہت کم کامیاب ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر بھسم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے، وہ آثار و قرائن سے بھی بعض باتوں کا اندازہ لگا کر ان بابت پیش گوئی کر دیتے تھے، اس میں غلط و صحیح دونوں کا امکان ہوتا تھا اور اب بھی اس کا معاملہ ایسا ہی ہے۔

2۔ تنجیم بھی پیش گوئی ہی کی ایک صورت ہے۔ جس کی استعداد و صلاحیت اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو عطا فرما دیتا ہے لیکن یہ بھی اکثر جھوٹی ہی ہوتی ہیں۔

2۔ عرافہ بھی اسباب و مقدمات کو دیکھ کر کسی واقعے یا معاملے کے مستقبل کے متعلق نشان دہی کرنے کا نام ہے۔ یہ تینوں فن آپس میں ایک دوسرے کے معاون ہیں اور دیگر اسی قسم کی چیزوں سے بھی مدد حاصل کرتے ہیں۔ یہ سب گویا کہانت کی قسمیں ہیں۔ علم رمل میں بھی غیب کی خبروں کی نشان دہی اور ان کی بابت پیش گوئی کی جاتی ہے۔

4۔ طرق کا مطلب ہے: پرندوں کو کنکری مار کر یا جو وغیرہ ڈال کر انہیں اڑا کر نیک شگونی یا بد شگونی لینا، **مثلاً**: پرندہ دائیں جانب اڑے تو نیک شگونی اور بائیں جانب اڑے تو اس سے بد شگونی لینا۔ یہ ساری چیزیں حرام اور ممنوع ہیں۔ محض کسی بات کے اتفاقیہ طور پر صحیح نکل آنے سے ان تمام خرافات کا جواز ثابت نہیں ہو جائے گا۔

نجومی کے پاس جانا

حضرت صفیہ بنت ابی عبید رحمہ اللہ ازواج مطہرات میں سے کسی سے روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص کسی عراف (غیبی امور کے جاننے کا دعوے دار) کے پاس آئے اور اس سے کسی چیز کی بابت پوچھے اور اس کو سچ مانے تو اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہیں کی جائے گی۔" (مسلم)

فائدہ :

اس سے معلوم ہوا کہ کاہنوں اور نجومیوں کے پاس غیب کی خبریں معلوم کرنے کی نیت سے جانا اور پھر ان کی تصدیق کرنا، یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے چالیس دن کی نمازیں برباد ہو جاتی ہیں، جیسے بعض لوگ چوری کا سراغ ایسے مدعیان غیب کے ذریعے سے لگواتے ہیں یا شادی اور کاروبار کی کامیابی یا ناکامی کی بابت استفسار کرتے ہیں اور پھر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں حرام ہیں۔ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔

شیطانی کام

حضرت قبیصہ بن مخارق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

عَیافہ، طیرہ اور طَرق، شیطانی کاموں سے ہیں۔"

اسے ابوداؤد نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور کہا ہے

کہ طرق کا مطلب ہے: پرندے کا اڑانا کہ وہ اڑ کر دائیں جانب جاتا ہے یا بائیں جانب۔ اگر وہ اپنی پرواز کا رخ دائیں طرف کرے تو اس سے نیک فال لے اور اگر بائیں طرف رخ کرے تو بد فالی لے۔

امام ابو داود رحمتہ اللہ نے فرمایا: اور عیافہ کے معنی لکیر کھینچنا ہیں۔

فائدہ : عیافہ کے معنی لکیر کھینچنا کیے گئے ہیں۔ اس کی صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ نجومی یا کاہن کسی شخص کے کہنے پر زمین کے نرم حصے میں نہایت تیزی سے لکیریں کھینچتا تاکہ انہیں شمار نہ کیا جا سکے، پھر دوبارہ

انہیں دو دو کر کے مٹاتا' اگر آخر میں دو لکیریں رہ جاتیں تو اسے کامیابی کی اور اگر ایک رہ جاتی تو اسے ناکامی کی علامت خیال کیا جاتا۔ بعض لوگوں نے اس کی اور بھی شکلیں اور صورتیں بیان کی ہیں۔

علم نجوم سیکھنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے علم نجوم کا کچھ حصہ حاصل کیا تو اس نے جادو کا ایک حصہ حاصل کیا۔ (اس حساب سے) جتنا علم نجوم زیادہ سیکھا تو اس نے اتنا ہی جادو کا علم زیادہ سیکھا۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں علم نجوم کو جادوگری کا ایک حصہ قرار دیا گیا ہے اور اسلام میں جادو کا علم سیکھنے کو کفر تک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ نجوم و کہانت کا علم بھی اسلام کی نظر میں کتنا خطرناک ہے اور اس کا سیکھنا کتنا بڑا جرم۔

2۔ اس علم نجوم سے مراد وہ علم ہے۔ جس کی بنیاد پر مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کی پیش گوئیاں کی جاتی ہیں اور ان کا تعلق وہ ستاروں کی چالوں سے جوڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک علم فلک ہے۔ جس کی رو سے سورج اور چاند کے طلوع و غروب اور زوال وغیرہ کے اوقات کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہ ایک جائز علم ہے کیونکہ اس کی بنیاد تجربہ و مشاہدہ پر ہے۔

جاہلیت

حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرا زمانہ جاہلیت قریب ہے (ابھی نیا نیا اس سے نکل کر آیا ہوں) اور اب اللہ تعالیٰ اسلام کو لے آیا ہے اور ہم میں سے کچھ لوگ کاہنوں کے پاس جاتے ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم ان کے پاس مت جانا۔"

میں نے کہا: "ہم میں سے کچھ لوگ بدشگونی لیتے ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ ایک ایسی چیز ہے جسے وہ اپنے سینوں میں پاتے ہیں' چنانچہ یہ ان کو کاموں سے نہ روکے۔"

میں نے عرض کیا۔

"ہم میں سے کچھ لوگ لکیریں کھینچتے ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"پہلے انبیاء میں سے ایک نبی لکیر کھینچتے تھے چنانچہ جس کی لکیر ان پیغمبر کی لکیر (کے اصول) کے مطابق ہو' وہ درست ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے وہ اپنے دلوں میں پاتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ بعض دفعہ کوئی چیز ایسی سامنے آتی ہے کہ آدمی کا ذہن بدشگونی کی طرف چلا جاتا ہے' گویا یہ ایک فطری اور طبعی چیز ہے۔ جس پر کوئی گرفت نہیں۔ البتہ پھر اس کے مطابق اگر انسان عمل کرے تو یہ غلط اور ممنوع ہے' اسی لیے آپ نے فرمایا: یہ چیز انہیں کاموں سے نہ روکے۔

2۔ اس میں جس لکیر کے کھینچنے کا ذکر ہے' یہ اس سے مختلف ہے۔ جس کا ذکر پہلے گزرا۔ یہ ایک نبی کا فعل تھا جو وحی الٰہی کی روشنی میں کیا جاتا تھا' اس لیے وہ یقیناً" صحیح تھا۔ لیکن اب اس کا علم کسی کے پاس بھی نہیں ہے' اس لیے اب اسے بھی اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ "جس کا خط ان کے (اصول کے) مطابق ہو' وہ درست ہے" اس کا مطلب ہے کہ اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ کسی کو وہ علم نہیں' یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ کام اب بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ جب تک اس کے اصول و قواعد کا علم نہ ہو' اسے کوئی شخص کس طرح کر سکتا ہے؟ یہ خط اللہ کے نبی کس طرح کھینچتے تھے؟ اس کے اصول و ضوابط کیا تھے؟ ان کا علم ان پیغمبر کے ساتھ ہی چلا گیا' اس لیے اب یہ بے فائدہ کام ہے۔ یہ پیغمبر کون؟ بعض کہتے ہیں کہ یہ حضرت دانیال تھے اور بعض کے خیال میں حضرت ادریس۔ علیہ السلام واللہ اعلم۔

☆

تہوار ہوں یا مل بیٹھنے کا کوئی بہانا یا کوئی چھوٹی بڑی تقریب کوئی بھی خوشی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک انواع و اقسام کے خوش ذائقہ مزے دار کھانوں کا اہتمام نہ کیا جائے عید ہمارا مذہبی روایتی تہوار ہے۔ خوش ذائقہ پکوان اس تہوار کی خوشی اور رونق میں اضافہ کرتے ہیں خصوصاً "عیدالاضحیٰ" کے موقع پر جب گوشت وافر مقدار میں ہوتا ہے اس دن خواتین کی مصروفیت عروج پر ہوتی ہے۔ ایک طرف قربانی کا پھیلاوا گوشت کی صفائی اور تقسیم۔ دوسری طرف انواع و اقسام کے کھانوں کی تیاری اور مہمان داری۔ نہ صرف مہمانوں کے لیے بلکہ گھر والوں کے لیے بھی اس دن خصوصی اہتمام ہوتا ہے تاکہ خاتون خانہ اپنا ہنر اور سلیقہ منوا سکے۔

ہر گھر اور خاندان کے کچھ مخصوص روایتی کھانے ہوتے ہیں۔ جو تہواروں کے موقع پر لازمی بنائے جاتے ہیں۔ نمکین پکوان کے ساتھ میٹھا بھی لازمی ہے کہ نمکین عید پر شیریں ذائقوں کی طلب اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

عیدالاضحیٰ کے موقع پر ہم نے اپنی مختلف شہروں اور گاؤں میں رہنے والی قارئین سے اسی حوالے سے سوال کیے ہیں تاکہ ان کی عید اور روایتی پکوانوں کے بارے میں جان سکیں۔ سوال یہ ہیں۔

1۔ عیدالاضحیٰ کا دن کیسے گزرتا ہے؟ کیا آپ قربانی کے گوشت کی صفائی تقسیم اور دیگر کاموں میں حصہ لیتی ہیں۔

2۔ ہر گھر کی ایک روایتی ڈش ہوتی ہے۔ جو تہواروں پر بنائی جاتی ہے۔ گوشت کی وہ کون سی خاص ڈش ہے۔ جو عیدالاضحیٰ پر آپ کے گھر میں ضرور بنتی ہے۔

3۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر آپ مہمانوں کی تواضع کے لیے کیا اہتمام کرتی ہیں؟ میٹھے میں کیا بناتی ہیں؟

آیئے دیکھتے ہیں۔ ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں؟

عیدالاضحیٰ اور ہم

امت الصبور

فائزہ محمد زبیر خان۔۔۔ ناظم آباد نمبر 2۔ کراچی

سب سے پہلے تو آپ سب کو۔۔۔ عید مبارک۔

1۔ بچپن میں تو صبح سویرے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد کانوں میں بالیاں اور مہندی رچے ہاتھوں پر کلائی بھر بھر چوڑیاں چڑھا لیتی تھی اور ناشتا کرنے کے بعد نئے کپڑے پہن کر جھٹ کھمبے کے پاس پہنچ جاتی تھی جہاں ہمارے چار چچاؤں اور ایک پڑوسی کی مشترکہ گائے ذبح ہوتی ہے۔ ذبح کرتے دیکھتے وقت جتنا پرجوش ہوتی تھی۔ ذبح ہونے کے بعد اتنی ہی افسردہ ہو جاتی تھی اور پھر اپنا غم غلط کرنے کے لیے واپس گھر آکر فوراً "میٹھا" شیر خورمہ یا ٹرائفل کھاتی تھی جو تمام چچاؤں کی مشترکہ فرمائش پر اماں خصوصی طور پر تیار کرکے رکھے ہوئے ہوتی تھیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بھابھی (میری امی) جیسا شیر خورمہ اور فروٹ ٹرائفل پوری دنیا میں کوئی بھی کوئی نہیں بنا سکتا۔ (اللہ بخشے امی مرحومہ کو)

سوال کے دوسرے حصے کا جواب جی ہاں گوشت کی صفائی ستھرائی کاٹ چھانٹ ناپ تول تقسیم اور بانٹنے تک کے تمام امور میں تن دہی سے حصہ لیتی ہوں بصد خوشی کیوں کہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اب کی بار تو امی کی کمی کے باعث نجانے عید کیسی گزرے۔ کچھ خبر نہیں مگر جب امی زندہ ہوتی تھیں تو ہوش سنبھالنے کے بعد سے لے کر پچھلے 2014ء کی عید تک تو میں امی اور بڑی بہن مل کر سب سے پہلے نیا نکور ٹاٹ بچھا دیتے تھے۔ اس کے بعد تمام گوشت ڈھیر کر دیتے اور چربی الگ اور ہڈیاں الگ کر دیتے۔ اس کے بعد گوشت کے تین حصے کر دیتے۔

ناپ تول کر (چونکہ ہم ہر سال لازمی قربانی کرتے ہیں سو ترازو ہمارے گھر میں ہوتا ہے) جس کا ایک حصہ غریبوں، مسکینوں۔ دوسرا حصہ پڑوسیوں، عزیزو اقارب جبکہ تیسرا حصہ ہمارا ہوتا ہے، مگر صرف نام کی حد تک کیوں کہ امی وہ بھی بانٹ دیتی تھیں۔ تھیلیوں کا پیکٹ پہلے سے لاکر رکھ دیے تھے تو تمام تھیلیوں میں برابر برابر گوشت ایک چربی اور ایک ہی ہڈی ڈال کر جب پرچیاں لکھنے کی باری آتی تھی تو قرعہ فال تو نہیں کہہ سکتی، مگر ووٹ زیادہ تر میرے حق میں ہی ہوتے ہیں کیوں کہ گھر بھر میں میری ہی لکھائی ذرا ڈھنگ کی ہے اور پھر امی بڑی بہن یا پھر مجھے ابو کے ہمراہ کردیتی تھیں تاکہ ابو کچھ گڑبڑ نہ کردیں اور اس طرح باری باری کرکے تمام امور انتہائی خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتے! یہ ہے ہمارے عیدالاضحیٰ کے خوب صورت دن کا احوال۔

2۔ ویسے تو بہت ساری ڈشیں ہیں جو ضرور بنتی ہیں مگر نہ صرف ہمارے گھر میں بلکہ پورے خاندان میں ایک ڈش خصوصی طور پر لازمی بنتی ہے۔ ہوسکتا ہے پڑھ کر آپ کو ہنسی آئے سو دل کھول کر ہنسیے۔ ڈونٹ وری، ڈونٹ مائنڈ۔ اور وہ ڈش یہ ہے کہ وہ ہڈیاں جن پر ہلکا ہلکا گوشت اور چربی لگی ہوتی ہے۔ ان تمام ہڈیوں کو صفائی سے دھونے کے بعد بڑے سے دیگچے میں ڈال کر دیگچہ منہ تک پانی سے بھرلیں اور ہلکی آنچ پر رکھ دیں رات کے ٹائم تو صبح تک پانی خشک ہو کر ساتھ میں گوشت بھی گل چکا ہوگا اور ایک خاص بات کہ اس میں نمک ڈالنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی کیوں کہ اس میں بذات خود کافی سے زیادہ نمکینی پائی جاتی ہے۔

لیکن یہ ڈش ہم ہر مہمان کو نہیں پیش کرتے۔ کیوں کہ خاصا معیوب سا لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے پیش کرنے پر مہمان دل میں سوچے "اتنی دور سے ہم ملنے آئے اور لے کہ یہ گلی ابلی ہوئی ہڈیاں اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیں۔ یہ ڈش انہیں پیش کی جاتی ہے جن کے بارے میں پتا ہو کہ وہ پسند کرتے ہیں۔ مثلاً" ایک ماں کو پتا ہے کہ اس کی بیٹی کو یہ ڈش شادی سے پہلے کتنی مرغوب ہوا کرتی تھی۔ سو جب سسرال سے بیٹی میکے میں رہنے آتی ہے تو اس ڈش پیش کردیتی ہے اور بیٹی پلیٹ بھر بھر کر ہڑپ کرجاتی ہے۔ اسی طرح اک نند کو پتا ہے کہ میری بھابھی کو یہ ڈش بہت پسند ہے۔ ایک بہن اپنی بہن کی پسندیدگی سے واقف ہے یا پھر ایک بھابھی کو پتا ہے کہ نند سراپا انتظار ہے کہ کب ہڈیوں سے بھری پلیٹ کا دیدار ہو تو جھٹ سے پیش کردیتی ہے آپ اس ڈش کو کوئی بھی نام دے سکتے ہیں جیسے ہڈیوں کا برادہ یا ہڈیوں کا سرمہ (ہاہاہا) اور سچی بات تو یہ ہے کہ بچپن میں جب خالا کی فیملی اور ہم نانا کے گھر جاتے تھے تو امی اور خالہ خوب پلیٹ بھر بھر کر ہڈیوں سے انصاف لازمی کرتی تھیں۔ آپ بھی یہ ڈش ضرور ٹرائی کیجیے گا کیوں کہ آپ تو مہمان نہیں ہے ناکہ برا مان جائیں۔ ہم سب تو اپنے ہیں اپنوں میں شرم کیسی (ہاہاہا)۔

3۔ آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم مختلف مہمانوں کو مختلف مختلف یعنی ان کی پسند کے لحاظ سے ڈش پیش کرتے ہیں جس سے بھرپور انصاف کرنے والے مہمان جھولیاں بھر بھر کر دعائیں دیتے نہیں تھکتے۔ کیوں کہ امی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔

لیکن جب میری بہن کے سسرال والے آتے تھے تو وہ خود ان کی خاطر تواضع کے لیے ایک سے ایک ڈش بناتی تھی جس میں فرائی گوشت، کڑاہی گوشت، اچار گوشت، کوئلہ گوشت، شاہی بہاری، چپلی اور سیخ کباب شامل ہوتے تھے ہر بار نہ صرف عید پر بلکہ اس کے علاوہ (ہماری خالہ کی فیملی بھی ہے) بھی ان میں سے دو سے تین ڈشز لازمی بنتی تھیں جس میں ایک زبردستی بہن پر احسان عظیم کرتی میں بھی بنالیتی تھی۔ کیوں کہ بہن کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اچھی اچھی ڈشیں بنا کر معدے کے ذریعے اپنے سسرالیوں کے دل میں بڑا نہ سہی چھوٹا ہی سہی اک گھر خرید لے۔ اور الحمدللہ ایسا ہی ہے اس کے سسرال میں تین بہوؤں میں میری بہن کو چہیتی بہو کا درجہ حاصل ہے۔ اور گھر کے تمام امور اور اہم فیصلوں میں ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے۔

میٹھے کا جواب پہلے ہی دے چکی ہوں۔ کسٹرڈ بہت کم بنتا ہے کہ وہ عام دنوں میں بھی ہم زیادہ تر بناتے رہتے ہیں۔ کھیر کمس، شیر خورمہ اور ٹرائفل ان میں سے ایک ضرور میٹھے میں بنتا ہے۔ اب کی بار امی کی کمی شدت سے محسوس ہوگی عید کی خوشیاں گویا اپنے معنی کھو چکی ہیں میرے لیے مگر آپ سب کی خوشیوں کے لیے دعا گو ضرور ہوں عید مبارک، خدا حافظ شاد رہیے، خوش رہیے، آباد رہیے۔

تہمینہ رؤف۔۔۔ خیبر پختون خواہ (بنوں)

1۔ عیدالاضحیٰ کا دن کیسے گزرتا ہے؟ یہ سوچ ہی بڑی نرالی، چمکیلی، بجلی اور دل گداز ہے۔ عید کا دن بہت اچھا گزرتا ہے۔ صبح اٹھ کے پہلے ہلکی پھلکی صفائی کرتی ہوں۔ گوشت آنے سے پہلے نہا کے اچھے سے سادہ کپڑے پہن لیتی ہوں کیوں کہ میں زیادہ چمکیلے بھڑکیلے کپڑے نہیں پہنتی۔ اپنے لمبے گھنے بالکل ناولوں کی ہیروئن کے جیسے بالوں کا سادہ سا جوڑا یا پھر چوٹی گوندھ کے کمر پہ ڈال دیتی ہوں۔ (گھر میں لگے پھولوں کے پودوں سے پھول چن کے اس کا گجرا بنا کے بالوں میں اٹکا لیتی ہوں) چوڑیاں، مہندی اور میک اپ میں کرتی نہیں ہوں تو یہ میری مختصری تیاری جلدی اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

گوشت کی صفائی ستھرائی اور تقسیم سے دور بھاگتی ہوں۔ یہ کام اماں کے ذمے ہیں، وہی کرتی رہتی ہیں یہ سب کچھ۔ ہاں پکانے کی ذمہ داری میری ہے، مگر وہ بھی صرف رات کو۔ کیوں کہ صبح کے چاول پکانے کی ذمہ داری پوری کرتے ہم ساری عمر بابا کو دیکھتے آرہے ہیں (زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے) میرے بابا کو خود کو کنگ کا شوق ہے اور وہ اپنی مرضی سے صبح کے چاول پکاتے ہیں جو کہ بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ اس طرح ہی عید کے دن فارغ ہی رہتی ہوں۔

2۔ کوئی ایسی خاص روایتی ڈش نہیں ہے۔ بس گوشت کے چاول پکاتے ہیں اور ساتھ میں سادہ بھنا ہوا گوشت ہوتا ہے۔ اتفاق سے ہمارے گھر والے سب ہی زیادہ کھانے کے شوقین نہیں ہیں اس لیے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا۔ ہاں رات کو صرف نمک ملا کے گوشت کو بھون کے کھایا جاتا ہے۔ اس لیے ترکیب کچھ خاص نہیں ہے۔ میرے خیال میں سب ہی کو بنانا آتا ہے۔ فرمائشی پروگرام تو پھر عید کے دوسرے دن سے شروع ہو جاتا ہے۔ کسی کو کریلے گوشت کھانا ہوتا ہے تو کسی کو اچار گوشت، کوئی کابلی پلاؤ کی فرمائش کرتا ہے تو کوئی بریانی (جس میں، میں ہی سرفہرست ہوتی ہوں)

3۔ مہمان عید کے دوسرے دن سے ہی آنا شروع ہوتے ہیں۔ پہلے چائے سے ان کی تواضع کرتی ہوں، پھر کھانے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ بہنیں پہلے سے کال کرکے بتا دیتی ہیں کہ ہم آرہے ہیں۔ (ہم سے مراد ان کے وہ بھی) تو تیاری پہلے سے شروع کر دیتی ہوں کہ کیا کیا بنانا ہے۔ اگر بھائی کے مہمان ہوتے ہیں ان کے دوست وغیرہ، تو بھائی سارا سامان ساتھ لا کے پیکٹ شیکٹ پکڑا کے کہہ دیتا ہے کہ یہ جو چیزیں شاپر میں موجود ہیں یہ بنانی ہیں۔

(لو جی اے تھے خیر گل ای مک گئی اے جی) میری پریشانی ختم ہوئی، کیوں کہ جو کچھ بنانا ہوتا ہے وہ سب کچھ پیکٹ کے مسالے میں تیار ہوا ہوتا ہے۔

مہمان چاہے گھر کے اندر ہو یا باہر سب کی ایک جیسی تواضع کی جاتی ہیں۔ چائے، شربت کے بعد اس کی کھانے میں خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ میں نے آج تک کسی مہمان کے لیے میٹھے میں کچھ نہیں بنایا۔ کیوں کہ خدا کی خاص مہربانی ہے مجھ ناچیز پر اکہ جب بھی کوئی ایسا مہمان ہو جس کے لیے میٹھے میں لازمی کچھ بنانا ہوتا ہے۔ تو اس دن خوش قسمتی سے میری کوئی شادی شدہ بہن آئی ہوتی ہیں جو میری مدد کو آسکتی ہے اور میٹھا وہی بنا لیتی ہے، میں خود میٹھا نہیں کھاتی تو آج تک ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا ہے مجھ سے۔ جتنے جوش و خروش سے اس عید سروے میں لکھنے کے لیے بے تاب تھی اب ایکسائٹمنٹ کے مارے سب کچھ بھول گیا ہے جی۔

بس آخر میں میری ساری فرینڈز اور پورے پاکستان والوں کو عیدالاضحیٰ مبارک ہو۔

مہوش قدیر۔۔۔ جمال چھپری ضلع لیہ

سروے کے سوالات یقیناً" انتہائی دلچسپ ہیں، سب سے پہلے سوال کا جواب۔

1۔ عیدالاضحیٰ کا دن کیسے گزرتا ہے؟ کیسے گزرتا ہے انتہائی پرجوش انداز میں مصروف ترین۔ جناب ہم عید کی صبح وہ عیدالفطر ہو یا عیدالاضحیٰ تین بجے جاگ جاتے ہیں اب ہم سے مراد پورا گھر نہیں بلکہ میں اکیلی خود ہوں۔ جاگ کر سب سے پہلے نماز تہجد ادا کی، پھر جناب کمروں اور برآمدے میں جھاڑو دی پونچا لگایا اور پھر جھاڑ پونچھ کی۔ جلدی جلدی صحن میں جھاڑو دی پھر واش روم دھوئے، پھر سب سے پہلے (عید کا) غسل کیا نماز فجر ادا کی اور سب سے پہلے تیار ہوئی۔ یہ سب سے پہلے تیار ہونے کی۔ بیماری مجھے بچپن سے ہے اب ختم پتا نہیں کب ہوگی۔

امی جان عید کے لیے سویاں تیار کرتی ہیں۔ ہم "عموماً" سویاں ہی بناتے ہیں۔ پھر بھائیوں کو ڈیڈی جان اور دادا جان کو کپڑے دیتی ہوں جو پہلے سے پریس کرکے رکھے ہوتے ہیں۔ وہ مسجد نماز پڑھنے جاتے ہیں ہم لوگ گھر میں پڑھتے ہیں۔

پھر ہم جناب کولڈ ڈرنک اور مٹھائی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہاں ایک بات' ہم بچپن سے بھی کبھی عید کے دن کسی کے گھر نہیں گئے اور اب بھی نہیں جاتے۔ مشکل سے عید پر سب اکٹھے ہوتے ہیں تو پھر جانے کا دل نہیں چاہتا۔

آپ قربانی کے گوشت کی صفائی کا پوچھ رہے ہیں ہم لوگ باقاعدہ سارے گھر والے مل کر قربانی والے جانور کا گوشت بناتے' صاف کرتے اور تقسیم کے لیے اس کے علیحدہ علیحدہ ڈھیر بناتے ہیں۔ میں اور میری بہن ڈیڈی کے ساتھ جانور کو ذبح کرنے میں بھی مدد دیتی ہیں۔ ہم بہت مزے سے یہ کام کرتے ہیں' کچھ لڑکیاں کہتی ہیں کہ خون سے ڈر لگتا ہے' لیکن ہم لوگ نہیں ڈرتے بھئی بہادر جو ہوئے (ہاہاہا) ایک دفعہ بھائی دونوں ابھی گھر کے اندر کپڑے تبدیل کررہے تھے۔

ہم دونوں بہنیں ڈیڈی کے ساتھ باہر تھیں ہم دونوں بہنوں نے بکرے کو قابو کیا اور ڈیڈی جان نے اسے ذبح کیا' سو میں تو بہت انجوائے کرتی ہوں۔

2۔ جہاں تک روایتی ڈش کا تعلق ہے تو ہم لوگ اتنے روایت پسند نہیں۔ ہمارے گھر میں کوئی خاص روایتی ڈش نہیں بنتی۔ سوائے سویاں یا پھر چاولوں والی کھیر' جو گھر کا دودھ ہونے کی وجہ سے کافی سارا دودھ ڈال کر بنائی جاتی ہے اور بڑے مزے کی ہوتی ہے ہماری تو یہ روایتی ڈش ہے۔ ہاں میری چاچی اپنی روایتی ڈش: میٹھے چاول بناتی ہیں' جنہیں میرے ڈیڈی جان (زردم' خراب) کے نام سے بلاتے ہیں۔

گوشت کی خاص ڈش دو بنتی ہیں (1) نمکین گوشت جو کہ ہم لازماً "بناتے ہیں اور سارے بہت پسند کرتے ہیں اور ایک جسے میرے بھائی باربی کیو کے نام سے تیار کرتے ہیں' اب آپ بتائیں کون سا باربی کیو سمجھے' ہمارا دیسی باربی کیو ہے۔ (ہے نا مزے کی بات)

نمکین گوشت

سادہ سی ترکیب ہے۔

گوشت کو اچھی طرح صاف کرکے اس میں لہسن' ادرک' پیاز کا پیسٹ ملالیں۔ اس میں ٹماٹر اور تھوڑی سے ہری مرچ کٹی ہوئی ڈال دیں اور تھوڑا سا گرم مسالا اور حسب ذائقہ نمک ڈال لیں۔ اس کو درمیانی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں' جب گوشت گل جائے اور پانی خشک ہوجائے تو اس میں حسب ضرورت گھی ڈال کر بھون لیں اچھی طرح بھون لینے کے بعد اس کو کھلے برتن میں نکال کر سب فیملی اکٹھی ہوکر اس پر ٹوٹ پڑے (ہاہاہا) ہم لوگ نمکین گوشت بہت پسند کرتے ہیں سادہ لوگ ہیں سادہ کھاتے ہیں' لیکن گوشت خور رج کے ہیں۔ چھوٹی عید پر بھی پورا بکرا ہم آسانی سے تناول فرمالیتے ہیں۔

باربی کیو

یہ میرے بھائیوں کا باربی کیو ہے وہ ہی بناتے ہیں۔ بڑے بڑے پیس کرکے ان کو ابال لیتے ہیں (بھئی! اچھی طرح صاف کرنے اور دھونے کے بعد) اس کے بعد اس میں لسٹ لگاتے ہیں پھر ان پر مسالا جات جو کالی مرچ' نمک' گرم مسالا' لال مرچ پر مشتمل ہوتا ہے وہ لگاتے ہیں پھر ان کو آگ جلا کر کوئلوں پر رکھ دیتے ہیں جب وہ بھن جاتا ہے یقین جانیے بہت مزے کا ہوتا ہے۔

اب آپ کو یہ پسند آئے یا نہ آئے ہمیں تو اور کوئی ترکیب نہیں آتی۔ بس میرا دل چاہا شرکت کرنے کو کرلی۔

3۔ عید پر مہمانوں کی تواضع کرنے کے لیے ہم نے کولڈ ڈرنک اور مٹھائی منگوائی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے مہمانوں کو یہ ہی پیش کی جاتی ہے اس کے بعد میٹھے میں اگر سویاں ہیں تو وہ پیش کی جاتی ہیں پھر ہماری فیورٹ گوشت کی ڈشز نمکین گوشت اور باربی کیو وہ پیش کیا جاتا ہے۔ ساتھ میں چٹنی جو دہی میں ہری مرچیں کوٹ کر ملاکر بنائی جاتی ہے وہ بھی پیش کی جاتی ہے۔

پھر اس کے بعد اگر اضافہ کرنا ہے تو پلاؤ بنالیتے ہیں۔ یا بھائی زندہ باد گوشت کو بیسن لگا کر فرائی کرتے ہیں۔ آپ سوچ رہی ہوں گی میرے بھائی بڑے کام کرتے ہیں جی جناب عید کے دن وہ ہمارے ساتھ اپنی پسند کی ڈشز خود تیار کرتے ہیں۔

شازیہ قیصر، تحصیل سرائے عالمگیر

پہلے سوال پر تو میں یہی سوچتی رہی کہ چھوٹی عید زیادہ مصروف گزرتی ہے یا بڑی عید' بڑی عید سے پہلے کی گہما گہمی' جانوروں کی سجاوٹ۔ بچوں کا جوش و خروش اور جذبہ یہ سب بہت بھلا لگتا ہے۔

عید کا دن تو اتنا مصروف گزرتا ہے کہ رات تک ٹانگیں اور پاؤں دہائی دے رہے ہوتے ہیں' لیکن کام ختم نہیں ہوتے۔ صبح اٹھ کر نماز کی ادائیگی کے بعد جو سب سے پہلے کام ہوتا ہے۔ وہ سویاں بنانے کا ہوتا ہے' پھر بچوں اور شوہر کو تیار کر کے مسجد بھیجا جاتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ گھر کی صفائی کا کام بھی جاری رہتا ہے' ویسے بچوں کے مسجد جانے کے بعد گھر کی ایسی حالت ہوتی ہے جیسے شادی ہال کی تقریب ختم ہونے کے بعد اور پھر اس کے بعد برتنوں کا نہ ختم ہونے والا انبار۔

ہمارا صحن بہت بڑا ہے تو جانور کی قربانی وہیں پر کی جاتی ہے شوہر اور پڑوس کے لڑکے خود گائے ذبح کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ چائے کی فرمائش' ہمارے ہاں مرد خود ہی گوشت بنا کر تقسیم کرتے ہیں جیسے رشتہ داروں اور ضرورت مندوں کا حصہ خود بانٹتے ہیں اور گاؤں کے بچے اتنے آتے ہیں کہ دینے والا اس ڈھیر میں دب کر رہ جاتا ہے۔ صرف اپنا حصہ ہمیں دیا جاتا ہے اسے سنبھالنا بھی ایک بڑا کام ہے۔

جو مرد ساتھ کام کروا رہے ہوتے ہیں ان کے لیے کھانا بنانا مجھے تو ہمیشہ سے مشکل لگتا ہے اور ساتھ فرمائش ہوتی ہے کہ روٹیاں بھی گھر پر بناؤ یعنی عورتوں کی عید تو نہ ہوئی نا پھر کہ وہ عید کے دن بھی ڈھیروں ڈھیر روٹیاں بنائے' میں تو اپنے حصے کے پیکٹ بنا کر رکھ دیتی ہوں' بعد میں سہولت رہتی ہے اور جو پڑوس میں رہ جاتا ہے انہیں باقی گوشت بھجوا دیا جاتا ہے۔

2 ہمارے ہاں عید پر میٹھے میں کھیر اور سویاں تو ضرور ہی بنتی ہیں اور بقر عید پر ہمارے ہاں کلیجی ہی بنتی ہے اور کلیجی بنانا تو میرے خیال میں سب کو ہی آتی ہے ویسے میں کلیجی کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنا کر اچھی طرح دھو کر اس میں تھوڑا سا پانی اور لہسن' پیاز' مرچیں' ٹماٹر ڈال کر چولہے پر چڑھا دیتی ہوں نمک نہیں ڈالتی۔ اس سے کلیجی سخت ہو جاتی ہے پھر بعد میں آئل ڈالتی ہوں پھر تھوڑا سا بھون کر آئل اوپر آجائے تو بس کلیجی تیار میں تو اسی طرح بناتی ہوں جلدی جلدی میں۔

3 ہمارے ہاں مہمان ہمیشہ عید کے دوسرے دن آتے ہیں۔ قربانی پہلے دن کرتے ہیں تو ان مہمانوں کے لیے خاص طور پر بریانی بنتی ہے کیونکہ میری نندیں آتی ہیں' شام میں ہم سب مل کر باربی کیو کا انتظام کرتے ہیں اور یہ محفل بھی رات گئے تک برخاست ہوتی ہے۔ ویسے تو اب گرمی کی عید آرہی ہے' سوچ کے ہی ہول اٹھتے ہیں کہ ہم یہ سب کیسے کریں گے۔ عید کے دوسرے دن تو ہمارے ہاں اسٹارش ہوتا ہے کہ پھر بھی اٹھاؤ تو ایک مہمان نکلے گا۔

میٹھے میں تیس پینتیس کلو دودھ کی کھیر بناتے بناتے بازو شل ہو جاتے ہیں۔

پہلے ہم مہمانوں کو کولڈ ڈرنک دیتے ہیں' پھر کھانا اور میٹھا ساتھ' پھر آخر میں چائے اور نندیں چونکہ مہمان نہیں ہوتیں تو وہ خود ہی ساتھ ساتھ کام کرتی رہتی ہیں' اس طرح مل جل کر کام کرلیا جاتا ہے اور عید کا دن بھی اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

خضریٰ ظفر۔ رحیم یار خان

آپ سب کو میری طرف سے دلی عید مبارک۔

1 عید کا دن بالکل نارمل سا گزرتا ہے کچھ زیادہ خاص نہیں۔ کیونکہ بھئی عید تو بچوں کی ہوتی ہے۔ لیکن خیر سب سے پہلے صبح اٹھ کر عید کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ پھر تیار ہو کر دادی کے گھر چلے جاتے ہیں جو کہ ہماری گلی میں ہی ہے۔ سارے چاچو اور ان کی فیملیز بھی وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ وہاں کچھ کھاتے پیتے ہیں۔ سب سے عیدی لیتے ہیں۔ پھر اپنے گھر آجاتے ہیں۔ کیونکہ قربانی وہاں پر بھی ہوتی ہے۔ دو تین سال پہلے سب دادی کے گھر اکٹھے ہی کھانا کھاتے تھے۔ لیکن اب سب کے گوشت کا حصہ ان کے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے' جو مزہ عید پر اکٹھا کھانا کھانے میں ہے' وہ مزہ کسی اور چیز میں نہیں۔

جہاں تک گوشت سنبھالنے کی بات ہے تو میں ان میں سے کوئی کام نہیں کرتی۔ اب کون تیار شیار ہو کر گوشت سنبھالے' یہ کام میری مماجی ہی کرتی ہیں۔ میں تو بس بیٹھ کر دیکھتی ہوں اور پھر مزے لے لے کر کھاتی ہوں۔

ہمارے ہاں عید پر ہر بار کوئی نئی ڈش ہوتی ہے۔ میری

مما ہر بار کچھ نیا ٹرائی کرتی ہیں کیونکہ ان کو کوکنگ کا بہت شوق ہے اور میں ان سے بالکل الٹ۔ تو کسی ریسپی کے لیے معذرت۔ ہاں لیکن کچھ بھی بنائیں دل سے اور پیار سے بنائیں تو کھانا بہت اعلا بنے گا۔ آزمائش شرط ہے۔

3 عیدالاضحیٰ پر تو ہر طرف گوشت کی بہار ہوتی ہے۔ ایسے میں مہمانوں کی تواضع گوشت کی ہی کسی ڈش سے ہوتی ہے۔ میٹھے میں ہم سب گھر والے کھیر بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ اس لیے بنتی بھی زیادہ ہے تو مہمانوں کے سامنے بھی کھیر ہی پیش کی جاتی ہے۔ آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ یہ عید سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لے کر آئے اور ہم سب کی عید خوشگوار گزرے۔ آمین

عائشہ حسین۔۔۔ قلعہ دیدار سنگھ

1 میں بیچلرز پارٹ ون کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ ایج کا اندازہ لگالیں ذرا۔ آج تک میرے گھر بس ایک بار قربانی ہوئی ہے۔ یوں تو بڑے ابو، تایا ابو وغیرہ کے گھروں میں گائے کا ہر عید مطلب بیل ذبح ہوتا ہے۔ یعنی کیا جاتا ہے (خود تو ہونے سے رہا)۔ مگر میرے گھر ایک ہی بار قربانی فرمائی گئی اور میں نے مجال ہے جو کوئی کام کیا ہو۔ سب کچھ امی جان اور اسماء (سسٹر) نے کیا تھا۔ اب تو خیر میں کرتی ہوں کام شام (امی جو نہیں ہیں اب) ان شاء اللہ اگر آئندہ سال قربانی کی تو ضرور کروں گی صفائی بھی، تقسیم بھی (کٹائی بھی کرلوں؟)

2 ہائے ہائے روایتی ڈش (یہ کون سی ڈش ہوتی ہے؟) اور خاص موقع پر تو ہر بار کچھ مختلف ہی پکایا جاتا ہے۔ اور ہم بقرعید یا عیدالفطر پر کچھ خاص تب پکایا 'بنایا' کرتے تھے جب امی زندہ تھیں۔ اب تو سب خواب ہوا۔ مجھے تو سویاں' پھینیاں اور حلوہ جیسی سادہ (پیچیدہ) ڈش بناتے دانتوں تلے پسینہ آجاتا ہے۔ عام طور پر ٹھیک بنتا ہے سب کچھ' مگر عید شید پر صحیح بنے امپاسبل۔ (کیا پتا اس بار بن جائے)۔ ہاں ایک ڈش جو مجھے صحیح بنانی آتی ہے وہ میں نے آپ کے ہی کسی عید نمبر شمارے سے سیکھی تھی۔ بتاؤں ریسپی؟ (اچھا پھر بتائیں)

پہلے گوشت لیں (جتنا مرضی لے لیں) پھر دہی میں ڈالیں۔ پھر جتنا گوشت ہو اتنا ٹماٹر بھی ڈالیں۔ (بھئی کاٹ کر پورا تھوڑی نا۔) حسب منشا نمک ڈالیں اور ڈھکن لگا کر مطلب دم کی طرح بند کر کے چولہا ہلکا سا (تاروں پہ) میں یہی کہتی ہوں ہلکی آنچ پر کر کے دو، ڈھائی گھنٹے تک بھول جائیں مگر موبائل پہ ریمائنڈر لگالیں تاکہ جل نہ جائے ہانڈی) ہاں یاد آیا تھوڑا سا آئل اگر دل مانے تو ڈال دیں اوپر اوپر پھر جب الارم بجنے پر دیگچی کا ڈھکن اٹھائیں گے تو وہ پک چکا ہوگا اب ڈش میں نکال لیں۔ بلیک پیپر کا پاؤڈر چھڑک کر دو سے پانچ لیموں نچوڑ لیں۔ ڈش کو ڈھانپ کر ساتھ میں کولا کاٹن میرے پتے پر بھیج دیں نہایت شکر گزار ہوں گی میں آپ کی (ہائے توبہ تھک گئی میں تو)

3 خاص اہتمام، جناب اصغری بننا تو چاہتی ہوں مگر۔ کوئی کولا ود کیک کوئی سا بھی (وہ بھی ریڈی میڈ) نمکو، بسکٹ بعد میں آئس کریم۔ اور میٹھے میں باقی کیا رہ جاتا ہے؟۔ مگر اس عید پر کباب بناؤں گی دو تین قسم کے اور نہاری بھی۔ (نئی نئی سیکھی ہیں دونوں ڈشز خالہ سے)

اور ہاں یاد آیا اس بار عید پہ ہم میٹھا نہیں بنانے والے (کوئی کھاتا ہی نہیں، اتنا تو ٹیسٹی بناتی ہوں۔ پڑا رہتا ہے)۔ آپ بتائیں' رزق برباد کرنا اچھی بات ہے؟ دعا کریں اللہ میاں ہمیں توفیق اور وسائل عطا فرمائے آئندہ سال بتاؤں گی کہ گوشت کی تقسیم وصفائی کیسے کرتی ہوں۔ سب مل کر بولیں (آمین) اللہ سب کو توفیق دے اور مجھ جیسی بیٹی بھی۔ دوبار آمین۔

طلعت شاعر۔۔۔ سیال شریف

ہر ہاؤس وائف کی طرح میرا بھی عیدالاضحیٰ کا دن بہت مصروف گزرتا ہے۔ عیدالفطر کی طرح عیدالاضحیٰ کا دن بھی اپنے ساتھ خوشیوں کے علاوہ بے پناہ مصروفیات بھی لاتا ہے۔ لیکن یہ مصروفیات خوشگوار ہوتی ہیں کیونکہ تمام فیملی اکٹھی ہوتی ہے۔ عیدالاضحیٰ کے دن باقی تیاریوں کے ساتھ ساتھ پراتیں اور چھریاں بھی سنبھالی جاتی ہیں کیونکہ یہ تو اس عید کا اہم حصہ ہیں عید کے دن روٹین کے کاموں سے فارغ ہوتی ہوں تو گوشت کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ مرد تو نماز کے بعد قربانی کرنے چلے جاتے ہیں اور بچے ساتھ وڈیو بنانے ہمارے ہاں گھروں میں قربانی کے جانور نہیں لائے جاتے بلکہ باہر ڈیروں پر رکھے جاتے ہیں اور وہیں قربانی ہوتی ہے۔

قربانی کے گوشت کی صفائی، تقسیم اور دیگر کام ہم نے ہی

کرنے ہوتے ہیں ہمارے علاوہ اور ہے کون ایک اکیلی جان اور سو بکھیڑے۔ بہرحال گوشت کے آنے کے بعد تو مصروفیت ہی مصروفیت ہوتی ہے اور پھر رات گئے فراغت نصیب ہوتی ہے میں تو حیران ہوتی ہوں ان لوگوں پر جو کہتے ہیں ہم تو عید کا دن سو کر گزارتے ہیں یا پھر ٹی وی دیکھتے ہوئے۔ سونے کا تو خیر چھوڑیے ٹی وی تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتا مصروفیت ہی مصروفیت ہوتی ہے پھر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ شکر ہے اللہ نے بچے دیے۔ فیملی بنائی کسی اور کا کام نہیں کرنا پڑتا۔ اپنا اور اپنے بچوں کا کام کرنا نصیب فرمایا۔ شرعی طریقے سے گوشت تقسیم کرتی ہوں اور پھر گوشت کو سنبھالتے' بانٹتے' پکاتے دن تمام ہوجاتا ہے لیکن خود کچھ کھانے کو دل نہیں کرتا۔ گوشت کو دیکھ دیکھ کر بھوک مٹ جاتی ہے۔

2۔ سب سے پہلے تو نمکین گوشت بنایا جاتا ہے۔ جو ہر گھر میں ضرور بنتا ہے اس کے علاوہ عید کے دوسرے دن میں سیخ کباب ضرور بناتی ہوں کیونکہ میرے بچوں کو بہت پسند ہیں۔ اس کی ترکیب۔ جو میں بناتی ہوں درج ذیل ہے۔

اشیاء۔ یہ ترکیب ان بہنوں کے لیے ہے۔ جن کے پاس سیخیں نہیں ہیں۔

بکرے گائے کا قیمہ	1 کلو
لہسن و ادرک پسی ہوئی	حسبِ ضرورت
نمک' مرچ سرخ	حسبِ ضرورت
کٹی ہوئی پیاز	1 عدد پیاز
تیل	حسبِ ضرورت
انڈے	2 عدد

ڈیئر سسٹرز ان کبابوں کا نام تو سیخ کباب ہے لیکن مجھے اور میرے بچوں کو انگاروں پر بھنی ہوئی کلیجی اور کباب پسند نہیں اس لیے میں اس میں رد و بدل کرکے اس کا نام فرائی کباب رکھتی ہوں۔ اب جن بہنوں کے پاس میری طرح سیخ نہیں ہیں لیکن ان کا دل کرتا ہے تو وہ میری ترکیب آزمالیں۔

ترکیب۔ کچا قیمہ لیں۔ اب اس میں لہسن و ادرک پیسٹ' نمک' مرچ' کٹی پیاز اچھی طرح مکس کرلیں۔ 2 انڈے پھینٹ لیں زیادہ نہیں۔ اب ان کو بھی اس میں شامل کرکے اچھی طرح مکس کرلیں اور سیخ کی جگہ اگر آپ کے گھر میں ٹوٹا ہوا چمچ جس کی پیچھے سے ڈنڈی نہ ہو اس پر اس آمیزے کو چپکالیں لمبائی میں۔ جس طرح سیخ کباب کی شکل ہوتی ہے اسی طرح اب ان کو ٹوٹی ہوئی جگہ سے آرام سے نکال لیں۔ اس طرح تمام آمیزے کے کباب بناتی جائیں اور پھر گھی گرم کرکے فرائی کرلیں لیکن یہ یاد رکھیں بناتے ہوئے لمبائی زیادہ رکھیں کیونکہ فرائی ہوکر یہ سکڑ جاتے ہیں۔ سادہ فرائی کرنے میں انڈہ نہیں لگاتا۔ انڈہ صرف پیچ میں ڈالنا ہے یقین کریں مزے کے بنتے ہیں۔

3۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے میں۔ شامی کباب۔ سیخ یا فرائی کباب کوفتے۔ پلاؤ وغیرہ بناتی ہوں۔ میرے پاس قیمہ بنانے والی مشین ہے' ہاتھ والی بجلی والی نہیں۔ تو وہ میں میز پہ لگادیتی ہوں عید سے پہلے ہی اور پھر جس کو قیمہ بنانا ہو' سب چلے آتے ہیں اور قیمہ بنالیتے ہیں لیکن کچھ لوگ مشین کو گھر منگوالیتے ہیں اس لیے پچھلی عید پر جب میں نے قیمہ بنانا تھا تو مشین دستیاب نہ ہوسکی۔ مجبوراً مجھے ایسے ہی دال اور گوشت کے صاف کیے ٹکڑوں کو چولہے پر رکھنا پڑا اور میں نے گوشت کے کباب بنائے یقین کریں وہ اتنے مزے کے بنے رس دار۔ مشین تو سارا رس ضائع کردیتی ہے۔ جن بہنوں کے پاس مشین نہیں ہے' وہ یہ ترکیب آزمائیں اور دعائیں دیں۔ اب تو میں ہر سال ایسے ہی بناؤں گی۔

میٹھے میں سردیوں میں عیدالاضحیٰ آتی تھی تو گجریلا اور انڈوں کا حلوہ پہلے ہی بنا کر رکھ دیتی تھی لیکن اب گرمیاں ہیں تو کبھی کھیر' کسٹرڈ یا قلفہ وغیرہ بناتی ہوں۔ پچھلی عید پر مجھے بخار تھا تو میں نے صرف مٹھائی منگوائی تھی' یہ بھی ایک آسان آپشن ہے۔

ڈاکٹر عائشہ جمیل۔۔۔ لیک سٹی لاہور

شعاع کھول کر سب سے پہلے غالباً ''پہلی شعاع'' ہی کھولی تھی۔ اور سروے کے سوالات دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ مگر میرے Send up ہو رہے ہیں۔ سوچا اناٹومی کے بعد لکھوں گی۔ مگر وقت نہیں ملا۔ پھر سوچا اتوار کو۔ مگر نہیں جی۔ پھر ارادہ کیا فزیالوجی کے بعد لکھوں گی اور یوں دس تاریخ آگئی۔ قارئین میں ''عائشہ'' نام کی بھرمار ہوچکی ہے اور تو اور ''عائشہ جمیل'' کی بھی۔ جیسے

عائشہ خان نے دوسری عائشہ خان سے کہا کہ اپنے نام کے ساتھ کچھ اور لگالیں۔ ایسے ہی میں نے کہا تھا کہ میرے نام کے ساتھ لیک سٹی لاہور لکھا کریں۔ مگر اب سوچ رہی ہوں "ڈاکٹر" لگالوں۔ آخر بعد میں بھی تو لگانا ہے۔ ان شاء اللہ۔ ٹھیک ہے نا؟ (بالکل ٹھیک۔ ہم نے "ڈاکٹر" لگادیا ہے)

1 بچپن میں تو عید چاچا کے گھر گزرتی تھی کیونکہ دادی اماں، دادا ابو وہاں ہوتے تھے۔ میں، ازکی اور ثناء تیار ہو کر دوستوں کے گھر جاتے (ازکی اور ثناء کی دوستوں کے گھر) جو عیدی ملتی اسے خرچ کرتے۔ اور ڈرامے بناتے۔ ازکی کی دوست بھی آجاتی۔ پھر خوب ایکٹنگ کرتے تھے۔

اب عید اپنے گھر مناتے ہیں۔ اس سال تو دادی اماں بھی ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ میں دیر سے تیار ہوتی ہوں۔ کیونکہ ساری رات جاگ کر صبح سوجاتی ہوں۔ پھر گیارہ بارہ بجے تیار ہوجاتی ہوں۔ چاچا کے گھر چلے جاتے ہیں ملنے۔ کھیر کھاتے ہیں اور بس۔

بچپن میں اقرا خوب ناراض ہوتی تھی کہ ہر عید پہ تم لوگ رائے ونڈ بھاگ جاتے ہو۔ دو تین عیدیں اقراء (دوست) کے ساتھ بھی گزاری ہیں۔ دوستوں کو، رشتہ داروں کو، عید مبارک کا میسج کردیتی ہوں۔ گوشت کی صفائی، تقسیم اور کسی کام میں میرا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ میں نے شاید بھی گوشت نہیں دھویا۔ ایک دو مرتبہ چکن ضرور دھوئی ہے۔ یہ سارے کام امی اور باجی کرتی ہیں۔ میں بس دیکھتی ہوں۔ (بھئی چھوٹے ہونے کا کچھ تو فائدہ ہونا چاہیے نا۔)

2 ہمارے ہاں بڑی عید پر "بریانی" ضرور بنتی ہے۔ باقی تکہ بوٹی بھی بنالیتی ہوں۔ بھائی کے دوست آکر باربی کیو کرتے ہیں۔ مگر ترکیب؟ ہائے۔ مجھے ان میں سے کچھ بھی نہیں بنانا آتا۔ تو ترکیب کیا لکھوں گی۔ باجی اسماء ہی بناتی ہیں۔ (میں تو کھاتی ہوں)۔

3 ہمارے ہاں عید پر مہمان بہت کم آتے ہیں۔ کیونکہ عید پر ہم لوگ مہمان ہوتے ہیں ازکی وغیرہ کے اکثر ہی۔ بس ابو اور بھائیوں کے دوست آتے ہیں۔ ان کے لیے بوتل وغیرہ اور میٹھے میں "کھیر" کیونکہ وہ لوگ اکثر صبح کے وقت آتے ہیں۔ ہماری عید ہوتی ہی "کھیر" سے ہے۔ کھیر امی بناتی ہیں۔ پہلے سب اکٹھے ہوتے تھے تو دادی اماں بناتی تھیں۔

اسی رات کو ہی بنانا شروع کردیتی ہیں۔ اور ہم رات کو ہی کھانا شروع کردیتے ہیں۔ پھر عید کا سارا دن کھیر ہی کھاتے ہیں۔ چاہے عید الفطر ہو یا عید الاضحیٰ۔ سچ۔ عید کے دن کھانا تو تھوڑا سا ہی کھاتے ہیں۔ مہمانوں کو بھی کھیر ہی پیش کرتے ہیں۔

عید پہ کھیر نہ ہو تو عید، عید نہیں لگتی۔ دو تین مرتبہ ہی ایسا ہوا ہے کہ کھیر کے علاوہ زردہ یا سویاں بن گئیں۔ اف! مت پوچھیں۔ جس رشتہ دار کے گھر گئے "اس سے یہی پوچھا "کھیر ہے؟" ہاہاہا۔ اللہ ہماری کھیر کو نظر بد سے بچائے۔ آمین۔ ہمارے لیے یہ جملہ فٹ بیٹھتا ہے۔ "کھیر ہو اور بہت ہو۔"

اب آپ میری باتوں سے یہ مت سمجھیے گا کہ میں کوئی بہت پھوہڑ لڑکی ہوں۔ باقی سارے کام آتے ہیں تقریباً" بس یہ بڑے بڑے کام نہیں آتے۔ بھئی میں چھوٹی جو ہوں۔

ایسے ہی ایک عید پر میں ازکی، ثنا اور ہمارے چھوٹے بہن بھائی، بچوں کا ایک ڈرامہ بنا رہے تھے۔ ہم نے دوپٹوں کی ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اور بڑے مگن تھے۔ میرے بھائی نے چھپ کر سب کچھ دیکھا اور پھر ہمارا خوب ریکارڈ لگایا۔ (معصوم بچوں کا) اب بھی عید پہ مزا آتا ہے۔ عید تو نام ہی خوشی کا ہے۔ مگر وہ بچپن والی عیدیں اب کہاں۔

عید پر پہلے سارے کپڑے باجی صبا استری کرتی ہیں۔ جب سے ان کی شادی ہوئی ہے۔ میں کرتی ہوں۔ (بیچاری معصوم بچی)۔

عید الاضحیٰ کی اصل رونق تب ہوتی ہے جب باجی شبانہ، باجی فرزانہ (پھوپھو) آتی ہیں۔ بچوں سمیت وہ لوگ عموماً" دوسرے یا تیسرے دن آتی ہیں۔

فرح بخاری نے میرے سوال کا جواب دیا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ان کا شکریہ۔

بندھن

فضا علی ہمراہ فواد

شاہین رشید

فضا علی / فواد

کافی عرصے سے سوچ رہی تھی کہ "بندھن" کے لیے فضا علی کا انٹرویو کروں، مگر فضا اپنی مصروفیات کی وجہ سے وقت ہی نہیں دے پا رہی تھیں۔ شاید ان مصروفیات میں ان کی گھریلو ذمہ داریوں، بیٹی کی پرورش، شوہر کا خیال، اداکاری، میزبانی، ماڈلنگ، کمرشلز یہ سب کچھ شامل تھا۔ بڑی بات ہے کہ ایک گھریلو لڑکی یا عام ماحول میں پلی بڑھی لڑکی بیک وقت اتنے کام کرے۔

فضا سے انٹرویو کے لیے بات تو "بندھن" کی ہوئی تھی۔ مگر ان کی خواہش تھی کہ ساتھ ساتھ ان کی پروفیشنل لائف کے بارے میں بھی بات چیت ہو۔ لہٰذا یہ انٹرویو مکسچر ہے فضا کی گھریلو اور پروفیشنل لائف کا۔

"کیسی ہیں فضا؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ ازدواجی بھی اور پروفیشنل بھی؟"

"اللہ کا بہت شکر ہے۔ دونوں زندگیاں بہت اچھی گزر رہی ہیں۔ میں بہت مطمئن ہوں۔"

"بیٹی کے آجانے سے کوئی فرق پڑا پروفیشنل لائف میں؟"

"کیوں نہیں... ازدواجی زندگی پہلے سے زیادہ حسین ہوگئی اور پروفیشنل لائف تھوڑی سی متاثر ہوئی، کیونکہ اب میری پہلی ترجیح میری بیٹی ہے۔"

"شادی کے کتنے سال بعد اللہ نے اولاد کی نعمت سے نوازا؟"

"یہی کوئی تقریباً سات، آٹھ سال بعد۔"

"مگر کیوں؟ اور بیٹی کا نام کیا ہے؟"

"کچھ اللہ کا حکم، کچھ ہماری وجہ سے... بہرحال

جب اللہ نے نوازنا ہوتا ہے تب کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ اولاد بہت پیاری چیز ہے اور اللہ تعالیٰ سب کو یہ نعمت عطا فرمائے اور بیٹی کا نام فرال ہے۔ جس کا مطلب نرم و نازک ہے اور واقعی میری بیٹی بہت نرم و نازک ہے۔"

"آپ کی طرح۔۔۔ جس طرح آپ نرم و نازک ہیں۔"

ہنستے ہوئے۔۔۔ "یہ تو آپ کی محبت ہے۔"

"عموماً" ہمارے یہاں روایت ہے کہ شادی کے بعد لڑکیاں اپنے نام کے ساتھ اپنے شوہر کا نام لگالیتی ہیں مگر آپ نے۔۔۔؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور میرے شوہر کو بھی اس پہ کوئی اعتراض نہیں' جب میری شادی ہوئی تو میں فضا علی کے نام سے ہی شہرت رکھتی تھی۔ ایک دم سے نام چینج کرنا ذرا مشکل لگتا ہے۔ پھر صرف نام ہی نہیں سارے ڈاکومنٹ بھی تبدیل کرنے پڑتے ہیں اور شاید میں کر بھی لیتی' لیکن فواد (شوہر) نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔"

"شادی میں آپ کی پسند کا کتنا عمل دخل ہے اور کیا شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی؟"

"جی بالکل۔۔۔ دھوم دھام سے ہوئی تھی۔۔۔ کیونکہ جس برادری سے یہ تعلق رکھتے ہیں وہاں شادیاں دھوم دھام سے ہی ہوتی ہیں اور شادی میں ہم دونوں کی پسند کا عمل دخل تھا' مگر دونوں فیملیز کی رضامندی سے ہمارا رشتہ طے ہوا۔ اس لحاظ سے آپ ہماری شادی کو ارینج کہہ سکتی ہیں' بلکہ ارینج ہی ہے اور ہم دونوں کے پیار میں اضافہ شادی کے بعد ہوا۔ جب ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارا اور ایک دوسرے کو پرکھا۔"

"آپ دونوں میں عمروں کا فرق ہے یا ہم عمر ہیں؟"

"نہ نہ۔۔۔ ہم۔۔۔ "ہم عمر" نہیں ہیں' میری اور فواد کی عمروں میں آٹھ سال کا فرق ہے۔ میری تاریخ پیدائش 5 اکتوبر 1984ء ہے اور میرے

خیال میں عمروں کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بس آپ میں انڈر اسٹینڈنگ ہونی چاہیے اور ہم دونوں میں ہے۔"

" 5 اکتوبر کے حساب سے آپ کا اسٹار "لیو" بنتا ہے۔ ستاروں پہ یقین ہے آپ کو؟"

"ہاں۔۔۔ بالکل ہے۔ کیونکہ جب میں اپنے ستارے کا مطالعہ کرتی ہوں تو محسوس کرتی ہوں کہ مجھ میں وہ ساری اچھائیاں اور برائیاں ہیں جو اس اسٹار میں ہوتی ہیں۔۔۔ لیکن آج کا دن کیسے گزرے گا وغیرہ پہ یقین نہیں کرتی' کیونکہ وہ صرف کسی ایک کے لیے نہیں ہوتا' بلکہ سب کے لیے ہوتا ہے۔"

"تکا لگ گیا تو ٹھیک' ورنہ غلط؟"

ہنستے ہوئے۔۔۔ "اکثر اوقات تو تکا ہی نہیں لگتا۔ ویسے اپنے ستارے کے بارے میں پڑھتی ضرور ہوں۔"

"آپ نے شوبز میں ماڈلنگ سے شروعات کی۔ اپنے "اونچے لمبے" قد کی وجہ سے یا خوب صورتی کی

وجہ ہے؟"

"ماڈلنگ میں اور خاص طور پر ریمپ پہ ماڈلنگ کے لیے لمبا قد بہت کام آتا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر آپ کا ٹیلنٹ کام آتا ہے۔ خوب صورتی ایکسٹرا کوالٹی ہوتی ہے تو الحمدو للہ میرا قد 5 فٹ 10 انچ ہے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے شکل، عقل، قد کاٹھ اور آواز سب نعمتوں سے نوازا ہے۔ اس کے لیے اپنے رب کا جتنا شکرادا کروں کم ہے۔"

"بیٹی کی پیدائش کے بعد بالکل کام نہیں کر رہیں یا کچھ سیریلز سائن کیے ہیں؟"

"نہیں، ایسا نہیں ہے کہ میں بالکل ہی گھر بیٹھ گئی ہوں۔ کم کام کر رہی ہوں، مگر کر ضرور رہی ہوں۔ آپ جلد ہی میرا کام اسکرین پہ دیکھیں گی۔ اگر آپ کو یاد ہو تو میں تو پہلے بھی منتخب اور اچھے ڈراموں میں کام کرتی تھی۔ پھر ہر سیریل کے لیے ہاں کرنا تو میری پہلے بھی عادت نہیں تھی۔"

"مثلاً "انڈر پروڈکشن کیا' کیا کام ہے؟"

"انڈر پروڈکشن میں سلیم شیخ کی ایک سیریل ہے۔ سرمد کھوسٹ کی سیریل "دوسری بیوی" شاہد ظہور کی "فاصلے کے درمیان" اور فیاض چوہدری کا سیریل ہے جس کا نام ابھی نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح ماڈلنگ کا کچھ کام ہے۔"

"گھریلو مصروفیات بہت زیادہ ہونے پر فیلڈ میں رہنے کے لیے کس کو زیادہ اہمیت دیں گی۔ اداکاری کو یا ماڈلنگ کو یا گلوکاری کو؟"

"ماڈلنگ کو ترجیح دوں گی۔ ماڈلنگ نہیں چھوڑ سکتی کیونکہ میں نے ابتدا ابھی ماڈلنگ سے ہی کی تھی اور گلوکاری تو میری روح میں بسی ہوئی ہے' اسے بھی چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ابتدا ماڈلنگ سے کی' پھر شادی ہوئی تو لاہور میں ڈیرا جمالیا۔ کیسا لگا تھا لاہور؟"

"شادی سے پہلے کراچی میں تھی' یہاں سے ہی کام کی ابتدا کی' مگر شادی کے بعد لاہور شفٹ ہونا پڑا۔ لاہور میرے لیے نیا نہیں تھا' کیونکہ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ البتہ لاہور کو مکمل طور پر میں نے شادی کے بعد دیکھا اور کیسا لگا تو اپنے پاکستان کے سب ہی شہر بہت خوب صورت ہیں۔"

"میاں صاحب کو کس روپ میں اچھی لگتی ہیں؟"

"ہر روپ میں۔۔۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں جس طرح گھر میں رہتی ہوں' باہر بھی اسی طرح سادگی میں چلی جاؤں' مگر فواد کی خواہش ہوتی ہے کہ میں گھر سے باہر ٹپ ٹاپ کے ساتھ جاؤں۔۔۔ وہ جب گھر میں مجھے ڈھیلے ڈھالے اور عام سے کپڑوں میں دیکھتے ہیں تو بہت ڈانٹتے ہیں کہ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔"

"میک اپ انہیں پسند ہے یا آپ کو؟"

"مجھے تو بالکل پسند نہیں۔ کام کے سلسلے میں تو مجبوری کروانا پڑتا ہے۔ کسی پارٹی میں یا کہیں اہم جگہوں پہ نہ جانا ہو تو پھر بہت ہی ہلکے میک اپ کے ساتھ نکلتی ہوں۔"

"اب تو پاکستان میں بھی اچھی فلمیں بننا شروع ہو گئیں۔ آپ کو بھی پیش کش ہوئی ہو گی؟"

"فی الحال تو کوئی پیش کش نہیں ہوئی۔ ہاں ملک سے باہر سے کافی آفرز ہیں' مگر میرے لیے اب ملک سے باہر جا کر کام کرنا کافی مشکل ہے۔ کیونکہ فیملی لائف ڈسٹرب ہوتی ہے' پھر میری فیملی شاید اس کی اجازت بھی نہیں دے گی۔ اس لیے فلم کے لیے میری ترجیح پاکستان ہی ہو گا اور اب تو نہ صرف فلم انڈسٹری ترقی کر رہی ہے' بلکہ فیشن انڈسٹری بھی ترقی کر رہی ہے۔"

"آپ کے خیال میں ہمارے ان میڈیاز میں نیا ٹیلنٹ آ رہا ہے؟"

"بالکل آ رہا ہے۔ آپ اگر ڈرامے دیکھتی ہیں تو آپ کو ہر سیریل میں سینئرز کے ساتھ نئے چہرے بھی نظر آئیں گے۔ اگر نیا ٹیلنٹ سامنے نہ آ رہا ہوتا تو ڈراما انڈسٹری اتنی ترقی کیسے کرتی۔"

"آپ میں ٹیلنٹ کس نے دریافت کیا؟"

"جاوید فاضل نے۔ اور نبیلہ نے۔"

"اچھا۔ مگر کس طرح!"

"اس طرح کہ میں "سی ویو" پہ محلے کے بچوں کو اکٹھا کرکے کرکٹ کھیلا کرتی تھی۔ حسب معمول ایک دن کرکٹ کھیل رہی تھی کہ جاوید فاضل اپنی ٹیم کے ساتھ ڈراما سیریل "مہندی" کی شوٹ کے لیے آگئے اور چونکہ انہوں نے "سی ویو" کے اسی ایریا میں ریکارڈنگ کرنی تھی۔ لہٰذا انہوں نے ہماری وکٹ خراب کردی۔ بغیر ہماری اجازت کے، مجھے تو غصہ آیا' میں نے مٹی اٹھائی اور ان کی ٹیم پہ ڈال دی۔ پتا نہیں انہیں کیا بات پسند آئی' شاید میری بولڈنیس پسند آگئی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے سیریل میں بک کرلیا۔"

"کتنی چھوٹی تھیں کہ سڑکوں پہ کھیلا کرتی تھیں؟"

ہنستے ہوئے۔ "اس وقت میں آٹھویں کلاس کی طالبہ تھی۔ سوچ لیں کتنی بڑی ہوں گی اور مزے کی بات یہ کہ مجھے آڈیشن کے لیے کہا گیا تو میں نے بڑے پراعتماد انداز میں کہا۔ "مجھے اداکاری آتی ہے۔ بے شک آپ کرا کے دیکھ لیں۔ اور ماڈلنگ میں مجھے نبیلہ نے دریافت کیا اور عاکف الیاس نے مجھ پر بہت محنت کی کیونکہ ماڈلنگ تھوڑا مشکل کام ہے۔"

"اچھا یہ بتائیں کہ فواد بحیثیت شوہر کے کیسے ہیں؟"

"فواد بہت اچھے شوہر ہیں۔ ہمیشہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ بہت محبت کرتے ہیں۔ ہمیشہ مجھے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہر مسئلہ میں اور میں بہت لکی ہوں کہ مجھے ایک بہت ہی اچھا سسرال ملا۔"

"گھر میں اپنے فن کار ہونے کا رعب ڈالتی ہیں؟"

"ارے نہیں۔ فنکاری کی یہ صلاحیت اور شہرت کوئی نئی نئی نہیں ملی کہ میں سب پہ رعب ڈالتی رہوں۔ ہرگز نہیں۔ میں بہت سادہ مزاج لڑکی ہوں' گھر میں کوئی آجائے تو اسے ذرا بھی نہیں لگے گا کہ وہ کسی فنکارہ کے گھر میں آیا ہے' کیونکہ میں گھر میں بہت سادگی سے رہتی ہوں۔"

"فضا! جب سے آپ کو دیکھ رہی ہوں آپ میں کوئی چینج نہیں آیا۔ ہمیشہ کی طرح دبلی پتلی اسمارٹ۔ کیا راز ہے؟"

"راز یہی ہے کہ میں سب کچھ کھاتی ہوں لیکن "یوگا" ضرور کرتی ہوں اور صبح صبح کرتی ہوں۔ کبھی تھکن کی وجہ سے آنکھ نہ کھلے تو پھر فواد مجھے اٹھا دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں خیال رہتا ہے کہ ان کی بیوی اسمارٹ رہے۔"

"کیا تربیت لی ہے "یوگا" کی؟"

"جی جی۔ تربیت لی ہے۔ لندن سے تربیت لی ہے اور یوگا کی اب میں خود بہت اچھی انسٹرکٹر ہوں۔"

"سنا ہے کہ یوگا میں ہر بیماری کا علاج ہوتا ہے؟"

"جی بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ یوگا میں آپ کے سر سے لے کر پاؤں تک ہر بیماری کا علاج ہے۔ اگر لڑکیاں اور لڑکے "یوگا" کرنا شروع کردیں تو وہ بالکل تندرست و توانا رہ سکتے ہیں۔"

"مزاجاً" کیسی ہیں؟"

"انتہائی خوش مزاج ہوں۔ لوگوں میں جلدی گھل مل جاتی ہوں۔ بس بحث مباحثے سے دور رہتی ہوں اور جہاں ایسی کوئی محفل ہو زیادہ تر خاموش رہتی ہوں اور ہاں ایک بات کی وضاحت کروں کہ میری بیٹی کا نام "فرال" ہے "فریال" نہیں۔"

"عموماً" والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ پہلا بیٹا ہو اور پھر بیٹی تو آپ کے یہاں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

"ارے نہیں۔ ہم تو بیٹی کی ہی دعا کرتے تھے اور فواد بھی۔ ان کو بھی بیٹیاں پسند ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ آئندہ بھی بیٹیاں دے۔"

"اچھا۔ گڈ۔"

اور اب تو فواد اور فرال ہی میری زندگی کا اثاثہ ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فضا سے اجازت چاہی۔

✡

دستک دستک دستک

شاہین رشید

آمنہ شیخ

"کیا حال ہیں... کہاں غائب ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے... آپ سنائیں... غائب کہاں ہونا ہے، یہیں ہوں۔"

"مطلب اسکرین پہ نظر نہیں آرہیں۔ آج کل پرانا سیریل "میں عبدالقادر ہوں" چل رہا ہے۔ نیا ڈرامہ کہاں ہے؟"

"بھئی، بہت کام کرلیا۔ اب میں ہروقت اسکرین پہ رہنے کے بجائے منتخب کرداروں کے ساتھ اسکرین پہ آنا چاہتی ہوں۔ تاکہ مجھے دیکھ کر لوگ یہ ضرور کہیں کہ یقیناً "ڈرامہ اچھا ہوگا۔"

"کچھ یاد ہے کہ آخری سیریل کون سا تھا؟"

ہنستے ہوئے... "ہاں کیوں نہیں... "**جیکسن ہائٹس**" تھا۔ جس کا موضوع ملک سے باہر رہنے والے پاکستانیوں کے مسائل تھا اور لوگوں نے بہت پسند کیا تھا اس سیریل کو۔"

"کام نہ کرنے کی وجہ اچھے کرداروں کا نہ ملنا ہے کیا؟"

"جی بالکل... ایک اچھے کردار کی تلاش میں ہوں۔ کیونکہ آج کل ایک جیسے موضوعات پہ ڈرامے بن رہے ہیں۔ لوگ کب تک ایسے ڈرامے برداشت کریں گے۔ صرف پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ اپنا اطمینان بھی کچھ ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ سیریل "مات" دو بہنوں کی کہانی تھی۔ بس جی یہ ٹاپک رائٹرز کو اتنا پسند آیا کہ ایک کے بعد ایک سیریل دو بہنوں کے موضوعات پر بننے لگیں۔ میں نے تو سوچ لیا تھا کہ اب ایسے کسی سیریل میں کام نہیں کروں گی۔ جس کے ٹاپک اس طرح ریپیٹ ہو رہے ہوں۔"

"کسی فلم میں بھی تو کام کرنے کا تلخ تجربہ ہے آپ کو؟"

"جی بالکل ہے... فلم آپریشن 021 میں کام کرنے کا تلخ تجربہ ہے۔ درحقیقت اس فلم کو ثمر ڈائریکٹ کررہے تھے۔ فلم کی ابتدائی کاسٹ بھی انہوں نے ہی فائنل کی تھی اور اس فلم میں میرا تقریباً "اسی، نوے فیصد کام مکمل ہوچکا تھا لیکن اتفاق سے ویزے کے کچھ مسائل ایسے پیدا ہوگئے کہ انہیں اس پروجیکٹ کو چھوڑ کر جانا پڑا۔ بعد میں "جامی" نے اسے اپنے انداز میں بنایا۔ میرا ان کے ساتھ ایک ہی سین تھا جو میں نے مکمل کروالیا اور میرے حساب سے فلم مکمل ہوچکی تھی۔ مگر پریمیر کے موقع پر مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ فلم تو یکسر تبدیل ہوچکی تھی۔ خیر کوئی مسئلہ ہوا ہوگا۔ میں تو فلم دیکھے بغیر ہی آگئی۔"

"پاکستانی فلم انڈسٹری ایک بار پھر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ آپ کچھ کہیں گی اس بارے میں؟"

"بے شک فلم انڈسٹری لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے لیکن اگر آپ اس کے موضوعات پر بھی غور کریں تو زیادہ تر فلمیں دہشت گردی کے موضوعات پر ہی بن رہی ہیں یا عورتوں کے مسائل کے گرد گھوم رہی ہیں۔ ہمیں نئے موضوعات کو تلاش کرنا چاہیے یا لکھوانا چاہیے۔ "نامعلوم افراد" ایک اچھی فلم

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اکتوبر 2015ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- "بن مانگی دُعا" عفت سحر طاہر کے ناول کی آخری قسط،
- عمیرہ احمد کا ناول "آبِ حیات"،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول "نمل"،
- "محبتوں کا ہنر" راشدہ رفعت کا مکمل ناول،
- "شہرِ آشوب" آمنہ العزیز شہزاد کا مکمل ناول،
- سمیعہ یاسمین، سدرہ حیات، اور فریدہ فرید کے افسانے،
- فروا خان کا ناولٹ،
- عیدالاضحیٰ کے حوالے سے فنکاروں سے سروے،
- "علی عباس" سے باتیں،
- "کرن کرن روشنی" احادیث کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

تھی۔"

"تو آپ کس طرح کے کردار کی منتظر ہیں؟"

"جو میرے لیے چیلنجنگ ہوں۔ جسے کر کے مزہ آئے۔ لوگ جسے یاد رکھیں۔"

"فلم کے لیے تو تلخ تجربہ ہوا۔ آپ نے ماڈلنگ بھی کافی کی ہے اس کے بارے میں کچھ کہیں گی؟"

"میں اب ہر کام میں محتاط ہو گئی ہوں۔ اس فیلڈ میں رہ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور یہی تجربات میری آئندہ زندگی میں میرے کام آئیں گے۔ اور میں نے کافی ماڈلنگ کی ہے اور کافی برانڈز کی برانڈ ایمبیسڈر بھی رہ چکی ہوں۔"

"اپنے ساتھی فن کاروں کے لیے کچھ کہنا چاہیں گی کہ اچھا کام کر رہے ہیں یا نارمل؟"

"سب اچھا کام کر رہے ہیں۔ میں کسی پہ تنقید کرنے کی مجاز نہیں۔ ہاں مجھے بالی ووڈ کی ایک بات بھائی کہ وہاں ٹی وی ڈراموں کے فن کار الگ ہیں اور فلم کے فن کار الگ ہیں۔ ہمارے یہاں تو جب کوئی فن کار کسی ڈراما سیریل میں ہٹ ہو جاتا ہے' پھر وہ فن کار ہر ڈرامے میں نظر آرہا ہوتا ہے' وہی پھر فلم میں بھی نظر آرہا ہوتا ہے۔ وہی ریمپ پہ بھی' وہی کمرشلز میں بھی' وہی بل بورڈز میں بھی۔۔۔ یہ ایک غلط رجحان ہے۔"

"آپ کو باہر کہیں سے آفرز آئیں؟"

"اگرچہ ایسا ابھی کچھ نہیں ہوا۔۔۔ لیکن میں نے اسکرین کے لیے آڈیشن دیے ہیں اور میری کوشش ہے کہ میں بین الاقوامی معیار کا کام کروں' تاکہ لوگ مجھے سراہیں اور اگر آپ کو یاد ہو تو میرا ایک ڈراما "بھاگ آمنہ بھاگ" بہت ہٹ ہوا تھا اور اس کردار کے لیے میں نے خصوصی تربیت حاصل کی۔"

"یعنی اپنے کردار کے لیے گہرا مشاہدہ ہوتا ہے؟"

"جی بالکل ہوتا ہے۔ فلم "آپریشن 021" کے لیے بھی میں نے فائٹنگ کے لیے تربیت حاصل کی تھی۔ ایک آرٹ موی کے لیے "مارشل آرٹ" کی تربیت حاصل کی تھی۔"

"آمنہ! آپ کی پہچان بحیثیت اداکارہ کے اور ماڈل کے لیے۔ ریمپ پر بھی ماڈلنگ کی، مگر کم۔۔۔ کیوں؟"

"ہاں۔۔۔ ریمپ پہ ماڈلنگ کی۔۔۔ مگر کم۔۔۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ میں اس ماڈلنگ کے لیے بہتر نہیں ہوں یا موزوں نہیں ہوں۔ میں وہی کام کرتی ہوں۔ جس کے لیے میرا دل اور دماغ دونوں راضی ہوں۔"

"فخر کا کوئی لمحہ؟"

"جب محب میرے میاں صاحب کو انگلینڈ میں بہترین اداکار کا پہلا بین الاقوامی ایوارڈ ملا تھا۔"

عائشہ خان

"کیا حال ہیں۔۔۔ اپنی آنے والی فلم "جوانی پھر نہیں آنی" سے کیا امیدیں ہیں؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔ یہ فلم عید الاضحیٰ پہ ریلیز ہو گی اور جب تک آپ کا میگزین آئے گا' فلم ریلیز ہو چکی ہو گی اور بہت حد تک اس کا رزلٹ بھی آچکا ہو گا اور مجھے یقین ہے کہ اچھا ہی رزلٹ آئے گا۔"

"(وار) میں آپ کے کام کو پسند کیا گیا' مگر تنقید بھی کی گئی کیوں؟"

"جی۔ تنقید کرنے کے لیے تو لوگوں کو بہانا چاہیے ہوتا ہے۔ تو اس فلم میں بے شک میرا کام پسند کیا گیا مگر تنقید یہ کی گئی کہ آپ کا لہجہ انگریزوں والا تھا' تو بھئی جب فلم انگریزی میں ہو گی تو کیا میں اردو انداز میں انگریزی بولوں گی اور پھر میری ساری ایجوکیشن باہر سے ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ میرا لہجہ ویسا ہی ہو گا۔ خیر یہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔"

"ہماری ایک فنکارہ بالی ووڈ میں کام کرنے گئی ہیں۔ لیکن ایک مقام پر وہ پھنس گئی ہیں کہ وہ کہتی ہیں کہ نامناسب مناظر فلمبند نہیں کرائیں گی تو آپ کو بولڈ کردار ملیں اور بولڈ سین ملیں تو؟"

"توبہ کریں جی۔۔۔ ہمارا گھرانہ تو ذرا پرانے خیالات کا ہے اور مجھے خود بھی اچھا نہیں لگے گا کہ میں بولڈ سین کراؤں۔ بولڈ کردار اور بولڈ سین میں فرق ہوتا ہے۔ بولڈ سین تو بالکل بھی نہیں۔ ہمارے گھرانے

میں تو بغیر آستین کا لباس پہننا معیوب سمجھا جاتا ہے' تو ڈانس اور بولڈ سین تو کسی طرح بھی نہیں کر سکتی۔"

"پھر آپ کے اسکینڈلز کیوں بنتے ہیں؟"

"جو لیے دیے رہیں' جو کسی کے کہنے پر نہ چلیں' جو ایسے کردار کرنے سے انکار کریں' ان کے اسکینڈل نہیں بنیں گے تو پھر کیا بنے گا۔ حمزہ علی عباسی تو میرا بچپن کا دوست ہے۔ ہمایوں سعید سینئر فن کار ہیں۔ ان کی مسز اور ان سے میری بہت اچھی دوستی ہے اور نعمان اعجاز تو مجھے بیٹا کہہ کر بلاتے ہیں۔ عجیب لوگ ہیں کیسی کیسی کہانیاں بنا دیتے ہیں۔ پہلے ایسی باتوں کو دل پہ لے لیتی تھی۔ مگر اب نہیں۔ یہاں لوگوں کو گوسپ کرنے کی عادت ہوتی ہے۔"

"اداکاری کا آغاز کب کیا؟"

"2000ء میں۔۔۔ اور میرا پہلا ڈراما پی ٹی وی سے ٹیلی کاسٹ ہوا تھا۔ جس کا نام "تم ہی کہنا" تھا۔ بس جناب اس کے بعد آفرز آنی شروع ہو گئیں۔"

"اور وہ ویڈیو؟"

"جی میں ڈرامے کی بات کر رہی ہوں۔ ورنہ میرا پہلا تعارف تو ویڈیو ہی ہے۔ جو میں نے شہزاد رائے کے لیے کی تھی اور اس ویڈیو کو دیکھ کر ہی مجھے ڈراموں کی پیش کش ہوئی تھی۔"

"گھر والے خوش ہوئے؟"

"جی۔۔۔ گھر والے بہت خوش ہوئے۔ میری حوصلہ افزائی بھی کی اور دو سال مسلسل کام کیا تو جیسے گھر والوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ مطلب پڑھائی جو چھوڑ دی تھی تو گھر والوں نے کہا کہ کیا پڑھائی مکمل نہیں کرنی' بس ختم کرو یہ اداکاری اور پڑھائی مکمل کرو اور پھر میں اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے لیے کینیڈا چلی گئی۔"

"ہوں۔۔۔ گڈ۔۔۔ کیا ڈگری لی؟"

"کینیڈا سے آرکیٹکچر اور انٹیریر ڈیزائننگ میں ڈگریاں حاصل کیں۔"

"کام آئیں؟"

"کیوں نہیں۔۔۔ جب چاہوں انہیں کام میں لا سکتی ہوں۔"

"بے شمار ڈراموں میں کام کیا آپ نے۔۔۔ کس کو بہترین کہیں گی آپ؟"

"بھئی۔۔۔ یہ تو آپ لوگ بہت مشکل سوال پوچھتے ہیں۔۔۔ سب اچھے ہیں اور کردار پسند آتے ہیں تو ہم کرتے ہیں' ورنہ صرف شکل دکھانے کے لیے کام تو نہیں کرتے۔"

"ڈراموں کے نام یاد ہیں؟"

ہنستے ہوئے۔۔۔ "یہ بھی مشکل سوال ہے۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ ایک تو آج کل آن ایر ہے' بلکہ دو آن ایر ہیں۔ "دل عشق عشق اور تمہارے سوا' مہندی" کو نہیں بھول سکتی کہ اس سے پہچان ملی' اس کے علاوہ میری ادھوری محبت' من و سلویٰ' خاموشیاں' میرے قاتل میرے دلدار' ماسی اور ملکہ' بول میری مچھلی' وصل' شک' تم ہی کہنا' مانے نہ یہ دل' خدا زمین سے گیا نہیں' چین نہ آئے۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اجازت" مزید یاد نہیں آ رہے۔ میرے خیال سے اتنا کافی ہے۔"

"سینئرز میں کس سے متاثر ہیں؟"

"بہت سے نام ہیں۔ سوال مشکل ہے' مگر چند ایک کا نام ضرور لوں گی' جیسے فیصل رحمن' نعمان اعجاز' روبینہ اشرف' نادیہ جمیل' ثانیہ سعید یہ سب میرے لیے بہت محترم بھی ہیں اور میرے لیے رول ماڈل بھی۔"

"سنجیدہ اور جذباتی کردار زیادہ کیے ہیں کیوں؟"

"شروع سے ہی ایسے کردار ملے ہیں اور ایسے بے شمار کردار کر چکی ہوں' اس لیے اب ایسے کردار کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ ہاں کوئی بہت ہی اچھا اور مشکل کردار ملا تو ضرور کروں گی۔ ویسے کوئی خاص کردار کی خواہش نہیں ہے۔ کیونکہ میرے خیال سے سب ہی کردار میں نے کر لیے ہیں۔"

"فارغ اوقات کے مشاغل؟"

"فرصت کے اوقات کم ہی ملتے ہیں۔ پھر بھی اگر مل جائیں تو فلمیں دیکھتی ہوں اور فلم دیکھنے کے دوران کچھ نہ کچھ کھاتی بھی رہتی ہوں کہ مزہ ہی اس وقت آتا ہے فلم دیکھنے کا جب آپ کچھ نہ کچھ کھاتے رہیں۔"

☆

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا بابل کا گھر چھوڑ کر پیا دیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔
غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں' کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک پڑھی لکھی' نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پڑھ لوگ 'گالم گلوچ' لڑائی جھگڑا' طعنے تشنے ہوں' اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی ٹھہرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ ہم اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ام..... دینہ جہلم

ہمیں آپ کا یہ سلسلہ بہت پسند آیا ہے وہ باتیں جو ہم کسی سے نہیں کر سکتے' آپ سے کر کے اپنا دل ہلکا کر لیں گے۔

س "شادی کب ہوئی؟"

ج "میری شادی 6 جون 2000ء میں ہوئی۔"

س "شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟"

ج "شادی سے پہلے ہر کام میں حصہ لیتا' ڈائجسٹ پڑھنا' کوکنگ کرنا' سلائی کرنا' ہر کام کر لیتی تھی۔ شادی سے پہلے کچھ عرصہ ٹیچنگ بھی کی ہے۔ گھر میں بھائی' بہنوں سے بڑی تھی' ہر کام میں امی کے ساتھ ساتھ' جو بھی کام کیا دل سے کیا' صرف پڑھائی نہیں کر سکی۔ میری تعلیم ایف اے ہے۔ کچھ حالات اور کچھ کام کا بوجھ تھا۔ امی کے گھر میں ابھی بھی وہ ہی اہمیت ہے۔ سب بہن بھائی' امی ہر کام میں مشورہ کرتے ہیں۔"

س "اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟"

ج "جب سے ہوش سنبھالا یہ ہی سنا کہ شادی تایا کے گھر ہو گی۔ تایا کا بیٹا آرمی میں تھا۔ تائی نے سو دفعہ رشتہ جوڑا اور سو دفعہ توڑا لیکن جو اللہ کو منظور ہو' ہوتا وہی ہے۔ پسند تو پوچھنا کسی نے ضروری ہی نہیں سمجھا۔ تایا کے بیٹے کی خواہش تھی کہ شادی اس سے ہو۔ لیکن بعد میں نہ تعاون کیا اور نہ کسی بات کا خیال رکھا۔ کانوں کے نہایت ہی کچے' جو کچھ ماں نے کہا اس کو سچ جانتا۔ اب ملک سے باہر ہیں' پھر بھی ایک ماہ بعد کال آتی ہے' وہ بھی پانچ منٹ کی' بزرگوں کے فیصلے پر آج تک رو رہی ہوں۔"

س "ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے پہلے

سے کوئی تصور تھا؟ نیز وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟"

ج "خیال تو سارے ہی نیک تھے، لیکن کوئی خواہش نہیں پوری نہیں ہوئی' شوہر صاحب نے نہ ہی خیال رکھا اور نہ ہی کوئی خواہش پوری کی۔ شادی کو 16 سال ہوگئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی خواہش پوری نہیں ہوئی اور نہ ہی پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ بس جی رہی ہوں اپنے بچوں کے لیے۔ نہ اچھے شوہر ہیں اور نہ ہی اچھے باپ ہاں اچھے بیٹے اور بھائی ضرور ہیں۔ جو تصور ذہن میں تھا سب چکنا چور' میری تو بس اتنی سی خواہش تھی' خیال رکھنے والا ہو۔ ہر قسم کے حالات میں' دکھ سکھ کا ساتھی ہو۔"

س "منگنی کتنا عرصہ رہی' شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ؟"

ج "منگنی پیدا ہوتے ہی' صرف زبانی کلامی۔ نہ انگوٹھی' نہ کبھی عیدی' فون پر تو بات کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہم پہلے کراچی میں رہتے تھے اور یہ پنجاب میں ہم نے تعلیم وغیرہ ادھر ہی حاصل کی ہے۔ شادی سے دو سال پہلے ہم ادھر شفٹ ہوئے تھے۔ ملاقات کا کیا تھا ایک ہی گھر تھا۔ ایک سال ساتھ رہے' پھر ہم ---- علیحدہ ہوگئے تھے ایک سال بعد شادی ہوگئی۔ شادی تو ان کے (شوہر اور تایا ابو) کی خواہش پر ہی ہوئی' کیونکہ تائی راضی نہیں تھیں' ان کے خیال میں منگنی عیدی وغیرہ سب فضول کام ہیں۔"

س "شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات تھے؟"

ج "کوئی خاص نہیں تھے۔ تائی امی کی عادتیں نہ پہلے پسند تھیں اور نہ ہی اب۔ وہ بہت ہی خود پسند ہیں۔ ان کو ہر وقت اپنی تعریف اچھی لگتی ہے' مجھے تو یہ ہی غلط فہمی تھی کہ خدمت کرکے ان کا دل جیت لوں گی لیکن بہت مشکل؟ اچھا کام کرو تو بھی برا اور برا تو ہے ہی برا۔ بس اللہ ہی مالک ہے۔ تائی ماں نہ تو خود پوزیٹیو سوچتی ہیں' نہ اپنی اولاد کو سوچنے دیتی ہیں۔ ہر وقت دوسروں کی برائیاں اور ساتھ میری بھی اور جھوٹ تو اتنے بولتی ہیں کہ کوئی یقین ہی نہ کرے۔ حالانکہ پانچ ٹائم نماز' قرآن پاک کی تلاوت' لیکن کوئی اثر نہیں' تائی ماں مصلے پہ بیٹھ کر جھوٹ بولتی ہیں اور میری اتنی جرات نہیں ہوتی کہ کہوں یہ جھوٹ ہے' حالانکہ ان کو پتا ہوتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے اور میری نندیں اور دیور اعلا تعلیم یافتہ ہیں' لیکن سوچ وہی ہے اپنی ماں جیسی!"

س "شادی کے لیے آپ کو اپنی تعلیم چھوڑنا پڑی یا کوئی قربانی دینا پڑی؟"

ج "تعلیم کا سلسلہ تو شادی سے پہلے ہی ختم ہوگیا تھا۔ پرائیویٹ اسکول کی جاب تھی وہ چھوٹی' خواتین اور شعاع کا ساتھ چھوٹا' کوئی بھی رسالہ پڑھنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی ٹائم ملتا تھا۔ یہ ڈائجسٹ والا شوق پھر صرف امی کے گھر تک ہی محدود ہوگیا تھا۔ میری بہنیں ہر ماہ پانچ ڈائجسٹ منگواتی ہیں۔ خواتین' شعاع' آنچل' حنا' کرن پھر سب مل کر پڑھ لیتے ہیں۔ اب تین سال ہوگئے ہیں۔ میں علیحدہ رہتی ہوں۔ علیحدہ ہونے کی بھی ایک لمبی داستان ہے۔"

س "شادی بخیروخوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین کے معاملے پر کوئی بدمزگی ہوئی؟"

ج "شادی خیریت سے ہی ہوگئی۔ کوئی رسم نہیں ہوئی اور نہ ہی میرے امی' ابو نے کوئی لین دین ان سے کیا۔ نکاح تایا نے اپنے ہی گھر کی بیٹھک میں کروالیا۔ سسرال والوں نے کسی کو شادی پر نہیں بلایا تھا۔ نکاح کے کافی دیر بعد گھر کے لوگ ہی گئے اور دلہن لے آئے۔ بہنوں نے دودھ پلایا' کچھ بھی نہیں دیا اور نہ ہی کرسی کا نیگ دیا' وہ تو ایسے لگتا تھا جیسے ان کو کوئی باندھ کے لایا ہے۔ ویسے ایک بات میں سب سے کہوں گی' جہاں لڑکے کی اماں راضی نہ ہو وہاں اپنی بیٹی کی شادی کبھی بھی نہ کرو' بے شک وہ کنواری بیٹھی رہے۔ شوہر جتنا بھی اچھا ہو' ساس اچھی نہیں تو کچھ بھی اچھا نہیں۔

بری میں پانچ جوڑے تھے۔ تین ریشمی، دو سوتی۔ امی کے گھر کے دس جوڑے تھے، پھر تیرہ سال کپڑے نہیں لے کر دیے کہ اس کے پاس بہت کپڑے ہیں۔ پورے سال میں ایک جوڑا اور وہ بھی لان کا سستا سا۔ بچوں کا صرف عید پر ایک ایک جوڑا اللہ کا شکر ہے امی

نے ہر موقع پر کپڑے دیے۔ کپڑوں کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی، لیکن دکھ اس بات کا تھا کہ شوہر کے گھر سے نہیں ملے۔ اب سلائی کرتی ہوں اور ان پیسوں سے یا جو امی دیں ان سے اپنے بچوں کے شوق پورے کرتی ہوں۔

شادی کے بعد

س "شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کے کیا کہا؟"

ج "کچھ بھی نہیں بس گرمی ہے، کپڑے چینج کرلو۔ ہاہاہا۔"

س "شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟"

ج "کوئی خاص نہیں، پہلے کی زندگی پھر بھی بہتر تھی، لیکن شادی کے بعد تو بدتر ہو گئی تھی۔ اب تو نہ خوشی کا کوئی احساس ہوتا ہے اور نہ ہی غم کا۔ 13 سال سسرال والوں کے ساتھ رہی۔ اب تین سال سے علیحدہ ہوں، شکر ہے اب ہر وقت کی ٹینشن نہیں، صرف خرچ کی ہے۔"

س "شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟"

ج "شادی کے دوسرے دن ہی کام شروع کر دیا تھا۔ کراچی میں تو گیس تھی، کھانے پکانے کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہاں پر لکڑی جلانا پڑتی تھی۔ ہینڈ پمپ چلا کر سارے کام کرنے پڑتے تھے، پھر بھی کسی کا کبھی منہ ادھر، تو کبھی ادھر۔ بجلی کے زیادہ استعمال کی اجازت نہیں تھی۔ زیادہ کیا؟ ایک پنکھا بھی اپنی مرضی سے نہیں چلا سکتی تھی۔ اگر زیادہ گرمی لگے اور چلاؤ تو ساس اماں اسی وقت بند کر دیتی تھیں اور میری اتنی جرات

نہیں تھی کہ دوبارہ چلا سکوں۔ شوہر کو بتانے کا فائدہ ہی نہیں تھا۔ سردیوں میں اتنی لمبی رات اور چھوٹے بچوں کا ساتھ، مگر نائٹ بلب جلانے کی اجازت نہیں تھی۔ اندھیرے میں سب کچھ کرو۔ پیمپر بھی نہیں لا کر دیتے تھے، ساری رات بچوں کے کپڑے ہی بدلتے رہو۔ شوہر گھر ہو تو ٹھیک، جب چلے جاتے تو ساس

میرے کمرے میں سوتی تھیں، وہ کہتی تھیں کہ بلب نہیں جلانا، مجھے نیند نہیں آتی، یہ نہیں سوچتی تھیں کہ بچے چھوٹے ہیں۔ ان کو صرف اپنی فکر اور میں پریشان، نہ دن کو سکون اور نہ رات کو۔"

س "کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟"

ج "بہت ہی مختلف۔ شادی سے پہلے میرے کھانوں کی ہر کوئی تعریف کرتا تھا۔ جس جس نے بھی کھایا، یہ نہیں کہا کہ کھانا اچھا نہیں۔ لیکن یہاں پر تو ہر چیز میں فیل اور ہر کوئی اس کو تو کچھ پکانا ہی نہیں آتا۔ بس جی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے کیا کرتے۔ جب کھانا ادھر پکانا پڑا تو نہ ٹماٹر اور نہ ہی کوئی مسالا، صرف نمک اور سرخ مرچ، پھر آپ ہی بتائیں۔ صرف دو چیزیں ہوں تو کھانا کیسے پکے گا۔"

س "میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس کیا؟"

ج "سسرال کا ماحول بہت ہی مختلف تھا۔ کسی ٹائم دل نہیں لگتا تھا۔ صبح چھ بجے ناشتا سب کو ساتھ ہی کرنا ہے دل ہے یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سردی میں دوپہر کی روٹی چار بجے پھر شام کی چھٹی، سردیاں ہوں یا گرمیاں روٹی صرف دو ٹائم پھر بس۔ اگر سالن ختم ہو جائے تو پیاز کاٹ لو، انڈہ مہنگا ہے، فرق ہی فرق تھا کیا کرتی۔"

س "سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کب تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟"

ج "ہر وقت تنقید، سونے پر، کھانے پر، بیٹھنے پر، لیٹنے پر کوئی ایک تنقید ہو تو بتاؤں تم اگر کوئی رائٹر میری کہانی

لکھے تو یہ کہانی قسط وار چلے اور 50 سے اوپر کی اقساط ہوں گی' مجھے یقین ہے۔ تعریف تو یہ مر کر بھی نہ کریں اور وہ بھی میری کوئی اور میری تعریف ان کے سامنے کرے تو ان کا غصہ آسمان تک چلا جاتا ہے۔ خاندان کی اکثر خواتین میری تعریف کرتی ہیں کہ یہ کھانا اچھا پکاتی ہے۔ سلائی اچھی کرتی ہے۔ سمجھ دار ہے۔ پھر تو جی ان کو برداشت نہیں ہوتا اور پھر تائی کا ڈرامہ شروع۔"

س "سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟ سسرال میں گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟"

ج "شرف تو بڑی بہو کا ملا ہے' لیکن آج تک سولہ سال ہو گئے ہیں وہ مقام نہیں ملا اور نہ ہی ملنے کی توقع ہے۔ میری رائے کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور نہ ہی ہے۔ مجھ سے تو وہ گھر کی باتیں بھی چھپ کر کرتے تھے' خاندانی معاملات تو پھر بہت دور کی بات ہے۔"

س "سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟"

ج "کوئی توقع پوری نہیں ہوئی' بس آپ سب بہنوں سے التجا ہے میرے لیے دعا کریں' میرے شوہر کو اللہ عقل دے اور اپنے دماغ سے کام لے کر میرا اور بچوں کا جائز حق دیں۔ خرچے کی طرف سے ہاتھ بہت تنگ ہے' آرمی میں تھے تب بھی کچھ نہیں تھا' اب ملک سے باہر ہیں' پھر بھی کچھ نہیں ہے۔ اپنے تمام پیسے وہ اپنے گھر والوں کو بھیج دیتے ہیں۔ گھر والے پھر اپنی مرضی سے دیتے ہیں۔ بس آپ دعا کریں' اللہ مجھے صبر دے اور ان کو عقل! شوہر ہر مہینے چالیس ہزار بھیجتے ہیں۔ سسر (تایا) 6 ہزار دے جاتے ہیں۔ دو ہزار دودھ کا' دو ہزار سودے کا' دو ہزار سبزی کا' اس میں پورا ہو نہ ہو ان کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ اپنی طرف کا فرض پورا کر جاتے ہیں مہینے کا۔ میں اور بچے سبزی دال کھائیں یا گوشت یا زہر ان کی بلا سے' یہ میں ہی جانتی ہوں یا میرا اللہ کہ مہینہ کیسے پورا ہوتا ہے۔ میں لوگوں کے کپڑے سلائی کرتی ہوں ان پیسوں سے اپنے بچوں کی ضرورت اور فرمائش پوری کرتی ہوں۔"

س "بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بہت

بڑا امتحان بن کر آتی ہے منصوصا "پہلا بچہ۔"

ج "بچوں کی پیدائش بھی مسئلہ کشمیر تھی۔ جب پہلی بچی ہوئی تو ساس کا فرمان تھا کہ ابھی تو میرے بچے بڑے نہیں ہوئے تمہیں کیا جلدی ہے اور نند کا کہنا تھا اس مہنگائی میں تو اولاد ہونی ہی نہیں چاہیے۔ یہ لوگ چیک اپ کے لیے کہیں نہیں لے کر جاتے تھے۔ ساس اماں کہتی تھیں وہ عورتیں بے غیرت ہوتی ہیں جو چیک اپ کرواتی ہیں' اس وقت میرا علاج بھی فری تھا۔ C.M.H میں' پھر بھی نہیں لے کر جاتے تھے۔

ایسے ہی ٹینشن کے ماحول میں تین بچے ہوئے ہیں۔ تینوں بار آپریشن' نہ اچھی خوراک ملی اور نہ کسی نے دیکھ بھال کی' اب یہ حال ہے کہ ہروقت جسم میں درد اور کمر میں درد رہتا ہے۔ امی ہی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتی تھیں۔ جب بچے ہوئے امی ہی اسپتال میں رہیں' پہلی بیٹی کو دیکھنے تو یہ اسپتال بھی نہیں گئے تھے کہ گھر ہی آنا ہے دیکھ لیں گے۔ ان کو تو اللہ کا بھی ڈر نہیں' پتا نہیں اللہ کو ان کی کون سی ادا پسند ہے کہ جتنا برا کریں ان کا اچھا ہی ہوتا ہے۔"

س "آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے۔ اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟"

ج "جوائنٹ فیملی سسٹم سے سخت نفرت ہے۔ اگر سب میں محبت ہو' خلوص ہو' ایک دوسرے کی قدر ہو پھر تو ٹھیک ہے' اگر بہو کو نوکرانی کا درجہ مل جائے تو غلط' سب ساسوں سے التجا ہے کہ آپ کی بھی بیٹیاں ہیں' پلیز پلیز' کسی کے ساتھ ظلم نہ کریں۔ کل کو کوئی آپ کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسے ہی کر سکتا ہے۔"

س "آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کی؟ آپ کی کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی؟"

ج "کوشش کیا کرنی تھی ادھر سب خود ہی استاد تھے' نہ یہ کسی کی سنتے ہیں اور نہ ہی ان کو کوئی سمجھا سکتا ہے۔ آپ ان کی باتیں سنیں تو کہیں گی ان کے جتنا تو کوئی اچھا ہے ہی نہیں' دینی مسئلے سنیں تو حیران رہ جائیں۔ میری نند اور ساس کہتی ہیں کہ اسلام میں ہے کہ عورت کو بالکل جائز خرچا دو' نہ زیادہ اور نہ ہی کم' ساس کا فرمان ہے کہ بہوؤں کو زیادہ خرچا نہیں دینا چاہیے۔ وہ خراب ہو جاتی ہیں' آگے آپ خود ہی سوچ لیں کہ ان کو بہتر کیسے کرتے۔ 13 سال ساتھ رہے ہیں' لیکن شوہر کو اجازت نہیں تھی مجھے کہیں ساتھ لے کر جائیں۔ اب تین سال سے علیحدہ ہیں' پھر بھی شوہر کے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی۔ اپنی دوائی لینی ہو یا بچوں کی "دیور" کے ساتھ یا "ابا" کے ساتھ جاؤ اور لے آؤ۔ کبھی کبھی تو دل کرتا ہے خود بھی کچھ کھاؤں اور بچوں کو بھی دے دوں' لیکن پھر اللہ کا خوف آجاتا ہے۔ کبھی دل کرتا ہے' بچوں کو لے کر کسی ایسی جگہ چلی جاؤں جدھر ان کی شکلیں نظر ہی نہ آئیں۔ پھر سوچتی ہوں کہ جاؤں بھی تو کدھر' کل کو بچیاں جوان ہو جائیں گی' پھر کیا کروں گی' یہ ہی سوچ کر چپ ہو جاتی ہوں۔ میکے جا کر والدین کو پریشان کرنا نہیں چاہتی' آپ سب بہنیں دعا کریں' اللہ میرے حالات بدل دے' میں خود بھی ہروقت اللہ سے دعا کرتی ہوں' آپ سب سے التجا ہے کہ پلیز دعا کریں۔ ابھی جوابات مختصر ہیں اگر تفصیل سے لکھوں تو پھر پورے شعاع میں میرے جوابات ہی ہوں' کچھ باتیں تو لکھنے والی بھی نہیں ہیں۔"

رخسانہ نگار عدنان

نئی زندگی کی پہلی صبح! مثال کے لیے بہت حیران کن تھی۔ ایک مکمل محبت کی مالک ہونے کا احساس۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ واثق کے دل میں اس کے لیے اس قدر چاہت ہے، محبت کی ایسی شدت، ایسی گہرائی ہے کہ وہ بھی اس کو شاید ناپ ہی نہ سکے۔

"محبت میں ناپ تول نہیں ہوتا محترمہ!" وہ جو بات اپنے دل میں چپکے چپکے سوچ رہی تھی، وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑے ہوتے ہوئے جانے کیسے جان گیا، وہ لحہ بھر کو گنگ سی رہ گئی۔

"کیا میں نے کچھ غلط کہا تم سے؟" وہ بہت آہستگی سے اس کے بالوں کو پیچھے سے ہلکا سا سہلا کر بولا۔

"اور اب یہ بھی نہیں کہنا کہ غلط کہا ہے، میں نے صحیح کہا ہے۔ تمہیں اس کا پتا نہیں ہے۔" وہ پھر سے جیسے اس کی ہنسی اڑانے کو بولا۔

"ہاں تو نہیں پتا ناں، مجھے تو ابھی تک یہ بھی پتا نہیں آپ نے جو مجھ سے محبت کے ۔۔۔ اونچے اونچے دعوے کیے ہیں۔ ان میں کتنی پرسنٹ حقیقت ہے۔" وہ بھی اسے چھیڑنے کو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا اور آئینے میں مسلسل اس کو فوکس کیے ہوئے تھا۔

واثق کی آنکھوں میں کچھ ناراضی سی ابھری۔

"ٹھیک کہا ناں میں نے" وہ اس کی آنکھوں میں شوخی سے جھانکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"شاید تم مجھے چڑانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

تیسویں قسط

"میں تو کر بھی چکی۔" وہ مزہ لے کر بولی۔
"خیر۔ مجھے تمہیں اپنی محبت کی شدت کا یقین دلانے کے لیے کسی بھی طرح کے آرگیومنٹس دینے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں اور تمہیں اس کا کتنا یقین ہے' یہ تو مجھے تمہاری آنکھیں ہی بتا رہی ہیں اور آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں ڈیئر۔"
وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اس کے بہت قریب کھڑا اس سے کہہ رہا تھا کہ اس کے لباس سے اٹھتی مدھم سی خوشبو مثال کو اپنے حصار میں لیے جا رہی تھی۔
"بولتی بھی ہیں اکثر آنکھیں جھوٹ۔۔۔ اس میں کیا ہے۔" وہ اس حصار سے نکلنے کے لیے کسمسا کر بولی۔
"تو وہ تمہاری آنکھیں ہوں گی نا!"

وہ شرارت سے اسے کچھ اور بھی اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔
"اور اتنے مہینوں سے تمہاری آنکھوں نے ہی تو مجھے تمہارے قریب تر کیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے یہ بات۔" وہ مزے سے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر کھڑکی کے پاس لے آیا تھا۔
"کیا مطلب؟" مثال کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی وہ چہرہ گھما کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ ساکت سی ہو گئی۔
"بھئی۔ تم تو پکی تھیں اپنے جھوٹ میں۔ مسلسل کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں' میری طرف دیکھنا بھی تمہیں پسند نہیں' میرا یوں راہوں میں ٹکرانا بھی تمہیں برا لگتا ہے' لیکن مائی لو' تمہاری یہ پیاری' بے ریا شفاف آنکھیں ان کی معصوم سی التجا بھری درخواست ہر بار میرے قدم جکڑ لیا کرتی تھی۔"
وہ اس کے چہرے کو اپنے کندھے سے لگائے آرام سے کھڑا تھا' مثال کوشش کے باوجود ہل بھی نہیں پا رہی تھی۔
"کون سی درخواست؟" وہ بے حد مدھم لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
"یہی کہ یہ مثال بڑی ہی بے وقوف ہے۔ اس کو تو اپنے جذبوں پر پابندی لگانے کا بڑا شوق ہے۔ اس کو خود پہ ظلم ڈھانے میں بھی بڑی مہارت ہے' لیکن ہمارا کیا قصور ہے' ہم تو دن رات' ہر لمحہ' ہر پل واثق! تمہیں اپنے پاس' اپنے سامنے' اپنے بے حد قریب دیکھنا چاہتی ہیں۔ خدا کے لیے ہم پر رحم کرو' ہمیں اس جھوٹی مثال کی گپ بازی کے باوجود اپنے قریب رکھو۔" کہتے کہتے اس کے بازوؤں کی گرفت اس کے گرد کچھ اور بھی تنگ ہو گئی۔
مثال نے پورا زور لگا کر خود کو کھینچا۔
"میں جھوٹی ہوں تو پھر کیوں مجھ سے شادی کے لیے مرے جا رہے تھے' کتنے بڑے ڈرامے باز ہیں آپ قسم سے واثق!" وہ اسے ناراض نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"کیا ابھی بھی تم اس سب کو ڈرامابازی کہو گی؟" واثق نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے اپنی انگلی رکھ کر تھوڑا سا چہرہ اونچا کیا۔
"ہاں۔۔۔ نہیں تو کیا۔" وہ نظریں ملائے بغیر مخمور سے لہجے میں بولی۔
"اور اگر میں یہ ڈرامانہیں کرتا۔ تمہیں اس فراڈیے فہد کا ہو جانے دیتا تو پھر۔۔۔؟" وہ اسے چھیڑنے کو بولا۔ وہ ایک دم سے ساکت سی ہو گئی' کچھ بول ہی نہیں سکی۔
"مثال!" اس کی خاموشی پر وہ کچھ پریشان ہو کر بولا۔
مثال نے نظریں اٹھائیں تو وہ آنسوؤں سے لبالب تھیں۔

"اوہ خدا کے لیے رات والے سین کو دُہرانا نہیں۔ پلیز میں مذاق کر رہا تھا۔ بلیومی۔۔۔!"
وہ اسے پیار بھرے انداز میں منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ یونہی سر جھٹک کر آنکھیں جھپک کر رہ گئی۔
"تم ناراض ہو گئیں' برا لگا تمہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔
"نہیں یہ تو شکریے کے آنسو ہیں' جو میری مرضی سے میری آنکھوں میں نہیں آئے ہم گر واثق! آپ نہ ہوتے۔"
اس نے بے اختیار مثال کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
"یہ بات پھر کبھی بھی نہیں کہنا کہ میں نہ ہوتا۔ مثال اگر میں نہیں ہوتا تو پھر تم بھی نہیں ہوتیں' میں اسی لیے ہوں کہ تم ہو' ہم دونوں اب کبھی زندگی بھر ایک پل کے لیے بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے' دور نہیں جا سکتے۔"

وہ بہت نرمی سے اسے ساتھ لگائے کہہ رہا تھا۔
مثال آہستگی سے اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔
"وعدہ کرو مثال! مجھ سے کبھی ناراض نہیں ہو گی۔ کبھی بدگمان نہیں ہو گی۔"
"پلیز واثق! میں آپ سے تو کم از کم کبھی بدگمان نہیں ہو سکتی' میری زندگی آپ سے ہے۔ آپ کی محبت' آپ کی رفاقت' آپ کا ساتھ ہی میرے لیے اب سب کچھ ہے۔" وہ دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔
دونوں ایک دوسرے کی محبت میں سرشار گم تھے۔
دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور دوسرے لمحے دروازہ ایک دم سے کھل گیا۔
واثق تیزی سے پیچھے مڑا' اس کے چہرے پر سخت ناگواری تھی' مثال بھی سمٹ کر ایک طرف ہو گئی۔
مگر اندر آتی پری ان دونوں کی محبت کا والہانہ انداز پل کے ہزارویں حصے میں بھی دیکھ چکی تھی۔
کسی کانٹے کی طرح وہ منظر اس کی آنکھ میں چبھا تھا اسے شدید تکلیف کا احساس ہوا تھا۔
"کیا ہے یہ؟" واثق نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی ناگواری ظاہر کرتے ہوئے کچھ کرختی سے بولا۔
"آپ کے پیار محبت کا فوٹو شوٹ ابھی ختم ــــ ہوا لگ نہیں رہا' آپ دونوں رات بھر سوئے بھی ہیں یا نہیں۔"
وہ اندر آتے ہوئے کچھ بے باکی سے بولی۔

اس نے واثق کے سخت لہجے کو جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ مثال اس کے انداز پر ذرا سی چونکی اور اسے دیکھنے لگی۔
"آپ لوگوں کے لیے ناشتا لے کر آنا تھا۔ میں تو آنا نہیں چاہ رہی تھی مگر مما نے زبردستی بھیج دیا کہ یہ رسم ہوتی ہے کہ شادی کے بعد اگلے دن پہلا کھانا لڑکی کے میکے سے آئے۔" وہ بات کو طول دے کر بول رہی تھی۔
اس کی متلاشی نظریں دونوں کے اردگرد بے چینی سے طواف کر رہی تھیں۔
"آپ کو اپنی والدہ صاحبہ کو بتانا تھا کہ ہم ان دنیاوی فضول رسموں کو نہیں مانتے۔" واثق کوفت بھرے لہجے میں بولا۔
"اوہ۔۔۔ ہم یعنی آپ اور مثال آپی؟" وہ لہجے کو معنی خیز بناتے ہوئے بولی۔
"چند گھنٹوں میں خیالات کا ایسا اتحاد میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ لکی یو آر مثال آپی!" وہ کچھ عجیب جلے بھنے لہجے میں بولی تھی۔
مثال نے کچھ پریشان ہو کر پری کو دیکھا۔
"ماما نہیں آئیں تمہارے ساتھ؟" وہ کچھ محتاط لہجے میں کن اکھیوں سے واثق کے خفا چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"آئی ہیں۔۔۔ آپ کی ساس صاحبہ کے پاس بیٹھی ہیں' مجھے آپ دونوں سے ملنے کی بے تابی تھی' آئی مین' اپنے دولہا بھائی سے ملنے کی تو اس لیے آئی' آپ دونوں کو میرا یوں آنا برا تو نہیں لگا؟" وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔

واثق سر جھٹک کر منہ پھیر کر رہ گیا۔

"واثق بھائی! کیا آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا؟" وہ معصوم لہجے میں کہتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"دنیاوی رسمیں نبھانے آئی ہیں آپ' سو اپنا کام کریں' کسی کی ناراضی' خوشی' ناپسندیدگی اور کسی بھی بات کی فکر نہیں کریں۔ بس اپنا کام کریں۔"

وہ تروشے لہجے میں کہہ کر الماری کھول کر اس میں سے کچھ نکالنے لگا۔

"واؤ! یہ کیا ہے بھئی؟۔۔۔" اس کی نظر بیڈ سائیڈ پر پڑے مثال کے اسٹل اسکیچ پر گئی تھی۔

مثال نے کچھ گھبرا کر واثق کو دیکھا۔

وہ بھی مڑ کر پری کی نظروں کے تعاقب میں دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہے یہ۔" وہ ایک دم سے آگے بڑھ کر وہ کاغذ فولڈ کرتے ہوئے جھک کر الماری میں رکھنے لگا۔ پری کے چہرے پر واضح ناراضی تھی۔

"میں مل لوں عفت ماما سے۔ آؤ پری!" مثال اس کی خفگی کو دور کرنے کے لیے بولی۔

پری کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔ مثال واثق کو دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

عدیل نے ساری رات جاگتے گزار دی تھی۔

کل رات میں جو کچھ ہوا' وہ ایک سہما دینے والے ڈراؤنے خواب سے کم نہیں تھا' لیکن اس کے بعد اللہ نے مہربانی کردی۔ نامعلوم اس کی کون سی نیکی' کون سا اچھا کام اچھن کے آڑے آگیا اور مثال خیر و خوبی سے رخصت ہو گئی۔

لیکن اس کے لیے' جو کچھ اس نے پری کے منہ سے سنا' اسے حواس باختہ کردینے کے لیے کافی تھا۔ وہ جانتے بوجھتے یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اپنے کانوں سے سنی اس ساری نامعقول بات کو جھٹلا دینا چاہتا تھا اور اس کی روح تک بوجھل ہو گئی تھی' رات کے آخری پہر یہ بوجھ خود سے سرکاتے سرکاتے وہ تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔

جانے کب اس کی بھاری پتھری آنکھیں کسی بوجھ تلے دب کر غنودگی میں جا رہی تھیں' جب گھر میں ہلچل سی جاگ اٹھی۔

وہ کچھ بھی سننا اور سوچنا نہیں چاہتا تھا ہر شور سے اس نے اپنے کان بند کر لیے تھے۔

"عدیل! میں ناشتہ بھجوا رہی ہوں مثال کے سسرال' جو بھی ہے وہ لوگ ہمارے لیے تو اجنبی ہیں بلکہ اسی لیے میں نے سوچا ہے میں خود جاتی ہوں ناشتہ لے کر۔ آپ چلیں گے ہمارے ساتھ؟"

صبح صبح جانے کیسے اتنی فرصت سے تیار ہوئی تھی۔ عفت خوب صورت نیلے سوٹ میں نکھری ہوئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی طمانیت اور فراغت تھی۔

غنودگی میں ہونے کے باوجود لمحہ بھر کو عدیل کا ذہن جھٹکا کھا کر بیدار ہوا تھا۔

"رہنے دیتیں' میرے خیال میں اس کی کچھ خاص ضرورت تھی تو نہیں۔۔۔ شادی ہو چکی اور میرا دل کہتا ہے وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ ان شاء اللہ مثال کے ساتھ اچھا ہی ہو گا۔"

وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بول پا رہا تھا۔

اس سے کچھ بھی بولا نہیں جا رہا تھا مگر اسے لگا عفت کو ابھی وہاں نہیں جانا چاہیے' وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔

"جانتی ہوں اچھا ہی ہو گا اور میری خدانخواستہ کون سی خواہش ہے کہ کچھ برا ہو۔" آخر میں کڑوے لہجے میں بڑبڑائی تھی۔ عدیل نے صوفے پر ہی ٹانگیں پھیلا لیں۔

"اس طرح کیوں پڑے ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ میرے خیال میں تو آپ رات کو بھی نہیں سوئے شاید ٹھیک سے۔"

اسے یوں مضمحل سا دیکھ کر عفت کو کچھ خیال آ ہی گیا کچھ فکر مند سے لہجے میں کہہ بیٹھی۔

"ٹھیک ہوں میں۔ کل جو کچھ ہوا بہت ناقابل یقین سا تھا۔" وہ گہرا سانس لے کر بوجھل لہجے میں بولا۔

"ایسا ویسا۔ صبح اٹھی ہوں تو کچھ دیر کو تو رات کی ساری کہانی میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ یقین کریں' عجیب سی طبیعت ہو گئی اگر مثال کی فہد ہی سے شادی ہو جاتی۔"

"اچھا اب پلیز تم مجھے کچھ دیر آرام کرنے دو' میرا سر بہت بوجھل ہو رہا ہے' تھوڑی نیند لے لوں تو شاید کچھ بہتر محسوس کروں۔" وہ عفت کو موضوع سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

"اسی لیے میں نے سوچا کچھ بھی سہی یہ لوگ ہمارے ایسے مشکل وقت میں کام تو آئے تو ہمیں بھی ایسے اچھے لوگوں کی قدر کرنا چاہیے' ناشتہ میں نے کچھ بازار سے ریڈی میڈ منگوا لیا ہے اور کچھ گھر میں بنا لیا ہے' ہمیں وہاں گھنٹہ بھر تو لگ جائے گا۔ اتنی دیر میں آپ ریسٹ کر لیں۔" وہ جلدی جلدی بتاتے ہوئے کمرے کی بکھری چیزیں اٹھا اٹھا کر ان کی جگہوں پر رکھ رہی تھی۔ عدیل کچھ کنفیوز سا اسے دیکھنے لگا۔

"دانی کہاں ہے؟" اسے اچانک خیال آیا۔

"سو رہا ہے' کیوں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" وہ کچھ پریشانی سے بولی' عدیل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں چلتی ہوں' آپ آرام کریں۔" وہ کہہ کر جانے کے لیے مڑی پھر کچھ خیال آیا تو دروازے کے پاس رک گئی۔ مڑ کر عدیل کو دیکھا۔ عدیل آنکھیں بند کر کے لیٹا تھا۔

"وہ عدیل! آپ نے مثال کی ماں کو بتا دیا کہ مثال کی شادی اب کہاں ہوئی ہے؟" وہ اٹک اٹک کر پوچھ رہی تھی۔

"جانے اس عفت کو کیا دشمنی ہے میرے سکون کے ساتھ' ضرور ایسے لمحے میں کوئی ایسی چبھتی ہوئی بے تکی بات ضرور کرے گی۔ احمق عورت!" وہ دل میں تلملایا۔

"ابھی میری بات نہیں ہوئی' جب ہو گی تو بتا دوں گا۔" وہ تحمل سے کہہ گیا۔

"اور ہو سکتا ہے وہ خود مثال کو فون کرے تو وہی ماں کو بتا چکی ہو میں اٹھوں گا تو کال کر کے بتا دوں گا۔ پلیز' تم یہ دروازہ بند کر جانا۔ کوئی مجھے ڈسٹرب نہیں کرے۔" وہ آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے کچھ کوفت سے کہنے لگا۔

"چلو پری! آجاؤ جلدی سے' ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" بند ہوتے دروازے کے پیچھے عدیل نے عفت کی بات سنی تو جیسے وہ اچھل ہی پڑا۔

"سنو یہ پری کو وہاں لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم دانی کو لے جاؤ۔ یہ کیا کرے گی وہاں؟" وہ بولا تو کافی زور سے تھا' لیکن شاید عفت نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔

"مما! میں تیار ہوں' چلیں آجائیں۔" اسے بیرونی دروازے کے پاس سے پری کی ہشاش آواز آئی تھی۔

وہ اٹھنا چاہ رہا تھا۔ انہیں روکنا چاہ رہا تھا' لیکن جیسے اس کے جسم سے کسی نے ساری جان ہی نچوڑ لی ہو' وہ کوشش کے باوجود اٹھ کر جا نہیں سکا۔

چند لمحوں بعد گھر میں ایک گہری گمبھیر خاموشی چھا چکی تھی۔ وہ چند لمحے اس بولتی خاموشی کو کان لگا کر سنتا رہا۔
"نہیں۔ مجھے یوں فکر مند نہیں ہونا چاہیے' ان شاء اللہ مثال کے ساتھ اب کچھ بھی برا نہیں ہو گا۔ واثق بہت اچھا لڑکا ہے۔ ایسا لڑکا جو صرف میری بیٹی کو چاہتا ہے اور اس کی ماما بہت گریٹ' بہت اچھی عورت ہے۔ ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو گا اور اس پری کو تو میں دیکھ لوں گا۔ اس کو خود ٹھیک کروں گا۔ اس پر نظر رکھوں گا۔ اس کا ذہن جو بھٹکتا ہو رہا ہے۔ مجھے اس کو دیکھنا ہو گا۔"
وہ بہت سے عزم دل میں کرتا مثال کی طرف سے بار بار اچھی باتیں سوچتا' بھٹکتا بھٹکتا بشریٰ کو سوچنے لگا اور سوچتا چلا گیا۔ یہ سچ آج اسے ماننا پڑا کہ بشریٰ تو کبھی اس کے دل سے نکلی ہی نہیں تھی۔ کچھ دیر میں وہ گہری نیند سو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼
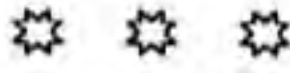
"کیا؟ آپ کیسے جانتی ہیں بشریٰ کو' میرا مطلب ہے۔ مثال کی ماں کو؟" عفت کے لیے عاصمہ کا یہ انکشاف بہت شاکنگ تھا۔
عاصمہ مسکرا کر چائے میں چینی حل کرنے کے بعد عفت کے آگے رکھنے لگی۔
"آپ چائے لیجیے نا۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ پری بیٹا! آپ بھی آجاؤ' کچھ لے لو۔ چائے نہیں تو جوس لے لو تھوڑا سا۔" عاصمہ نے آواز لگائی تھی۔
"وہ وردہ کے ساتھ ہے۔ دونوں ساتھ ہوتی ہیں پھر انہیں کسی چیز کی طلب نہیں ہوتی۔" عفت نے جلدی سے کہا۔
یوں بھی وہ نہیں چاہ رہی تھی کہ پری ابھی آئے۔
"یہ تو ہے۔ ماشاء اللہ سے بہت دوستی ہے دونوں میں۔" عاصمہ اپنی مخصوص مہربان مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
"آپ نے بتایا نہیں' آپ بشریٰ کو کیسے جانتی ہیں۔"
عفت زیادہ دیر تک اپنی بے چینی چھپا نہیں سکی پھر سے پوچھ بیٹھی' عاصمہ نے اس کی بے چینی کو محسوس کیا تھا۔
"کچھ ٹائم کالج میں ہم نے اکٹھے گزارا تھا۔ میری پہلے شادی ہو گئی تھی۔ انٹر ہی کر سکی تھی میں صرف' باقی ساری تعلیم تو میں نے واثق کے پاپا کی ڈیتھ کے بعد حاصل کی۔" وہ کچھ افسردگی سے بولی۔ عفت کو عاصمہ کے قصے میں دلچسپی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ بے توجہی ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔
"بشریٰ بہت خوب صورت تھی' مطلب ہماری کلاس میں جتنی بھی لڑکیاں تھیں ان سب میں — تو قدرتی طور پر اس کی طرف ہر کوئی متوجہ ہو جاتا تھا پھر طبیعت کی اور مزاج کی بھی بہت اچھی تھی ہم دونوں میں اچھی گپ شپ تھی۔"
عاصمہ کچھ سوچتے ہوئے جیسے اسی دور میں چلی گئی تھی۔
"شادی کے بعد بھی آپ دونوں ملتی رہی تھیں؟" عفت کی بے چینی کچھ اور بڑھ گئی تھی یہ سب سن کر۔
عاصمہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"نہیں بلکہ میں تو کچھ عرصہ دوسرے شہر میں رہی تھی شادی کے بعد اور سچ کہوں ہیں بشریٰ کو اتنے عرصے میں بالکل بھول چکی تھی' ایک بار بعد میں ایک قریبی دوست ملی۔ وہ بشریٰ کی بھی دوست تھی اس نے بتایا کہ بشریٰ کی شادی ہو گئی ہے ایک بیٹی ہے اور وہ بہت خوش ہے اپنی زندگی میں۔"

عفت کو اب یہ ساری کہانی بے مزہ سی لگنے لگی تھی۔
"لیکن جب میں پہلی بار مثال سے ملی تو ایک دم سے میری نظروں کے سامنے بشریٰ کا چہرہ آگیا۔" وہ بولی تو لمحہ بھر کو عفت ساکت سی رہ گئی۔
اسی لمحے اندر آتے واثق اور مثال بھی بے اختیار ٹھٹھکے تھے۔ مثال تو وہیں کھڑی رہ گئی۔
"اور پھر جب ایک بار میں مثال سے ملی تو یہ بات مجھے کنفرم ہو گئی کہ یہ بشریٰ کی ہی بیٹی ہو سکتی ہے۔ اس کے چہرے پر بائیں گال کے عین نیچے ایسا ہی تل تھا جیسے ہماری مثال کے ہے۔"
وہ اٹھ کر مثال کے استقبال کو آگے بڑھی تھی۔ اسے اپنے ساتھ لگا کر بے اختیار لہجے میں بولی۔ مثال کچھ سمٹ سی گئی۔
"اس تل کی تعریف تو واثق نے بھی بہت کی تھی کہ یہ اس کے چہرے پر بہت سوٹ کرتا ہے۔" اس نے کن انکھیوں سے واثق کی طرف دیکھا، وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
وہ بے اختیار ہنس پڑا اور مثال شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا گئی۔
عاصمہ دونوں کو سرشار نظروں سے دیکھنے لگی۔
دوسرے رُخ پر کھڑی پری کے چہرے پر شدید نفرت اور غصہ جھلکنے لگا تھا۔
"منحوس ماں جیسی قسمت والی ہے۔ ساس، شوہر کیسے جان چھڑک رہے ہیں۔"
عفت تلملا کر انہیں دیکھے جا رہی تھی۔
عاصمہ، مثال کو ساتھ لگائے اپنے ساتھ بٹھا رہی تھی۔
"مما! چلیں اب گھر، پاپا ویٹ کر رہے ہوں گے، آجائیں میں جا رہی ہوں باہر۔" پری سخت بیزار، کھڑے لہجے میں کہہ کر کسی سے بھی ملے بغیر تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔
"ارے رکو تو پری کی بچی! میں آ رہی ہوں نا کچھ دیر تو بیٹھو میرے ساتھ۔" وہ دوڑ کر اس کے پیچھے گئی تھی۔
عفت، عاصمہ سے مل کر اجازت لینے لگی۔
اس نے سرسری انداز میں مثال کو دیکھا تھا اور عاصمہ کے ساتھ باہر کی طرف چلی گئی تھی۔ مثال سر جھکا کر خاموش بیٹھی رہی تھی۔
"لو بھئی اب تو ہم ایک نئے رشتے میں بھی بندھ گئے۔" واثق اس کے قریب آکر سرگوشی میں بولا تھا۔
"تمہاری اماں اور میری اماں کلاس فیلو بھی رہ چکی ہیں۔ یار! ہماری رشتے داری تو بڑھتی جا رہی ہے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔
مثال پھیکی سی مسکراہٹ سے دیکھ کر رہ گئی۔
"اب کیا ہوا تمہیں؟" وہ کچھ فکرمندی سے پوچھنے لگا۔ مثال نے ذرا سا مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ واثق اسے دیکھ کر کچھ سوچنے لگا۔

☆ ☆ ☆

عدیل بہت تھوڑی نیند لے سکا تھا۔ ہلکے سے کھٹکے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔
آواز کہاں سے آئی، یہ تو اسے پتا نہیں چل سکا، لیکن پھر اسے مزید نیند بھی نہیں آئی۔
سیل فون اٹھایا کہ بشریٰ کو کال کرے مگر پھر پتا نہیں کیوں رک گیا۔
"پہلے مجھے مثال سے بات کرنا چاہیے۔ اس کی خیریت پوچھنی چاہیے۔" وہ مثال کا نمبر ملانے لگا۔

کال ریسیو نہیں ہو سکی۔ شاید فون اس کے پاس نہیں تھا۔
وہ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا اس کا ذہن خالی خالی سا تھا۔
"اگر وہ عورت رات میں فرشتہ بن کر نہیں آتی اور واثق... تو اس وقت اگر میں فائزہ اور وقار کی باتوں میں آ کر مثال کو ان کے ساتھ رخصت کر دیتا تو... ساری زندگی میں اپنی بیٹی سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ اٹھ کر یونہی ٹہلنے لگا تب ہی اس کا فون بجا تھا۔
اجنبی نمبر دیکھ کر لحہ بھر وہ یونہی بیٹھا رہا پھر کال ریسیو کی' دوسری طرف عاصمہ تھی۔
"عدیل بھائی! آپ کو شام میں ولیمے کے لیے انوائیٹ کرنا تھا' میں نے عفت بہن کو بھی تاکید کر دی ہے۔ آپ کو اس لیے کال کر رہی ہوں۔" وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"بہت شکریہ عاصمہ بہن! بلکہ میں خود سوچ رہا تھا۔ آپ کو فون کر کے آپ کا شکریہ ادا کروں' جس طرح آپ نے رات کو ہماری عزت رکھی میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔" وہ مغلوب لہجے میں کہہ رہا تھا۔
عاصمہ کچھ دیر خاموش رہی۔
"کیا پتا عدیل بھائی! کبھی آپ نے میرے ساتھ اتنا بڑا احسان کیا ہو کہ اس کے مقابلے میں یہ بہت معمولی بات ہے۔" وہ آہستگی سے بولی تو عدیل چونک گیا۔
"کیا مطلب؟" وہ رہ نہ سکا۔
"مطلب کچھ نہیں... آپ کسی کے ساتھ ایسی نیکی کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ آپ کو کچھ بھی یاد نہیں رہتا مگر اللہ یاد رکھتا ہے' وہ سارے حساب رکھتا ہے۔" وہ بہت کھوئے ہوئے گم صم لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"بے شک۔" عدیل کے منہ سے یہی نکل سکا۔
"اور پھر ہوتا تو وہی ہے جو آدمی کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے' اصل بات تو یہ ہے عدیل بھائی کہ مثال اور واثق کو اللہ نے ایک کرنا تھا' ہمارا کچھ بھی بنتا' ہم اور آپ چاہتے یا نہیں تو بھی یہ ہو کر رہتا۔" وہ مطمئن لہجے میں بولی۔
"بالکل؟" عدیل یہی کہہ سکا۔

"چونکہ ایمرجنسی میں یہ سب کچھ ہوا تو بہت بڑے پیمانے پر تو نہیں سادگی سے ولیمے کا فنکشن رکھا ہے' میں نے عفت بہن سے کہہ دیا تھا کہ وہ بچوں کو لے کر چاہیں تو ادھر ہی آ جائیں۔"
"جی ضرور عفت آتی ہے تو ہم آپ کو فون کر کے بتا دیتے ہیں وہ وہاں سے تو آ گئی ہو گی۔"
"جی ابھی کچھ دیر پہلے نکلی ہیں تو میں نے سوچا آپ کو کال کر دوں' میں آپ کو ہوٹل کا نام اور ایڈریس بھی ٹیکسٹ کر دیتی ہوں جہاں شام میں ولیمے کا فنکشن ہے۔" پھر سے تاکید کرتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔
عدیل ٹیکسٹ میسج پڑھ کر کچھ سوچنے لگا۔
"اگر بشریٰ یہاں ہوتی تو وہ کم از کم مثال کے ولیمے میں شامل ہو جاتی اور دیکھتی میں نے اپنی بیٹی کے لیے کیسے شان دار لڑکے کا انتخاب کیا ہے۔" وہ پھر سے کچھ فخریہ انداز میں سوچتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی بشریٰ کو یاد کرنے لگا۔
"یہ مجھے آج ہو کیا ہے۔ ایک ہی بات سوچے جا رہا ہوں۔" وہ خود ہی جھنجلا کر اٹھا اور کپڑے لے کر واش روم میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

بشریٰ بے چین سی کبھی عدیل کو کال کرتی کبھی مثال کو' دونوں اس کا فون نہیں ریسیو کر رہے تھے۔

دل ساری رات اتنا بے چین رہا۔ کل کا دن بھی وہ اسی طرح دونوں کو فون کرتی رہی تھی۔ پھر احسن کمال کے گھر آنے پر اس نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا۔
وہ شخص آج بھی مثال کے ذکر پر اس طرح چڑتا تھا جیسے پہلے دن سے اس نے مثال کو ناپسند کیا تھا۔
"اور میں بھی کیسی نادان تھی۔ اس شخص کی آنکھوں میں چھپی مثال کے لیے نفرت نہ دیکھ سکی اور اس کے لفظوں پر یقین کرلیا۔" ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگاتے ہوئے وہ خود ہی میں گم تھی۔
"کیوں اتنی زور سے برتن پٹخ رہی ہو' کس بات کا غصہ نکال رہی ہو ان برتنوں پر؟" احسن کمال کی تیز غصے بھری آواز پر وہ بری طرح سے چونکی تھی۔
اور ڈائننگ ٹیبل کی طرف آتی آئینہ بھی بے اختیار ٹھٹھک کر رکی تھی۔
جانے کیوں احسن کمال کا لہجہ' اس کا بات کرنے کا انداز دن بدن اتنا تلخ' کڑوا اور ناقابل برداشت کیوں ہوتا جا رہا تھا۔
"اب تو مثال بھی ہمارے ساتھ نہیں جس کی اس شخص کو سب سے زیادہ تکلیف تھی۔" بشریٰ نے احتیاط سے پلیٹیں رکھتے ہوئے کڑھ کر سوچا۔
"پاپا! ایک بات ہے' بہت ڈسٹرب لگ رہے ہیں آپ آج کل۔" آئینہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کچھ جتانے والے انداز میں باپ کو ٹوک کر بولی تھی۔
احسن کمال نے اسے چونک کر دیکھا انداز کچھ سنبھل جانے والا تھا۔ "نہیں ٹھیک ہوں میں۔"
اس نے خود کو کھانے میں مصروف کرنے کی کوشش کی۔
"پاپا! کوئی بات تو ہے ضرور' آپ کافی دنوں سے اسی طرح سے بے وجہ ری ایکٹ کرتے ہیں' حالانکہ ماما بہت آرام سے برتن رکھ رہی تھیں۔" آئینہ میں اعتماد تھا' وہ بشریٰ کے برعکس باپ سے جس انداز میں چاہتی بازپرس کر لیا کرتی تھی بالکل سیفی کی طرح!
"سیفی بھائی ٹھیک ہیں نا؟" آئینہ جیسے بشریٰ کی سوچ پڑھتے ہوئے باپ کو جتانے والے انداز میں پوچھنے لگی۔
"ہوں ٹھیک ہے وہ' اسے کیا ہونا ہے' سب عذاب تو اللہ نے میرے لیے لکھ رکھے ہیں۔" وہ منہ میں بڑبڑایا تھا۔
آئینہ اور بشریٰ نے اسے چونک کر دیکھا۔
تو گویا کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ بشریٰ بس سوچ کر رہ گئی۔
اس وقت اسے صرف مثال کی طرف سے کسی اچھی اطلاع کا انتظار تھا۔ احسن کمال کے رویے نے یوں بھی اسے کچھ بے نیاز سا کردیا تھا۔ اس کے دکھوں اور پریشانیوں سے!
"پاپا! کیا ہوا ہے؟" آئینہ کی ہمدردی بھری آواز نے پھر بشریٰ کو لمحہ موجود میں پہنچا دیا۔
"ایوری تھنگ از فائن! آئینہ کھانا کھاؤ آپ اور اگر کچھ پرابلم ہے بھی تو آئی کین مینیج ڈیئر! ڈونٹ وری۔" احسن کمال نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ بڑے ٹھہرے ہوئے نپے تلے لہجے میں گویا آئینہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔
"آئی ہوپ پاپا! ایسا ہی ہو اور مجھے فخر ہے آپ ہر مشکل کو آسانی سے ہینڈل کرلیتے ہیں۔"
آئینہ باپ کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولی۔
بشریٰ دونوں سے لاتعلق' کچھ بے دلی سے کھانا ٹونگ رہی تھی۔
"تمہیں کیا پریشانی ہے بشریٰ؟" کچھ دیر کے انتظار کے بعد احسن کچھ سرد لہجے میں بولا۔
بشریٰ اسے دل گرفتی سے دیکھ کر رہ گئی۔

"اوہ! ایس یاد آیا مجھے۔ آج تو اس مثال کی شادی تھی نا تم نے بتایا تھا مجھے۔"
وہ کچھ تمسخرانہ انداز میں بشریٰ سے بولا تو بشریٰ کا خون لمحہ بھر کے لیے کھول کر رہ گیا۔
"اس مثال۔" اس کا لہجہ صاف طیش دلانے والا تھا۔
"میری بات نہیں ہو سکی۔ آج فنکشن تھا تو بات کرنا مشکل تھا۔ کل فون کروں گی۔" وہ بدقت ٹھہرے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ بولی۔
"چلو اچھا ہے 'نیا پار لگی۔ اگر لگی تو۔" وہ پھر اسی تحقیرانہ لہجے میں بولا تھا۔
بشریٰ کا دل کچھ ایسا الجھا ہوا تھا کہ وہ مزید اس پر کچھ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آہستگی سے اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔
اس کا دل جیسے بھرا ہوا تھا' بے مقصد کچن کیبنٹ کھولتے ہوئے بار بار اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔
پیچھے آتی آئینہ 'ماں کو یوں چپکے چپکے روتے دیکھ کر وہیں سے پلٹ گئی۔
بشریٰ 'مثال کی کوئی بات اس سے کبھی شیئر نہیں کرتی تھی اور وہ کچھ پوچھتی بھی نہیں تھی۔

٭ ٭ ٭
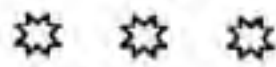
"مثال! میری بیٹی تم کیسی ہو؟ ٹھیک ہو ناں کل کا فنکشن ٹھیک ہو گیا سب کچھ خیریت سے ہے؟"
مثال نے اس کی کال ریسیو کر لی تھی۔ وہ سخت بے قرار لہجے میں پوچھنے لگی۔
اگر فہد سے اس کی شادی ہو جاتی اور بشریٰ اسے کال کر کے یہ سب پوچھتی تو وہ شاید فون بھی بند کر دیتی۔
مگر چند گھنٹوں میں واثق کی شدید محبت 'اس کے پیار نے اس کی زندگی کے گزشتہ سارے دکھ جیسے مٹا ہی ڈالے تھے' وہ بھول سی گئی کہ اسے بشریٰ سے کیا کیا گلے شکوے تھے اور وہ اپنی اس خود غرض 'بے حس ماں سے کتنی ناراض تھی۔
"ماما! میں ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ کیسی ہیں؟"
وہ نارمل سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
اور بشریٰ جیسے شاک میں آ گئی۔ آج کتنے مہینوں بعد مثال نے اس سے یوں نارمل لہجے میں بات کی تھی اور سب سے بڑھ کر خود سے بشریٰ کا حال پوچھا تھا۔
"میں ٹھیک ہوں یہ بتاؤ فہد کیسا لڑکا ہے' وقار بھائی جیسا ہی ہو گا خوش اخلاق 'محبت کرنے والا۔" وہ جاننے کے لیے بے چین تھی۔
"ماما! میری شادی فہد سے نہیں واثق سے ہوئی ہے اور واثق واقعی میں بہت محبت کرنے والے' میری قدر کرنے والے اور مجھے سمجھنے والے ہیں بہت لکی ہوں میں ماما!" وہ تشکر سے بولی۔
"ماما شاید آپ نے میرے لیے بہت دعائیں مانگی ہوں گی جو اللہ نے واثق کو میری قسمت میں لکھ دیا۔ میں بہت خوش ہوں ماما! بہت خوش۔" وہ نم لہجے میں سرشاری سی کیے جا رہی تھی۔
"مثال۔۔۔ واثق۔۔۔ کون؟" بشریٰ تو شدید شاک میں تھی۔
"میرے شوہر۔ میرا سب کچھ ماما! جن کی محبت نے میرے دل سے ہر غم' ہر دکھ' ہر محرومی کو مٹا دیا ہے۔ مجھے اب آپ سے 'پاپا سے 'عفت ماما سے 'کسی سے بھی کچھ شکایت نہیں۔" وہ جذباتی پن میں بول رہی تھی۔
"اور وہ فہد۔۔۔ آئی مین۔"
"وہ ایک فراڈ تھا ماما! ان لوگوں نے بہت دھوکا دیا تھا ہمیں۔" وہ کچھ افسردگی سے بولی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو مثال! میں جانتی ہوں۔ وہ لوگ۔ بہت اچھے تھے' شروع ہی سے۔ بہت چاہت کرنے والے۔"
وہ بے یقینی سے کہے جا رہی تھی۔
"یہی دھوکا تو پاپا نے بھی کھالیا مما! فہد پہلے سے میرڈ تھا اور۔" وہ آہستہ آہستہ ماں کو بتانے لگی۔

☆ ☆ ☆

عدیل لحہ بھر کو ششدر سا کھڑا رہ گیا۔
اس نے بے یقینی سے دونوں کنگن پھر سے ہاتھ میں لے کر دیکھے۔
بہت کچھ اس کے دماغ میں جیسے زندہ ہو گیا تھا پھر سے؟ جب اس نے شادی کی رات یہ کنگن بشریٰ کو دیے تھے اور شادی کے پہلے پانچ سال اس نے یہ کنگن کبھی نہیں اتارے تھے۔
بعد میں عدیل نے اسے۔ بہت خوب صورت بریسلٹ بنوا کر دیا تو اس نے یہ بھاری کنگن اتار دیے تھے۔
اور پھر جب مثال نے عدیل کو بتایا کہ بشریٰ آسٹریلیا جاتے ہوئے یہ کنگن اور کچھ رقم دے گئی ہے۔
عدیل نے جان بوجھ کر سن کر بھی ان سنا کر دیا تھا۔ وہ یہ چیزیں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ بہت سے جان لیوا لمحے اسے ستانے لگتے۔
اور پھر جب مثال نے عفت سے پوچھا کہ اس کے کنگن اور رقم کا لفافہ اس کی الماری میں نہیں ہے تو عفت نے کس قدر ہنگامہ مچایا تھا۔
مثال نے اس پر چوری کا الزام لگایا ہے اسے اس کے اپنے گھر میں چور بنایا ہے۔
عدیل بھی مثال پر خوب ناراض تھا کہ وہ یہ چیزیں اگر سنبھال نہیں سکتی تھی تو کم از کم کسی کو پکڑا دیتی۔
اور بعد میں عفت نے صاف کہہ دیا تھا کہ بشریٰ مثال کو ایسا کچھ دے کر ہی نہیں گئی تھی' مثال نے صرف ڈرامہ کیا تھا۔
عفت نے کچھ اس طرح یہ سب کہا کہ عدیل کو یقین کرنا پڑا اور اب یہ دونوں چیزیں عفت کے لاکر میں موجود تھیں' لفافے میں رقم تو کم تھی مگر یہ کنگن!
وہ یک ٹک ان کو دیکھا جا رہا تھا۔ محبت سے چور لمحے' بشریٰ کے ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ اس کی نازک کلائی میں' کھنکتے یہ کنگن اسے۔ بہت کچھ یاد کرا رہے تھے۔
وہ لاکر سے کچھ رقم لینے کے لیے آیا تھا۔
اس نے سوچا تھا کہ شام کو ولیمے کے فنکشن کے لیے وہ عاصمہ' ورد اور واثق کے لیے کچھ قیمتی تحائف خریدے گا۔ کیونکہ شادی میں تو کچھ بھی ان کے لیے۔ نہیں کر سکا تھا۔
وہ رقم لینے کے لیے عفت کی الماری سے چابی لے کر لاکر کھول کر دیکھنے لگا تو اسے یہ سب دیکھنے کو ملا۔
"تو عفت بیگم! یہ ہے تمہاری حقیقت۔ کیا مل گیا تمہیں یہ سب کچھ لے کر فقط ایک کمینی سی خوشی اور کچھ بھی نہیں۔"
باہر سے عفت اور پری کی آوازیں آ رہی تھیں وہ دونوں چیزیں لے کر لاکر بند کر کے باہر نکل گیا۔
اسے یہ کنگن اصل حق دار تک پہنچانے تھے' وہ سوچ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

پری بہت دل گرفتہ تھی۔
وہ جب سے واپس آئی تھی۔ یونہی کمرے میں پڑی تھی۔ عفت کے بار بار یاد دلانے پر بھی تیار ہونے کے لیے

نہیں اٹھ رہی تھی۔
عفت اس کا سوٹ استری کر کے کمرے میں لائی تو وہ یونہی کمرے میں اندھیرا کیے گم صم بیٹھی تھی۔
لحہ بھر کو عفت کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔
"پری کیا ہوا ہے میری جان؟" وہ تڑپ کر آگے بڑھی تھی۔
پری نے چہرے پر اداسی اور آنکھوں میں افسردگی لیے ہلکا سا نفی میں سر ہلایا تھا۔
"کسی نے کچھ کہا ہے میری جان تم سے؟" وہ اسی تڑپ سے پوچھ رہی تھی۔
"مما! ہمیشہ سے میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا آیا ہے۔ جو چیز مجھے چاہیے ہوتی ہے' وہ مجھے نہیں ملتی میری نظروں کے سامنے اس شخص کو مل جاتی ہے۔ جس سے میں بے تحاشا نفرت کرتی ہوں۔۔۔ اس کو کیوں ملتی ہے میری پسند کی چیز۔" وہ بیٹھ کر رونے لگی تھی اور عفت لحہ بھر کو گنگ سی رہ گئی۔
"پری! میری بیٹی! میری جان! کیا ہوا ہے تمہیں۔ کس چیز کی بات کر رہی ہو تم؟" عفت کے تو جیسے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
پری جیسی بیٹی کی آنکھوں میں تو اس نے کبھی ذرا سی نمی نہیں آنے دی تھی' اس طرح کا رونا جیسے خدانخواستہ اسے کچھ روگ ہی لگ گیا ہو۔
"آپ نہیں سمجھیں گی۔ کوئی بھی نہیں سمجھے گا اور لوگ جھوٹ بولتے ہیں' بکواس کرتے ہیں کہ سچے جذبوں میں بڑا اثر ہوتا ہے' وہ ضرور دوسرے کے دل پر اثر کرتے ہیں۔ میرے جذبے اتنے بے اثر تھے کہ اسے کبھی نہیں پتا چلا جس کے لیے میں' مما! میں مرجاؤں گی۔ مجھے لگتا ہے۔"
وہ بے اختیار ماں سے گلے لگ کر ٹوٹ کر رو پڑی۔
"اللہ نہ کرے میری پری! میری جان! اللہ تمہیں میری بھی عمر لگا دے تمہیں کبھی کچھ نہ ہو تم بہت ساری خوشیاں پاؤ۔ کبھی تمہیں کوئی دکھ نہیں ملے۔"

عفت جذب کے عالم میں اسے چومتی پیار کرتی کیے جا رہی تھی۔
"مل چکا ہے مما۔۔۔ کبھی نہ ختم ہونے والا دکھ تو مجھے مل چکا ہے' میرے دل کا روگ بن چکا ہے وہ تو۔" وہ زخمی لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"ایسے نہیں کہو پری! ایسی باتیں نہیں کرو' ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔ اپنی ماں کا سوچو بیٹا!" وہ خود بری طرح سے پریشان ہو گئی تھی۔
"ہوا کیا ہے۔ تم کیوں اتنی دل گرفتہ ہو رہی ہو' مجھے نہیں بتاؤ گی۔ میں ماں ہوں تمہاری۔" وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر ہولے ہولے کمر پر ہاتھ پھیرتی سہلا رہی تھی۔
"اب کسی کو بھی کچھ بتانے کا فائدہ نہیں مما۔۔۔ میرے دل کا چین' میری زندگی کی خوشی سب کچھ روٹھ چکا ہے مجھ سے۔۔۔ اب کوئی بھی یہ واپس نہیں دلا سکتا۔"
وہ جیسے ٹکڑے ہوتے دل کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ اتنی سخت باتیں!
عفت کو بہت غصہ آیا۔ ایسی کم سنی میں ایسی باتیں!
دل تو لحہ بھر کو چاہا' ایک تھپڑ جڑ دے اسے' اس بے وقوف' کم عقل لڑکی کو' مگر وہ بھی جانتی تھی کہ یہ تھپڑ بعد میں کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے سو دل پر پتھر رکھ لیا۔
"ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تم صبح ٹھیک تھیں بالکل' جب میرے ساتھ گئیں۔ مثال کے سسرال۔" وہ اسے

ٹریک پر لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"جبکہ مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا کبھی نہیں۔" وہ منہ میں ہذیانی انداز میں بڑبڑائی۔

"پری کچھ بھی کہو تم میں مانوں یا نہیں۔ بس تو وہ تمہاری ہے میری جان۔"

وہ اسے نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بولی جبکہ جانتی تھی یہ بات پری کو اور بھی بھڑکا دے گی۔ بجائے ٹھنڈا کرنے کے وہی ہوا پری کے چہرے پر شدید ناراضی جھلکنے لگی تھی۔

"ہو رہی تھی نا اس مثال کی شادی اس فہد کے ساتھ تو کیوں آپ نے واثق کے لیے ہامی بھرلی۔ آپ جانتی تھیں میرے کیا جذبات ہیں واثق کے لیے، آپ کو پاپا کو روکنا چاہیے تھا ہم نہیں منع کرنا چاہیے تھا۔"

وہ ایک دم سب لحاظ خیال بھول کر تیز لہجے میں چیخ کر بولی عفت کے چہرے پر غصہ سا آ گیا۔

"پاگل ہو رہی ہو تم ایک بے کار کی بات کے پیچھے، واثق کون سا پرنس ہے کہیں کا، پھر رشتہ ان لوگوں نے خود مانگا تھا میں نے تو روکا تھا بہت منع کیا تھا تمہارے پاپا کو مگر واثق کی ماں۔۔۔ اور تم بھول رہی ہو یہ واثق ہی تھا جو شاید پہلے سے مثال کے ساتھ۔۔۔" عفت نے کچھ جتانے کی کوشش کی۔

"مما! میں بہت ہرٹ ہوئی ہوں، واثق میری پہلی محبت ہے اور میں اسے مثال سے چھین کر رہوں گی۔" وہ اسی اشتعال میں کہہ رہی تھی جس میں پچھلی رات تھی۔

"یہ بہت بے کار، بے حد فضول بات ہے۔ نان سینس!" عفت اب کے ضبط نہیں رکھ سکی۔

"آپ کے نزدیک میرے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔" وہ ڈٹ کر ماں کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

"پری۔۔۔ میری بیٹی کچھ خیال کرو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اب کسی بھی طرح سے پھر تمہاری اور واثق کی عمروں کے فرق۔۔۔ میری بچی تمہیں واثق سے ہزار گنا خوب صورت پڑھے لکھے اور اچھے امیر رشتے مل سکتے ہیں۔"

"مگر ان میں سے واثق کوئی نہیں ہو گا۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

"پری!" عفت بل کھا کر رہ گئی۔

"مما۔۔۔ بچپن سے لے کر آج تک آپ جانتی ہیں۔ میں نے جو چاہا وہ پالیا اگر مجھے میری پسند کی چیز نہیں ملتی تھی تو میں اس چیز کو توڑ دیا کرتی تھی۔ اب بھی اگر واثق مجھے نہیں ملا تو میں آپ کو بتا رہی ہوں پھر وہ مثال کی زندگی میں بھی نہیں رہے گا۔ میری بات یاد رکھیے گا۔"

وہ عفت کی آنکھوں میں دیکھ کر چیلنج کرنے والے انداز میں کہتے ہوئے اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم میں چلی گئی عفت تو جیسے سناٹے میں ہی کھڑی رہ گئی۔

بہت کچھ اسے اپنے ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور لگتا تھا صرف بے بسی ساتھ میں رہ جانے والی ہے!

☆ ☆ ☆

ولیمے کی تقریب سب کی توقع سے بڑھ کر شان دار تھی۔

واثق اور مثال کی شان دار جوڑی کو تو سب سراہ ہی رہے تھے، واثق، مثال کے ساتھ جا کر خود ولیمے کے کپڑے خرید کر لایا تھا۔

مثال کے چہرے پر واثق کی محبت کی جو روشنی تھی۔ اس کی چمک اس کی آنکھوں کی لو کو بڑھا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر روشنی کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اور واثق جس انتظار کے ساتھ اس کو اپنے ساتھ لیے بیٹھا تھا وہ بہت سوں کے لیے قابل رشک اور پری کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

وہ بغیر پلکیں جھپکے ان دونوں کو دیکھے جا رہی تھی' عفت چپکے چپکے پری کے پاگل پن کو دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں بہت پریشان ہو رہی تھی۔

اس کی پریشانی اس لمحے کچھ اور بھی بڑھ گئی جب عدیل نے اسٹیج پر پہلے عاصمہ اور وردہ کو گولڈ کے قیمتی تحائف دیے' واثق کو مہنگی ترین برانڈ کی گھڑی پہنائی۔

اور مثال کو اس نے وہی خوب صورت بشریٰ کے بھاری کنگن دیے جن پر چمکتی ہوئی نئی پالش تھی۔

عفت کو جس طرح اس سارے معاملے میں نظرانداز کیا گیا اسے بہت کھلا لیکن یہ کنگن؟

وہ شاکڈ تھی۔

عدیل نے کس وقت یہ کنگن لاکر سے نکالے اور اس نے ایک بار بھی عفت پر نہیں جتایا کہ وہ جان چکا ہے یہ کنگن عفت نے چرائے تھے۔

وہ جو زندگی بھر اپنے شوہر سے خائف رہی کہ اس نے کبھی اسے وہ جائز مقام نہیں دیا جس کی وہ حق دار تھی کہ اس نے عدیل کو ایک خوب صورت بیٹا دیا اس کے باوجود وہ ہمیشہ بشریٰ اور مثال کو ترجیح دیتا رہا۔

آج عفت کو لگا اس کا مقام عدیل کی نظروں میں کچھ اور بھی گر گیا ہے۔

وہ عدیل کو دیکھ رہی تھی جب عدیل نے اسے دیکھا تو وہ صاف نظریں چرا گئی۔ اب نظریں ملاتی بھی تو کیسے؟

اسٹیج پر اب فوٹو شوٹ ہو رہا تھا۔

اور عفت کو پتا ہی نہیں چلا کب پری یہاں سے اٹھ کر اسٹیج پر جا چکی ہے۔ وہ اب مثال کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں بنوانے کے بہانے واثق کے ساتھ بہت قریب کھڑے ہو کر پوز دے رہی ہے۔

عفت تو پریشان ہوئی ہی' یہ سب دیکھ کر عدیل کی پیشانی پر بھی بل پڑ گئے تھے' اس نے چبھتی نظروں سے عفت کو مڑ کر دیکھا۔

عفت ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ دوسرے لمحے عدیل اسٹیج پر پری کے پاس کھڑا اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ عفت کو مثال نے اپنے ساتھ کھڑا دیکھا تھا۔

عاصمہ اور وردہ بھی ان کے ساتھ کھڑی تھیں۔

عدیل یہ سب دیکھ کر بہت خوش تھا کہ اس کی بیٹی کو وہ سب کچھ مل ہی گیا جس کی تمنا اور دعا اس نے بارہا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

واثق کا فون مسلسل بج رہا تھا۔

وہ گہری نیند میں تھا۔

بمشکل اس نے آنکھیں کھول کر نمبر دیکھے بغیر کال ریسیو کی تھی' دوسری طرف شہزاد تھا۔ اس کا بزنس پارٹنر۔

"واثق! یار' میرے پاپا ہاسپٹل میں ہیں۔ بہت سیریس کنڈیشن ہے ان کی۔ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اکیلا ہوں اس وقت' جانتا ہوں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے بٹ.... آئی فیل ہیلپ لیس یار۔"

وہ آخر میں جیسے رو ہی پڑا۔

"حد ہے یار! اس طرح نہیں کہو۔ تم کو ئے ... ل کر دیتا تھی۔ میں آ جاتا نا فوراً" ہی اور تم پلیز پریشان نہیں ہو۔ اللہ اپنا رحم کرے گا۔ کچھ نہیں ہوگا انکل کو۔ میں آ رہا ہوں میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔ پلیز تم سنبھالو خود کو۔"

وہ جلدی سے بستر سے اٹھتے ہوئے مدھم آواز میں کہہ رہا تھا۔
مثال نے آہستگی سے آنکھیں کھول کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔
"واثق! کہاں جارہے ہیں؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر خفیف سا مسکرایا اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر کہا۔
"میرے دوست کی کال ہے' اس کے فادر ہاسپٹل میں ہیں۔ ان کی حالت سیریس ہے۔ وہ پریشان ہے کافی۔ مجھے جانا ہے ہاسپٹل۔"
"اوہ کیا زیادہ بیمار ہیں وہ؟" وہ تشویش سے بولی۔
"ہاں ہیں تو۔ کافی ٹائم سے بیمار ہیں۔ آج شاید زیادہ سیریس ہو گئی ہے ان کی حالت۔ تم پلیز سو جاؤ اگر کہتی ہو تو میں وردہ کو بھیج دیتا ہوں تمہارے پاس۔"
"نہیں' وہ سو رہی ہو گی۔ میں ٹھیک ہوں۔"
"ہاں اپنا ہی گھر ہے اگر کچھ محسوس ہو تو تم مما کے پاس چلی جانا۔ میں تو اب شاید صبح ہی لوٹوں گا۔"
"آپ پریشان نہیں ہوں۔ میں رہ لوں گی۔" مثال اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔
"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں تم سو جاؤ۔" وہ کہہ کر اپنی ضروری چیزیں اور گاڑی کی چابیاں لے کر باہر نکل گیا۔
مثال اسے جاتا دیکھتے ہوئے طمانیت بھرے انداز میں کچھ سوچ کر مسکرانے لگی۔
"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اللہ مجھے اتنی خوشیاں بھی دے گا جبکہ میں نے کوئی بڑی نیکی بھی نہیں کی۔" وہ یہی کچھ سوچتی گہری نیند میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

عاصمہ نے کچھ فکر مندی سے گاڑی ڈرائیو کرتے واثق کو دیکھا۔
"واثق!" اس نے ہولے سے پکارا۔
"جی مما!" وہ جیسے کسی گہری سوچ سے چونکا تھا۔
"کیا زیادہ سیریس حالت ہے ان کی۔ آئی مین شہزاد کے فادر کی۔"
"جی مجھیں۔ لگ ہی رہا ہے میں کہنا تو نہیں چاہ رہا۔ شہزاد بہت پریشان ہے۔ صبح بھی میرے گلے لگ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ اس کا اپنے والد کے سوا دنیا میں ہے ہی کون' ڈاکٹرز بھی کوئی امید نہیں دلا رہے' آپ چل کر اس کے والد کی عیادت کرلیں اور ساتھ میں اس کو تھوڑی تسلی دے لیں' اسے ضرورت ہے اس وقت۔"
واثق پریشان سا کہہ رہا تھا۔
"یہ تو نیکی ہے بیٹا! اور اللہ ایسے موقع پر ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا حکم دیتا ہے۔ تم نے اچھا کیا' مجھے لے آئے۔" عاصمہ سرہلا کر بولی۔
دونوں ہاسپٹل پہنچ چکے تھے۔
واثق عاصمہ کو آئی سی یو میں لے آیا۔
اندر ایک ہی شخص کو جانے کی اجازت تھی۔ عاصمہ شہزاد سے مل کر اندر گئی اور آکسیجن ماسک اور مشینوں میں جکڑے اس شخص کو دیکھ کر وہ شاکڈ سی کھڑی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مصباح علی

اس نے ماربل کے بینچ سے پشت ٹکاتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور دوسری بار قمیص کا پلو جھٹک کر درست کیا۔ وہ دبلا پتلا' سانولا رنگ' چمکتے بال' تیکھے نقوش اور خاص کر اس کی ذہانت بھری بڑی بڑی آنکھیں' ویسے تو اس کی گھنی سیاہ پلکوں پر اکثر خشکی سی چپکی رہتی تھی' مگر آج خاصا بشاش لگ رہا تھا۔ یقیناً" منہ کسی اچھے صابن سے رگڑ کر دھویا گیا تھا اور اگر رگڑا نہیں گیا تھا تو یقیناً" کوئی کریم ضرور لگائی گئی تھی۔ واش اینڈ ویر کا ہلکے آسمانی رنگ کا سوٹ جو چند ہفتے پہلے ہی سل کر آیا تھا۔ جاب کے لیے انٹرویو دینے جانا تھا تو دروازے کے پیچھے لٹکا استری شدہ سوٹ جلدی سے زیب تن کیا۔ براؤن پشاوری چپل جو نئی بھی تھی اور خاصی چمکائی بھی گئی تھی اور یقیناً" ابھی تک کسی بھیا یا بھانجے کی نظر سے نہیں گزری تھی' ورنہ ایک فنکشن کے لیے ادھار لے چکے ہوتے۔ گھر سے نکلتے نکلتے کنگھی کی' جیب میں موجود کریم کا ساشے گلی میں چلتے چلتے ہتھیلی پر نکالا اور ملا اور بس اسٹاپ پر مطلوبہ بس کا انتظار کرنے لگا۔

وہ جان بوجھ کر جلدی گھر سے نکل آیا تھا۔ اسی لیے انتظار کی طویل گھڑیاں بینچ پر اینٹھتے گزر رہی تھیں۔ اس نے اپنے سن گلاسز جس پر اس کی بڑی بھانجی کی کب سے نظر تھی۔ بالوں پر ٹکائے آنکھیں قدرے سکیڑے سڑک کو دور کنارے تک دیکھا۔ شاید بس آتی دکھائی دے۔ بس تو نظر نہ آئی' البتہ ذرا فاصلے پر ہی شیڈ کے نیچے دو لڑکیاں نظر آگئیں۔

کندھوں پر بیگ جھلاتے' ہاتھوں میں فائل تھامے وہ بھی یقیناً" بس کے انتظار میں تھیں۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ان میں سے ایک کی نظر اچانک ایاز پر رک گئی۔ اس نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ چہرے کے زاویے کوفت سے ہلکی مسکراہٹ میں تبدیل ہوئے۔ پھر گاہے بگاہے وہ ایک نظر اس کو دیکھ کر دونوں ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ کو جاذب بناتی اور پھر رخ پھیر کر ہنسنے لگتی۔ اسے لگا کہ شاید وہ آج بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اسے پہلی نگاہ کی محبت پر یقین تو نہ تھا مگر۔ شاید وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ یہ سوچ کر ہی وہ کھل اٹھا۔ اتنی پرُشوق نگاہ سے اسے پہلی بار کسی نے دیکھا تھا۔ اماں' ابا کے مرنے کے بعد اس کے نصیب میں صرف حاکمانہ' احتجاجی یا التجائیہ نظریں ہی رہ گئی تھیں۔ مگر اس لڑکی کی نظر نے دل میں اک عجیب سی گدگدی' جسم میں عجیب سی سنسنی پیدا کر دی۔

وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا قدرے آگے ہو بیٹھا اور چور نگاہوں سے اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ دل یار کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے برابر کھڑی سہیلی کو کہنی سے ٹھوکا دیا۔ کان میں کھسر پھسر کی۔ وہ خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کے لیے بے نیازی سے اپنی سی وی کو الٹ پلٹ کرنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ترچھی نگاہ سے انہیں دیکھا۔ اس لڑکی کی سہیلی کو بھی وہ بہت پسند آیا تھا۔ تب ہی اس کی پوری آنکھیں کھل گئیں اور غالباً" اسی لیے سراہتے ہوئے مسکائی بھی تھی مگر وہ سہیلی سے زیادہ' با اعتماد واقع ہوئی یا پھر اماں رشتے کرواتی ہوں گی تب ہی سہیلی کے دل کا پیغام اسے سنانے کے لیے سج سج اس کی طرف بڑھی۔

"آہم۔"

اس کے کھنکھار کر مخاطب کرنے پر ایاز نے سی وی سے نگاہ اٹھا کر بے نیازی سے اسے دیکھا۔

"جی فرمائیے۔" اس نے آواز گمبھیر بنائی۔

"سر... وہ آپ سے ایک بات..." وہ کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے رکی اور اس ایک لمحے میں ایاز کو لگا جیسے اس کا سوکھی سوکھی ٹہنیوں جیسی پسلیوں میں پھنسا دل پھڑک کر محبوب کے قدموں میں نچھاور ہو جائے گا۔

"صبر کا امتحان کیوں لے رہی ہے، کہہ بھی دے جو کہنا ہے۔" اس نے دھڑکتے دل سے سوچا۔

"وہ آپ... بھائی... آپ نے شلوار الٹی پہنی ہوئی ہے۔" اس نے آخری جملہ ایک سانس میں کہا اور تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ جہاں دوسری لڑکی مشکل سے جبڑے دبائے ہنسی روکتے ہوئے آڑی ترچھی ہو رہی تھی۔

وہ تو اس دھماکے کے بعد پتھر کے بت کی طرح بینچ پر جما کا جما رہ گیا۔ خالی خالی آنکھیں اس پیغامبر کو جاتے دیکھ رہی تھیں۔ سماعت سن ہو گئی۔ بصارت بہت مشکل سے پھسل کر نیچے شلوار کے پائنچے پر گئی۔ اس کا جی چاہا یا تو خود بینچ میں دھنس جائے یا پھر اپنے بڑے ساتوں بہن بھائیوں کو دبا دے۔ وہ کس مشکل سے افراتفری کے عالم میں گھر سے نکلا تھا۔ اس نے گزشتہ اتوار کا دن بھی خاصا کلستے ہوئے گزارا تھا۔ لوگوں کے لیے وہ آرام و تفریح کا دن ہوتا ہے۔ مگر ایاز کے لیے بڑی شامت لاتا ہے۔

اس دن صبح صبح سات بجے تیسرے نمبر والی بہن کی کال آ گئی۔

"ہیلو..."

"ہاں بولو۔" اس نے بڑی مشکل سے جمائی روکی۔ آنکھوں میں آنے والے پانی کو چپکی پلکیں جھپک جھپک کر روکا۔

"تو ابھی تک سو رہا ہے۔" اس کی خمار آلود آواز سے بہن صاحبہ نے اندازہ لگایا تھا۔ جس پر وہ اندر تک کلس گیا۔

"نہیں، مرنے کے بعد قبر میں پڑے رہنے کی پریکٹس کر رہا ہوں۔"

"دفع دور خبیث! مریں تیرے دشمن۔" لگتا تھا بہن کا دل اندر تک ہول گیا۔ لاڈلے بھائی کے منہ سے صبح ہی صبح بدفال سننے پر۔

"میرے ماں باپ کی آخری نشانی ہے تو۔ تجھے کیا پتا کتنا پیار ہے مجھے تجھ سے۔ جان بھی وار دوں میرا جان سے پیارا بھائی۔" اس کے لمبے چوڑے اظہار محبت پر اس کا موڈ مزید ناخوشگوار ہو گیا۔

"کاش وار ہی دے، ایک تو کم ہو۔" دل میں سوچا۔

"باجی! اتنی صبح فون جان وارنے کے لیے کیا تھا؟"

"نہیں خبیث..." وہ تھوڑا سا مسکرائی۔ "تو یاد آ رہا تھا، میں نے سوچا تیرا حال چال ہی پوچھ لوں... ہاں وہ یاد آیا۔" وہ لمبا سا "ہاں" کہہ کر تھوڑا سا رکی۔

"وہ میرا... پوسٹ کروا دیا؟"

وہ اس کے لمبے سے ہاں سے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس

کی بہن ساری زندگی تو اسکولوں میں پٹتی رہی۔ مگر اب جانے کہاں سے لغت' ڈکشنریاں' اخبار کی کترنیں جمع کر کے ایک چھوٹی سی کہانی بنائی جو پریس کی غلطی سے شائع بھی ہو گئی۔ اس بار تو پورا ناول لکھ ڈالا۔ اشاعت سے پہلے ہی پھولی جا رہی تھی۔ زمین پر پاؤں نہ ٹکتے' بس نہ چل رہا تھا کہ چھلانگ لگا کر آسمان میں سوراخ کر دے۔ بینر لگا دے' پمفلٹ چھپوا دے۔ یا پھر تانگے پر ڈھول والا بٹھا کر منادی کروا دے کہ میں ایک مصنفہ ہوں۔ وہ یہ سب یقیناً" کرتی' اگر دوسری تحریر شائع ہو جاتی' اس کی شہرت سے ایاز کو کوئی تکلیف نہ تھی مگر اس کی پیاری باجی نے اس چکر میں اسے پوسٹ مین ہی بنا ڈالا تھا۔ اس نے پوسٹ کا نام سن کر بددلی سے کروٹ لی۔

"باجی آج تو اتوار ہے۔ پوسٹ آفس بند ہوگا.... کل کروا دوں گا۔"

"اچھا یاد سے کروا دینا۔ میں کل پھر یاد دہانی کروا دوں گی۔" اس نے اللہ حافظ یقیناً" دل میں ہی کہا ہوگا۔ کیونکہ فوراً" ہی فون اسکرین چمک گئی تھی۔ ایاز نے دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں۔ کمبل کو ٹانگ مار کر پرے کیا۔ پچکے ہوئے مسلز چھپانے کے لیے جلدی سے قریب رکھی قمیص اٹھائی' ابھی ایک بازو ہی ڈالا تھا کہ میسج ٹون بجی۔ اس نے جلدی سے گریبان میں سر گھسایا اور میسج پڑھنے لگا جو دوسرے نمبر والی آپا کا تھا۔

"ایاز چندا! آج تو فارغ ہے نا' مجھے گڑیا سے ملنے جانا ہے' جلدی آجا میرا بھائی۔"

گڑیا کے گھر جانے کا مطلب میزبانی کے فرائض انجام دینا تھے۔ بازار سے بوتل' جوس' مرغی لا کر دی جائے' چائے کے لوازمات پھر نان' روٹی بھی' کیونکہ اس کے میاں سرکاری ملازم تھے اور آرام طلبی' نوابی طبیعت کا خاصا بن کر ہڈیوں میں گھل رہی تھی۔ ایاز نے کمر کسی اور واش روم میں گھس گیا۔

تولیے سے بال رگڑتا ہوا باہر نکلا ہی تھا کہ بڑے بھائی جان کے حکم پر بھابھی نے جلدی سے اس کی پلیٹ میں گرما گرم پراٹھا رکھ دیا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھا' ابھی دو' چار نوالے ہی کھائے تھے کہ بھائی جان نے سالن کا ڈونگا اس کے مزید قریب کر دیا۔

"پیارے بھائی! بوٹی اور ڈال لے' تیرا جسم دیکھ کر تو اسکول کا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ ایمان سے سائنس بلاک کے باہر رکھے ڈھانچے سے بہت ڈر لگتا تھا مجھے۔" بھائی جان کے مذاق پر بھابھی کی جو پھس پھسی ہنسی نکلی۔ اس کو نوالہ اندر نگلنا مشکل ہو گیا مگر وہ اپنے مذاق سے بے نیاز کچھ ہی دیر بعد چٹکی بجاتے ہوئے اشارے کر رہے تھے۔

"جلدی جلدی فارغ ہو جا' میرے ساتھ دکان پر چل' کچھ مال لے کر آنا ہے۔"

"وہ۔۔ آج ماما کو گڑیا کے گھر لے کر جانا تھا۔"

"ہاں۔۔ ہاں لے جانا۔" بھائی جان نے رومال سے منہ پونچھا۔ پورا گلاس پی کر زور سے ڈکار لگائی اور دکان کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کھڑے ہوئے۔

"پہلے میرے ساتھ دکان پر چل' پھر اسے لے جانا۔" وہ فیصلہ سنا کر بٹوے سے خرچے کے پیسے بیگم کے ہاتھ پر رکھ کر دروازے کی طرف بڑھے۔

"ارے ذرا سننا۔" پیچھے سے آواز دینا بھابھی کی شروع کی عادت تھی۔

"وہ۔۔ سبزی اور دہی ایاز کے ہاتھ ہی بھجوا دینا۔" وہ اپنی بات کر کے نوٹ گنتی کچن میں چلی گئیں اور وہ منہ صاف کرتا دانت کچکچاتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

بھائی جان کی پلاسٹک کے برتنوں کی دکان تھی۔ ایاز ہول سیلر کو فارغ کر کے پلاسٹک کے لوٹے' وائپرز' صفائی کے برش' واٹر کولر' جگ اور مختلف قسم کے سامان کے ڈبوں سے لدی گدھا گاڑی کے پیچھے پیچھے بائیک بھگاتا گیا اور دکان پر مال سیٹ کروایا' پھر ماما کو گڑیا سے ملوا کر تقریباً" شام چار بجے سبزی اور دہی لے کر تھکا تھکا سا گھر لوٹا تھا۔ بڑی بھابھی انتظار میں بیٹھی تھیں۔ بچوں کو اس کے ساتھ چیز لینے بھیجا اور خود

سبزی پکڑی، دھوئی اور تخت پر بیٹھ کر بنانے لگیں۔ وہ محلے کی دکان سے، بچوں کو پاپڑ، بسکٹ دلوا کر گھر لے آیا۔ اس کے منہ ہاتھ دھونے کے دوران بھابھی اونچی آواز میں گڑیا، ماہا اور ان کے بچوں کا حال احوال پوچھتی رہیں، کس حد تک اندازہ لگانا چاہ رہی تھیں کہ کس نے کیا کیا باتیں کیں۔ وہ گلاس میں پانی بھر کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا اور تفصیل سنانے لگا۔ ابھی پانی کا گلاس پورا ختم بھی نہ ہوا تھا کہ لینڈ لائن شور مچانے لگا۔

"ایاز! دیکھنا ذرا کس کا فون ہے۔" بھابھی نے کریلے کے بیج نکالتے ہوئے کہا تھا۔ وہ بھی "جی اچھا" کہہ کر فوراً" اٹھ گیا۔

"ہیلو۔"

"ہاں یار۔ تو گھر پر ہے؟" چھوٹے بھیا کے اتنے بے یقین انداز پر وہ اندر تک تلملا گیا۔

"نہیں، پی ٹی سی ایل کی تار گلے میں ڈال کر گلی میں ناچ رہا ہوں۔" سیدھی سی بات تھی لینڈ لائن پر بات ہو رہی ہے تو بندہ گھر میں ہی ہو گا، مگر نہ جی ہر تصدیق کرنا لازمی ہے۔ چھوٹے بھیا نے تصدیق ہونے پر زور سے قہقہہ لگایا۔ اس کے تلملائے لہجے کو حس مزاح کا نام دے کر چٹکی میں اڑایا اور فوراً" ہی فون کرنے کا مدعا بیان کیا۔

"دراصل یار! میں شہر سے باہر ہوں، ذرا بچوں کو ٹیوشن سینٹر سے گھر لے آ۔ تو۔ تو فارغ ہی ہو گا نا؟"

وہ اگر فارغ ہونے کا ڈنڈا نہ مارتے تو یقیناً" وہ بھی خوشی خوشی بچے لینے چلا جاتا۔ مگر۔ اس نے بائیک کی چابی مٹھی میں دبوچی اور بائیک اسٹارٹ کی۔ ابھی گلی بھی پار نہ کی تھی جب سب سے بڑی آپا کا فون آگیا۔ وہ چند مکان چھوڑ کر ہی رہتی تھیں اور شروع سے ہی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف بات کرنے کی عادی تھیں۔

"ہاں ایاز کہاں ہے تو؟" کال اٹینڈ کرتے ہی وہ شروع ہو گئیں۔ "ذرا میری طرف بائیک لے کر آ، مجھے تیرے ساتھ بازار جانا ہے، کل بلو کی پینٹ لائی تھی، کچھ چھوٹی آگئی، وہ بدلوانی ہے۔"

"آپا! میں گڑیا گڈو کو لینے جا رہا ہوں۔ آپ معید بھائی کے ساتھ چلی جائیں۔" اس نے مشورہ "نا" کہا، جس پر آپا اچھی خاصی خفا ہو گئیں۔

"تو جانتا تو ہے ان کے مزاج کو، وہ کہاں جائیں گے۔" ان کے میاں مولوی نما سے تھے۔ پہلے لمبے باریش شلوار پنڈلیوں سے کچھ ہی نیچے، سر پر جالی کی ٹوپی رکھے۔ شکل تو تھی ہی سو آپا نے عقل سے کام لیا، انہیں مکمل مولوی بنا دیا۔ لو میاں، اب بچوں میں دین بانٹتے رہو۔

اب ایسے میں وہ اپنی ماڈرن بیوی کو نامحرم دکان دار کے ساتھ بھاؤ تاؤ کرتے کیسے برداشت کرتے۔ دوسرے اگر کبھی بیگم کے ساتھ باہر نکل ہی جاتے تو محلے کے ہر گھر سے دو دو، چار چار بچے ہاتھ ملانے کے لیے نکل پڑتے۔ کوئی برف کا گولا چوستا، کوئی بھٹہ کھاتا، چنے پھانکتا سب کچھ چھوڑ دیاں ہاتھ پشت سے صاف کر۔ "سر السلام علیکم۔ میڈم السلام علیکم!" کرتے اچھا خاصا گھیر لیتے۔ اب اتنے جلوس کے ساتھ بیگم کے ہمراہ بیٹے کی پینٹ کیا تبدیل کروانے جاتے۔

"اب بول بھی بچوں کو چھوڑ کر آ رہا ہے نا تو۔"

"اگر نہیں آؤں گا تو کیا مجھے بخش دیں گی؟" اس کے کلس کر کہنے پر آپا ہنس پڑیں۔

"بڑا ہی کمینہ ہے تو۔ چل آجا جلدی سے میرے لال۔ تجھے گاجر کا حلوہ بہت پسند ہے نا، بلو کے ابو آج گاجریں لائے تھے۔ میں نے دھو چھیل کر رکھ لیں، بازار سے آکر کش کر کے دیجیو، پھر دونوں مل کر بھنائی کر لیں گے۔ بس اب آجا جلدی سے میرا بچہ! بہانے نہ بنا۔" آپا کے کندھوں کے درد کی وجہ سے گاجر کش کرنے کی ہمدردی کی تھی جو آج تک بھگت رہا تھا۔

اس کی شکل پر زمانے بھر کی مسکینیت در آئی تھی۔ اسی غربت برساتی شکل کے ساتھ بچے ٹیوشن سینٹر سے بھابھی کی گود میں پٹخ۔ بلو کی پینٹ تبدیل کروا، گاجریں کش کرنے کے بعد بھنائی کروائی اور اب سب بیٹھے ٹھونس رہے تھے۔ آپا کے تینوں بچے ملنگوں کی طرح سر دھنتے حلوے کی داد دے رہے تھے۔

"واہ ماموں! مزا آگیا۔"

"میں سوچ رہا ہوں اگر ایاز کی شادی ہو گئی۔" معید بھائی اپنی پلیٹ لیے وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے تھے "ہم تو گاجر کے حلوے کا ذائقہ ہی بھول جائیں گے۔" اس نے بھنویں اچکا کر بڑی مشکل سے انہیں برداشت کیا۔ جی چاہا اپنے اس رقیب کی پلیٹ چھین کر عینک چھپا دے۔

☆ ☆ ☆

رات کے تقریباً" دس بجے تھے۔ وہ اپنا بستر جھاڑ کر لیٹ گیا۔

الارم چیک کرنے کے لیے موبائل اٹھایا۔ اس کا ان باکس ابلا چاہتا تھا۔ اس نے میسج چیک کرنے شروع کیے۔ صرف ایک ہی پیغام کی گردان تھی۔

"ایاز! جب فارغ ہو تو میری بات سننا۔" یہ چوتھے نمبر والی بہن تھی۔ عادتاً" ذرا سی بات پر سنسنی پھیلانے والی مگر ہمیشہ "کھودا پہاڑ نکلا چوہا"

اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی مس بیل دی جو تقریباً" آدھی ٹون پر ہی ریسیو کر لی گئی۔

"باجی خیریت؟"

"ہاں! وہ تجھے پتا ہے نا، عتیق دوسرے شہر مال لینے گئے ہوئے ہیں۔" اس کے پژمردہ سے انداز اور دوسرے شہر کے نام پر ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ چھلانگ لگا کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"عتیق بھائی ٹھیک تو ہیں نا؟"

"ہاں۔۔۔" باجی نے کروٹ بدلتے ہوئے اتنے اطمینان سے ناک سے "ہاں" کی آواز نکالی۔ اس کا جی چاہا مکا مار کر ان کے آگے نکلے اونچے اونچے دانت توڑ دے۔

"پھر ایسے کیوں بول رہی ہیں۔"

"منیر کے اسکول میں فنکشن ہے اور دیکھ! اس کی میڈم نے اسے مینڈک بنا دیا۔ اب میں کہاں مینڈک کا خول سلواتی پھروں، میں نے کل اس کے اسکول جانا ہے۔ میڈم کو پیسے دے دوں گی، خود ہی سلواتی پھریں۔" وہ کچھ دیر سانس لے کر شروع ہوئی۔

"تو کل مجھے اسکول لے چل، اب کیا ذرا سے کام لیے رکشے کا کرایہ بھروں۔"

وہ اس کے ہر جملے پر ناک پھلاتا اور ہونٹ بھینچتا رہا۔ آخر میں دانت پیس کر بولا۔

"کل جانا ضروری ہے کیا؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔" سلنے میں بھی تو ٹائم لگے گا نا۔"

"لیکن باجی! کل مجھے انٹرویو کے لیے جانا ہے۔" اسے فوراً" یاد آگیا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے، مجھے اسکول اتار دینا، پھر جاتے رہنا۔۔۔ اللہ تجھے کامیاب کرے۔ قسم سے میں تو صبح و شام تیرے لیے دعا مانگتی ہوں، بس جلدی سے میرے بھائی کی نوکری لگ جائے۔"

"ہاں، مگر اسکول ایک سمت ہے اور بینک دوسری سمت۔۔۔ دیر ہو جائے گی۔" وہ اس کی منمناتی آواز کی پروا کیے بغیر زور سے بولی، جس پر وہ بیٹھے بیٹھے جُھل گیا۔

"ہاں۔۔۔ سب کے کام کرتا پھرتا ہے تو۔۔۔ اور میں کوئی کام کہہ دوں تو ایسے ہی ٹال مٹولیاں شروع کر دیتا ہے۔ صاف کہہ دے نہیں لے جاتا۔ کرلوں گی کسی دیور جیٹھ کی منتیں میں۔" دراصل اس باجی کے میاں جی حضور ٹائپ تھے۔ غالباً" اسی لیے اسے اپنی منوانے کی عادت تھی اور اس سے جب بھی کوئی کام کہتی یا آرڈر دیتی۔۔۔ ورنہ اتنے بخیے ادھیڑتی کہ اللہ کی پناہ۔

"اچھا۔۔۔ آپ تیار رہنا، میرا انٹرویو بارہ بجے ختم ہو گا۔ میں فوراً" آپ کو لینے آجاؤں گا۔"

"شکریہ۔۔۔" کے ساتھ ہی باجی کی آواز میں بشاشت آگئی اور خوب دعائیں دے کر فون بند کیا۔

اس کا دل چاہا موبائل دیوار میں دے مارے یا پھر بائیک کو آگ لگا دے، جن کی وجہ سے وہ سارا دن شہر میں سرکس کرتا رہتا ہے۔

صبح الارم کے دھوم دھڑکے پر تیزی سے اٹھا۔ واش روم سے نکلتے ہی اس کی نظر بھابھی کی تیاریوں پر گئی۔ یقیناً" ان کی پھرتیاں، نئے کپڑے میکے جانے کا

پیش خیمہ تھیں۔ بھائی جان کا تو اسے معلوم تھا کہ آج کسی ضروری کام سے شہر سے باہر جانا ہے۔

"تو پھر کیا ان کا ڈرائیور بننا پڑے گا؟" ایک بمن کے پوسٹ کی الاپ آنے والی تھی۔ دوسری کے بیٹے کو مینڈک بنوانا تھا۔ بھابھی سے الگ خطرہ محسوس ہوا۔ عافیت اسی میں جانی کہ جتنی جلدی ہو سکے بھاگ لے۔

اس نے بغیر نہائے دھوئے منہ تولیے سے رگڑا لوڈشیڈنگ سے کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے دروازے کی روشنی میں جانچ پڑتال کرنے کی زحمت نہ کی، بس جلدی جلدی کپڑے چڑھائے، سی ڈی اٹھائی، تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس نے بائیک بھی نہ نکالی، کہیں بھابھی چوکس نہ ہو جائیں۔ اب ایسے حالات میں شلوار الٹی پہن لینا اتنی بھی انہونی بات نہیں تھی، جتنی وہ لڑکیاں دوہری ہو رہی تھیں۔

وہ مارے شرمندگی کے بڑی مشکل سے وہاں سے اٹھا اور ایک پبلک باتھ روم میں جا کر شلوار سیدھی کی۔

☆ ☆ ☆

وہ پانچ بہنوں اور دو بھائیوں کا سب سے چھوٹا لاڈلا راج دلارا تھا۔ ابا پانچ بچوں کی شادیاں طے کرتے ہی اپنے آخری سفر پر چل پڑے۔ اماں نے پوری زندگی ابا کو ادھر ادھر تانک جھانک کرنے نہ دی۔ اسی خدشے کے پیش نظر مزید دو کو فارغ کیا اور فوراً" پیچھے پیچھے ہو لیں۔ مبادا حوروں کے چکر میں نہ پڑ جائیں اور اس افراتفری میں اپنے بڑھاپے کی نشانی سات بہن بھائیوں پر چھوڑ گئیں۔ وہ ساتوں اپنی ذات میں سلطنت کے برابر تھے۔

وہ ان ساتوں کے درمیان پس کر رہ گیا تھا۔ اب ایسا بھی ہرگز نہیں تھا کہ ان ساتوں کو اس سے محبت نہیں تھی۔ محبت کا عالم تو یہ تھا کہ اسے لمحہ بھر کے لیے تنہائی کا احساس نہ ہونے دیتے۔ کہیں اکیلے میں اماں ابا کو یاد کر کے بچہ روئے نہ کوئی سماعتی رابطے میں رہتا تو کوئی بہلا رہتی۔ صبح اٹھنے سے لے کر رات سونے تک کے تمام اوقات اس پر کڑی نظر رکھی جاتی کہ لڑکا ذات غلط راہ نہ لگ جائے، روز قیامت اماں ابا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ برسر روزگار ہو گا تو بیاہ دیں اور اماں، ابا کے سامنے سرخرو ہو جائیں۔

اسے بیاہنا بھی کسی معرکہ آرائی سے کم نہ تھا۔ ساتوں کے معیار پر کسی ایک لڑکی کا اترنا ناممکن تھا۔ بڑی آپا کو پڑھی لکھی لڑکی چاہیے تھی جو بوقت ضرورت ان کے مدرسے میں پڑھا سکے۔ ایک آپا کو خوب طاقت ور سسرال چاہیے تھی تاکہ کوئی مشکل پیش آنے پر سالے ساتھ کھڑے ہو جائیں۔ ایک کو اپنے افسانوں کی طرح حسین بھابھی چاہیے تھی۔

ایک کو سیدھی سادی چاہیے تھی تاکہ ان کا معصوم بھائی ان کے ہاتھ سے نکل نہ پائے۔ ایک کو پیسے والی چاہیے تھی تاکہ وہ کنجوسیاں جو اکثر ایاز ان کے ساتھ کر جاتا ہے اس کا ازالہ ممکن ہو سکے۔

بڑی بھابھی اس فکر میں دبلی تھیں کہ کہیں دیورانی کی بہن نہ آ جائے اور چھوٹی بھابھی کو ہول اٹھتے کہیں جٹھانی کی رشتے دار نہ آگر ان کا نہ پتا صاف کر دے۔ اور باپ جیسے دونوں بھائیوں کو ایک ہی فکر تھی۔ "بھئی سہرا ضرور لگے ایاز کے سر پر مگر ہمارے ہی سر سے نہ لگے۔"

ساتوں کا مشترکہ گوہر مراد ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔

☆ ☆ ☆

اسے انٹرویو میں منتخب کر لیا گیا تھا اور جاب کرتے چھ ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اتوار کے روز ناپے سمیت باقی دن بھی روٹین پر گزر رہے تھے۔ کچھ سکون تھا وہ کچھ دیر پہلے ہی آفس سے آیا۔ ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کیے کھانا کھایا۔ دو عدد بہنیں آئی ہوئی تھیں اور حسب عادت اپنے اپنے سسرال کے گناہ دھو رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا ان کے دکھڑے سنتا رہا۔ پھر آرام کی غرض سے اٹھ کر معذرت کرتا اپنے

کمرے میں جاکر لیٹ گیا۔ برآمدے میں براجمان ان دونوں کی آوازیں کمرے تک آرہی تھیں۔ ان کے بدلے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ موضوع گفتگو تبدیل ہو چکا ہے۔ یعنی آج وہ کوئی رشتہ دیکھ کر آئی تھیں۔

بڑی آپا اس کی تعلیم پر فریفتہ تھیں۔ غالباً" لڑکی اکنامکس میں ماسٹرز تھی۔ جبکہ دوسری بہن مسلسل اس کے سانولے رنگ اور پتلے جسم کو نشانہ بنائے ہوئے تھی۔ ایسی گفتگو وہ اکثر ہی سنتا رہتا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ کوفت زدہ ہوکر کروٹیں بدلتا رہا۔ آخر تنگ آکر اٹھا، میز پر سے موبائل، بائیک کی چابی اٹھائی اور باہر جانے کے لیے نکلا۔

وہ بائیک کے دونوں ہینڈل پکڑے اسے گھسیٹتا دہلیز سے باہر نکال رہا تھا کہ پیچھے سے باجی کی آواز آئی۔

"ایاز! تو بائیک لے کر جارہا ہے۔" ایسے بے تکے سوالوں پر وہ دانت پیس کر رہ جاتا تھا۔

"نہیں ۔۔۔ صحن میں بچوں کو سرکس دکھانے لگا ہوں۔" تپ کر بولا۔

"اچھا! چل پہلے مجھے گھر چھوڑ دے۔ پہلے ہی دیر ہوگئی۔" وہ چادر کی بکل مار کر دھپ سے اس کی بائیک پر اس سے پہلے ہی بیٹھ گئیں۔ جس کوفت زدہ گفتگو سے فرار کے لیے باہر کی راہ لی تھی۔ وہ سارے رستے اس کے ساتھ گئی۔ باجی سارے راستے اس بے چاری لڑکی میں نقص نکالتی رہیں۔

"لو دیکھو بھلا" آپا کو صرف اس کی تعلیم نظر آرہی ہے، سوکھا لکڑی جسم نظر نہیں آیا۔

اب بتا! وہ کالی کھجور تیرے لیے ہی رہ گئی ہے بھلا' ایک تو 'تو' بھی کالا، اوپر سے وہ مل جائے گی۔ اندازہ لگا لوگ کیا کہیں گے۔ یہ تو وہی بات ہوجائے گی 'ماں ٹینی' باپ کلنگ' بچے نکلے رنگ برنگ۔"

اس کی آنکھیں باجی کے محاورے اور خاص کر "تو کالا" کی صاف گوئی پر پھٹ گئیں۔ وہ جانتا تھا باجی کتنی منہ پھٹ ہیں اور جانے کیا کیا کہیں گی ۔ اس نے کلس کر جو بائیک بھگائی تو ان کے دروازے پر آکر روکی۔ باجی نے پچکارتے ہوئے چائے، شربت کی بہت آفر دی، مگر وہ "دیر ہوجائے گی" کا بہانہ بنا کر فوراً بائیک اڑا لے گیا۔

کسی کی شکل و صورت کے عیب اسے ذرا نہ بھاتے تھے۔ اسی لیے ان کی باتوں پر وہ جی بھر کر کڑوا ہوا اور وہ کڑواہٹ دوچند ہوگئی۔ جب ایک بھاری بھرکم وجود بائیک کے آگے سے ہٹنے کا نام لے رہا تھا۔ غالباً" کوئی ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ ایک ہاتھ میں دو ڈھائی کلو چاول، بناسپتی گھی کچھ مسالاجات اور دوسرے میں خربوزوں کا شاپر پکڑے دائیں بائیں ڈولتی گلی کے بیچ و بیچ چل رہی تھیں۔ ایاز نے کئی ہارن دیے، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ آخر اس نے ہارن پر انگلی ہی رکھ لی۔ جس پر اس خاتون نے ذرا کی ذرا مڑ کر دیکھا۔ چند لمحے آنکھیں چھوٹی کیے دیکھی گئیں۔ پھر پوری کھل گئیں۔

"ارے تو وہی ہے نا اپنی نغمہ کا چھوٹا۔" انہوں نے قریب ہوتے ہوئے بائیک کے پیچھے ایک شاپر رکھا اور اس کے اقرار و سلام کے جواب میں "ماشاء اللہ۔۔۔ ماشاء اللہ۔" کہتے ہوئے خوب جما کر ہاتھ پھیرا، جو سر سے پھسلتا ہوا گردن سے کمر تک رگڑ گیا۔

"اس ۔۔۔ تو اتنا بڑا کیسے ہوگیا؟" ماشاء اللہ کے بعد بھی ان کی حیرت دیدنی تھی۔ جس پر اس نے معصوم سا منہ بنایا اور آنکھیں مٹکائیں۔

"خالہ! رات بھر انگوٹھا چوستا رہا، صبح آنکھ کھلی تو دیکھا بڑا ہوگیا۔"

"جا۔ دفعان ہو کمینے ۔۔۔ تیری مذاق کی عادت نہیں گئی۔" انہوں نے پشت پر پیار بھری دھپ لگائی اور خود بھی دھپ سے پیچھے بیٹھ گئیں۔ بھاری بھرکم وجود اس نے بائیک کنٹرول کرتے ہوئے اپنا ناتواں سا وزن ٹنکی کی طرف کھسکایا۔ شاپرز پکڑ کر آگے لٹکائے تو کچھ توازن ہوا۔ وہ خاتون اماں کی گہری سہیلی تھیں اور ابھی تک اسی پرانے محلے میں آباد تھیں۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں اور میاں کی کوئی دکان تھی۔ اماں سے بے تحاشا دوستی ہونے کے باوجود نہ انہوں نے کاروبار کا کرید کے

پوچھا نہ ہی انہوں نے خود بتایا۔ ہاں البتہ رہن سہن سے خاصے کھاتے پیتے لگتے تھے۔ روزانہ بھنے گوشت کی خوشبوئیں اور پھر فربہی جسم بھی خوش خوراکی کی علامت تھے۔

گھر تک کی لفٹ کے دوران ان کی دکھ بھری گفتگو مرحومہ سہیلی کی یادوں سے ہوتی ہوئی تمام بہن' بھائیوں کے حال احوال تک گئی۔ اس کی تعلیم' روزگار کا پوچھا اور اپنے حالات زندگی بتائے۔ وہ برآمدے میں بچھے تخت پر ان کے برابر ہی گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ خالہ چائے کا بہت اصرار کرتی اسے اندر لے آئی تھیں اور بہت دلار سے اسے اپنے قریب ہی بٹھالیا۔

حیا پاس سے سلام کرتے ہوئے گزری اور کچن میں چلی گئی۔ اور کچھ ہی کھٹر پٹر کے بعد ایک ٹرے میں چائے' چپلی کباب اور کچھ تکے اس کے سامنے رکھ کر سیدھی ہوئی۔ قدرے فربہی مائل' صاف ستھرا رنگ' تیکھے نقوش اور مسکراتا چہرہ۔ اس نے لمحہ بھر ہی دیکھا۔ پھر نظریں جھکالیں۔ وہ چائے اور باقی لوازمات کی ایک ٹرے اندر کمرے میں بھی لے گئی تھی۔ یقیناً وہاں بھی مہمان بیٹھے تھے۔ وہ کباب کھانے کے بعد دھیرے دھیرے چائے کی چسکیاں بھر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ خالہ کی لاڈ بھری باتیں اور کمرے سے کھلکھلاتی نسوانی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ ایک شوخ آواز پر اس کے کان کھڑے ہوگئے۔

"یہ باہر کون ہے۔" یقیناً" کسی نے باہر کی جانب جھانکتے ہوئے پوچھا تھا جواب حیا نے دیا۔

"امی کی بہت اچھی فرینڈ تھیں' ان کا بیٹا ہے' بہت ہی نیک اور فرماں بردار ہے۔" اس کی تمہید میں لپٹی تعریف پر پہلی آواز نے کسی تیسری کو مخاطب کرتے ہوئے دماغ پر زور ڈالا۔

"یار۔۔۔ یہ وہی فرماں بردار تو نہیں۔۔۔ جو اس دن الٹی شلوار پہنے بہت شوخا ہو رہا تھا۔" اس کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ ہنسی کے فوارے چھوٹ گئے۔ حیا نے اپنی ہنسی بمشکل سے روکی اور سہیلیوں کو ڈپٹا۔

"آہستہ بولو' وہ سن لے گا۔" دوسری نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بمشکل ہنسی دبائی اور بھنویں نچائیں۔

"تو جی وہ سن لے گا۔ ہم ہی نے اس فرماں بردار کو جتا کر سیدھی کروائی تھی' ورنہ۔۔۔" اندر سے پھر پھس پھس آوازیں آنے لگیں۔ وہاں سے اٹھ جانا ہی اس کے بھلے میں تھا۔

✿ ✿ ✿

اس کی سرگرمیاں کئی ہفتوں سے مشکوک سی تھیں۔ شام کے وقت اکثر ہی غائب رہتا۔ اکثر ہی کال کاٹ دیتا۔ چھٹی والے دن دیر سے اٹھتا تیار ہوتا اور جانے کہاں چلا جاتا تھا۔ بہن' بھائیوں کی پوچھ گچھ پر ٹال مٹول شروع۔۔۔ وہ سب ان ٹال مٹولیوں میں بھی کچھ نہ کچھ کام نکلوا ہی لیتے تھے۔ پھر بھی بھائی جان بڑی آپا سے فون پر شکوہ کناں تھے۔

"جانے سارا دن کہاں سیر گشت کرتا رہتا ہے' کئی دن سے کہہ رہا ہوں جانوروں کی منڈی لگی ہوئی ہے۔ شام کے وقت چلتے ہیں۔ شاید کوئی سستا جانور قربانی کے لیے مل ہی جائے' مگر نہ جی وہ نواب تو کہہ رہا ہے ایک دن پہلے جانور لائیں گے۔"

"بس کیا کریں' ایسا ہی لاپروا ہو گیا ہے۔" آپا بھی بکرے کو گھاس ڈالنے اٹھی تھیں۔ ہاتھ میں گھاس پکڑے اپنا ہی دکھڑا رونے لگیں۔

"میں تو خود اس کے لیے دال کا حلوہ بنانے کا سوچ رہی تھی' مگر خبیث آکے ہی نہیں دے رہا۔" ابھی فون بند ہی ہوا تھا کہ ایاز کا فون آگیا۔ آپا نے "میں' میں" کرتے بکرے کے سامنے گھاس رکھی اور پھر مسکرا کر بولیں۔

"ہاں کہاں ہے تو؟ میں کتنے دنوں سے تجھے بلا رہی ہوں' آجا مل کر حلوہ بناتے ہیں مگر تو۔۔۔"

"آپا! آپ ایک حلوے کے لیے ہلکان ہو رہی ہیں اور میں نے آپ کے لیے پوری دعوت کا انتظام کر رکھا ہے۔"

"ہائیں۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔" آپا حیران ہو گئیں۔

"حیران مت ہوں۔ چاند رات کو میری طرف سے آپ سب کی دعوت ہے۔"

چند دن بعد عید قرباں تھی اور ہر عید کی شام بھائی جان کے ہاں سب بہن بھائیوں کا کھانا ہوتا تھا مگر اس بار عید کی شام کے بجائے چاند رات اور وہ بھی ایاز کی طرف سے نہ صرف بڑی آپا بلکہ سب بہن بھائیوں کو حیران کر گیا۔ سب بہنیں اپنے بچوں سمیت صبح ہی جمع ہو گئیں۔

بھائی جان کے گھر میں خوب ہلچل مچی تھی۔

بچوں نے چھوٹے سے گھر میں طوفان بدتمیزی مچا رکھا تھا۔ کوئی کسی کے کان کھینچ رہا تھا' تو کوئی کسی کے بال' کوئی چیخیں مار رہا تھا' تو کوئی آتے جاتے دوسرے کے چٹکیاں بھر رہا تھا۔ بڑی بھابھی گھر کی اس رونق پر اوپر ہی اوپر ہنس رہی تھیں مگر دل میں میاں کو کوس رہی تھیں کہ یہ سالانہ اجلاس اپنے ہاں ہی ضرور لگواتا ہوتا ہے۔ مگر بہن بھائیوں کی جانے بلا۔ وہ مزے سے بیٹھے ایاز کا انتظار کر رہے تھے۔ جو شام سے تیار ہو کر ہوٹل کھانا لینے گیا ہوا تھا اور اب تقریباً" رات ہو گئی تھی۔

وہ پیکنگ ڈبوں کے بڑے بڑے شاپرز پکڑے خاصی دیر بعد آیا تھا۔ اس نے تمام شاپرز گم صم کھڑی بھابھیوں کو پکڑائے۔ سب کی متحیر نظریں شاپرز پر کم' اس کے پہلو میں بنی سنوری سرخ جوڑے میں ملبوس حیا پر رک گئی تھیں۔

ان سب کی حیرانی پر وہ مسکرایا اور بولا۔

"باجی یہ۔۔۔۔"

"میں حیا ہوں' مسز حیا ایاز۔" عمر کے تمہید باندھنے سے پہلے ہی وہ فخر سے بول پڑی اور ایاز نے بھی مسکرا کر سینہ تان لیا۔ باجی کا جی چاہا اس بے حیا کا منہ توڑ دے۔ بھلا سات بہن بھائی مر گئے تھے کیا یا اتنی آفت آئی کہ خاموشی سے بیاہ رچا لیا اور پھر دیدہ دلیری دیکھو' کتنے فخر سے سوکھی ہڈیاں تان کے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ ہماری محبتوں کا یہ صلہ دیا۔ اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا' پیار کیا اور آج ہمیں مکھن میں سے بال کی طرح نکال باہر کیا۔ سب دانت جمائے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہے تھے اور وہ دیدہ دلیر جیسے مٹکتی ہوئی آئی تھی۔ ویسے ہی آگے بڑھی' سلام کیا اور گم صم ہونق زدہ بھابھیوں کے ہاتھوں سے کھانے کے شاپرز پکڑے اور میز پر کھول دیے۔

"آپ سب شروع کریں نا۔" اس نے ادا سے کہا اور پھر سیدھی ہو گئی۔

"ہم ہوٹل میں کھائیں گے' میرے ابا نے ٹیبل ریزرو کروا رکھی ہے۔" اس نے مسکرا کر ایاز کو دیکھا جو اس کی ہاں میں ہاں ملاتا سر ہلا رہا تھا۔

"اب چلیں جی' دیر ہو رہی ہے۔" وہ اس کے بازو میں بازو ڈالے لہراتی ہوئی باہر کی طرف ہولی۔

"دیکھ لیا۔ اسی دن سے ڈرتا تھا میں۔" بھائی جان غصے میں بھنبھناتے کرسی دھکیل کر اٹھے۔

"میں کہتا بھی تھا کہ اسے قابو میں رکھو' مگر۔۔۔ تم بہنوں کے تو لاڈ ہی ختم نہیں ہوتے' اب بھگتو۔" وہ ہمیشہ کی طرح سارا الزام دوسروں کے سر ڈال کر ہاتھ جھاڑ کھڑے ہو گئے۔ چھوٹے بھیا ان کا ساتھ دے رہے تھے۔

"موبائل' کمپیوٹر' موٹر سائیکل رابطے کی کس چیز کی کمی تھی اس کے پاس' جب اتنی آزادی ملے گی تو یہ سب تو اس نے کرنا ہی تھا' ہم نے تو نہ کی اتنی جرات۔" انہیں اپنے ماں باپ کی پسند ہر وقت ناکوں چنے چبوائے رکھتی تھی۔ اسی لیے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

"بس بھیا! اپنے حسن سے قابو کر لیا' دیدہ دلیری دیکھو اس فتنی کی' کیسے مٹکتی ہوئی آئی اور چلی بھی گئی۔" باجی کی خیالی حسین ہیروئن کم از کم اتنی پراعتماد نہیں تھی۔ ان کی حسن پرستی کا سپنا چھن سے ٹوٹ گیا اور دوسرے نمبر والی آپا کسی پیرنی کی طرح آنکھیں بند کیے مسلسل کہہ رہی تھیں۔

"ہائے! قیامت کی نشانیاں ہیں' قیامت کی۔" باقی تین بھی انگشت بدنداں تھیں۔ کوئی طاقت ور سسرال کی متوقع سیاست سے خوف زدہ ہوئی تو کوئی پڑھی لکھی کی ہوشیاری سے۔ غالباً" سب کو ہی پتا تھا

کہ حیا پڑھی لکھی بھی ہے اور کھاتے پیتے گھرانے سے بھی۔ سب ہی کی خواہش یک جان ہوئی تو خاصی ہولناک لگنے لگی۔

بے شک اس نے سب بہن، بھائیوں کو حیرت انگیز سرپرائز دیا تھا اور چند دن بعد حقیقتاً" سب ٹھیک ہو جانا تھا۔ وہ اسی خوشی میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔ جب اس کی پہلی نظر حیا پر گئی تو وہ بہت اچھی لگی۔ پھر خالہ کا لاڈ، خالو کا بات بات پہ فریفتہ ہونا۔ اسے اصرار کر کر کے بلانا، خاطر تواضع کرنا، اس کا بھی وہاں دل لگنے لگا اور پھر اکثر ہی آفس سے واپسی پر کچھ دیر کے لیے چلا جاتا۔ خالہ کے بیٹا تھا نہیں۔ انہیں اس کی شرافت اور حکم بجالاتی فطرت دیکھ کر بیٹے کی کمی کا شدت سے احساس ہوا اور یہ کمی اپنی بیٹی کا ہاتھ دے کر پوری کرنا چاہی۔ عمر کو تو حیا پسند تھی، مگر خدشہ ـــ ہوا کہ وہ سات بہن، بھائیوں کے "معیاروں" پر کبھی پوری نہ اترے گی، سو اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر خالہ، خالو کو صاف صاف بتا دیا۔ جس پر وہ مزید قربان ہو گئے۔ انہیں تو بازو ہی چاہیے تھا۔ جب لڑکا لڑکی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ سب کچھ جھٹ پٹ طے ہو گیا۔ اسی جھٹ پٹ کو منانے کے لیے اس نے ایک پلان ترتیب دیا۔ سب سے پہلے بہن، بھائیوں کو دعوت پر خوش نما سرپرائز دیں گے، پھر ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔ پھر چاند رات کو دل بھر کے شاپنگ اور پھر صبح قربانی سے فارغ ہوتے ہی گیارہ بجے والی گاڑی سے مری کی طرف روانگی۔ اپنا ہنی مون سب سے مختلف انداز میں عید کے روز مری کے مرغزاروں میں منائیں گے۔

"ہم تم ہوں گے، بادل ہو گا" کی جھنکار اس کے خیالوں میں رس گھولنے لگی۔ وہ حیا کو پیچھے بٹھائے بائیک اڑاتا ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ساس کا گھر بھی پڑتا تھا۔ حیا نے عادتاً" دروازے کی جانب جھانکا۔ وہاں قربانی کا بیل بندھا کھڑا تھا۔ وہ کھل گئی۔ یقیناً" اس کی رخصتی کے بعد ہی ابا خرید کر لائے تھے۔ اس نے ایاز کو کندھے سے ہلایا۔

"ذرا سنیے۔"

"ہوں۔" اس نے ذرا گردن موڑ کر نرمی سے کہا۔

"اماں کی طرف بیل آگیا ہے، کیا خیال ہے مبارک باد نہ دیتے جائیں۔"

بیگم کی پہلی پہلی فرمائش بھلا کیسے ٹالی جا سکتی تھی۔ اس نے پاؤں سڑک سے ٹکرا کر بائیک روکی، پھر موڑی اور دروازے کے آگے جا کر کھڑی کی۔ دروازہ دوسری بیل پر ہی کھل گیا۔

"ارے میرا بچہ۔ کتنی عمر ہے تمہاری ماشاء اللہ۔ اللہ زندگی دے۔" خالہ ان کی بلائیں لیتی، دعاؤں کے حصار میں اندر لے گئیں۔ دونوں کو تخت پر بٹھایا۔ ان کے بہت منع کرنے کے باوجود خالو نے ندا کو آواز دے کر شیشے کے گلاسوں میں بوتل لانے کو کہا۔ ردا بھی انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

"ہم تو تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔ خیر سے اب داماد والے ہو گئے ہیں، اب کاہے کی فکر۔" خالہ سامنے موڑھے پر ٹکتے ہوئے بولیں تو اس نے قریب بیٹھی حیا کو کہنی سے ٹہوکا دیا اور مسکرا کر بھنوؤں سے کچھ جتایا۔ وہ کندھے سکیڑتے ہوئے شرما گئی اور خالہ دونوں کو خوش دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ اٹھ کر دونوں کے ماتھے چومے۔

"ندا، ردا کب سے تمہارے خالو سے ضد کر رہی تھیں۔ ایک کو پارلر جانا ہے، دوسری کی چوڑیاں جوتی رہتی ہے اور ایک یہ ہیں کہ۔۔۔" انہوں نے موڑھے سے پشت ٹکائے ہوئے شکوہ کناں نظروں سے میاں کو دیکھا۔ انہوں نے ایاز کے کہنے پر نکاح رخصتی سادگی سے کی تھی۔ اگلے دن عید پر سب نے دگنے ارمان نکالنے تھے۔ مگر خالو جو دوسرے تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اطمینان سے بیٹھے تھے۔ خالہ کی بات سن کر مزید پھیلے اور سیدھے لیٹ گئے۔

"وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔ او بھائی میں نے بتایا بھی ہے کہ آج کندھے میں کچھ درد ہے، پھر کل کتنا کام ہو گا، اب آرام کرنے دو مجھے۔" وہ بیٹی کو رخصت کر کے بہت مطمئن تھے۔ اسی لیے اطمینان سے ایاز کو

دیکھ رہے تھے۔

"کوئی بات نہیں خالو جان! آپ آرام کریں' میں انہیں لے چلتا ہوں۔" اس نے مروتاً" کہا تھا کہ نئے نویلے جوڑے کے ساتھ نہ کوئی بھیجے گا اور نہ کوئی جانا پسند کرے گا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہوا۔ خالہ سنتے ہی خوشی سے جھوم گئیں۔

"واہ بھئی' ایسا ہونا چاہیے نافرماں بردار بچہ۔" خالہ نے تالی بجا کر داد دی اور روا' ندا چادریں لپیٹ فوراً" کھڑی ہو گئیں۔

"چلیں ایاز بھائی!"

"چلو۔" اس نے جانے کس دل سے کہا۔ بیگم کے ساتھ ہوٹلنگ' شاپنگ تو گئی بھاڑ میں۔ وہ حیا سمیت دونوں سالیوں کو گھماتا' دہی بھلے' شوارمے' ربڑی' فالودے کھلاتا رات کے ایک بجے سسرال پہنچا تھا۔ خالو نے اسے بہت اصرار سے وہیں روک لیا۔

"اب آدھی رات کو کیا چوکیداروں کی طرح دروازہ بجاؤ گے۔" بھائی جان اور بھیا کے بہت فون آئے۔ اماں نے پوچھا۔ پتا چلنے پر گھر داماری کے طعنے دیے' مگر سسر کا حکم نہیں ٹال سکا۔

وہ دنیا کا پہلا دولہا ہی ہو گا' جس کی پہلی رات' دلہن کی سنگت کے بجائے سسر کے دل خراش خراٹوں میں کروٹیں بدلتے گزری ہو گی۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھ اوزاروں کے تیز ہونے کی رگڑ اور سسر کے کھنکھارنے پر کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ موبائل اٹھا کر ٹائم دیکھا تو یک لخت جست لگائی اور کھڑا ہو گیا تاکہ گھر جا کر تیار ہو اور نماز بھائیوں کے ساتھ مرکزی عید گاہ میں ادا کرے۔

"کیا ہو گیا بیٹا! لیٹے رہو' کچھ دیر اور آرام کر لو۔" خالو ایک ہاتھ میں لمبا چھرا اور دوسرے میں چوپر پکڑے ایک دوسرے پر رگڑتے ہوئے تیز کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے اٹھتا دیکھ کر اندر جھانکا' پھر اندر ہی آ گئے۔ وہ اوزاروں کو دیکھ کر لفظ ہی بھول گیا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ خالو۔۔۔ مجھے گھر جانا ہے' تیاری' نماز' وہ بھائی۔۔۔" وہ انہیں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر جانے کہنا کیا چاہ رہا تھا اور ساتھ ساتھ پاؤں میں الٹی سیدھی چپل اڑس رہا تھا۔

"او میاں! کچھ نہیں ہوتا' تمہاری تیاری اور بھائیوں کو۔۔۔" وہ دونوں اوزار اس کے قریب ہی لکڑی کی مونڈھی پر رکھتے ہوئے سیدھے ہوئے۔

"بیٹا۔۔۔ تم سو رہے تھے۔ رات دیر سے آئے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں تو برابر والی مسجد میں نماز ادا کر آیا ہوں۔ دراصل وہاں نماز جلدی ہوتی ہے۔" وہ اس کے برابر کھڑے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے رسانیت سے بول رہے تھے۔

"اور رہ گئی تمہاری عید گاہ میں تو میری جان! جب تک تم گھر جاؤ گے تیار شیار ہو گے تو وہاں بھی ہو جائے گی۔ بہتر ہے بھاگ کر پچھلے چوک کی مسجد میں پڑھ آؤ۔" وہ ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے اندازہ لگانے لگے۔

"میرا خیال ہے وہاں ابھی جماعت کھڑی ہوئی ہو گی۔" اس کی رو دینے والی شکل پر ان کی مسکراہٹ پھوٹ پڑی۔

"یار! کیا ہو گیا۔ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے' تم فکر نہیں کرو۔ چلو شاباش۔۔۔ ہاتھ منہ دھو لو' کچھ کھا لو' تمہاری ساس نے خصوصاً" تمہارے لیے خوب کھویا ڈال کر کھیر پکائی ہے' وہ چکھ لو' پھر چلتے ہیں۔"

وہ منہ کھولے حیرت سے انہیں تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا ابھی تو اسے بھگا کر پچھلے چوک بھیج رہے تھے اور اب کھلا پلا کر چلنے کا عندیہ دے رہے ہیں۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے حیا کو زور سے پکارا۔

"حیا بیٹے۔۔۔ میری نئی صدری اور تہہ بند ایاز بیٹے کو دے دو' میں پرانی ہی پہن لوں گا۔"

جلدی نماز' صدری' تہہ بند' چلتے ہیں۔۔۔ اس نے ربط کو جوڑتے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھیں قریب رکھے چمکتے اوزار کی جانب سرکائیں۔ اس کی آنکھیں مزید

پھٹ گئیں۔ یہ تو معلوم تھا خالو اچھے خاصے پیسے والے ہیں۔ مگر وہ کرتے کیا ہیں۔ یہ نہیں پتا تھا۔ بڑ بڑ جڑتے جڑتے اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں اور پلکیں خالو کی جان دار تھپکی نے جھپکیں بلکہ پلکیں کیا جھپکیں ساری ہڈیاں ہی تڑخ گئیں۔

"چل بھئی جوان! جلدی تیار ہو۔ میں ذرا رسہ نکال لوں۔" وہ تھپکی دے کر دو قدم دروازے کی جانب بڑھے' پھر گم صم سے داماد کو دیکھ کر دوبارہ پلٹ آئے۔

"دراصل بیٹا! میں نے دو' تین لوگوں سے ایڈوانس پکڑ رکھا ہے مگر کل میرے کندھے میں درد اٹھ گیا۔ اب اگر تم جیسا گبھرو جوان بیٹا اللہ چھپر پھاڑ کر نہ دیتا تو اور بات تھی' مگر اب عین وقت پر پیسے واپس کرتے شرم آتی ہے' تم فکر نہیں کرو۔" انہوں نے پہلے جیسی دو' تین تھپکیاں اور لگائیں۔

"جانور بھی میں گرا لوں گا' تکبیر بھی پڑھ لوں گا بس تم کھال اور بوٹیوں میں مدد کر دینا۔ اپنی قربانی تو کل ہی کریں گے ہم۔"

خالو کی لمبی چوڑی ولاسے بھری تقریر اور دل ڈبا دینے والے انکشافات اوپر سے ہڈیاں توڑتی تھپکی۔ وہ رسہ نکالنے چلے گئے اور وہ پتھر کی طرح منجمد ہو گیا۔ حیا نے اندر آکر اس کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"کیا ہوا۔ ؟ تم تو ایسے ہو گئے جیسے ابا بیل کو نہیں تمہیں گرانے لگے ہوں۔" اس نے اگلے دانت جمائے اور نتھنے پھلا کر اسے گھورا۔

"اوہو۔ اب اپنے بیل کی نقلیں مت اتارو۔" وہ ہنستے ہوئے اس کے قریب ہوئی۔

"کیا ہو گیا ایاز! ابا تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ بیٹا سمجھ کر ہی تم سے مدد چاہی ہے۔ ایک راج دلارے بیٹے کو اتنا فرماں بردار تو ہونا ہی چاہیے نا۔"

"ہونہہ۔ راج دلارا۔" اس نے گردن جھٹکی۔

"اچھا بابا۔" وہ معافی کے انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"سال میں ایک دن ہی مدد مانگیں گے' کون سا روز روز۔"

"گگ۔ کیا۔ ہر سال۔" ایاز کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"اوہو۔" اس نے اتراتے ہوئے کہنی سے ٹھوکا دیا اور تہہ بند اور صدری اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"یہ لو۔" اس منفرد لباس کو دیکھتے ہی اس کی پتلیاں ابل کر باہر گرنے کو ہو گئیں حیا دہری ہو کر ہنس پڑی۔

"کیا دیکھ رہے ہو بھئی۔ بلا جھجک پہن لو' یہ کبھی بھی شلوار کی طرح الٹی سیدھی ہونے کا دھوکا نہیں دیتی۔"

اس کے ہنسی بھرے دورے سے زیادہ بھنویں نچا کر یاد دہانی کروانے پر اس کا سینہ اندر تک سلگ گیا۔ اس کا جی چاہا قریب رکھی لکڑی کی مونڈھی اٹھا کر اس کے سر پہ دے مارے۔ وہ ہنستے ہوئے مٹکتی' لچکتی دروازے کی طرف بڑھی' پھر ادا سے گردن موڑی اور پراندہ بھی پشت پر پھینکا۔

"سنیے۔"

اس نے جواباً" بھنویں اچکا کر غصے سے دیکھا۔

"صرف اس سال۔ میری خاطر۔ شام کو ابا سے میں خود بات کرلوں گی' بلکہ ہرجانے کے طور پر ایڈوانس سمیت سارا معاوضہ بھی آپ کا۔ اب خوش۔"

وہ گردن مٹکا' لچک دے' سر زا سنا۔ جا چکی تھی اور وہ تہہ بند صدری پکڑے بے بسی اور خوشی کا امتزاج بنا کھڑا تھا۔

☼

غزالہ کنول

رضیہ عرف رجو نے جوں ہی تاج بی بی عرف تاجو کو دیکھا تو ڈر کے جھٹ بکرے کی رسی چھوڑ دی۔ بکرا موقع ملتے ہی یوں سرپٹ دوڑا جیسے میراتھن ریس میں فرسٹ آنے کا ارادہ ہو۔

"ارے او بلو پکڑ اسے بھاگ بھاگ... وہ گیا بکرا..." رجو چیخی۔

ادھر سے بلو بھاگا تو ادھر سے مانی بھاگا کہ آخر بکرا رجو کا جو تھا۔ اور مانی صاحب یہ موقع ضائع کر کے عاشقوں کے منہ پہ کالک تھوڑا ہی مل سکتے تھے۔

مانی نے ماں کی گھوریوں کی پروا بھی نہ کی اور اتنا تیز دوڑا کہ بکرے کو بھی مات دے دی اور اس سے بھی دو قدم آگے نکل گیا۔ پھر مڑ کر پیچھے دیکھا اور پلٹ کر کچھ اس طرح بکرے پہ جھپٹا جیسے چیل اپنے شکار پہ جھپٹتی ہے۔

بکرے کو واپس آتے دیکھ کر رجو کی جان میں جان آئی، جو اپنے بکرے کو شوقیہ دروازے تک لے آئی تھی اور پھر سارے محلے نے مفت میں یہ ڈراما دیکھا تھا۔ پورے محلے میں مانی کی واہ واہ ہوئی اور رجو نے شرماتے تشکرانہ انداز میں مانی کو دیکھا۔ مانی نے مسکرا کر جو سر ہلایا تو نظر سیدھی اماں پر پڑی، جس کے خطرناک تیور دیکھ کر مانی گھبرا گیا۔ یہ سارا منظر دیکھ کر اماں کے منہ کا زاویہ کچھ اس قدر بگڑ چکا تھا کہ لگتا تھا کہ اماں نے کڑوی گولی کو نہیں ڈھریک کا پانی سب کچھ اکٹھا ہی نگل لیا ہے اور اب منہ میں کڑواہٹ اس قدر گھل گئی ہے کہ اماں کی آنکھیں باہر کو آرہی ہیں۔

تاجو بی بی نے مانی کا کان مروڑا اور اسے لے کر اندر آگئی۔

"وے چل تو ذرا اندر، ادھر تو آ... بڑے دانت نکال رہا ہے۔"

رضیہ عرف رجو، فضل دین اور بانو بی بی کی بیٹی تھی اور رجو کا ایک ہی بھائی تھا، بلال عرف بلو... فضل دین ٹھیکیدار تھا۔ جب تک زندہ تھا تو بہت اچھی گزر بسر ہو جاتی تھی۔ یہ تین کمروں کا گھر بھی فضل دین نے بنایا تھا اور مین روڈ پہ دو دکانیں بھی لی تھیں۔ جن کا اچھا کرایہ آجاتا تھا۔ فضل دین کی اچانک موت نے بانو بی بی کو پریشان کر دیا کہ اس مہنگائی میں دکانوں کے معمولی کرائے میں گزارا مشکل تھا۔ مگر رجو نے آگے بڑھ کے ماں کا ساتھ دیا اور پورے گھر کا نظام سنبھال لیا۔ رجو پرائیویٹ بی اے کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ چھوٹے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھانے لگی اور سلائی بھی کرنے لگی جس سے اچھی گزر بسر ہونے لگی۔

عمران عرف مانی، احسان ملک اور تاج بی بی کا اکلوتا بیٹا اور دو بہنوں کا بھائی تھا۔ بہنیں دونوں شادی شدہ تھیں۔ احسان ملک کی جوتوں کی تین بڑی چلتی ہوئی دکانیں تھیں اور وہ رجو کے سامنے والے گھر میں رہائش پذیر تھے۔

مانی گندمی رنگت والی سادہ سی رجو کو پسند کرنے لگا۔ رجو بھی مانی کی پسندیدگی بھانپ گئی اور مانی کو پسند کرنے لگی۔ مانی نے رجو سے شادی کی بات تین سال پہلے اپنی ماں سے کی تو تاجو نے نہ صرف صاف انکار کر دیا بلکہ رجو اور اس کی ماں سے بیر بھی باندھ لیا۔ وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی ماں بیٹی کو ذلیل کرنے کا۔ یوں

بھی یہ لوئر مڈل کلاس کا محلہ تھا۔ زیادہ تر لوگ محنت مزدوری کر کے اپنا بھرم قائم رکھے ہوئے تھے۔ تاجو کو ملک صاحب کی دولت پہ ناز بھی بہت تھا اور وہ کسی کو اپنے ہم پلہ بھی نہ سمجھتی تھی اور محلے بھر میں یہ مشہور کرتی پھرتی تھی کہ ان ماں بیٹی کی نظر ہماری دولت پہ ہے۔ "ہائے میرے بیٹے کو لوٹ کر کھا گئیں۔"

اب تاجو بی بی کے تیور ایک دفعہ پھر خراب تھے۔

"یہ بتا مانی پتر' یہ بکرا آیا کہاں سے۔" تاجو نے پوچھا۔

"لے اماں تو بھی کمال کرتی ہے۔ نا بکرا بانو چاچی کا ہے' تو مجھے کیا پتا۔ کہ کہاں سے آیا۔ ان سے پوچھ جا کر۔"

"دے سچ بتا دے' قسم سے آج تیری ٹانگیں تڑوا دوں گی۔ تیرے باپ سے۔"

"اماں مسئلہ کیا ہے تیرا۔ نا میرا اس بکرے سے کیا لینا دینا۔"

"لینا دینا تیرا بکرے سے تو نہیں اُس رجو سے تو ہے نا۔"

"کیا مطلب اماں۔"

"ارے اتنی کاکی نہیں میں۔ سب جانتی ہوں۔"

"اماں تو جانتی ہی تو کچھ نہیں۔"

"بس صاف بتا' رجو نے بکرے کے لیے کتنے پیسے اینٹھے؟"

"اماں۔" مانی ہکا بکا رہ گیا۔

"بس کر دے اماں۔ اب بس۔"

"نہیں بس تو اب بانو بی بی اور وہ رجو کریں' میں آج جا کے یہ روز روز کا تماشا ہی ختم کر دیتی ہوں۔" تاجو خطرناک تیور لیے باہر کی طرف بڑھی۔

مانی ماں کے پیچھے بھاگا۔ "اماں نہیں کرے گی اب تو کچھ بھی برا، سمجھی۔"

تاجو رجو کی دہلیز پار کرکے ڈیوڑھی تک پہنچی 'مانی بھی پیچھے تھا کہ اندر سے آتی آوازوں اور تاجو کے نام کی تکرار نے تاجو کے قدم روک دیے۔

"اماں! آپ یہ بتائیں، بکرا لے کر میں کیا کوئی ناجائز کام کر بیٹھی ہوں جو آپ یوں مجھے کوس رہی ہیں۔"

"ارے رجو ہم غریب لوگ، ہمارا کیا کام بکرے اور قربانی سے' نہ تو نے تاجو کے تیور دیکھے تھے' وہ ہمیں ذلیل کرنے کا کوئی موقع کیا اپنے ہاتھ سے جانے دیتی ہے۔ بکرا لے کر ایک اور الزام لے لیا تو نے اپنے اوپر۔"

"اماں' پیاری اماں! ہمیں اس سے کیا کوئی ہمیں کچھ بھی کہتا رہے۔ دیکھیں اماں۔۔۔ رب سوہنا تو جانتا ہے نا کہ اس رجو نے کتنی محنت کرکے ٹیوشن پڑھا پڑھا کے' سلائی کر کرکے اپنی بہت سی ضرورتیں روک کر پیسے جمع کیے ہیں اس بکرے کے لیے۔ اس قربانی کے لیے۔ اللہ تو میری نیت جانتا ہے نا اور یہ بھی کہ ہم مانی کی ایک پائی بھی خود پہ حرام سمجھتے ہیں۔ پھر بھلے کوئی کچھ بھی کہتا رہے مجھے پروا نہیں۔

اماں! بلو کتنا خوش ہے اس بکرے کے لیے۔ اس کی آنکھوں کی انوکھی چمک اور اس کے چہرے کی سچی خوشی نہیں دیکھی کیا آپ نے۔ اماں! بلو کیا سوچتا کہ ابا نہیں رہے تو ہم قربانی نہیں کرسکتے۔ نہیں اماں' ایسا احساس کمتری میں اپنے بھائی میں پنپتے نہیں دیکھ سکتی۔ رہی بات تاجو ماسی کی تو وہ اپنی جگہ ٹھیک ہیں' اماں ان کا ایک ہی بیٹا ہے' فکر ہے انہیں اس کی۔

اماں! آپ فکر نہ کرو اللہ سب ٹھیک کرے گا۔"

تاجو نے مانی کی طرف دیکھا اور مانی نے تاجو کی طرف اور آج پہلی بار ہوا تھا کہ تاجو اپنے بیٹے سے نظر نہ ملا سکی اور ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔

پھر اچانک کچھ سوچ کر تاجو نے اپنا جھکا سر اٹھایا اور طمانیت سے مسکرادی اور بولی۔

"مانی بیٹا! میں آج تک کتنا غلط سوچتی تھی' مجھے معاف کردے۔"

"اماں ایسے مت بول۔"

بیٹا! آج میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ مجھے بانو کے گھر آنا تو ہے' مگر بہت سی مٹھائی لے کر۔"

"اماں۔۔۔ اماں۔۔۔ تو کتنی اچھی ہے۔"

تاجو نے دیکھا' آج مانی کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ تاجو نے سوچا نہ جانے کیوں ہم اپنے بچوں سے پیار کا راگ تو الاپتے ہیں' مگر کبھی کبھی ان کی حقیقی خوشیاں تک چھین لیتے ہیں۔ کاش ہم اپنے بچوں کو اپنی ملکیت سمجھنے کے بجائے ان کو بھی خوشی سے جینے کا حق دیں' کاش۔۔۔

اب تاجو کو مانی کی خوشی کے لیے رجو کو اپنانا تھا اور ہاں تاجو کو بھی تو ایسی ہی بہو چاہیے تھی جو اتنی اچھی سوچ کی مالک اور خاندان کو جوڑنے والی ہو۔

مانی نے ماں کے ہاتھ پکڑے اور آنکھوں سے لگا لیے۔ اب عید تو صحیح معنوں میں رجو اور مانی کی تھی۔

"میری بیوی میرے ہزار کہنے پر بھی ابتسام اور قاسم کو ساتھ لانے پر تیار نہیں ہوئی اس کا خیال تھا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے لیکن آئے گا اسے امید تھی، امید ہے اور ہمیشہ رہے گی۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں عجیب انداز میں جگمگانے لگتی تھیں۔ مجھے اس کی امید سے جگمگاتی آنکھیں ایک طرح شرمندہ کردیتی تھیں کیونکہ جب بھی میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا امید کو اتنا روشن بھی نہیں پایا۔

"تم اپنے بیگ میں کیا کیا رکھ رہی ہو؟"

میں اسے بیگ میں ایک ہفتے پہلے سے کچھ نہ کچھ رکھتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تیاری عروج پر تھی لیکن وہ اپنے اس جوش اور جذبے کو ہر ایک سے چھپا رہی تھی یہاں تک کے اپنے آپ سے بھی۔ ایک نوٹ بک اس کے بیگ کے ساتھ رکھی تھی۔ اس دن مقررہ تاریخ میں ابھی دو دن باقی تھے۔ میں نے کام پر جانے سے پہلے اس کی نوٹ بک کو اٹھایا۔ خدیجہ باورچی خانے میں میرے لیے کافی بنارہی تھی۔ میں نے اس کی یاددہانی کے نکات پر نظر ڈالی۔ جو کچھ یوں تھی۔

چاکلیٹ دودھ کا ڈبہ، خوشبو کی شیشی، تصاویر، ایک بالوں کا برش۔

"ہونہہ۔ تیاری تو دیکھو جیسے وہ وہاں اسے ملنے دیں گے۔ مجھے تو ذرا بھی امید نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ وہاں ہے بھی یا نہیں۔ اللہ کرے، جو بھی ہو وہ ایسا ہو کے اس کے اعصاب اسے سہار سکیں۔"

ام ایمان

"لیجیے جناب! آپ کی گرما گرم کافی حاضر ہے۔" خدیجہ کا جوش و جذبہ اور خوشی چھپائے نہ چھپتی تھی۔

میں نے کن اکھیوں سے اس کو دیکھا اور کافی کا پیالہ تھام کر کمرے کے واحد دریچے کی طرف رخ کیا۔ اس دریچے کے سامنے کوئی منظر دور تک کھلا نہ تھا۔ ننھا سا صحن اور پھر اس کی دیوار۔ ہمارا ایک کمرے کا یہ منا سا گھر جس میں ہم کئی مہینوں سے رہ رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے مقدس شہر القدس کا محلہ "المغربیہ" جہاں ہمارا خاندانی گھر تھا۔ جس کا سامنے کا باغ تو بڑا تھا ہی لیکن پائیں باغ بھی ہمارے اس موجودہ گھر کا چار گنا تو ہوگا۔

مجھے دریچے کے سامنے بیرونی دیوار پر اپنے گھر کے مناظر نظر آنے لگے۔ زیتون کے درختوں اور سیب کی خوشبو سے مہکتا ہوا ہمارا گھر۔ دادا عماد الدین کی سفید براق داڑھی جو مسلسل ہلتی رہتی، جب وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر ہمارے کھیل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ چچا بشام جن کی پیشانی اور کھڑی ناک ان کے مراکش نسل سے ہونے کی گواہی دیتی تھی۔ دادا تو ہم کو بار بار یہ ہی جتاتے تھے۔ ورنہ ہمیں چچا بشام کی وسیع پیشانی اور کھڑی ناک سے زیادہ ان کی ٹوپ کی جیبوں اور ان کے نئے نئے طرح کے کھیلوں کی ایجاد سے دلچسپی تھی۔

دادا، بابا، بشام چاچا اور مجھے شام کو قہوہ کی چسکیوں میں اکثر اس بات کی چھوٹی چھوٹی تفصیل سنایا کرتے تھے، جب ان کا خاندان مراکش سے سلطان صلاح الدین ایوبی کے جھنڈے تلے مسلمانوں کو صلیبیوں کے ظلم سے نجات دلانے کے لیے آکر شامل ہوا۔

یہ جولائی 1187ء کی بات ہے جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں سے "حطین" کی فیصلہ کن جنگ لڑی اور انہیں شکست فاش سے دوچار کیا۔ اور اکتوبر 1187ء میں فاتحانہ اسلامی افواج اپنے امیر کے ساتھ فلسطین میں داخل ہوئیں۔

"دادا جان! تو کیا اس سے پہلے فلسطین میں مسلمان نہیں تھے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیوں نہیں تھے میرے بیٹے! مسلمانوں نے تو حضرت عمرؓ کے دور میں پندرہ ہجری 638ء میں ہی فلسطین فتح کر لیا تھا۔ اور امیر المومنین نے خود یروشلم آکر وہاں کے صلیبی بطریق سے شہر کی چابیاں لی تھیں جو اس نے ایک معاہدے کے بعد خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے کی تھیں اور خاص بات یہ کہ اس وقت مسلمانوں نے بغیر کوئی خون بہائے یہ کامیابی حاصل کی تھی۔"

"حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وہاں کے لوگوں نے یوں ہی اپنے شہر کی چابیاں دے دی تھیں؟" میں حیرانی سے پوچھتا۔

"ہاں میری جان! عیسائی بطریق نے ہتھیار ڈالنے کی یہ ہی شرط رکھی تھی کہ امیر المومنین خود آکر اس کے ہاتھ سے شہر کی چابیاں لیں۔ اس وقت مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان وہ مشہور معاہدہ ہوا جسے تاریخ میں "عہد العمریہ" کہا جاتا ہے۔"

"یہ کس بات کا عہد تھا؟" اس سوال کو پوچھنے والے چچا بشام تھے۔

دادا ہلکی سی مسکراہٹ سے ان کو دیکھتے اور سوال کی تہہ میں بیٹھا ہوا مقصد پا جاتے۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کا جواب دیتے۔

"اس معاہدے کی رو سے مقامی آبادی کو پہلی بار مذہبی آزادی حاصل ہوئی اور ان کے کلیساؤں کو بھی تحفظ دیا گیا —— اسی دور میں مقام معراج پر گنبد صخریٰ جیسی خوب صورت عمارت تعمیر کی گئی۔ مقامی آبادی (جو کنعانیوں اور فلسطینیوں پر مشتمل تھی) عرب سے آنے والوں کے ساتھ ان کے انصاف اور رواداری کی باعث خوب گھل مل گئی۔ خوش حالی کا دور شروع ہوا۔ اب مقامی اور غیر مقامی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ عربی زبان سب کی زبان بن گئی۔"

"پھر صلاح الدین ایوبی کو یہاں آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" بابا بھی چچا بشام کے انداز میں سوال پوچھتے۔ اور دادا اسی طرح میری طرف رخ کر کے جواب دیتے جیسے سوال کرنے والا میں ہوں۔

"بیٹا! مسلمانوں کی حکومت جاری تھی لیکن 1099ء میں صلیبیوں نے القدس پر حملہ کیا اور اس پر قابض ہو گئے۔ خوب لوٹ مار مچائی یہاں تک کہ انسانی خون میں گھوڑوں کی ٹانگیں ڈوبنے لگیں۔"

"یا اللہ! خون بہایا؟" میرے دل کو گھبراہٹ سی ہوئی۔

"ہاں اٹھاسی سال تک صلیبی یہاں مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے میں لگے رہے آخر ایوبی تلوار میدان میں آئی۔ جس نے مسلمانوں کو ان کے ظلم سے نجات دلائی۔ حطین کی فیصلہ کن جنگ میں مسلمانوں نے صلیبیوں کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔

سلطان صلاح الدین نے "محلہ المغربیہ" کا یہ قطعہ زمین ان مراکش مجاہدوں کے لیے وقف کردیا جنہوں نے صلیبیوں کے مقابلے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔"

"تو ہم ان مراکش مجاہدوں کے وارث ہیں؟" چچا ہشام کی پرجوش آواز آئی۔

"ہاں میرے بچو، ہم ان کے وارث ہیں اور یہ محلہ المغربیہ مسلمانوں کی وقف جائیدادیں ہیں۔ یہودی چالبازی کے ساتھ ان پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ دیکھتے ہو نہ کہ ابوغنیم کی پہاڑی یہودی کالونی بن گئی ہے۔"

"ہاں بابا! یہودیوں کی نیت ٹھیک نظر نہیں آتی۔ مجھے ان کے ہاتھوں سے خون ٹپکتا محسوس ہوتا ہے۔"

"ہاں لیکن یہ جگہ ہم خالی نہیں کریں گے۔ ہرگز خالی نہیں کریں گے بدذات یہودیوں کے لیے۔" دادا کی آواز مستحکم اور پرعزم تھی۔

☆ ☆ ☆

بابا نے دادا کے قول کو نبھایا۔ اگرچہ یہاں رہنا انتہائی خطرناک ہو گیا تھا۔ ہر لحہ حملے اور بلوہ کا ڈر۔ خبر آتی کہ فلاں فلاں محلے میں یہودیوں نے دھاوا بولا اور شقاوت اور درندگی کی ساری حدیں پھلانگ ڈالیں۔ سب سے پہلے بلدۃ الشیخ پھر حبرون' ابو قصر' دیریاسین' خان یونس' قلقیلیہ' آئے دن ایک ہولناک خبر آتی۔

آخر ان ہی حالات میں میری شادی ہوئی۔ خدیجہ میری زندگی میں آئی۔ دادا اور بابا کے قول کے معاملے میں ڈگمگاتا تو آگے بڑھ کر مجھے سہارا دیتی۔

"نہیں یحییٰ حسینی ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ ان شقی یہودیوں کے لیے اپنے محلے کو چھوڑ کر ہم کبھی نہیں جائیں گے۔"

حالات خراب تھے المغربیہ کے اکثر مسلمان ہمت کے ساتھ ڈٹے تھے۔ یہودی ابھی اس محلے کو خالی کرانے میں دلچسپی لیتے نظر نہیں آتے تھے۔ وہ ابھی اپنی سرحدوں میں اضافے کے لیے کوشاں تھے۔ شاید ان کے ذہن میں تھا کہ اس پر تو ہم جب چاہیں قابض ہو جائیں گے۔

وہ ایک سخت گرم دن تھا۔ میں کام سے گھر سے نکلا تو دوبارہ اس گھر میں جانا نصیب نہیں ہوا۔ الجواہریہ کے پاس انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ بغیر کسی بات کے انہوں نے مکوں اور گھونسوں کی بوچھاڑ شروع کی ابتداء میں میں نے مدافعت کی لیکن میں تنہا اور وہ پورا جتھہ۔ بے ہوش ہو کر گرا تو ہوش میں آنے کے بعد اپنے آپ کو جیل کی تنگ کوٹھری میں پایا۔

دس سال کی اس قید کے دوران مجھے اپنے بچوں کی شکلیں بھی بھول گئیں تھیں۔ خدیجہ ایک دفعہ ابتداء میں مجھ سے ملنے آئی تو میں نے آئندہ آنے سے سختی سے منع کردیا اور بچوں کو لے کر فوراً فلسطینی کیمپ کا رخ کرنے کو کہا۔

دادا اور بابا تو پہلے ہی اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکے تھے بعد میں چچا ہشام کے بارے میں خدیجہ نے خط میں بتایا کہ اسرائیلی افواج انہیں بھی گرفتار کر کے لے جا چکی ہے۔

خدیجہ میری ہدایت پر بچوں کو لے کر کیمپ چلی گئی تھی۔ میں مطمئن تھا۔ کال کوٹھری میں بھی پرامید تھا۔ اسرائیلیوں کے غیرانسانی سلوک کا اندازہ کسی دوسری جیل کا قیدی نہیں لگا سکتا۔ بس ایک پتھریلی زمین تھی جس میں ہم کو پھینک دیا گیا تھا۔ انتہائی ناکافی خوراک

اور اذیت دینے کے نت نئے طریقے۔

ایک صبح میں کوٹھری میں بیٹھا سورج کی اس کرن کا انتظار کر رہا تھا جو ایک دیوار پر کبھی کبھی نظر آتی تھی۔ نہ جانے کیسے اور کس رخ سے وہ کوٹھری میں داخل ہوتی تھی میرے ہزار سراغ لگانے کے باوجود مجھے کبھی پتا نہ چل سکا۔ شاید یہ اس امید کا استعارہ تھی جو میرے دل میں جاگتی تھی۔ ہزار اندھیروں کے باوجود۔

چابیوں کو کھنکھناتا ہوا فوجی کوٹھری کا دروازہ کھول رہا تھا۔ میں نے چونک کر اس کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سفاکی میں کسی چیز کی ملاوٹ تھی۔ یہ وہ آنکھیں نہیں تھیں جو مجھے اذیت خانے لے جاتے ہوئے نظر آتی تھیں۔ جوش اور خوشی کے ساتھ مل جلی سفاکیت سے لبریز۔ آج کچھ کچھ بجھی ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے؟ کہاں جانا ہے؟" اس کے باہر نکلنے کے اشارے پر میں نے پوچھا۔

"چپ چاپ باہر آجاؤ۔" وہ غرایا۔ طویل راہ داریاں طے کرتے ہوئے وہ مجھے کسی انجانی جگہ لے جا رہا تھا۔ شاید آخری نیند سلانے 'موت کی وادیوں میں اتارنے کے لیے۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میری زبان پر کلمہ اشھدان لا الہ جاری ہو گیا۔ میں نے دل ہی دل میں خدیجہ اور بچوں کو خدا حافظ بھی کہہ دیا۔

لیکن وہ مجھے جیل سے باہر لے آیا جہاں بہت سے دوسری فلسطینی قیدی بھی موجود تھے۔ پتا چلا کہ ہمیں ایک اسرائیلی فوجی کے بدلے میں رہا کیا جا رہا ہے۔ میں نے سجدہ شکر ادا کیا۔ میری ننھی امید کی کرن روشنی پھیلا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆
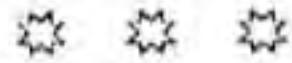
مجھے آزادی مل گئی۔ کیمپ میں خدیجہ اور بچوں سے ملاقات بھی ہو گئی۔ قاسم اور ابتسام میرے قد سے اونچے ہو چکے تھے۔ مراکش نقوش کے جوان رعنا' جو اب عنقریب القسام بریگیڈ میں شامل ہونے والے تھے۔ یہ خدیجہ نے مجھے فخریہ بتایا۔ اونچے قد اور چوڑے سینے والے بیٹوں کے سامنے تو اب میں بالکل مرنجاں مرنج قسم کا ایک عمر رسیدہ شخص لگتا تھا۔

"میرا ہشام۔ کہاں ہے؟ میرا ہشام یوسف۔" ایک دم میں نے چونک کر یاد کیا۔ شکلیں بھولی تھیں تعداد تو نہیں۔ میں نے پلٹ کر خدیجہ سے پوچھا۔ قاسم اور ابتسام کو جھنجھوڑا۔ سب خاموش تھے۔ دم سادھے۔

"کیا ہوا؟ کیوں خاموش ہو؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔ خدیجہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لائی بستر پر بٹھایا۔ قاسم کو اشارہ کیا' قاسم کوئی ٹھنڈا مشروب لے آیا۔ میرے ہاتھوں نے اس کی ٹھنڈک محسوس کی۔ شدت کی گرمی میں ٹھنڈا ہی نہیں' میں تو برسوں پانی کو بھی ترسا رہا تھا۔ لیکن اس مشروب کا گلاس میرے لبوں تک نہیں جا سکا۔ میں نے گلاس کو سختی سے تھاما۔

"یہ ٹھنڈا شربت میرے ہاتھ میں برسوں بعد آیا ہے۔ لیکن میں اسے نہیں پیوں گا۔ جب تک تم لوگ ہشام کے بارے میں مجھے آگاہ نہیں کرو گے۔" شاید وہ شہید ہو گیا ہے۔ میں نے لحہ بھر کو سوچا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو یہ یوں گم صم نہ ہوتے' مطمئن ہوتے۔

"کیا بات ہے؟ کچھ تو بتاؤ۔" میں نے اب کے ذرا دھیمے سے پوچھا۔

"یحییٰ حسینی" خدیجہ نے میرا نام رک رک کے لیا۔ ذرا صبر۔ ذرا صبر۔ ذرا ٹھہرو تو۔ دم تو لو۔ اچھا بس' یہ شربت پی لو پھر تمہیں ساری باتیں بتاتی ہوں۔

"ہرگز نہیں" میں پھر چلا اٹھا۔

"اچھا اچھا بتاتی ہوں' یحییٰ غصہ نہ کرو۔" خدیجہ کی آنکھیں نم ہو چلی تھیں۔

"ہشام ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"ہشام کہاں ہے؟ یہ ہی تو پوچھ رہا ہوں۔" میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے کو تھا۔

"المغربیہ کے محلے سے نکلتے ہوئے وہ وہیں تھا اسی گھر میں۔" میں نے حیرت سے خدیجہ کو دیکھا۔

"ہاں میں قاسم اور ابتسام کے ساتھ گھر واپس آرہی تھی گھر میں ہشام اور چچا تھے۔ اسرائیلی فوجیوں نے مجھے واپس گھر نہیں جانے دیا۔ انہوں نے محلے کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ لوگوں کو گھر سے نکال نکال کر مار رہے

تھے۔ ایک بھگدڑ تھی۔ افراتفری کے عالم میں، میں نے قاسم اور ابتسام کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ انہیں اپنے ساتھ رہنے کو کہا۔ ورنہ اس بھگدڑ میں یہ بھی گم ہو جاتے۔ بھلا بتاؤ حسینی میں اس گھر میں دوبارہ جاسکتی تھی۔ اسرائیلیوں کا محاصرہ اور خون کے پیاسے درندے۔

"پھر۔ پھر چچا بشام نے میرے بیٹے کی حفاظت کی۔؟"

"ہاں انہوں نے حفاظت کی حسینی جہاں تک وہ کرسکتے تھے۔"

"پھر۔ پھر کیا ہوا؟"

"بس اس سے آگے مجھے کچھ خبر نہیں۔ میرا لال، میرا شہزادہ ہشام یوسف کہاں ہے؟ ہے بھی یا نہیں؟" چچا بشام کے ساتھ یہودیوں نے ہشام کو بھی پکڑ لیا تھا۔ معصوم۔ پالنے کا قیدی۔ اس وقت چھ ماہ کا ہی تو تھا۔ آنسوؤں کا نہ ختم ہونے والی برسات تھی۔ جو ہم سب کی آنکھوں سے جاری تھی۔ کتنے ماہ گزر گئے۔ لیکن یہ سب ابھی کل کی ہی بات لگتی تھی۔ زخم ایسا تھا کہ بھرتا ہی نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

کل خدیجہ ایک انوکھی خبر لائی۔

یہودیوں کی عید کا دن انہوں نے القدس کے قدیم شہر کے باسیوں کو وہاں کی زیارت اور داخلہ کی اجازت دی ہے۔ لیکن ثبوت لازم ہے اس بات کا کہ وہ قدیم شہر کے باسی ہیں۔

خدیجہ کے پاس قاسم اور ابتسام کا پیدائشی کاغذ تھا۔ کیونکہ اس دن وہ انہیں اسکول میں داخلے کے لیے، لے کر نکلی تھی۔ خدیجہ کو یقین تھا کہ یہ ثبوت کافی ہوگا۔

اسرائیلیوں نے ہم دونوں کو کاغذ دیکھ کر داخلے کی اجازت دے دی۔ راستے بڑے انجان، نئے محلے بن گئے تھے۔ وہ جدید ترین سڑکوں اور ٹریفک کے اشاروں کے ساتھ ایک نیا انجان شہر تھا۔ جس سے ہم واقف نہیں تھے۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور جو شکل سے کچھ کچھ فلسطینی عرب لگ رہا تھا۔ ہم نے اسے روکا اور محلہ الغربیہ جانے کے لیے کہا۔ وہ فلسطینی ہی نکلا جو کسی اسرائیلی کی ٹیکسی کرایہ پر چلاتا تھا۔ اس کا نام عبداللہ باسم تھا۔ المغربیہ کی بیرونی سڑک پر اتار کر وہ خوش دلی سے بولا "واپسی کے لیے مجھے اس نمبر پر کال کرلینا۔" میں نے سرہلایا۔

محلہ ابھی اتنا تبدیل نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ کافی جدید گھر بن چکے تھے۔ ہماری گلی کا آخری گھر جو ہمارا تھا ابھی تک ویسا کا ویسا ہی تھا۔ موٹی دیواروں اور وسیع باغوں کے ساتھ لیکن صدر دروازہ بدل دیا گیا تھا۔ موٹی لکڑی کا تراشا ہوا ایک بڑا گلاب کا پھول صدر دروازے کے اوپر لگا تھا۔ خدیجہ نے جلد بازی سے اطلاعی گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔

"کون؟" ایک سیاہ حبشی چپٹی ناک والا دروازہ کھول کر باہر آیا۔

"کیا بات ہے؟ کون ہو؟"

"ہم کو تمہاری مالکہ سے ملنا ہے۔" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"کون ہو تم؟"

"اپنی مالکہ سے کہنا ہم حکومت سے اجازت لے کر آئے ہیں اور اس گھر کے اصل مالک ہیں۔" حبشی نے غور سے ہم دونوں کو دیکھا اور گھونگر بھرے سر کو کھجاتا ہوا چلا گیا۔

"انگلیاں اس کی سر کی جلد تک پہنچ پاتی ہوں گی؟" میں نے خدیجہ سے مسکرا کر کہا۔ خدیجہ بھی دھیرے سے مسکرائی اور یہ ہی میرا مقصد تھا۔ دباؤ سے آزادی۔

دروازہ کھٹ سے کھلا۔ وہی حبشی تھا۔ سیاہ ہونٹوں سے سفید دانت جھانک رہے تھے۔ شاید مسکرا رہا ہے۔ میں نے سوچا ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔

دروازے کے سامنے والی دیوار خالی تھی۔ القدس کی سنہری جالیوں اور گنبد والی پینٹنگ وہاں سے ہٹالی گئی تھی۔

راہ داری سے گزرتے ہوئے دریچے سے باغ کا منظر سامنے تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا۔ زیتون سیب اور آڑو کے درخت البتہ اب بوڑھے بوڑھے سے لگ رہے تھے۔ درمیان کا کنول نما فوارہ موجود تھا لیکن اس کی کئی پتیاں موجود نہیں تھیں۔

دریچے کے سامنے گزرتے ہوئے ہم دونوں ہی کے قدم جم سے گئے۔ نظروں کے سامنے عماد دادا ابشام چاچا اور بابا کی شکلیں گزر رہی تھی۔ ہاں وہ آرام کرسی کہاں ہے؟

ہم عموماً" اسے راہ داری میں ہی رکھتے تھے یا جہاں دادا کہتے تھے اسے پہنچا دیا جاتا۔ نئے مالکوں نے زیادہ تبدیلیاں نہیں کی ہیں۔

"آیئے جناب۔ ڈرائنگ روم ادھر ہے۔" حبشی کی آواز سے ہم دونوں پھر اپنے خیالوں سے واپس آگئے۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہم نے غور سے ہر شے کو دیکھا۔ حبشی اب جا چکا تھا۔

فرنیچر کچھ تبدیل کیا گیا تھا لیکن ترتیب تقریباً" ویسی ہی تھی آتش دان کے سامنے چھوٹا ایرانی قالین بچھا تھا۔ پرانا تو وہ پہلے ہی بہت تھا لیکن اب تو اس کے دھاگے نکل رہے تھے۔ خدیجہ عین اس ایرانی قالین کے پاس آکر زمین پر بیٹھ گئی۔

"ارے کیا کر رہی ہو' نیچے نہیں اوپر بیٹھو۔" میں یہ بات کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ میرے کہنے سے پہلے پیچھے سے آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا۔ ادھیڑ عمر انگریز جو ظاہر ہے یہودی ہو گا۔ لیکن خدوخال کچھ فرق تھے۔ چہرے پر وہ درشتگی نہیں تھی۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے بڑھ کر تھام لیا۔ اس نے اپنا نام بتایا۔

"تھامس ایڈورڈ۔ آئرلینڈ سے آیا ہوں۔"

"یحییٰ حسینی۔ اس گھر کا قدیم مالک۔"

"ہوں۔" اس نے دلچسپی سے سنا اور سامنے بڑے دیوان پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

خدیجہ ابھی بھی وہیں بیٹھی تھی۔ بوسیدہ قالین کے نکلے ہوئے دھاگوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"یحییٰ! ابشام کو آخری دفعہ میں نے یہاں لٹایا تھا۔ اس قالین پر۔ اب وہ مجھے کہاں ملے گا؟"

"یہ کیا بات کر رہی ہے؟" تھامسن نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہمارا بچہ' جسے تم لوگوں نے چھین لیا۔ خدا کے لیے بس یہ بتا دو کہ وہ کہاں ہے؟ زندہ ہے یا مار دیا؟" مجھ سے پہلے وہ بول اٹھی۔ خدیجہ کی دل گیر آواز نے ماحول کو بے حد سوگوار کر دیا تھا۔ اگرچہ حبشی گرم قہوہ کی سینی' مٹھائی اور زیتون رکھ کر گیا تھا۔ یہ یہودی مہمان نواز ہے۔ شاید اس نے میرے بیٹے کو اچھی طرح رکھا ہو میں نے سوچا۔ تھامسن ابھی تک سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھیے جناب! میری بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ باہر تھی جب اسرائیلی فوج نے اس گھر کا محاصرہ کیا' یہاں ہمارا چھوٹا بچہ اور میرا چچا موجود تھا۔ ہمیں پھر یہاں آنے نہیں دیا گیا۔ چچا کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا جب کہ مجھے تو اس سے بہت پہلے جیل میں پھینکا ہوا تھا۔ اب ہم آپ سے ہرگز اس گھر اور یہاں کی کسی چیز کے بارے میں سوال کرنے نہیں آئے' ہم اپنے بیٹے کے بارے میں معلوم کرنے آئے ہیں' خدا کے لیے ہماری امیدوں کو خاک میں نہ ملایئے گا۔"

"اچھا' تم مائیکل کے ماں باپ ہو؟" یہ آواز ایک عورت کی تھی جو ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی تھی اور اندر کے معاملے کا جائزہ لے رہی تھی۔

"لیکن اب مائیکل ہمارا بیٹا ہے اور ایک یہودی ہے۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔ وہ ہرگز یہودی نہیں ہو سکتا۔" خدیجہ یک دم قالین سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سرخ انگارہ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں گر رہی تھیں۔

"ہونہہ' کوئی ماں باپ چھ ماہ کے بچے کو چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟"

"لیکن اس کا چچا اس کے ساتھ تھا۔"

"سب ڈھکوسلہ ہے۔ دراصل سارا قصور تمہارا

ہے۔" گوری عورت نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کر کہا۔

"مائیکل گھر پر ہے؟" تھامسن نے بیوی سے پوچھا۔

اس کے جواب سے پہلے ایک اونچا لمبا لیکن دبلا لڑکا دروازے پر کھڑا تھا۔ سرخ آدھی آستین کی شرٹ اور سیاہ برمودا پہنے ہاتھوں میں اسنیکرز تھے جن کی ڈوریاں زمین کو چھو رہی تھیں۔

"مام مجھے زیتون کے اچار والے سینڈوچ پسند ہیں۔ آپ ہمیشہ اس کے بغیر بنا دیتی ہیں۔"

"مائیکل ادھر آؤ۔ ان سے ملو۔"

"اوکے۔ مجھے جانے کی ذرا جلدی ہے۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

"نہیں ٹھہرو، یہ ذرا اہم بات ہے۔" خدیجہ اور میری سانسیں الجھ رہی تھیں۔ ہشام کے نین نقش اپنے بھائیوں سے مختلف تھے لیکن کھڑی مراکشی ناک، ہو بہو چچا ہشام کی طرح تھی۔

"مائیکل یہ تمہارا دعویٰ لے کر آئے ہیں؟"

"ہاں انہیں تمہارے ماں باپ ہونے کا دعویٰ ہے۔ ہم نے مائیکل سے کچھ نہیں چھپایا ہے۔" تھامسن کی بھی آواز آئی جس نے ایک لمحے کو میری طرف بھی دیکھا، جتا دینے کے انداز میں۔

مائیکل ساکت ہو گیا۔ چند لمحے بعد سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے پتا ہے کہ مام ڈیڈ میرے اصل ماں باپ نہیں ہیں۔ لیکن مجھے اپنے اصل ماں باپ کی بھی ذرا پروا نہیں ہے۔ کیونکہ انہوں نے بھی میری ذرا پروا نہیں کی۔ چھ ماہ کے بچے کو کوئی ماں چھوڑ کے جاتی ہے؟" اس نے خدیجہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ سرخ غم کی آگ سے دہکتی آنکھیں، مائیکل نے سر گھما لیا۔

"ہم خود چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ یہ اسرائیلی فوج تھی۔ جس نے ہم کو واپس نہیں آنے دیا۔"

"سب باتیں ہیں۔" وہی رٹا رٹایا جواب تھا۔

"ٹھیک ہے ہم ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو اپنے مام ڈیڈ کے ساتھ رہو۔ بس ایک بات کا تم سے وعدہ لینا ہے۔ اسرائیلی فوج میں شمولیت اختیار نہ کرنا۔ ورنہ وہاں تمہیں اپنے دونوں بھائیوں کے مقابل آنا پڑے گا۔" خدیجہ کی سرخ آنکھوں میں ایک سرد مہری سی در آئی تھی۔ یہ ہشام نہیں مائیکل ہے۔ اس نے یقین کر لیا تھا۔

"میں نہیں چاہتی کہ وہ تمہیں آگ کا ایندھن بنائیں۔ چلو بھئی ہماری تلاش ختم ہوئی۔" خدیجہ نے میرا ہاتھ پکڑا۔ میری بھی برداشت ختم تھی۔

"ہمیں واپس جانا چاہیے۔"

ہم دونوں تیزی سے صدر دروازے سے باہر نکل گئے۔ فاصلے قدموں میں لپٹ رہے تھے۔ میں نے عبداللہ باسم کو کال ملائی گلی کے اختتام پر ہم کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ خاموشی کا دبیز پردہ مزید دبیز ہوتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے آنسو چھپانا چاہتے تھے۔ ٹیکسی میں ہم دونوں کھڑکی سے باہر نظر جمائے ہوئے تھے کہ اچانک موبائل کی گھنٹی نے خاموشی کا دبیز پردہ چاک کر ڈالا۔ یہ عبداللہ باسم کا موبائل تھا۔ چند لمحے عبداللہ نے موبائل کانوں سے لگا کر مجھے دے دیا۔

"آپ کا فون ہے۔"

"میں ہوں آپ کا ہشام۔۔۔ بابا۔۔۔ مام ڈیڈ کے سامنے ڈرامہ کرنا لازم تھا۔ بھلا وہ اور اسرائیلی حکومت صحیح سالم آپ کے ساتھ جانے دیتی؟" میں ششدر سا رہ گیا، پھر میرے منہ سے بے یقینی کے عالم میں نکلا۔

"تمہارے پاس عبداللہ کا نمبر کیسے آیا؟"

"اس کو میں جانتا ہوں۔ اس کو یہ ٹیکسی مام ڈیڈ نے ہی کرایہ پر لے کر دی ہے۔ بس آپ جائیے اور اپنا اور مما کا خیال رکھیے۔ ان شاء اللہ میں بھی جلد آپ سے ملنے آؤں گا۔ اور پھر ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گا۔"

اب میں سوچ رہا تھا کہ یہ اتنی بڑی خوشی کی خبر خدیجہ کو کس انداز میں سناؤں کہ اس کے اعصاب سلامت رہیں۔

☆

سائرہ رضا

شادی کے تقریباً" دو سال بعد پیدا ہونے والے جڑواں بچوں نبیحہ اور ایبک نے جیسے خسارے کے سارے احساس کو مٹا ڈالا اور آج کی یہ تقریب بہت ساری خوشیوں کا باعث تھی۔

نوین اور اخطب کی شادی کی دوسری سالگرہ.... نبیحہ اور ایبک کا عقیقہ اور اخطب کی کچھ دن بعد ہونے والی سالگرہ کو بھی آج ہی منا کر مزے کو دوبالا کیا گیا تھا گویا۔

خوشی، قہقہے، طمانیت، شکر کے سارے رنگ یہاں سے وہاں تک بکھرے تھے۔ سرخ ساڑھی میں گلاب بنی گھومتی نوین پر اخطب کی محبت بھری نگاہوں کا مستقل پہرہ تھا۔

دونوں ننھے بچے اپنی کاٹ میں پرسکون نیند کے زیر اثر تھے۔ ذرا سا کسمساتے تو میز پر گردن گرا کے بیٹھی نوال چونک کر کاٹ کو ہلا دیتی اور پھر دوبارہ گردن گرا کے آنکھیں موند لیتی۔

نوال اور ڈھیل.... یہ دو متضاد باتیں تھیں اور وہ بھی آج کے دن جس کے لیے اس نے ڈھیروں منصوبے بنائے اور آخری لمحے تک نوک پلک سنوارتی رہی مگر اس کا کیا کیجیے کہ عین وقت پر یعنی آج صبح جب وہ الارم

مکمل ناول

بجنے پر اٹھ نہ پائی کہ سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اتنے دنوں کی تھکاوٹ نے اثر تو دکھانا تھا۔۔۔ مگر آج ہی کیوں۔۔۔ نوال نے کنپٹیاں دباتے ہوئے کڑھ کر سوچا۔

نانو کو پتا نہ چلے' اس لیے وہ دبے قدموں فریج تک گئی اور بخار کا زور توڑنے کے لیے' جو جو دوا ہاتھ لگی۔ اکٹھی پھانک لی۔ اب ان سے بخار نے تو کیا اترنا تھا۔ شدید ترین غنودگی اعصاب پر حاوی ہو گئی۔ جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ مگر نقاہت اور چکراتے سر کے باعث جب وہ ادھر ادھر ڈولتی پائی گئی تو سارے گھر کو خبر ہو گئی۔

ٹھنڈا ٹھار جسم' چڑھی ہوئی آنکھیں۔۔۔ اپنا سارا بوجھ نانو کے ناتواں کندھوں پر ڈال کر جب بھاری زبان کے ساتھ لڑکھڑاتے لہجے میں اس نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں خاتون۔" تب نانو کے حواس کوچ کر گئے۔

"ہائے کسی نے میری بچی کو کچھ الٹا سیدھا کھلا دیا' اپنی نانو کو نہیں پہچان رہی ہائے۔۔۔" اسے صوفے پر بمشکل ٹکا کر نانو نے اگلے منٹ میں سب کو جمع کر لیا تھا۔ کھلانے کے نام پر اخفش پتا نہیں کیوں نظریں چرا جاتا' ہاں' یہ سچ تھا کہ اس نے بی بی نوال کو کچھ نہیں کھلایا پلایا تھا (مگر اس کا دل چاہتا تھا وہ اسے کچھ کھلا۔۔۔ پلا یا کم از کم چٹا کر غائب ضرور کرنا چاہتا تھا۔ جتنا کہ وہ تنگ تھا)

"بی بی رات ایک بجے تک لان کا سجاوٹ بناتا تھا۔ امارے خیال سے اس پر کوئی جن عاشق ہو گیا ہے۔" بے زار لالا نے بے زار لہجے میں قطعیت سے کہا۔ نانو اور صوفیہ دادی کا رنگ فق ہو گیا۔

"کسی جن کی شامت نے دھکا دیا ہو گیا جو آپ کی نواسی پر عاشق ہو جائے۔ہاں اس نے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہو تو الگ بات ہے۔ کوئی زندگی سے بے زار جن ہی ایسا قدم اٹھا سکتا ہے۔" اخفش کا لہجہ بے زار خان سے بھی زیادہ اکتایا ہوا تھا۔

"بری بات اخفش۔۔۔! سیریس کنڈیشن ہے یہ۔ ڈاکٹر ہی بتائے گا کہ کیا ہوا ہے اسے۔" اخطب نے پیشانی پر ہاتھ رکھا جو ٹھنڈی برف تھی۔

"تو میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں ناں' اوئے بے خود! کہیں نسوار وغیرہ تو نہیں چاٹ لی تمہاری بی بی نے۔۔" اخفش نے بارعب آواز و انداز سے پریشان کھڑے بے خود کو پکارا۔

"کیا بے ہودگی ہے اخفش۔۔۔!" نوین کو برا لگا۔ باقی سب کو بھی ناگواری محسوس ہوئی۔

"بے ہودگی نہیں ہے یہ۔۔۔ اس دن یونی ورسٹی کے باہر جو فقیروں کی جھگیاں ہیں' وہاں ایک چرسی کے سر پر کھڑے ہو کر اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔ پوچھنے پر پتا چلا دیکھنا چاہتی ہیں آخر نشے والا سگریٹ بھرتے کیسے ہیں۔"

"کیا؟" سب کی متعجب آوازوں نے اخفش کو ہمت دلائی اب تو سارا قصہ سنانا ہی چاہیے۔

"میں نے سنا ہے' چرس پینے سے وزن کم ہو جاتا ہے؟" نوال نے سگریٹ بھرنا سیکھ لیا تھا لہٰذا اگلا بہت ضروری سوال چرسی سے پوچھا۔ چرسی نے لمبا کش بھر کے خلا میں گھورتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"ویری گڈ۔۔۔!" نوال نے سراہا۔ اس کے بعد دائیں بائیں دیکھا۔ اخفش سخت اچھنبے کے عالم میں نوال اور چرسی کی گفتگو سن رہا تھا۔ نوال کی متلاشی نگاہوں پر فوراً" اجنبی بن گیا۔ منہ ہی پھیر لیا۔ مگر آگے بھی نوال تھی۔ اسے پکار لیا۔

"اے اخفش! تم چرس کیوں نہیں شروع کر دیتے۔ کچھ دنوں میں سلم اینڈ اسمارٹ ہو جاؤ گے۔" اخفش تو یوں ہو گیا جیسے وہ اخفش نہیں کوئی اور ہی ایکس وائی زیڈ ہے۔ نوال کو تقریر کا موقع مل گیا۔ "دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں ہے اور اللہ نے بلا جواز کچھ بھی پیدا نہیں کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"بے وقوف۔۔۔ چرس نشہ ہے' لگ جائے تو چھٹتا نہیں۔۔۔" نوال کی کلاس فیلو نے لتاڑا۔

"تو موٹاپا بھی تو نشہ کی طرح مہلک ہے۔ آنکھ پر بھی

چربی چڑھتی ہے اور عقل تو باقاعدہ بند ہو جاتی ہے۔ سنائی بھی نہیں دیتا جتنا مرضی پکار لو۔ ورنہ کوئی اتنا فاصلہ بھی نہیں کہ میری آواز نہ پہنچی ہو۔" آخری جملہ چند قدم آگے ہو کر باقاعدہ اخفش کو سنانے کے لیے کہا گیا تھا۔

اخفش سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ دراصل اس نے نوال کے حوالے سے یونی ورسٹی میں قطعی اجنبیت کا رویہ اپنا رکھا تھا۔ نوال کچھ بھی کرے "اخفش جیسے جانتے نہیں پہچانتے نہیں" کی مصداق ایک اجنبی کی طرح گزر جاتا۔ نوال بھی اس رویے کو بھانپ گئی تھی۔

یونیورسٹی کی یہ خاموشی اور لاتعلقی اسے بری لگتی کہ گھر میں تو اخفش اینٹ کا جواب پتھر سے دینے پر یقین رکھتا تھا یا چپ رہنا گناہ تھا جیسے... اور ابھی اس وقت نوال کی اس حالت 'بند آنکھوں' ٹھنڈا جسم' لڑکھڑاتی بھاری آواز سے نشہ کر لینے کا نتیجہ اخذ کیا تھا تو کون سا غلط کیا تھا۔ نوین نوال کی ہتھیلی سہلاتے ہوئے مسلسل پکار رہی تھی۔

"نوال' نوال آنکھیں کھولو... ہوش کرو ارے اللہ!"

نوال کچھ کہہ رہی تھی۔ اخطب نے ہونٹوں پر خاموش رہنے کی تلقین والی انگلی رکھی۔ شاید بھید ملے نوال کو ہوا کیا ہے۔

"ہوش والوں کو خبر کیا' بے خودی کیا چیز ہے۔" نوال اٹک اٹک کر گنگنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ارے اللہ..." نانو کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"ضمیر نے میرے بھروسے پر جوان لڑکی کو چھوڑا تھا اور میں ہی بچی کی حفاظت نہ کر سکی۔" نانو کے بیان کی تائید سب نے سر ہلا کر کی۔

"جی نانو...؟" نوال نے ذرا سی آنکھ کھولی۔

"بھروسے کی چادر میں ایک بار... چھید ہو جائے تو... پھر کسی سوئی سے رفوگری نہیں ہو سکتی۔" آہ (ہچکی بھری)

"واہ...؟" اخفش نے سینے پر ہاتھ لپیٹ کر نوال کو جی بھر کے گھورتے ہوئے داد دی۔ اش اش تو باقی گھر والے بھی کر رہے تھے۔ اندر داخل ہوتے دادا جان نے تو اظہار بھی کر دیا۔

"بھئی' بہت خوب' سبحان اللہ... جو لڑکی بے ہوشی کے عالم میں اتنے اعلا و ارفع خیالات رکھتی ہے۔ وہ ہوش مندی میں کیا قیامت ڈھاتی ہو گی۔ ماشاء اللہ' ماشاء اللہ۔"

"بالکل۔" اخفش نے دانت کچکچائے۔ "ہوش میں ہوتی ہے تو سگریٹ بھرنا سیکھتی ہے۔"

"بس کرو اخفش! تم نے تو بچی کا پیچھا ہی لے لیا۔" صوفیہ نے اپنی شدید پریشانی کو کم کرنے کے لیے پوتے کو جھاڑا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی چوٹ وغیرہ لگ گئی ہو ہم تو ساتھ تھے ناں بے خود درختوں' دیواروں پر چڑھ کر لگا رہی تھی یہ غبارے اور بتیاں' نہیں گری ہو اور سر پر کاری ضرب لگنے سے حواس جاتے رہے۔"

نوین بھی قیاس کے گھوڑے دوڑا رہی تھی۔ سب کی نگاہیں بے خود خان پر ٹک گئیں جس نے منہ سے

جواب دینے کے بجائے زور زور سے نفی میں سرہلایا۔ سب کی فکر مندی مزید بڑھ گئی ڈاکٹر بھی آکر نہیں دے رہا تھا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا ہے رات کا وقت تھا۔ درختوں پھولوں کی خوشبو پر جن آتا ہے۔ تعویذ منگوانا پڑے گا تعویذ۔۔۔" بے زار لالہ ابھی تک مصر تھے۔

"ارے خوامخواہ۔۔۔ بے زار خان یہ میرا گھر ہے میرا۔۔ اور میرے جیسے بھوت کے ہوتے ہوئے کسی جن کی کیا ہمت ہے۔ جو ادھر کا رخ بھی کرے۔"

دادا جان نے سینہ تان کر اپنے بارے میں ایک نیا انکشاف کیا۔ تو سب چونکے اور کسی حد تک یقین بھی آنے لگا۔ سرخ و سفید رنگ پر کالا سیاہ ٹریک سوٹ جس پر کسی خون آشام بھیڑیے کی آنکھیں سجی تھیں اور آنکھوں کا سرمہ اف۔۔۔

سب کو جائزہ لیتے دیکھ کر دادا جان نے مزید سینہ پھلایا۔

"بھوت ناتھ ریٹرن۔۔۔ دادا جان بچ۔۔۔ ایسی بات پہ پارٹی بچ۔۔۔ تو بنتی ہے بچ بچ۔" نوال کو سب سنائی دے رہا تھا۔ یعنی دماغ ہوش میں تھا مگر یہ آنکھیں۔

"ارے بابا پارٹی تو رات کو ہے ہی۔۔۔ مگر اس حال میں کیسی پارٹی کہاں کی پارٹی۔" صوفیہ نے سر پکڑا۔

"مجھے لگتا ہے اس نے واقعی کچھ الٹا سیدھا کھالیا ہے۔" نانو کو اخفش کی باتوں پر ہمیشہ زیادہ اعتبار ہوتا تھا۔ اخفش حمایتی مل جانے پر مزید غصے سے کھڑا ہوا۔

"بخار کم کرنے کے لیے دو تین ٹیبلٹس کی ایکسٹرا ڈوز لی گئی ہے اور کھانسی کا کوئی سیرپ۔ بہت زیادہ مقدار میں پی لیا ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے فوراً بتادیا جیسے کہ سامنے ہی ہو۔

بعد میں نوین فریج کے اوپر سے آدھی پی ہوئی کھانسی کے سیرپ کی بوتل اٹھا لائی۔

☼ ☼ ☼
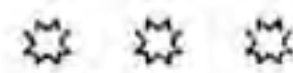
ڈاکٹر کی بروقت درست تشخیص نے بہت بہتری دکھائی۔ اتنی کہ نوال نے کپڑے بھی بدل لیے۔ اور گاؤ تکیے کے سہارے آنکھیں موند کر لیٹے لیٹے میک اپ کروالیا۔۔۔ بالوں کو وہ ویسے بھی بنانے کا تکلف کرتی نہیں تھی گھونگھریالا جنگل خودرو بیل کی طرح جس رخ چاہتا مڑجایا کرتا تھا' مون لائٹ کی چمکتی گولڈن ٹائٹس پر میرون گولڈن چنری والی کرتی پر چنا دوپٹا جھولی میں بھر کے وہ ساری شام میز پر سر گرائے اونگھتی رہی یا پھر کبھی کبھار مندی مندی آنکھوں سے رنگ و بو کے سیلاب کو دیکھ لیتی۔

نانو سارا وقت اس کی میز پر رہیں۔ نواسا' نواسی کی پہلی باقاعدہ تقریب کے باعث مووی اور فوٹوز کے لیے انہیں بار بار پکارا جاتا' مگر وہ نوال کی حالت کے پیش نظر انکار کردیتیں یا پھر بس گھڑی بھر کو اٹھتیں اور فوراً" ہی واپس پلٹ آتیں۔ بعض اوقات چند منٹ کی غیر حاضری کے لیے بھی کسی کو نگہبان بنا کر بٹھا جاتیں۔

ایسے ہی ایک پل میں اخفش ادھر آنکلا۔ بے خود خان متفکر سا نوال کے نزدیک کرسی رکھے باقاعدہ چوکیداری کررہا تھا۔ اخفش کو غصہ تھا' نوال نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا گویا۔۔۔ اور اب جبکہ ڈاکٹر صاحب "سب ٹھیک" کی رپورٹ دے گئے تھے تب بھی اونگھنے اور ڈولنے کا کیا مقصد۔

"تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔ اتنی جلدی مرنے والی نہیں ہے تمہاری نوال باجی۔۔۔ کم از کم آدھے شہر کو ساتھ لے کر ٹلے گی یہ مصیبت۔" بے خود کو اخفش کے جملوں سے زیادہ لہجے نے تکلیف دی۔

"دشمنی کے بھی اصول ہوتے ہیں اخفش بھائی جان! ہم خان لوگ کبھی کمزور دشمن پر حملہ نہیں کرتے۔"

"اوہ بابا حملہ نہیں کررہا۔ تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں۔"

"یہ حملہ ہی تو ہے ناں۔ ابھی نوال بی بی ہوش میں ہوتا تو آپ کو جواب دیتا مگر۔۔۔" بے خود بہت دکھی تھا۔

"میں سب سن رہی ہوں بے خود۔۔۔!" اس سے پہلے اخفش جواب دیتا گردن گرا کر بند آنکھوں کے

ساتھ پڑی نوال کے لب کھلے' دونوں بری طرح چونکے۔

"آدھے شہر کا تو پتا نہیں مگر تمہارے اس بھائی جان سے پہلے ٹلنے والی نہیں میں' ہم دشمنی قبر تک نبھانے والے لوگ ہیں بے خود خان اس لیے قبر تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں ہائے!"

"دیکھا۔ دیکھا میں نہ کہتا تھا یہ سب ڈراما ہو رہا ہے۔ سب کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش ہے اچھے خاصے ماحول کو افسردہ و پریشان کر کے خود اوندھی پڑی ہے۔ اعصاب جواب دے گئے۔ آنکھ کھل نہیں رہی' قدم اٹھانے کی سکت نہیں مگر بس ایک زبان ہے جس پر کچھ اثر نہیں کرتا۔"

"تو تم کیا چاہتے ہو میں گونگی ہو جاؤں؟" نوال خوب ہمت کر کے سیدھی ہوئی اور اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"ہنہ جیسے میرے کہنے سے تو ہو جاؤ گی؟" انفش کو کب یقین تھا اس کی تابع داری کا۔

"نہیں نہیں تم کہہ کر تو دیکھو۔" نوال کے لہجے سے اتنی تابع داری جھلکنے لگی جیسے وہ ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑی رہنے والی بات بھی مان لے گی۔

"او رہنے دو۔ کہہ کر تو دیکھو۔ جیسے میں تمہیں جانتا نہیں۔ گونگا ہو کر تم نے کون سا باز آجانا ہے۔ اشاروں سے بولنا شروع کر دو گی' بلاوجہ کی بدنامی۔ لوگ کیا کہیں گے اشارہ باز لڑکی۔ سکون ہمیں اب بھی نہیں ہے۔ سکون ہمیں تب بھی نہیں ہو گا۔"

انفش کے اس بیان نے ثابت کر دیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے سخت مخالف ضرور ہیں مگر شاید ایک دوسرے کو سب سے زیادہ جانتے بھی ہیں۔ نوال نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر زبان میں لڑکھڑاہٹ سی آرہی تھی۔ اس نے "تلو یا" انگلی اٹھا کر جیسے اسے باز رکھنا چاہا مگر نقاہت نے اجازت نہ دی۔

"تمہارے اس تجزیے و تبصرے کا' جواب ادھار رہا میں تمہیں۔"

نوال کی آنکھیں ایک بار پھر بند ہو گئیں اور ایسے وہ اتنی معصوم لگتی تھی کہ کیا کہیے۔ انفش نے ادھر ادھر دیکھا۔ ہوں' شکر کوئی متوجہ نہیں تھا آہ مگر یہ بے خود خان۔۔۔ ہاں اس نے تو سب سنا تھا واحد چشم دید گواہ...

انفش پہلے تو جارحانہ انداز سے اسے دیکھتا رہا پھر یکدم کچھ مطمئن ہوا۔ بے خود خان کی کہانی یہ تھی کہ وہ جملوں کی گہرائی طنز کے نشتر کی کاٹ' تک تو نہ پہنچ پاتا تھا کہ کس نے کتنا اسکور کیا۔ یا کس کے جملے زیادہ پاور فل تھے۔

اسے تو بس نوال باجی کے چہرے کی طمانیت' مسکراہٹ اور انفش بھائی کے پھڑکتے نتھنوں' بھنچتی مٹھیوں اور آخر میں واپس پلٹتے قدموں کی دھمک سے اندازہ ہو جاتا تھا۔ جیت ہمیشہ کی طرح نوال باجی کے حصے میں آئی ہے۔

بے خود خان نے نوال باجی کو دیکھا۔ ان کی اردو اتنی اچھی نہ تو بولنے میں تھی نہ لکھنے پڑھنے میں۔۔۔ لیکن اسے خیال یہی آرہا تھا کہ جیسے مرا ہاتھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ ایسے ہی مری نوال باجی بھی لاکھوں سے کم تو نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"چھوٹی موئی کے بعد۔۔۔ میری تو مانو زندگی اندھیر ہو گئی۔ اتنی کم عمر لکھوا کر لائی میری بچی۔۔۔!" مہمان آنٹی کی آواز بھرائی اور ساتھ ہی آنکھیں ٹپکنے لگیں۔ ماحول بے حد رنجیدہ ہو گیا۔ صوفیہ دادی نے اپنی وہیل چیئر کو ذرا آگے سرکایا اور اپنی چچازاد' بہن بلیں بچپن کی سہیلی اور دبئی سے تازہ تازہ درآمد مہمان کے کھر بھرے بھرے سے گلابی ہاتھ کو تشفی دینے کے انداز سے تھام لیا۔ دوسرے ہاتھ سے آنسو بھی پونچھنے کی سعی کی جو بہتے ہی چلے آرہے تھے۔

"ایسے مت رو لیلی! ہر شخص نے مرنا ہی ہے۔ کوئی پہلے' کوئی بعد میں' آگے پیچھے کا نمبر ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو صوفیہ!" آنٹی نے ٹشو باکس سے ایک ڈھیر سا نکالا باکس کو اپنے بڑھے پیٹ پر رکھ لیا

تھا۔ بے حد افسردگی کے باوجود نوال ٹشو بکس کے اس نئے ریک کو دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

"رونا چھوٹی موئی کے چلے جانے کا تھوڑی ہے۔ تم نے دلاور کو دیکھا۔ اس نے تین مہینے فقط تین مہینے بعد دوسرا بیاہ رچالیا کوئی ایسے بھی کرتا ہے بھلا۔" داماد کی یہ عجلت دل پر چھری چلاتی تھی۔

"یہ عورتیں ہی ہوتی ہیں جو بیوگی کے سو سال بھی کاٹ لیتی ہیں۔ مرد تو بیوی کے جنازے پر پرسے کے لیے آئی عورتوں ہی میں دوسری کو تاڑ لیتے ہیں۔ مردوں کا بس چلے تو بیوی کے سوئم کے ساتھ اپنے ولیمہ کو بھی بھگتا دیں۔"

ان کے اقوال میں اتنی صداقت تھی کہ نوین کی نظریں اخطب پر جبکہ دادی نے بے ساختہ اپنے شوہر نامدار کو دیکھا تھا۔ نوال جواب بخار سے مکمل طور چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد نوین کے اصرار پر ناشتہ کرنے ادھر آئی تھی، اپنی فطرت کے برعکس کچھ چپ چپ تھی۔ سر ہلکا بوجھل تھا۔ منہ کا ذائقہ کڑوا۔

مگر ان آنٹی کے خیالات نے جیسے دل و دماغ پر چھائی کثافت دور کردی تھی۔ مگر ترحم بھرے انداز سے سنتا اخفش آنٹی کے دکھ کو سمجھتا تھا مگر یہ جو نوال نے ہر نئے انکشاف کے بعد ارادتاً "یا شاید بے خیالی میں اخفش کو دیکھنا شروع کردیا تھا۔ یہ تاثر اور الزام کم از کم اب برداشت سے باہر تھا۔ مگر آداب محفل، وہ اٹھ کر بھی نہیں جاسکتا تھا۔

"دیکھتی میں جو مردوں پر عدت فرض ہوجاتی۔ کرنا پڑتا انتظار چار ماہ دس دن۔"

آنٹی کا دکھی لہجہ دھمکاتا ہوگیا۔ کاش یہ کوئی قرارداد ہوتی تو اللہ کے حضور پیش کردیتیں کہ مرد بھی۔۔۔ ورنہ ان کے داماد نے جو تین ماہ بعد ہی سہرا سجالیا۔ ہوگا پہلے کا کوئی چکر۔۔۔ وہ آخر میں یہ سوچتیں اور نئے سرے سے کڑھنا شروع کردیتیں تینوں میزبان مردوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے (عدت۔۔۔ اللہ نہ کرے)

اس محفل میں ایک بندی اور بھی تھی جو اس ساری گفتگو سے بے نیاز تھی۔ یہ مہمان آنٹی کی اکلوتی نواسی تھی۔ ان صاحب کی بیٹی جس کی برائیاں اللہ جھوٹ نہ بلوائے، کوئی دو گھنٹے سے جاری تھیں اور اسے تو جیسے پرواہی نہ تھی کہ اس کے والد بزرگوار کا ذکر خیر کیسے کیا جارہا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اپنی نانی کی رائے سے متفق ہو، آخر اسی کے باپ نے تو فقط تین ماہ بعد دوسرا بیاہ۔۔۔

وہ کبھی در و دیوار کی آرائش دیکھتی، کبھی چھت کو۔۔۔ کبھی یونہی اڑتی پڑتی سی نظر حاضرین پر ڈال لیتی اور پھر توجہ کہیں اور مرکوز کرلیتی۔

اس کا رویہ ناقابل فہم تھا۔ مگر نوال نے اندازہ لگایا۔ وہ اپنی نانی کے کلام سے متفق ہی ہوگی، ورنہ کون بیٹی اپنے باپ کی اتنی دیر تک عیب جوئی سن سکتی ہے۔ کم از کم نوال ضمیر خان تو ایسی بیٹی نہیں تھی۔ ڈیڈ سے محبت میں نوال کے اصول کچھ بے اصولی کی جانب مائل تھے۔ ڈیڈ غلط ہو ہی نہیں سکتے اور اگر ہیں تو۔۔۔ تو بھی کسی کو کیا۔۔۔ نوال وہی بچی تھی ناں، جو اپنے ڈیڈ کا اس وقت سہارا بنی، جب وہ ایکسیڈنٹ کے بعد ٹانگیں ضائع ہوجانے کے ڈپریشن میں گھر کے ہر چیز سے مایوس ہوگئے تھے۔ اپنے آپ سے، دنیا سے، اپنے ہر رشتے سے۔ ایسے میں نوال ہی تو تھی۔ جس نے انہیں زندگی کی طرف دوبارہ موڑا۔

☼ ☼ ☼

محفل وہی تھی مگر موضوع گفتگو بدل جانے سے ماحول و موڈ بھی بدل گیا تھا۔ نوال کے کچھ نڈھال اعصاب پوری طرح بحال ہوچکے تھے۔ وہ سخت بے یقینی کے عالم میں آنٹی کو سن رہی تھی اور نواسی کو دیکھ رہی تھی۔

"سوتیلی ماں کیسے کیسے نہ ظلم ڈھاتی معصوم بچی پر۔۔۔ میں تو لے آئی اسے اپنے ساتھ۔۔۔ اکلوتی بیٹی کی اکلوتی بچی آہ۔"

"معصوم بچی! بیس اکیس برس سے کیا کم ہوگی۔" نوال نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے۔

"پھولوں کی طرح رکھا ہوا تھا چھوٹی موئی نے

اسے۔" (چھوٹی موئی آنٹی کی مرحومہ بٹی کا نک نیم تھا)

"اور یہ اتنی معصوم ہے کہ اسے خبر تک نہیں کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔" معصوم کانوں میں ہینڈ فری ٹھونس رہی تھی۔

"چالاکی نام کو نہیں ہے۔ میں کہتی ہوں اتنی سیدھی کا اس دنیا میں گزارا کیسے ہوگا۔" آنٹی کا لہجہ سخت پریشانی کا غماز تھا۔

"سیدھی۔" گانا سیٹ کرلینے کے بعد اب ریمور اور کاٹن سے اپنے ناخن پر لگا چمکیلا سنہری رنگ اتارنے لگی تھی۔ پاس ہی ایک اور چمک دار دمکتا سرخ رنگ موجود تھا۔

"اتنا چھوٹا سا چڑیا جیسا دل ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہے۔ میں تو اسے خبریں تک سننے نہیں دیتی۔ بریکنگ نیوز کی ڈھن ڈھنا ڈھن ایسے اچھوں اچھوں کا دل دہلا دیتی ہے پھر میری بچی تو کسی کی اونچی آواز تک برداشت نہیں کر سکتی۔"

سب کی ترحم آمیز نگاہیں چڑیا پر جمی تھیں چڑیا نے موبائل سنبھال رکھا تھا۔ کانوں کو جاتی تاریں.... پھر نیل کلر لگانے کی مصیبت 'ہاتھ ذرا سا لڑکھڑایا' موبائل زمین پر گر گیا۔ اوہ نوال نزدیک ترین تھی۔ وہی مدد کو آگے بڑھی۔ چڑیا نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا رکھے تھے۔ نوال ہی کو دوبارہ موبائل سیٹ کرکے دینا تھا۔ پھر یونہی دھیان آیا ذرا دیکھے تو جدید سسٹم کے مہنگے ترین موبائل کو کانوں سے لگائے سیدھی معصوم چڑیا سن کیا رہی ہے۔ نوال نے والیوم بلند کیا۔ ہائیں... نوال کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ چونکے تو باقی سب بھی تھے۔

یویو ہنی سنگھ کی آواز.... وہ لڑکی کو گھر سے بھاگنے کا پراپر طریقہ سمجھا رہا تھا۔

یار تیرا سپر اسٹار دیسی کلا کار
میں پت جٹ دا مندا نہیں ہار

واقعی معصوم جتنی سیدھی بتائی گئی تھی۔ لے لیے ایسا تربیتی گانا بہت ضروری تھا۔ دوسری طرف آنٹی ابھی تک نواسی کے بارے میں مکمل معلومات دے رہی تھیں۔

"اور ویسے بھی یہ نیوز ویوز مردوں کا کام ہے۔ مضبوط دل ہوتے ہیں ان کے.... سنتے رہیں بیٹھے، بچیاں تو بس پھولوں، گہنوں کی باتیں کرتی اچھی لگتی ہیں۔"

آنٹی کے سنہری خیالات کا جھرنا بہہ رہا تھا۔ فیض عام تھا گویا سب ہی فیض یاب ہو رہے تھے۔ سب سے آگے اخفش انعام....

یہ تو گویا میرے دل میں تھا... کی مصداق اب عقیدت سے سن رہا تھا۔ نوال نے سب کو دیکھا۔ باقی سب صرف سننے والے تھے۔ ان کے چہروں پر واضح لکھا نظر آیا تھا۔ "مدیر کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔"

جبکہ اخفش صاف دکھائی دیتا تھا۔ سردھن رہا تھا جبکہ اخطب اور دادا جان نے جمائیاں اور انگڑائیاں لینی شروع کردی تھیں۔

ادھر چڑیا اپنے پنجوں اوہ سوری' ناخنوں پر رنگ کر رہی تھی گردوپیش سے ناآشنا... مگن 'کان یقیناً' یویو ہنی سنگھ کی ہدایات پر لگے تھے اور ہاتھوں کی مہارت' ہاتھوں پر بہار بن کر جھلکنے لگی تھی۔

نوال نے تسلیم کیا۔ خوب صورت انگلیاں مزید خوب صورت لگ رہی تھیں۔

"میں نے کبھی گرم ہوا بھی نہ چھونے دی تھی۔ اپنی بچی کو.... مگر وہ بدنصیب عمر ہی کم لکھوا کر آئی تھی۔" آنٹی کا بیان جاری تھا۔ کبھی بیٹی تو کبھی نواسی۔

"بہت خوش نظر آتی تھی ماں کے ساتھ مگر کیا میں نے دنیا نہیں دیکھی۔ میں کیسے چھوڑ دیتی اسے سوتیلی ماں کے برتن دھونے کے لیے.... دیکھ تو رہی ہو تم' کتنی نازک سی ہے میری نازک اندام۔"

صوفیہ ہربات پر پہلے ہی آمنا صدقنا تھیں' اب کیسے قبلہ بدلتیں۔ زور و شور سے سرہلایا۔ جبکہ نوال کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے تیزی سے گردن گھما کر نازک کو دیکھا پھر نوین کو وہ بھی اسی شاک کے عالم میں تھی۔ کل دوپہر سے آئی دادی کی یہ کزن اپنی چہیتی

نواسی کو معصوم کہہ رہی تھیں' نام پر غور کسی نے کیا ہی نہیں ۔۔۔ تو کیا سیدھی معصوم چڑیا بتائی جانے والی گوشت کی ایسی چھوٹی سی پہاڑی کا نام نازک تھا' نہ۔۔۔ نازک نہیں نازک اندام۔۔۔

"ہائے۔" نوال نے دل پر ہاتھ رکھا آسمانی چوڑی دار پاجامہ' آسمانی اور سرخ پرنٹ کا کسا ہوا کرتا ۔۔۔ (شامیانہ) اور چنا ہوا رنگین دوپٹا۔۔۔ بے پناہ ریشمی بال اسٹیپ کٹنگ تھی' ایک دائرہ چہرے کے گرد۔۔۔ پھر ایک کانوں سے نیچے۔۔۔ پھر گردن کے اطراف۔۔۔ اور شانے اسی طرح آخیر میں کمر کے درمیان میں ایک سیدھی برابر لٹ۔۔۔ بڑی بڑی آنکھیں' صحت مند گلابی گالوں میں دھنسی تھیں۔ ناک پیاری تھی اور پتلے نرم ہونٹ۔۔۔ چہرہ خوب صورت تھا بہت زیادہ۔۔۔ مگر اس پر گوشت بھی تھا۔۔۔ بہت زیادہ۔

اور نام۔۔۔ نازک۔۔۔ اوں ہوں' نازک نہیں نازک اندام۔۔۔ نواسی نانی کا پرتو تھی تو اس کا مطلب ہے جس بیٹی کو وہ چھوٹی موٹی کہہ رہی ہیں وہ بھی۔۔۔؟ نوال کی تو سوچ کا دائرہ سمٹ کر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بظاہر اخفش کا کوئی قصور نہیں تھا۔ مگر سب ایسی ملامتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے کہ بے چارہ صفائی دینے سے بھی گیا اور کوئی موقع ہوتا تو وہ لاپروائی سے ہنس کر کہتا "مجھے کیا۔۔۔ یا میں کیا کروں" کہہ دیتا' مگر اس وقت کچھ تکلیف دل میں محسوس ہو رہی تھی۔ اور کچھ حیرانی تھی۔ اسی لیے بہت گہرائی تک جا کر سوچ نہیں رہا تھا (ہاں بعد میں خیال آتا۔۔۔ بلکہ لازمی آتا) کہ چوٹ لگنے سے لے کر گھر پہنچنے تک اس نے لب سے سی تک نہ نکالی' اور اب جب سارے گھر کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا تو باقاعدہ روتی تھی اور زخم کسی کو دیکھنے بھی نہ دیتی تھی' ہاتھ لگانا تو دور کی بات۔۔۔ مگر خیر چار انچ سے کچھ لمبا کٹ جو ایڑی سے اوپر سیدھا پنڈلی کی طرف جا رہا تھا اور گوشت گویا کھلا پڑا تھا۔

اس کی کولھا پوری براؤن چپل کا من کے باہر پڑی تھی اور خون سے لت پت تھی۔ دروازے سے اندر کرسی تک خون کے قطرے تھے۔ اور سچ مچ دل کو دہلاتے تھے۔

"بس میرا ستارہ کسی نحوست کے زیر اثر ہے نانو!" نوال نے نانو کے رنگ اڑے چہرے کو دیکھ کر خود کو نارمل ظاہر کیا۔

"اوں ہوں۔۔۔ یہ ستارے وتارے کچھ نہیں ہوتے۔ تمہیں خیال کرنا چاہیے تھا۔" نوین نے اس کے خیال کو جھٹلایا۔

"بس تو پھر مجھے کسی کی نظر لگ گئی ہے۔" نوال نے اک ادا سے پلکیں جھپکائیں۔

"ہوں۔" اشتیاق احمد نے سر سے پیر تک نوال کو دیکھا اور تائید میں سر ہلایا۔

"میں پیاری بھی تو کتنی ہوتی جا رہی ہوں ناں!"

"یہ کس نے کہا۔۔۔؟" لاکھ اخفش نے براہ راست منہ نہ لگنے کی قسم کھا رکھی تھی مگر اب بھی نہ بولتا تو پھر کب۔۔۔؟

"کس نے کہنا ہے' اسے خود آگاہی کہتے ہیں جناب۔۔۔ ویسے بھی حسن بتایا نہیں جاتا' محسوس ہو جاتا ہے۔ جو بتایا جائے' سمجھایا یا جتایا جائے وہ حسن' تھوڑی ہوتا ہے۔ وہ تو کوشش ہوتی ہے۔ حربہ ہوتا ہے اور سچ کہوں تو خواری ہوتی ہے اور یہ جو میرا حسن بے نیاز ہے' یہ تو ساحل کی ہوا ہے۔ رات کی رانی کی خوشبو ہے۔ ایک دلفریب احساس ہے ایک۔۔۔"

"بس کرو نوال۔۔۔ ابھی تو تم نے چلا چلا کر سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا اور اب اچانک نثر نگار ہو گئیں۔" نوین نے ٹوکا۔ اس کا سارا دھیان اس بات پر تھا' پٹی بندھے گی یا ٹانکے لگائے جائیں گے۔

"ہاں تو درد تو اب بھی ہو رہا ہے۔ یہ تو میں دل بہلانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔" نوال نے چہرے پر نقاہت طاری کر لی۔ "ہائے مما۔۔۔ ہائے ڈیڈ!"

"شور مت کرو اور اپنا ٹراؤزر چینج کر لو' سارا پائنچہ خون میں لت پت ہے۔ اخطب نے گاڑی بھیج دی ہے۔ ابھی ڈاکٹر کے پاس چل رہے ہیں۔" نوین نے

کہا۔

"خالا میں گیٹ تک چل کر نہیں جا سکتی۔" وہ بسوری۔

"ہم تمہاری کرسی اٹھا کر گیٹ تک رکھ دیں گے۔" اخفش نے کہا نوال نے منہ پھیر کے ہونہہ کیا۔

"ضرورت نہیں ہے اٹھا کر رکھ دیں گے۔" اس نے نقل اتاری۔ "میں اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی ہوں آخر یونیورسٹی سے گھر تک بھی تو بنا کسی سہارے کے آئی ہوں ناں۔"

اخفش سے شکوے شکایت والا رشتہ نہیں تھا۔ مگر منہ سے نکل گیا تھا۔ اودھر اشتیاق احمد کے کان کھڑے ہوئے انہوں نے کچھ چونک کر دونوں کو دیکھا۔

"سنو نوال! یہ اخفش بھی اسی شٹل میں تھا جس میں تم تھیں۔"

نوال نے منہ پھلا لیا اور سر زور زور سے اثبات میں ہلایا۔

"پھر بھی تمہیں پتا نہیں چلا کہ یہ کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔" اشتیاق احمد کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔

اب اخفش کیا جواب دیتا۔ وہ شٹل میں سب سے آگے کھڑا تھا جبکہ نوال سب سے پیچھے بیٹھی تھی۔ شٹل میں طالب علم ایسے بھرے ہوتے تھے جیسے صبح صبح پولٹری فارم سے مرغیوں کو ٹرک میں بھر کے شہر میں لایا جاتا ہے۔ دبے، پھنسے، گھٹے شور مچاتے طالب علم۔۔۔ اسے پیچھے کی جانب شور محسوس ہوا تھا مگر سر نکال کے کیسے دیکھتا۔ پھر اس نے نوال کے نام کی پکار بھی سنی تھی۔ مگر نظر انداز کر کے کانوں میں ہینڈز فری ٹھونس لیا کہ جس طرف نوال ہو وہاں چیخ و پکار نہ ہو، کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے۔ مطلوبہ اسٹاپ پر دونوں آگے پیچھے ہی اترے تھے۔ اخفش نے خود نوال کو اترتے دیکھا تھا۔ مگر اخفش اپنے دوست کی بائیک پر بیٹھ کر رفوچکر ہو گیا۔ جبکہ نوال اپنی ایک کلاس فیلو کے ساتھ کبھی پیدل اور کبھی رکشہ کر کے آجایا کرتی تھی اس میں نیا کیا تھا۔

وہ بائیک پر تھا اس لیے گھر پہلے پہنچا۔۔۔ نوال دس منٹ دیر سے۔۔۔ اور وہ دروازے سے ہی دہائیاں دیتی آ رہی تھی۔ آوازیں اتنی ہولناک اور بلند تھیں کہ اشتیاق احمد اور نوین اپنے گھر سے بھاگے آئے۔

لان میں ملنے والے بے خود خان نے حواس باختگی کے عالم میں بتایا۔ "بی بی کا سارا خون نکل گیا۔" اخفش کو جھوٹ لگا۔ ابھی تو ہٹی کٹی شٹل سے اتری تھی۔ تو خون کب نکلا جبکہ بے خود کہہ رہا تھا۔ یونیورسٹی بس کے اندر سیٹ کے نیچے کولڈ ڈرنک کی ٹوٹی بوتل پڑی تھی۔ بس کو جھٹکا لگا تو وہ نوال کی ایڑی کو سیدھا کاٹتی چلی گئی۔

"ہائیں!" اخفش کو سب جھوٹ یا ڈراما لگا مگر دروازے کے پاس خون بھری جوتی اور آگے۔۔۔ خون کے قطرے۔۔۔ اور پھر زخم بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس کے دل کو سچ مچ کچھ ہوا۔ بعد میں نوال نے بے خود خان کے بیان کی تصدیق کر دی۔

"تو بیٹا! تم اخفش کو پکار لیتیں۔ وہ تمہاری ہیلپ کرتا۔ ٹیکسی کر کے تمہیں گھر لاتا، بلکہ ڈاکٹر کے ہاں سے ہوتے ہوئے گھر آتے۔"

نانو کی اخفش سے محبت کمال تھی۔ وہ اب بھی غلطی نوال کے کھاتے میں فٹ کرنے والی تھیں کہ نوال ایک بار اخفش کو بتاتی تو سہی۔ جب اس معصوم کو معلوم ہی نہیں تو۔

"ہاں نوال۔۔۔ امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تمہیں بتانا چاہیے تھا۔ تم دونوں ایک ہی بس میں تھے۔ ایک راستہ ایک گھر۔" نوین کے لیے بھی سوال اہم تھا۔

"کیا بتاتی خالہ!" نوال نے سرد آہ بھر کے نگاہیں خلا میں کہیں ٹکا دیں۔

"وہ ہم سفر تھا مگر اس سے ہم نوائی نہ تھی۔"

وہ گنگنائی اور ایسی الزام لگاتی نگاہیں اخفش پر جما دیں کہ اخفش اگر موم کا ہوتا تو پگھل جاتا۔ نمک کا ہوتا تو گھل جاتا۔ مگر اخفش انعام تو چربی کا ڈھیر تھا۔ عقل پر چربی، دل پر چربی، آنکھ پر چربی۔

حق ہا۔۔۔ یہ بدگمانی بھی کیا چیز ہے۔

ہر منظر کو سیاہ کر دیتی ہے
پھول نظر نہیں آتا بس کانٹوں کی چبھن یاد رہتی ہے
عطر کی شیشی نہیں کھولتے خوشبو اڑ جائے گی یا پاگل
یہ نہیں سوچتے خوشبو پھیل بھی تو جائے گی۔
بدگمان لوگ خوش نہیں رہتے۔۔۔ کسی کو رہنے بھی تو نہیں دیتے۔
مسکراتے نہیں۔۔۔ کہ دل کا بھید کیوں دیں۔
ہنسنے والی بات پر ہنستے نہیں۔۔۔ رونے والی بات پر آنکھ پتھر کر لیتے ہیں۔
پتھر میں پھر کونپل کیسے پھوٹے؟
وہ نوال سے بدگمان رہتا تھا۔
وہ اسے نظر انداز کرنے کی شعوری کوشش کرتا تھا۔ جبکہ نہیں جانتا تھا۔
نوال جیسے نکھرے ستھرے دل کی لڑکی سے بدگمانی پالی جا ہی نہیں سکتی اور نظر انداز۔۔۔ نوال ضمیر خان بھلا نظر انداز کرنے والی چیز تھی۔
وہ تو خوشبو تھی' ہوا' بادل' بارش جیسی۔۔۔ لیکن یہ جو اخفش انعام تھا۔ اور اس کی مردانہ انا۔۔۔ یہ اسے وہاں لا کر مارنے والی تھی جہاں پانی نہیں ملتا۔
اور آج جو ہوا۔۔۔ اخفش نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اشتیاق احمد اور نوین کا سہارا لے کر آتی نوال کو بغور دیکھا۔ نوین نے گھونگریالے سنہری جنگل کو آدھا ادھورا سا کلپ میں جکڑ دیا تھا۔ ہر قدم پر اس کے پر بہار چہرے پر زردی چھاتی تھی۔ مگر سنہری آنکھوں کے اندر رہمت جوان رہتی تھی۔ نوال ضمیر خان مضبوط تھی اور یہ بات با آسانی باور کروا دیتی تھی۔
بے خود خان ایک بڑے پیالے میں کٹے سیب' انگور اور آڑو لیے پیچھے بیٹھا تھا۔ اتنا چل کر آنے سے تازہ باندھا گیا رومال بھی سرخ ہونے لگا تھا۔ کچھ سرخی گاڑی کے اندر بھی نشان چھوڑنے لگی۔ نوال نے خود ہی جھک کر رومال کو دوبارہ کسا اور پھر بے خود سے ایک شاپر منگوا کر پیر پر باندھ لیا کہ اگر خون بہے تو گاڑی گندی نہ ہو۔ اس کام سے فراغت کے بعد اس نے فروٹ والا باؤل گود میں رکھا اور کانٹے سے کھانے لگی۔
نوین نوال کے ساتھ بیٹھی جبکہ اشتیاق احمد ڈرائیور کے ہمراہ۔
گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ تو ذرا گم صم سا اخفش چونک کر پیچھے ہوا۔۔۔ گاڑی گیٹ سے نکل کر سڑک پر رواں بھی ہو گئی۔ اخفش وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ نگاہیں زمین پر گڑی تھیں۔ جہاں خون کے کچھ تازہ قطرے تھے اور بے خود خان چہرے پر شدید غم زدہ تاثرات لیے کپڑے سے انہیں پونچھنا شروع ہو گیا تھا۔
یہ نہیں تھا کہ وہ نوال کے نام کی پکار پر چونکا نہیں تھا۔ چونکا تھا بہت بری طرح سے یقیناً "کوئی نیا تماشا یا کریٹی ویٹی ہو گی۔ کوئی نیا ایڈونچر۔۔۔ اور بقول اخفش نری بے عزتی' نتیجہ بدنامی' لہٰذا اس نے کان لپیٹے رہنے کو ہی ترجیح دی۔
ویسے ہی جیسے۔۔۔ اس روز۔۔۔
اس روز تاں۔۔۔ جس روز نوال نے مزدا کی ریس میں حصہ لیا تھا اور جیت کر گھر آئی تھی۔
اخفش تو اس روز بس سے اتر جانے کے مواقع ڈھونڈتا رہ گیا تھا۔ مگر بس ریس جیت لینے سے پہلے رکنے کے حق میں نہیں تھی۔
اور اس دن کو یاد کر کے آج بھی اخفش نے جھرجھری لی تھی' وہ سارا تناؤ۔ شرمندگی' بے بسی یاد آئی تو نوال کے زخم پر آنے والی تازہ تازہ ہمدردی اڑن چھو ہو گئی۔ یاد رہا تو بس وہ دن اور وہ شرمندگی اور۔۔۔
اپنے منفی خیالات میں گم اخفش نے جب اپنے گھر میں قدم رکھا تو صوفیہ بیگم' لیلیٰ بیگم اور نواسی نازک۔۔۔ نازک اندام اسی کی منتظر تھیں۔
"کیا ہوا۔ زیادہ لگ گئی نوال کو۔۔۔ ڈاکٹر کہاں لے کر گئے ہیں۔ خون نہیں رکا تھا۔" صوفیہ بیگم کا لہجہ بے تاب اور فکر مند تھا۔
لیلیٰ بیگم نے پوچھا تھا۔
"ویسے لگا کیا تھا؟"
"کولڈ ڈرنک کی ٹوٹی بوتل۔۔۔" اخفش نے تفصیلاً

جتایا۔

"مائی گاڈ!" نازک نے پہلی بار جھرجھری لیتے ہوئے لب کشائی کی۔ "مجھے تو سوچ کر خوف آرہا ہے۔ میں تو دیکھ بھی نہیں سکتی اس طرح کے زخم وغیرہ۔"

"اوہو... نازک!" لیلیٰ آنٹی نے نواسی کو ٹوکا۔ "تم اس بارے میں سوچو بھی مت' یونہی دل خراب ہو گا۔ پھر ساری رات اسے نیند نہیں آتی۔" اگلا جملہ صوفیہ بیگم اور اخفش کے لیے تھا۔

"میں نے تو اسے کبھی ہارر موویز' ایکشن مووی بھی دیکھنے نہیں دی۔ بچپن میں ٹام اینڈ جیری دیکھتے ہوئے بھی یہ گھبرا کر رونے لگ جاتی تھی۔"

لیلیٰ بیگم نواسی کو سمجھانے والی گائیڈ بک تھیں جیسے۔ سامنے والے کی حال تو حال ماضی تک سے آگاہی ضروری ہے۔

"اب تو خیر ماشاء اللہ بڑی ہو گئی ہے نازک!" صوفیہ بیگم نے پیار سے نازک کو دیکھا۔

"ہاں مگر دل تو اب بھی چھوٹا سا ہی ہے ناں۔" لیلیٰ بیگم اپنے بیان سے پیچھے ہٹنے والی نہیں تھیں۔ "میں نے تو اسی لیے کہہ دیا انٹر بہت تعلیم ہے۔ انگلش تو پہلے ہی اس کی بہت اچھی ہے۔ ڈگریاں لے کر ہم نے اچار نہیں ڈلوانا... نہ نوکریاں کرنی ہیں' بس سیدھے سیدھے اچھا لڑکا دیکھ کر بیاہ دوں گی اپنی گڑیا کو..."

اب یہ ارادتاً تھا یا یونہی... اچھے لڑکے کے نام پر ان کی نظریں اخفش پر آن رکیں۔ صوفیہ بیگم تو بغور سنتے ہوئے سر ہلا رہی تھیں۔ جبکہ نازک کی نگاہیں بھی اچھے لڑکے پر جا کر ٹک سی گئیں تو کیا... یعنی کہ وہ حیران ہوئی پھر یقین بھی کر لیا' اس کی نانو جان کبھی غلط تھوڑی کہتی رہتی ہیں لہٰذا اچھا بہت اچھا۔

"تم کھانا نہیں کھاؤ گے اخفش... سب تیار ہے۔ پروین ہے کچن میں۔" صوفیہ بیگم کو پوتے کا اترا چہرہ بھوک کا باعث لگا تھا۔

"نہیں! بھوک اڑ سی گئی ہے۔" وہ پژمردہ ہو رہا تھا۔

"پتا نہیں اب کتنے دنوں کا ریسٹ کرنا پڑے گا نوال کو۔" نازک نے اخفش کو دیکھا۔

"یہ تو اب ٹریٹمنٹ پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔ صرف پٹی کی جائے گی یا ٹانکے لگیں گے۔"

"اللہ ٹانکے؟" نازک نے دہل کر نانو جان کو دیکھا۔

"ارے... ارے تم کیوں ٹینشن لیتی ہو۔" لیلیٰ بیگم الرٹ ہوئیں اور تم اخفش بیٹا! نازک کے سامنے ایسی باتیں مت کرو۔ یہ گھبرا جاتی ہے۔"

اخفش نے نازک کے چہرے کو دیکھا جہاں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اور اپنی نانو کے بیان کے مطابق وہ شاید رو دینے کو تھی۔

"ہاہ... ایک یہ ہے۔ ذرا سی تکلیف کے احساس ہی سے کانپ رہی ہے' اور دوسری وہ مردمار نوال ضمیر خان... سب کو ہولا کر خود ڈونگا بھر کے فروٹ چاٹ ٹھونسنے لگی۔ اب گھر آئیں گی تب محترمہ کی تیمارداری اور دلداری۔ ہونہہ..." اخفش کو اچانک غصہ سا آگیا۔

"پروین' پروین کھانا نکالو... مجھے بھوک لگی ہے۔" وہ کھڑا ہو کر پکارنے لگا۔

"خوامخواہ میں' میرا کوئی لینا نہ دینا اور گلٹ سب مجھے دینا چاہ رہے ہیں کہ میں نے مڑ کر کیوں نہ دیکھا۔ اس روز بھی تو دیکھا تھا ناں' کیسا تماشا لگا کر بیٹھی تھی۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ آج سچ مچ کچھ ہے ہونہہ۔"

اخفش نے دوبارہ بدگمانی کے پل پر پیر رکھے اور پھر آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

نوال نے ڈرائیونگ تو شناختی کارڈ بننے سے بھی پہلے سیکھ لی تھی۔ اور پکا ارادہ تھا کہ اپنے لیے ایک گاڑی تو لازمی خریدنی ہی ہے۔ مگر عین وقت پر ڈیڈ نے اپنے وعدے کو ڈنکے کی چوٹ پر فراموش کرتے ہوئے گاڑی نہ دلانے کا اعلان کر دیا۔ نوال نے وعدہ خلافی کرنے والے کے سو عیب بیان کیے۔ مگر ڈیڈ بھی آخر اس کے باپ تھے ٹس سے مس نہ ہوئے۔

کراچی میں ٹریفک جتنا بے ہنگم ہے۔ تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تمہیں ایسے شوق پالنے دوں گا نوال..."

"تو پھر میں کیسے جاؤں گی یونی؟" نوال نے گھونگھریالے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ لیا۔

"میں تمہیں وین لگوا دوں گا۔" ڈیڈ سب سوچ بیٹھے تھے۔

"وین...؟" نوال کی آنکھیں پھیلیں اور پھر آگے ایک لمبی بحث تھی۔ ڈیڈ گاڑی پر نہ مانے اور نوال وین پر۔

"میں بس میں جاؤں گی۔ کھڑے ہو کر... انجن پر بیٹھ کر... بس کا ڈنڈا پکڑ کے دروازے پر لٹک جاؤں گی۔ چھت پر بیٹھ جاؤں گی۔ ڈیڈ میں بھی اب یونی ورسٹی کے ہزاروں اسٹوڈنٹ کی طرح آؤں گی اور جاؤں گی بس۔"

ضمیر خان کو مانتے ہی بنی۔ اب یہ نوال کے لیے نیا تجربہ تھا۔ وہ پیلی پیلی گوٹے لشکیے والی جھومتی جھامتی مزدا میں فراٹے سے چڑھنے میں ماہر ہو گئی چند دنوں میں۔

مایوں کی دلہن کی طرح سجی بنی بسیں... اور اندر چلتے ڈیک...

"آخر آپ لوگ بسوں کو اتنا سجاتے کیوں ہیں؟"

ایک دن جناب ڈرائیور صاحب کا انٹرویو بھی کر لیا اور انٹرویو چونکہ طویل تھا لہٰذا بس مطلوبہ اسٹاپ سے آگے چلی گئی۔ محترمہ کو پتا تک نہ چلا۔ اللہ جانے کہاں اتر کر دوبارہ بس پکڑ کر شام گئے تھکی ماندی گھر لوٹی۔

اسی طرح شروع میں مزدا کی آپس میں ریس بھی سمجھ نہ آئی۔ اچانک یہ دو مزدا ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی تگ و دو میں کیسے اوور ٹیک کرنے لگ جاتیں، سگنل توڑتیں، روٹ بدل کر شارٹ کٹ استعمال کر کے آگے ہونے کی کوشش... ایسے میں سواریاں بٹھانا بند کر دیتیں۔ خیر ہے... اتارنا بھی بھول جاتیں۔ مسافر بھی دبک کر رہ جاتے اور باقی ماندہ بنا کسی کے کہے سنے اپنے اندر اسپورٹس مین اسپرٹ کو بیدار ہوتا دیکھتے بھول جاتے کہاں جا رہے ہیں کیوں جا رہے ہیں بس وہ مزدا جیت جائے جس میں وہ بیٹھے ہیں اور ایسی کسی مزدا میں اگر نوال سوار ہو تو...

یہ بھی ایک ایسا دن تھا۔ یونیورسٹی اسٹاپ سے مزدا میں چڑھنے والی ننانوے فیصد سواریاں طالب علموں پر ہی مشتمل ہوتی تھیں۔ بس گویا اپنی لگتی یا پھر اپنے باپ کی... نوال کو آج جگہ نہیں ملی تھی وہ دروازے کے آخری پائیدان پر ایک ٹانگ پر کھڑی تھی۔ سید ضمیر جعفری کی کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے۔ کا مطلب بھی یہیں آ کر سمجھ آیا تھا۔ مزدا ڈرائیور جیسے بجھے دل سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ روتے بسورتے گانے بج رہے تھے۔

"دیوانوں سے یہ مت پوچھو... دیوانوں پہ کیا گزری ہے۔"

سارا دن کلاسیں بھگت کر نڈھال اسٹوڈنٹ بالکل ہی ڈاؤن ہو گئے۔ دیوانے سے کیا کم ہوں گے؟

اوروں کو پلاتے رہتے ہیں اور خود پیاسے رہ جاتے ہیں
یہ پینے والے کیا جانیں... پیمانوں پہ کیا گزری ہے
گزری ہے... دیوانوں سے...

نوال کے اپنے حلق میں پیاس سے کانٹے چبھنے لگے۔ وہ ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ ہوا میں لہرا کر ڈری سہمی کھڑی تھی (لٹکی تھی)

"آخر یہ بس اتنی آہستہ کیوں چل رہی ہے۔"

ایک لڑکی نے بیزاری سے کہا تھا۔ ابھی الفاظ منہ میں ہی تھے۔ بس نے ایک جھٹکا کھایا۔ ہر مسافر کی چیخ نکلی، سب ایک دوسرے سے گویا لپٹ گئے۔ اور بہت سوں کے سر آپس میں ٹکرائے یا پھر کسی نہ کسی چیز سے۔

ڈرائیور نے اپنی جانب کے دروازے سے منہ باہر نکالا اور پشتو میں دوسری بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے ناقابل اشاعت الفاظ میں کچھ کہا اور اس کے بعد بس ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ یونی ورسٹی کی مصروف شاہراہ پر زگ زیگ ہونے لگی اور مسافر گتھم گتھا ہونے کے باوجود دائیں بائیں یوں ڈولتے تھے۔ جیسے خالی ڈش میں اکیلا انڈہ...

سوئے اعصاب جاگ گئے۔ اونگھتے اسٹوڈنٹ بھی خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور نوال جیسوں کے تو

چودہ طبق روشن ہو گئے۔

ریس۔۔۔؟ واؤ۔۔۔

"تو جس کو اترنا ہے اور ابی اترے۔ اب گاڑی آگے نہیں رکے گی۔"

سگنل پر گاڑی مجبوراً رکی تو ڈرائیور نے فرمان جاری کیا۔ اگلے منٹ میں بس سے آدھے اسٹوڈنٹ اتر چکے تھے۔

نوال کو دروازے کے ساتھ والی سیٹ پر جگہ ملی پر اب کون کافر بیٹھتا' سگنل کھلا تو دونوں بسیں آگے پیچھے نکلیں اور عجیب بات تھی نوال والی بس آگے نہیں ہو پا رہی تھی۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر شور مچا رہے تھے۔ ڈرائیور تھوڑی دیر بعد منہ باہر نکال کچھ سنہری الفاظ اگلی بس کی شان میں کہتا۔ زبان یقیناً پشتو تھی۔ مگر گالیاں زبان بیان سے ماورا ہوتی ہیں۔ نوال کو پشتو کی سدھ بدھ نہ تھی۔ وہ ہر گالی پر سر دھنتی۔

دغا دغا۔۔۔ ڈھنا ڈھن ڈھن۔۔۔

"دیوانوں سے یہ مت پوچھو دیوانوں پہ کیا گزری ہے۔" مکمش کرلاتا۔

"ارے استاد گیئر بدلو گیئر۔ آخری گیئر میں ڈال دو۔" نوال چلائی۔

"دائیں سے دائیں۔" وہ جوش میں کھڑی ہو گئی۔ وہی ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ ہوا میں لہراتا۔۔۔ ایک جانب ڈرائیور کی جدوجہد۔۔۔ پچھلے دروازے پر کنڈیکٹر کا فلاں بجیا۔۔۔ ڈھمکاں بچیا۔۔۔ دغا دغا۔۔۔ استا' استا ادھر نوال کی ہدایات۔

نوال کی دیکھا دیکھی۔۔۔ بچی کھچی لڑکیوں کے چہرے بھی جوش سے تمتمانے لگے تھے' جبکہ لڑکوں نے کھڑکیوں سے منہ نکال کر دوسری بس کے مسافروں پر جملے کسنے شروع کر دیے۔ (وہاں بھی تو سب اسٹوڈنٹ تھے ناں۔۔۔ اور ان ہی اسٹوڈنٹس میں ایک تھا۔ اخفش انعام۔

جس نے پھٹی آنکھوں سے بلکہ شدید ترین بے یقینی سے ڈنڈے سے جھولتی نوال کو دیکھا تھا اور بے یقینی سے پلکیں جھپکی تھیں۔ پھر آنکھوں کو ملا تھا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے وہ نوال تھی سچ مچ کی نوال جو۔۔۔ کنڈیکٹر کی دیکھا دیکھی۔ سوچے سمجھے بنا' فقط تلفظ کو پکڑ کر دغا دغا اور استا۔۔۔ استا کر رہی تھی۔

دوسری طرف بے یقینی سے نکلنے کے بعد اخفش نے سوچا۔ بس رکے تو وہ فوراً' کہیں بھی اتر جائے۔ مگر دوسرے ڈرائیور نے بھی پہلے ہی کہہ دیا تھا' بس اب رکے گی نہیں۔۔۔ تو کیا اخفش کھڑکی سے نکل لے۔۔۔ مگر کیا اخفش انعام کھڑکی سے نکل سکتا تھا؟ پہلی بار اپنے موٹاپے کا احساس ہوا' دل مسوس کر رہ گیا۔

اس نے منہ پھیر لیا۔۔۔ مگر اس سے کیا۔ دونوں بسیں برابر چل رہی تھیں۔ اور نوال کے نعرے کانوں میں سیسہ پگھلا رہے تھے۔ اور نوال ہی پر کیا الزام دونوں بسوں کے مسافر (اسٹوڈنٹس) اب ایک دوسرے کو منہ در منہ اپنی جیت اور ان کی ہار کا یقین دلا رہے تھے۔

کون سا گھر کہاں کا گھر۔۔۔ کسی کو واپسی یاد ہی نہ رہی۔ ممنوعہ زکی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔ نوال تو خیر نوال تھی۔ دوسری بس کی لڑکیوں نے بھی ہونٹوں کے گرد ہاتھوں کی اوک بنا کر ووکی آوازیں نکالنی شروع کر دی تھیں۔

ہاں بس وہ ایک اخفش تھا۔ جسے منہ چھپانے کو جگہ نہیں مل رہی تھی۔ اسے صرف نوال دکھائی دے رہی تھی اور سنائی دے رہی تھی۔

نوال نے کھیل کا لائحہ عمل تبدیل کر دیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو گانا بدلنے کو کہا تھا۔ ڈرائیور ناکام عاشق تھا اس نے ایک ہی گانا بھر رکھا تھا۔

نوال نے اندر منہ کر کے اعلان کیا۔ "یہ گانا لگا رہا تو ہم جیتا گیم ہار جائیں گے۔ ہے کوئی ایسا بندہ جو ایک جوشیلا گانا مستعار دے۔"

نوال کی دردمندانہ اپیل پر آدھے اسٹوڈنٹس نے رضاکارانہ طور پر خود کو پیش کیا اور اپنے موبائل سے کارڈ نکال کر پیش کر دیے' گانا نوال ہی نے سلیکٹ کیا۔

اور ادھا تیرا جلوہ۔۔۔

اب صورت حال کچھ ایسی بن گئی تھی کہ اور ادھا تیرا جلوہ کے ساتھ کنڈیکٹر کی دعا دغا اور استا استا چل رہی تھی۔ ڈرائیور پر گلنے کی تبدیلی نے مثبت اثر ڈالا تھا اس نے اک نئی ترنگ سے گیئر بدلا تھا وہیں مخالف بس کے ڈرائیور نے جیسے اب ہی۔۔۔ اچانک نوال کو دیکھا تھا۔

"ہائیں! یہ کیا چیز ہے بھئی۔۔۔" دراصل جوش و خروش میں پونی کھل گئی تھی اور گھونگھریالے بالوں کا چھتا۔۔۔ ہوا سے اڑ کر نوال کو پہلی نظر میں ناقابل فہم بنا تا تھا۔ غور کرنے پر پتا چلتا تھا یہ تو ایک لڑکی ہے۔

ڈرائیور نے ڈائیوو بس سروس میں لڑکی کنڈیکٹر کا سن رکھا تھا مگر یہ اس کے بھائی بند نے کب رکھ لی لڑکی کنڈیکٹر۔

ادھر نوال نے کنڈیکٹر کی دیکھا دیکھی دو تین بار کی ناکام کوشش کے بعد شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو ہونٹوں کے بیچ رکھ کے سیٹی بھی بجا ڈالی اس عمل سے جہاں مخالف ڈرائیور کے پیر بے ساختہ بریک پر پڑے تھے وہیں انخفش کی آنکھوں کے آگے ہفت آسمان گھوم گئے۔

زمین پھٹ جانا اور سما جانا، چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا۔ اسے محاورے سمجھ آنے لگے۔ (نوال منہ چڑا رہی تھی)

مخالف ڈرائیور اور انخفش دونوں سکتے میں آگئے تھے۔ اور سکتے کی اسی کیفیت میں نوال اور نوال کی بس کب ان کے سامنے سے گزری اور گزرتے گزرتے اتنی دور چلی گئی کہ گرد بھی بیٹھ گئی۔ پتا ہی نہ چلا۔ نوال نے نشست سنبھالی اور بڑی سرشاری کے عالم میں بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے سب کو فاتحانہ نگاہوں سے دیکھا۔ ہر جانب سے نوال کی واہ واہ ہو رہی تھی اور وہ ذرا سی گردن خم کیے اپنا حق سمجھ کر وصول کر رہی تھی۔

جبکہ دوسری جانب۔۔۔ دوسری بس کے مسافروں میں جہاں بددلی پھیلی تھی۔ وہیں ڈرائیور، کنڈیکٹر سے پوچھ رہا تھا۔

"خان نے کنڈیکٹر لڑکی رکھی؟"

کنڈیکٹر نے شانے اچکائے اس کی سمجھ ہی نہ آیا تھا یہ ہوا کیا تھا۔

لڑکی تھی یا چڑیل۔۔۔؟

کنڈیکٹر کو سارا قصور نوال ہی کا لگا تھا۔ ہاتھ جو مل رہا تھا۔

"ارے یہ تو نوال ضمیر خان تھی۔ سیکنڈ ایئر کی۔۔۔" کسی نے پہچان کر آواز لگائی تب ایک طرف ڈرائیور و کنڈیکٹر نے سکھ کا سانس لیا کہ لڑکی ہی تھی۔ چھلاوا نہیں، وہیں انخفش انعام نے کان لپیٹ لیے۔ بھلے سے وہ نوال سے ایک فاصلہ اور اجنبیت رکھتا تھا مگر کئی لوگ جانتے تھے کہ وہ آپس میں رشتے دار ہیں اور پڑوسی بھی ہیں اور۔۔۔۔

انخفش نے فائل منہ پر رکھ لی، مبادا کوئی اور پہچان لے اسے انخفش، انام سے بھی جوڑ دے۔

✿ ✿ ✿

جس قصے کو نوال ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو کر سنا رہی تھی۔ خصوصاً "وہ گالیاں جو اس نے خفش تلفظ کو پکڑ کر دہرائی تھیں۔۔۔ جب بے خود خان نے سنیں تب اس کا رنگ لال ہو گیا اور بیچ کانوں سے دھواں نکلنے لگا اوپر سے نوال کا پرزور اصرار۔

"مطلب بتاؤ ناں بے خود خان۔۔۔ اس کا کیا مطلب ہے۔۔۔ اور اس کا کیا مطلب؟"

پر بے خود کی ناں ہاں میں نہیں بدلی۔

بس اتنا کہہ گیا۔ "آپ کو اللہ کا واسطہ۔ کسی اور کے سامنے مت کہنا۔۔۔ اور مطلب تو بالکل مت پوچھنا۔"

"اچھا۔۔۔" نوال کو مزہ آیا "کیا بہت کراری گالیاں ہیں؟"

بے خود خان کھڑا ہو گیا۔ بات گھوم پھر کر گالیوں کے معنی و تشریح پر ہی آ کر رکی تھی۔

"اب کہاں جاتے ہو؟" نوال نے مجسم لہجے میں پوچھا۔

"جارہا ہوں۔" بے خود خان کا لہجہ خفگی آمیز تھا۔

"ادھر رہا تو آپ میرے سے مطلب پوچھ ہی لیں گی۔" نوال نے ہنستے ہوئے بے خود خان کا مجبور انداز دیکھا۔

"ہاں ان سے کیا بعید..." نوال کی ہنسی تھمی، یہ دروازے کے بیچ و بیچ کھڑا اخفش تھا جس کے تیور اچھے نہیں تھے۔

"تم نے دیکھا اخفش... نوال نے آج کیا کیا۔" اشتیاق احمد کا لہجہ فخر سے بھرپور تھا۔

"جی ہاں!" اس نے دانت پیسے۔ "میں نے ہی تو دیکھا بلکہ سب سے زیادہ دیکھا۔"

"اوہ ریئلی!" نوال الرٹ ہوئی۔ "تم کہاں تھے؟"

"کہاں ہوتا تھا بس میں ہی تھا۔" اخفش کے دانت کچکچانے کی آواز سب کو سنائی دی۔

"میں نے تو نہیں دیکھا کہاں بیٹھے تھے تم؟" نوال نئے جوش سے سوال و جواب کے لیے تیار تھی۔

"تمہاری سامنے والی مزدا میں..."

"واٹ... یعنی تم... اومائی گاڈ... یعنی میں نے تمہیں ہرا دیا... ان بلیو ایبل اخفش انعام! تم پھر ہار گئے۔" وہ سرشار سی ہو کر صوفے پر اوندھی ہو گئی۔

کب سے خاموش نوین کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اخفش کا سرد انداز شدید ترین ناراضی میں بدل رہا تھا۔ اوپر سے نوال کا لوٹ پوٹ ہونا۔

"کمال ہے میں نے تو تم کو دیکھا ہی نہیں۔ مگر یہ تو بتاؤ۔ تم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے کیوں بیٹھے رہے۔ اپنی ٹیم کو بک اپ کیوں نہیں کیا؟"

نوال بے حد معصومیت بھرے اچنبھے سے پوچھ رہی تھی۔ پھر جو وہ شروع ہوا۔

روایات 'اقدار' طور طریقہ لڑکیوں کے سلجھے انداز... وہ باوقار اور نپی تلی ہی اچھی لگتی ہیں۔ یہ ٹام بوائے اسٹائل... اس کی تو ایسی کی تیسی۔ لوگ کیا کہیں گے اور کیا سوچیں گے۔ یہ ہوتا ہے شریف لڑکیوں کا طریقہ؟

"اس نے کنڈیکٹروں والی سیٹیاں بھی بجائیں۔"

اخفش کا شکایت نامہ ابھی باقی تھا۔

"ارے ہاں!" نوال نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "یہ دیکھیں۔" اس کا رخ اشتیاق احمد کی طرف تھا۔ ساتھ ہی اس نے انگوٹھا اور شہادت کی انگلی ہونٹوں کے بیچ رکھ کے سائرن نما آواز نکال کر دکھائی، جہاں اخفش کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہیں اشتیاق احمد مزید فین ہو گئے۔ نوین نے آگے بڑھ کر نوال کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ نوال خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگی۔ اخفش ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

اس کا سارا خطاب سن اٹھارہ سو کے کسی اقدار و روایات کے پابند بابا جی کا سا تھا۔ اور بلند ہوتی آواز غصے کے بڑھنے کی غماز تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا۔ وہ نوال کو پیٹنا ہی شروع کر دیتا۔

"جا رہی ہوں اپنے گھر... آپ کچھ کھلائیں پلائیں اپنے جیتنے کو... اور سچ بات کہوں ناں۔" وہ جاتے جاتے رکی "تم کو اصل غصہ یہ ہے کہ وہ بس کیوں جیتی جس میں 'میں' تھی۔ جیتے ہوتے ناں تم 'پھر میں دیکھتی' بیان بالکل الگ ہوتے۔"

وہ اخفش کی فطرت سے واقف تھی۔

"اور ہاں!" وہ گیٹ سے نکلتے نکلتے پھر کچھ یاد آنے پر رکی۔ "اب شکر کرو کہ میں نے تمہیں نہیں دیکھا۔" نوال کا انداز دھمکی آمیز ہو گیا۔

"اگر جو میں تمہیں دیکھ لیتی۔ قسم خدا کی باقاعدہ نام لے کر کہتی۔

گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو' اخفش انعام مردہ باد! جیتے گی بھئی جیتے گی نوال خان جیتے گی۔"

وہ سیاسی کارکن کے سے انداز میں مکا لہراتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اخفش صوفے پر ڈھے گیا اور واقعتاً" شکر ادا کیا۔

واقعی اگر نوال نے دیکھ لیا ہوتا تو...

☼ ☼ ☼

پے در پے واقعات اور ان سے ملنے والی ہزیمت کے بعد اخفش... نوال سے بچ کر چلتا تھا۔

مگر ایک ہی گھر (نوین اور اخطب کی شادی کے بعد لان کی درمیان والی دیوار میں سے راستہ بنا دیا گیا تھا کہ زینب بیگم اور نوال دو ملازمین بے خود خان اور بے زار لالہ کے ساتھ اکیلے رہتی تھیں) میں رہتے ہوئے حد فاصلہ برقرار نہیں رہ پاتی تھی۔ ٹکراؤ ہو ہی جاتا تھا اور یہ ٹکراؤ کبھی لفظی ہوتا اور کبھی عملی۔

اور اس وقت بھی یہ عملی ٹکراؤ نوال کو دن میں تارے دکھا گیا۔ وہ پاپ کارن کھاتی اس درمیانی دروازے سے گزرتی گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ آسمان بادلوں سے بھرا تھا۔ مگر برسنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اگر یہ ایبٹ آباد ہوتا؟ تو اب تک جل تھل ہو چکا ہوتا۔

وہاں وہ دھوپ کے نکلنے کی دعا کرتی تھی اور یہاں آہ... اللہ' آہ اوئی حسرت سے اللہ کو پکارتی وہ آخر میں تکلیف سے دہری ہو گئی۔ کیا دیوار سے ٹکرائی تھی یا پہاڑ سے... پاپ کارن ہوا میں اچھلے تھے اور موتیا کے پھولوں کی طرح دونوں پر برس کر پیروں میں جا گرے نوال نے نیچے دیکھا اور پھر سامنے...

"اچھا!" اس نے نتھنے پھلائے "تو پہاڑ سے ٹکرائی تھی۔ مطلب اخفش انعام"

"کیا ہے دیکھ کر نہیں چل سکتی تھیں۔" وہ غرایا۔

"دیکھ ہی تو رہی تھی۔" نوال پر کب غراہٹیں اثر کرتی تھیں۔

"سامنے دیکھ کر چلتے ہیں بے وقوف..."

"آپ سے کس نے کہا نانو جان...؟" نازک حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"جس نے بھی کہا وہ تم چھوڑو... صرف یہ بتاؤ' تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے ناں؟" لیلیٰ بیگم جانتی تھیں۔ تو اسی ان کے کہے پر آمنا صدقنا ہے مگر رسماً" پوچھا۔

"جب آپ کو اعتراض نہیں تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" نازک نے ذرا سا کسمسا کر نزاکت سے کمر کے پیچھے کشن درست کر کے نشست کو مزید آرام دہ کیا۔

"سیدھی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ گھرانہ تمہارے لیے بہت پسند آیا ہے۔ اخفش کو تو تم اکلوتا ہی سمجھو۔" لیلیٰ بیگم نے لاپروائی سے کہا۔

"کیوں؟" نازک حیران ہوئی "وہ جوان کے پاپا کی فیملی ہے امریکہ میں... بہن بھائی بھی ہیں۔ صوفیہ نانو بتا رہی تھیں۔"

"ہاں ہاں...! وہ اخفش کے بابا کی فیملی ہے۔ بیٹا' سات سمندر پار کو دور کے سلام..."

"تو یہاں بھی تو ان کے چاچو اخطب کی فیملی ہے۔ پھر دادا دادی بھی جو ہیں۔" نازک نے یاد دلایا۔

"دادا' دادی کون سا تمہارے سر پڑیں گے اور چاچو اور چاچو کی فیملی کو بھول جاؤ میں نے سب سوچ رکھا ہے تمہارا اپنا گھر ہو گا۔ ورنہ اپنے ساتھ رکھوں گی۔ یوں بھی صوفیہ کو میری تنہائی کا بڑا احساس ہے اور انہیں سنبھالنے کے لیے ان کا اپنا بیٹا بھی ہے' ناں..."

"اچھا...!" نازک کی دھیرے دھیرے سمجھ میں آنے لگا۔ "لیکن وہ جو پروپوزل ڈیڈ بتا رہے تھے اور... وہ پھوپھو والی فیملی۔" نازک کو اپنے سب پروپوزل یاد تھے۔

"ہونہہ... ڈیڈ اور ڈیڈ کے پروپوزلز... وہ صرف اب اپنے لیے تیسری ڈھونڈ لے" لیلیٰ بیگم نے شدید ناگواری سے ڈپٹا اور وہ تمہاری پھوپھو والی فیملی... ان کا خاندان نہیں ہے وہ قبیلہ ہے قبیلہ... بھلے سے نوکروں کی فوج ہے۔ مگر پانی بھی سرو کرنے لگ گئیں ناں تو درجنوں گلاس ہوں گے۔" لیلیٰ بیگم کو محض تصور دہلا رہا تھا ان کی لاڈلی نازک مودب بنی پانی پلا رہی ہے۔

"پھوپھو بہت پیار کرتی ہیں مجھ سے..." نازک کے منہ سے نکلا۔

"خالی پیار کا نام ہی ہے ادھر..." لیلیٰ بیگم کی تیوریاں چڑھ گئیں "تم بہت معصوم ہو' میری بچی! تمہیں زمانے کی کچھ خبر نہیں پھوپھو صاحبہ کو خبر ہے' باپ کی اکلوتی ہو اور بے چاری چھوٹی موٹی کی بھی ساری جائداد تمہاری ہے اور میرا سب کچھ تو ہے ہی

تمہارا وہ پیار کیوں نہ جتائیں گی اب کتنی بار سمجھاؤں تمہیں میں۔" لیلیٰ بیگم کو نازک کی معصومیت پر غصہ سا آنے لگا۔

"آپ خفا تو نہ ہوں نانو جان!" نازک نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"خفا نہیں ہوں مگر تم سمجھ کیوں نہیں لیتیں بچہ۔ اس بھری دنیا میں میں ہی تمہاری واحد خیر خواہ ہوں بے چاری چھوٹی موئی تو۔" لیلیٰ بیگم کی آواز بھرا گئی۔

"او نانو جان!" نازک لیلیٰ بیگم سے لپٹ گئی۔

"اب آپ روئیے گا مت۔ ورنہ میں بھی رو دوں گی۔"

نازک کو اس دھمکی کے اثر انگیز ہونے کا پتا تھا۔

لیلیٰ بیگم نے آنسو پونچھنے شروع کر دیے۔

"میں نے دیکھا ہے اس لڑکے انفش کو۔ وہ بہت کیئرنگ ہے۔ بہت ادب سے بات کرتا ہے اور تم سے تو خاص طور پر بہت ریسپیکٹ سے بات کرتا ہے۔ مجھے تمہارے لیے ایسا ہی لڑکا چاہیے، جو تمہیں پھولوں کی طرح رکھے۔ جیسے کانچ کی گڑیا کو سنبھالتے ہیں۔ تمہیں سنبھال لے۔ اتنی نازک سی تو ہو تم۔"

لیلیٰ بیگم نے پیار سے نازک کے گال کو چٹکی میں پکڑنا چاہا۔

(مگر ننھی سی چٹکی میں اتنا گوشت بھلا کہاں سماتا۔ انگلی اور انگوٹھا آپس ہی میں ٹکرا کر رہ گئے۔)

"وہ تمہیں کسی گڑیا ہی کی طرح ٹریٹ کرتا ہے۔ اس دن دیکھا نہیں شاپنگ بیگ بھی تمہارے ہاتھ سے لے لیا تھا کہ وزن ہے اس میں اور جس دن نوین کچن کیبنٹس میں بڑے برتن پتیلے وغیرہ رکھوا رہی تھی تو کیسے اس نے نوین کو سخت کام کرنے سے منع کر کے خود سب پتیلے وغیرہ رکھ دیے تھے۔

نوین کے دونوں بچوں کو دونوں بازوؤں پر ڈال کر کتنی مہارت سے بہلا لیتا ہے۔ جو چچا کے بچوں کے لیے اتنا کیئرنگ ہو، وہ اپنے بچے کیسے نہ پالے گا۔

خود ہی ڈسٹنگ کر دیتا ہے۔ گھر کی ساری سیٹنگ بھی آئے دن خود ہی چینج کرتا رہتا ہے۔ گارڈننگ بھی کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر عورتوں کے حوالے سے بڑا پروٹیکٹیو ہے۔ بڑے محدود مگر پختہ خیالات ہیں کچھ اپنی پدر کے بعد تو۔۔۔"

لیلیٰ بیگم نے گویا انفش انعام پر تھیسس لکھنا تھا۔ ہر پہلو پر گہری نظر تھی۔

نازک بغور سن رہی تھی۔ واقعی نانو جان سچ کہہ رہی تھیں۔ انفش انعام ایسا ہی تھا بہت کیئرنگ اور لونگ بھی۔

وہ جو لیلیٰ بیگم کی بات سنتے ہوئے شروع میں ہچکچاہٹ تھی۔ وہ دور ہو گئی۔ جیسے منظر روشن نظر آنے لگا۔ تب تو ہونٹوں پر مسکراہٹ سی دوڑ گئی۔ واقعی انفش انعام نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھا۔

تو پھر۔۔۔

☼ ☼ ☼

"میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اور مجھے دوسروں سے سننے کو مل رہا ہے۔"

"آپ کے ساتھ پرابلم کیا ہے دادی۔ ابھی لائف میں بہت کچھ کرنا ہے۔ آپ پہلے ہی پر کاٹ دینے پر تلی ہیں۔" انفش سن کر ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"اتنی جلدی تو لوگ بیٹی نہیں بیاہتے دادی جان۔" اس نے دہائی دی۔

"کیوں نہیں بیاہتے؟" صوفیہ بحث پر اتر آئیں "تم سے چھوٹی ہے نازک اور لیلیٰ اسے بیاہنے کو تیار ہے۔"

"اوہاں۔ آپ کو نازک کا خیال ہی کیوں آیا۔ ایسے بیٹھے بٹھائے۔" انفش کو دوسرا مسئلہ بھی یاد آیا۔

"سیدھی بات ہے۔ مجھے تو وال ہی پسند تھی۔ اب بھی ہے۔ مگر اس کا نام سن کر تم یوں بدکے جیسے میں نے لٹھ مار دیا۔"

"او خدا۔۔۔ وہ بلا، آپ اب تک بھولیں نہیں اسے۔" انفش نے سر پکڑا۔

"وہ بھولنے والی چیز ہے بھلا۔ ایسی چلبلی، شوخ، صبح بہار اس سی لڑکی۔ تمہارے دادا بھی کتنے خوش ہو

گئے تھے۔ اخطب اور نوین نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ بس تمہیں ہی پتنگے لگ گئے۔"

"مجھے نہیں لگتی اچھی دادی جان! مجھے کبھی بھی مردانہ اوصاف رکھنے والی مردمار لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔" اخفش عاجز آکر کھڑا ہو گیا۔ "ایک ہی بات کو کتنی بار دہرایا جائے' خود کو ہر فن مولا سمجھنے والی لڑکیاں' ہر بات میں گھسنے والی بلاوجہ کی تکرار' عورت مخفی چیز کا نام ہے۔ اپنے دائرے میں سمٹی ہی اچھی لگتی ہے۔ یہ کیا کہ۔۔۔ خود انحصاری کے نام پر اپنی جبلت ہی چھوڑ دے' پُراعتماد ہونا اچھی بات ہے مگر حد سے بڑھی نوال جیسی خود اعتمادی اور خود مختاری مجھے پسند نہیں۔۔۔

میں ایسی لڑکیوں کو نا صرف ناپسند کرتا ہوں بلکہ ان سے کوسوں دور بھاگتا ہوں اور آپ کہتی ہیں کہ زندگی بھر کے لیے۔۔۔ نیور امپاسبل۔۔۔"

سال پہلے اس نے صرف قطعیت سے انکار کیا تھا تب برا لگا تھا۔ اور آج وجوہات بھی بتادی تھیں اور ان الفاظ اور لہجے کے اتار چڑھاؤ نے صوفیہ بیگم کو سخت بدمزہ کیا۔

"بہت افسوس ہوا اخفش! جنہیں تم نے اتنے بُرے لہجے میں برائیاں گنوایا ہے وہی تو اس بچی کی خوبیاں ہیں۔ محبت کرنے والی' ملنسار' قابل' ذہین' درد مند' ہنسنے والی' ہنسانے والی' زندگی کی مشکلوں کو ہنس کر جھیل جانے والی باہمت لڑکی۔ ایسی لڑکی جس پر آنکھ بند کر کے بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح اس نے اپنے معذور باپ کو زندگی کی طرف واپس موڑا۔ وہ بھی صرف آٹھ سال کی عمر میں۔ تم نے نجانے تعصب کی کون سی عینک آنکھوں پر لگا رکھی ہے۔ جس میں اس کا اجلا تن اور من دکھائی ہی نہیں دیتا۔"

تواتر سے بولتی صوفیہ بیگم کا لہجہ ناراضی سے بھرپور ہوتا جا رہا تھا۔

"میں تو چاہوں گی نیہجہ' نوال سی خصوصیات لے کر پروان چڑھے۔" ان کا لہجہ سچائی کا مظہر تھا۔ جو دو ماہ کی پوتی کے لیے نوال جیسا بن جانے کی دعا مانگ رہی تھیں۔ اخفش نے پہلی بار چونک کر دادی کو دیکھا۔

"اپنے زورِ بازو پر بھروسا صرف مردوں کی خوبی نہیں' یہ انسانوں کی خوبی ہوتی ہے۔ مرد تناور درخت کی طرح ہوتا ہے۔ ایستادہ مضبوط۔ عورت نازک بیل سی ہوتی ہے۔ مگر چڑھتی ہمیشہ اوپر کی طرف ہے۔ نکلنے والا ہر نیا پتا اور بڑھتی شاخ اوپر ہی کو اٹھتی ہے۔ پھر کسی کو دیوار ملے نہ ملے الگ بات ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔

اور رہے تم۔۔۔ تمہیں نازک جیسی لڑکی ہی سوٹ کرتی ہے۔ میں عنقریب تمہارے دادا اور باپ سے مشورہ کر کے بات کو آگے بڑھاتی ہوں۔"

"آپ تو خفا ہو گئیں دادی جان!" اخفش دوبارہ ان کے قریب آبیٹھا۔

"نہیں' کوئی خفا نہیں۔ مگر میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے' میری شدید ترین خواہش تھی کہ نوال نہ سہی' نوال جیسی فطرت کی حامل لڑکی تمہاری زندگی میں شامل ہو۔ مگر تم۔"

صوفیہ اٹک گئیں۔

"من مانی کسی کی بھی اچھی نہیں لگتی۔ مگر اپنی کرتی عورت پر ہی حد لگاتے ہیں۔ عورت سسکتی گڑگڑاتی محتاج ہی کیوں اچھی لگتی ہے۔ اللہ نے اسے پورا مکمل انسان بنا کر بھیجا ہے۔ کوئی کمی نہیں رکھی کہ اس پر ترس کھایا جائے یا کمتر سمجھا جائے۔

دین کے کسی رکن کی ادائی میں اس کے لیے چھوٹ نہیں۔۔۔ مرد و عورت کی نماز برابر۔۔۔ زکوۃ برابر۔۔۔ حج یکساں۔۔۔ جزا پوری' سزا ایک سی' برا ایسا کچھ نہیں ہے۔ اللہ کوئی چیز بنائے اور وہ کمتر ہو؟ استغفار۔"

صوفیہ بیگم نے جھرجھری لی۔ ان کی آنکھ میں خوفِ خدا نے نمی سی پیدا کر دی تھی۔ دل گرفتی سے پوتے کو دیکھا جو بالکل سفید چہرے کے ساتھ کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

"جاؤ۔۔۔ میں اب تھوڑا آرام کروں گی۔" صوفیہ بیگم نے نظریں پھیر لیں۔

اخفش شرمسار سا پیچھے ہو گیا۔ صوفیہ تکیہ درست کر کے لیٹ گئیں۔ اخفش مجرم سا کھڑا کا کھڑا تھا۔

"میں عورت کو کمتر تو نہیں سمجھتا دادی جان! آپ نے جو کچھ کہا میں اس سے اگری کرتا ہوں۔"

اخفش بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا اور ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"اور میں خدانخواستہ نوال کی کردار کشی نہیں کر رہا۔ وہ سچ مچ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اور یہ بات میں دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ مگر بس۔۔۔ لائف پارٹنر کے حوالے سے میرے کچھ اصول ہیں پلیز انڈر اسٹینڈ می دادی جان۔" وہ مجبور سا ہو گیا صوفیہ اس کی شکل دیکھنے لگ گئیں۔

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں دادی جان!" خاموشی کا وقفہ اعصاب پر حاوی ہونے لگا تب اخفش کا بے بسی میں گھلا لہجہ صوفیہ بیگم کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

"مجھے یقین آگیا ہے۔ میرا بچہ اتنا غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ اور پھر میری تربیت اتنی خراب بھی نہیں تھی۔" وہ مسکرائیں۔

"تو پھر اصل بات یہی ہے۔ یہ دوسری والی۔" اخفش ان کے اوپر جھک آیا۔ صوفیہ بیگم نے بھی جھٹ لپٹا لیا۔ ماتھے پر بوسہ دیا۔

"نازک کے لیے اگر تم ہاں کرتے ہو تو تمہارے باپ کو فون ملا دوں امریکہ۔" صوفیہ بیگم کو یاد آیا۔

"اب آپ شرمندہ مت کریں دادی جان! آپ کو سارے حق ہیں، جو فیصلہ کریں۔"

"نہیں بھئی۔۔۔!" صوفیہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

"میں پہلے بھی اسی بھروسے نوال کا نام لے کر تمہارے باپ سے بات کر چکی ہوں پھر تمہارے انکار نے مجھے شرمندہ کروایا۔ اب تم گرین سگنل دو گے تو بات بڑھے گی۔" صوفیہ بیگم نے یاد کروانا ضروری سمجھا۔

شرمندہ ہوتا اخفش یکدم چونکا اسے بروقت یاد آیا تھا۔

"آپ مسلسل مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرا رہی ہیں دادی جان! جیسے سارے قصور میرے ہوں۔ اس نوال کی بچی نے بھی تو صاف انکار کیا تھا کہ زندگی بھر کنواری رہے گی مگر اخفش انعام توبہ توبہ۔"

اخفش نے کانوں سنی بات دہرائی۔ چہرے پر غصہ بھی عود کر آیا تھا۔ آنکھیں شرربار ہو گئیں۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔

"ہاں تو ٹھیک ہے ناں۔۔۔ اس کا حق تھا اس نے استعمال کر لیا۔ اور تم نے اخفش! الزام کا ٹوکرا اٹھا کر ایک بار پھر اس کے سر رکھ دیا۔"

صوفیہ بیگم نے جتایا مگر اخفش کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ "اس نے بھی تو منع کر دیا تھا۔ بلکہ طوفان اٹھایا تھا۔"

★ ★ ★

"کیا؟" پانی پیتی نوال کو اچھو لگا تھا۔ ایک پھوار سی منہ سے نکلی ہاتھ کی پشت ہونٹوں پر رگڑ کر اس نے نوین کی صورت دیکھی۔

"واقعی۔۔۔ آپ نے وہی کہا ہے جو میں نے سنا۔" اسے اپنی قوت سماعت پر بھی شک ہوا بات ہی ایسی تھی۔

"تم نے وہی سنا ہے جو میں نے کہا ہے۔" نوین نے جتا جتا کر کہا۔

"خالہ! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" نوال اپنی جگہ سے اٹھ آئی۔ اور نوین کا ماتھا چھو کر دیکھا۔

"ختم کرو نوال۔۔۔ زیادہ ہو گئی۔" نوین کو ایسے ہی ردعمل کی توقع تھی۔

"میں نے صرف تمہیں یہی بات کہنے کے لیے بلوایا ہے اور بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کہی ہے۔ ایسی باتیں یونہی منہ سے نہیں نکالی جاتیں۔ سمجھیں۔" نوین نے اپنے رتبے کے حساب سے مدلل اور قطعی لہجہ اپنایا۔

"وہ مجھے پتا ہے۔" نوال تسلی سے نشست پر براجمان ہوئی۔ "لیکن مجھے گمان ہوا آج کل آپ کے سارے کام الٹے ہو رہے ہیں۔ کبھی پودینے کی ڈنڈیاں چباتی ہیں، کبھی کچے چاول۔"

نوال نے بڑے منہ بنائے "اور اس دن اف نوال کی آنکھیں پھیلیں۔" "آپ چینی کا ڈبا گود میں لیے بیٹھی تھیں اور مٹھیاں بھر بھر کے پھنکے مار رہی تھیں اف!" اس نے جھرجھری لی "تو مجھے یونہی خیال آیا آج کل

دماغ الٹا ہوا ہے تو بات بھی الٹی ہی کریں گی۔"

اپنی تجزیاتی رپورٹ پیش کرنے کے بعد نوال ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ نوین نے دانت پیس کر اسے گھورا (نوین کی پریگننسی کا آغاز تھا۔ وہ واقعی سارے الٹے کام کرتی پائی جاتی تھی۔ اگر نوال نے بات کو جوڑا تھا تو ایسا غلط بھی نہیں تھا مگر)

"یہ میری ہی نہیں اخطب کی بھی خواہش ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" نوال کی آنکھیں ابل پڑیں۔

"ہاں۔۔۔ میں تو بقول تمہارے پاگل ہو چکی ہوں، اب ان کے لیے بھی کچھ کہہ دو۔"

"کچھ کیا؟" نوال نے ہاتھ نچایا "خربوزے کو دیکھ کر خربوزے نے رنگ پکڑا ہوگا۔ مجھے ان کی عقل پر شک ہونے لگا ہے۔

ماں بنتی عورت کی جسمانی حالتوں میں فرق آجاتا ہے تو ہو سکتا ہے باپ بننے والے کا دماغ الٹ جاتا ہو۔ تب ہی وہ کچھ بھی سوچ لے۔۔۔ کہہ دے۔"

نوال نے نتیجہ پیش کر دیا اور وہ اپنے طور پر درست بھی تھی اس کی اور اخفش کی شادی کی بات کرنے والا یا تو ہوش و حواس میں نہیں ہو سکتا یا پھر اس کا واقعی دماغ الٹ گیا ہو۔

"یہ ہم سب کی خواہش ہے نوال کی بچی۔۔۔! اشتیاق انکل، صوفیہ آنٹی۔۔۔ اخطب اور میں بلکہ امی بھی یہی چاہتی ہیں۔" نوین نے صاف بات کرنا بہتر سمجھا۔

"آپ مجھ سے بدلہ لے رہی ہیں خالہ!" نوال کو خیال آیا۔

"بدلہ۔۔۔ کیسا بدلہ؟" نوین کے سر سے گزری یہ بات۔

"یہی بدلہ کہ میں نے جیسے آپ کی شادی کروادی تو اب آپ میری۔۔۔ آہ۔" اس نے لہجے میں مصنوعی یاسیت پیدا کی۔ "لیکن خالہ! میں نے تو آپ کا بھلا چاہا تھا اور آپ۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ (جھوٹ موٹ)

"اوہ نوال۔۔۔!" نوین نڈھال ہو گئی۔ "میری پوری بات تو سن لیں۔"

وہ بات کو حسب عادت ہوا میں اڑا رہی تھی۔ ایک بار سنجیدگی سے سن تو لیتی۔ صوفیہ نے اعلان کیا تھا اخطب کی شادی میں دیر ہو گئی۔ وہ اخفش کی بہت جلدی کریں گی۔ اور صوفیہ نے یکدم تو کہہ نہیں دیا تھا۔ وہ نجانے کب سے اس معاملے پر سوچ رہی تھیں، اشتیاق احمد نے یہ سن کر انہیں سراہا۔ اور پھر جب لڑکی کا نام سنا تو اش اش کر اٹھے (اس وقت لڑکی بھی اش اش کر رہی تھی)۔

"اخطب کو بھی تم بہت پسند ہو نوال۔۔۔ سب سے زیادہ تو وہ خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ اگر نوال۔۔۔"

"خالہ۔۔۔" نوال بری طرح چونکی نوین کا جملہ کاٹ دیا اور سامنے بیٹھ کر دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے نوین گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔ کیا ہو گیا تھا اب۔

"کہیں ایسا تو نہیں۔۔۔ وہ آپ کو بلیک میل کر رہے ہوں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ میری معصوم سی خالہ۔۔۔ کہ جاؤ اپنی بھانجی کا رشتہ لے کر آؤ اور اگر خالی ہاتھ آئیں تو تمہارے لیے بھی اس گھر کے دروازے بند ہوں گے۔" نوال نے ڈرامائی لہجہ اختیار کیا۔

"ارے۔۔۔!" نوین اچھل ہی تو پڑی۔ "اللہ نہ کرے اور اخطب کیوں کہیں گے ایسا۔"

"نہیں خالہ! آپ مجھ سے دل کا حال کہہ سکتی ہیں۔ کیا وہ آپ کو مجبور کر رہے ہیں اگر ایسا ہے تو آپ کھل کر مجھے بتایئے۔۔۔ بتایئے بتایئے۔" نوال کا انداز پچکارتا ہوا ہو گیا۔ "میں اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔ میرے ہوتے ہوئے یہ سب۔۔۔ اونو"

"خدا کے لیے نوال!" نوین نے نوال کی بلند ہوتی آواز اور مقررانہ انداز سے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بے چاری پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ اخطب ایسے نہیں ہیں، یہ تو بس ایک خواہش ہے اور تم سنتی تک نہیں۔ بات کو کہاں سے کہاں لے گئیں تم سیھسلی سنو تو۔" نوین تھک گئی۔

"اوکے!" نوال نے ہاتھ اٹھائے۔ "اگر بات سیریس ہونے کی ہے تو خالہ میرا اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ ہمارا مینٹل لیول... ٹوٹلی اپوزٹ... مجھے سب کی محبت اور خلوص پر کوئی شک نہیں مگر پلیز اس بات کو یہیں ختم کردیجیے۔"

"تم ایک بار غور تو کرتیں نوال!"

"غور و فکر تک کیسے پہنچوں خالہ... جب سن ہی نہیں پاتی۔"

"وہ بہت اچھا ہے نوال!" نوین کو بہت محبت اور انسیت تھی اس سے۔

"سچ خالہ! میں نے کب کہا۔ وہ برا ہے۔ وہ واقعی بہت اچھا ہے مگر ہمارا کوئی کنکشن ہو ہی نہیں سکتا۔" نوال نے بے حد سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے لجاجت سے کہا۔ نوین اثبات میں سرہلانے لگی۔ جیسے تسلیم کر رہی ہو۔ مگر اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔

"اور خالہ! صرف میں ہی کیوں، مجھے یقین ہے یہ آئیڈیا جب آپ کا چہیتا سنے گا تو وہ تو طوفان اٹھادے گا۔ کپڑے پھاڑ کر جنگل میں نکل جائے گا قسم سے۔" نوال ہنسی اور انداز اتنا بے ساختہ تھا نوین کے لبوں کو بھی مسکراہٹ چھوگئی۔

"یہ ہوئی ناں بات۔" نوال نے نوین کے شانے پر بازو پھیلا دیا۔

"آن سیریس نوٹ خالہ... میں اور اخفش بجلی کے دو مخالف تار ہیں۔ جن کے ٹکرانے سے صرف دھماکا ہو سکتا ہے۔ ہم ندی کے دو کناروں کی طرح ہیں خالہ..." نوال نے افسانوی مثال دی "ہم ٹرین کی پٹری کی طرح ہیں، جو ساتھ چل تو سکتی ہیں مگر ملتی کبھی نہیں۔" نوال نے اداکاری کی حد کردی۔ گردن افسردگی سے گرادی۔ جیسے دل پھٹ جانے کو ہو۔ نوین نے سر پکڑ لیا۔

"دراصل خالہ میں اور اخفش... ہم دونوں۔"

"باس!" نوین نے دونوں ہاتھ کھٹاک سے جوڑ دیے۔ "مجھے پتا چل گیا۔ تم اور وہ... وہ اور تم ایک دوسرے کے لیے نہیں ہو۔ مجھے معاف کردو، ہماری توبہ جو آئندہ ایسا خیال۔"

"خالہ! بے ہودہ خیال..." تسلی سے سنتے ہوئے اس نے تصحیح کے لیے اضافہ ضروری سمجھا۔

"ہاں ہاں بے ہودہ خیال جو ہم کبھی ذہن میں لائیں۔" نوال متانت سے سرہلاتی رہی۔ نوین اپنا عہد دہراتی رہی۔

☆ ☆ ☆

نوال بلا کی سحر خیز تھی۔ اور ادھر اتوار کے دن سب دوپہر تک سونا فرض سمجھتے تھے۔ نوال نے بھی دیر تک سونے کی اس عادت کو اپنانا چاہا تھا مگر ناکامی ہوئی۔ لہٰذا وہ حسب عادت اپنے وقت پر ہی اٹھتی اور اشتیاق احمد کے ساتھ واک پر نکل جاتی۔ کبھی وہ گھر کے پاس والے پارک تک جاتے اور کبھی اشتیاق احمد گاڑی نکال لاتے اور یہ دونوں ساحل پر پہنچ جاتے۔

اس وقت بھی اچانک پروگرام بن گیا اور صبح صبح یہاں آکر مانو مزہ آگیا۔ اگست کے مہینے کی بادلوں سے ڈھکی ذرا ذرا برستی صبح۔

گیلی ریت پر پیر پڑے تو پورے جسم میں سردی گدگدی سرسرا اٹھی... دور آسمان پر اڑتے پرندے... بہت دور نگاہ کی حد پر نقطہ نظر آتی پانی کے سینے پر ڈولتی لانچیں... چیدہ چیدہ پڑی سیپیاں... ایک مکمل منظر اور منظر کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہنستی مسکراتی نوال... محبت شفقت اور دلچسپی سے نوال کو دیکھتے اشتیاق احمد...

نوال کی رکتی ہنسی ایک بار پھر زور پکڑ گئی۔ اشتیاق احمد نے بات ہی ایسی کی تھی۔

"میں اب تمہارے لیے جاگنگ سوٹ خود اپنی پسند کا خرید کر لاؤں گا۔ تمہیں تو ذرا سینس نہیں کیسے کپڑے اور کلرز چوز کرنے چاہئیں۔" وہ واقعتاً بدمزہ ہوئے تھے۔ نوال نے سفید تنگ ٹراوزر پر گول دامن والی گرے اور سفید پرنٹڈ شرٹ پہن رکھی تھی۔ کسی اور سوٹ کا دوپٹا اٹھا کر شانے سے آگے پیچھے ڈال کر پہلو میں گانٹھ لگا کر... پیروں میں بڑے بے ہودہ سے

جاگرز کے ساتھ وہ اپنے تئیں خود کو بالکل ٹھیک سمجھ رہی تھی۔ جبکہ اشتیاق احمد کا موڈ ہی خراب ہو گیا تھا۔

نوال کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر اس نے اشتیاق احمد کو بغور سر تا پیر دیکھا۔ اپنے فیورٹ جاگنگ سوٹ میں ملبوس۔۔۔ ڈارک اورنج کلر کا سوٹ جس کے سینے پر فیروزی سرخ اور آتشی گلابی پٹیاں لگی تھیں۔ پیلے رنگ کے جوگرز کے ساتھ اپنے سفیدی مائل گرے گھنے بالوں کو ہوا سے اڑنے سے بچانے کی کوشش کرتے وہ آسٹریلین طوطے سے کیا کم لگ رہے تھے۔

اور اس پر جب نوال کو اپنا جائزہ لیتا پایا تو انداز میں زیادہ اعتماد اور بے نیازی در آئی تو نوال کی رکتی ہنسی دوبارہ فضا میں گونجنے لگی۔

"واقعی میں آپ جیسا ڈیسنٹ اور ایلیگنٹ ڈریس سینس کہاں سے لاؤں۔"

اشتیاق احمد نے حق سمجھ کر سر ہلاتے ہوئے تعریف وصول کی بلکہ آگے پھندنا بھی لگایا "میری کلر چوائس کی تو ایک دنیا تعریف کرتی ہے۔" دوبارہ انہیں سر سے پیر تک دیکھا اور ہونٹ پھیلا کر سر ہلایا۔ اشتیاق احمد کا سینہ فخر سے تن گیا' دونوں ساحل پر ٹہل رہے تھے۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ۔۔۔" نوال بولی۔ "آپ روز مرہ روٹین میں اتنے برائٹ کلرز استعمال کرتے ہیں تو اپنی شادی پر تو آپ نے سارے ارمان پورے کیے ہوں گے؟ کون کون سے کلرز چوز کیے تھے۔"

مسکرا کر سنتے اشتیاق احمد کا موڈ آف ہو گیا۔ اتنا برا منہ بنایا جیسے کڑوا بادام چبا لیا ہو۔

"ہاں ہو گئے تھے ارمان پورے۔۔۔ مایوں مہندی میرے ابا نے کرنے نہیں دی۔ بولے کاکے تو مرد ہے کہ زنخا خبردار۔۔۔ جو کوئی ڈراما کیا۔ گھر کے باہر والی دیوار پر بھی چونا پھروا دے اور سامنے کے درختوں کے تنوں پر اپنے ہاتھوں سے پھیر دے۔ مہمانوں نے آنا گھر کے اندر ہے۔ مگر گلی سے گزر کر ہی آئیں گے۔ سارے ہاتھ کٹ گئے تھے چونے سے۔۔۔ نکاح نامے پر سائن تک نہیں کیے جا رہے تھے۔"

قصے سے زیادہ اشتیاق احمد کا انداز بیان دلچسپ تھا۔ نوال ہنس دی۔

"تو بارات' ولیمہ کے سوٹ اپنی پسند کے بنوائے ہوں گے۔ مایوں کا پیلا کرتا نہ پہننے کا دکھ ختم ہو گیا ہو گا۔" نوال نے لاپروائی سے کہا۔

"ہونہہ!" اشتیاق احمد نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"دونوں جوڑے صوفیہ کے گھر سے آنے کا رواج تھا اور تم کیا ان کی چوائس سے واقف نہیں۔۔۔ بارات کی سرمئی شیروانی اور جناح کیپ۔۔۔ مجھے لگ رہا تھا۔ میں بیاہنے نہیں اسمبلی کے اجلاس میں حلف اٹھانے جا رہا ہوں۔ ولیمہ کے لیے کوٹ پینٹ تھا۔ میں ریڈ بو (کالر کے سرے پر لگائی جانے والی سلک کی تتلی) لگانا چاہتا تھا۔ ادھر سے بسکٹی رنگ کے سوٹ کے ساتھ ڈارک براؤن سلک کی سادہ ٹائی آ گئی۔ سوٹ تو بدل نہیں سکتا تھا۔ ٹائی ہی کچھ رنگین شوخ ہو جائے' تب والد صاحب نے ڈانٹ دیا۔ دلہن کا دل برا ہو گا اور وہ جو میرا دل برا ہوا تھا وہ۔"

اشتیاق احمد کا انداز و لہجہ اس بہو کا سا تھا جو قبر میں ٹانگیں لٹکائے ہوئے بھی سسرال سے آئی بری میں کیڑے نکالنا نہیں بھولتی۔ کتنے عرصے بعد آج کسی نے دل کی کہنے سننے کا موقع دیا تھا۔ پھولتے پچکتے نتھنے' چڑھی آنکھیں' نخوت اور آخر میں پچھتاوا۔۔۔ نوال کی آنکھیں پھیلتی جاتی تھیں۔

اس نے ایسی باتیں کبھی سنی نہیں تھیں اور وہ بھی ایک مرد کے منہ سے۔۔۔ پر اسے اپنی ہنسی قصداً" روکنا پڑی۔ کیونکہ اشتیاق احمد تو یاد ماضی کے صدمات سے ابھر ہی نہ پا رہے تھے۔ بچوں کی طرح ہونٹ لٹکا کر خفا ہو بیٹھے۔ وہ تو واقعی دکھی تھے۔ لہٰذا نوال کو ہمدرد کا کردار ادا کرنا چاہیے تھا۔ ایسا کیا کرے کہ ان کا موڈ بحال ہو۔

"چلیے۔ آپ انفش کی شادی میں اس کے لیے اپنی پسند کی شیروانی بنوا لیجیے گا۔ بلکہ اس کے لیے ہی کیوں اپنے لیے بھی۔"

"واقعی۔۔۔" اشتیاق احمد کی آنکھوں میں مسرت اتری۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔"

"ہاں تو میں بتا رہی ہوں ناں اب۔" نوال نے کہا۔
"پر اس وقت پتا نہیں کتنا وقت لگ جائے۔" اشتیاق احمد کو شاید ہتھیلی پر سرسوں جمانا تھی۔
"آجائے گا عنقریب آجائے گا۔ وہ وقت بھی۔۔۔" صوفیہ دادی کے ارادے تو نیک ہیں۔" نوال ہنسی۔

"ہاں۔" اشتیاق احمد کے لہجے میں اشتیاق کا فقدان تھا۔ "شادی کا ارادہ تو نیک ہے مگر مجھے لڑکی اتنی پسند نہیں۔"
"ارے!" نوال کو اتنے قطعی پن پر تحیر ہوا۔ "کیوں اتنی پیاری سی تو ہے۔ خوب صورت 'پھر رشتے دار ہے اور میرے خیال میں اخفش کی پسند کے عین مطابق ہے۔" نوال اتنے دنوں سے نازک کو دیکھ رہی تھی۔ اتنا تو جان ہی گئی۔
"ہونہہ۔۔۔ اخفش اور اخفش کی پسند۔۔۔" اشتیاق احمد نے بدمزہ ہو کر دہرایا۔
"آپ کو کیا اعتراض ہے۔"
"مجھے کوئی اور لڑکی پسند ہے۔" اشتیاق احمد نے براہ راست نوال کی آنکھوں میں جھانکا۔
"شادی آپ کی نہیں ہونی۔" نوال نے نگاہیں چرائیں۔
انکار کیا تو تھا۔ اشتیاق احمد کے منہ پر بھی کر سکتی تھی۔ تمام دلائل و حقائق کے ساتھ 'مگر اب ان کے منہ پر ان کے پوتے کے عیب نکالتی؟ اور ان سے کیا بعید۔۔۔ رونا ہی شروع کر دیں 'لہٰذا نوال نے بات کو ہلکا پھلکا رنگ دیا۔
"ویسے تمہیں اخفش پر کیا اعتراض ہے؟" اشتیاق احمد نے معصومیت کی حد کر دی۔
"اعتراض۔۔۔ تصحیح کرلیں 'اعتراضات ہیں اور صرف میں ہی کیوں اسے مجھ سے بڑھ کر مجھ پر اعتراضات ہیں۔" نوال نے صاف گوئی کی حد کر دی۔
"اور دوسرے ہم اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔ یہ بات سال پہلے طے کرلی تھی۔"
نوال نے دوستی کے کچھ اصول یاد کروائے۔ ایک دوسرے کی رائے کا احترام۔۔۔ حاوی نہ ہونا۔ مجبور نہ کرنا۔ اشتیاق احمد نے سر ہلایا۔ جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے نوال نے بھی پیش قدمی کی اب دونوں خاموش اپنی اپنی سوچ میں گم ریت پر چل رہے تھے۔
"اب کیا ہم یوں خفا خفا رہیں گے۔" اشتیاق احمد کو لگا وہ ناراض ہو گئی ہے۔
"ارے نہیں۔" نوال چونکی "میں تو بس سوچ رہی ہوں۔ ہمیں اپنی تیاری پوری رکھنی چاہیے۔ ہم تو بھئی دل بھر کے ارمان نکالیں گے۔ پہلے ہی خالہ کی شادی 'شادی کم خفیہ مشن زیادہ تھا۔ خشک سانس اور ہر پل خطرہ۔"
اشتیاق احمد نے بھی زور و شور سے سر ہلا کر تائید کی۔
"ویسے یہ نیک کام کب انجام دیا جائے گا۔ یہی رشتہ وشتہ 'منگنی وگنی۔"
"عنقریب ہی۔۔۔ لیلیٰ بیگم اپنے گھر واپس لوٹ جائیں تو پھر ہم سب جائیں گے باقاعدہ رشتہ لے کر۔۔۔ صوفیہ سارے ارمان نکالنا چاہتی ہیں وہی تمہاری والی بات اخطب اور نوین کی شادی تو ایسی اچانک ہوئی کہ۔۔"

نوال سر ہلانے لگی۔
"کہہ رہی تھیں۔ جھولی پھیلا کر مانگوں گی نازک کا ہاتھ اپنے اخفش کے لیے اور ایسی بارات چڑھاؤں گی کہ دنیا دیکھے گی۔" اشتیاق احمد بتا رہے تھے 'پر نوال ٹھٹک کر رک گئی تھی۔
"تمہیں کیا ہوا؟ رک کیوں گئیں؟"
"آں۔۔۔ کچھ نہیں۔" نوال اپنے خیالات سے ابھری۔
"میں تو بس یہ کہہ رہی تھی صوفیہ دادی سے کہیے گا جس دن جھولی پھیلا کر نازک کو مانگنے جائیں۔ اے لائن قمیص پہن لیں۔ اب سیدھی قمیص کے دامن میں اتنی گنجائش کہاں کہ اس میں نازک اندام سما سکے۔"
نوال کا لہجہ بے حد سنجیدہ اور متفکر سا تھا۔ اشتیاق

احمد بغور سن رہے تھے۔ مشورہ ختم ہوا۔ تب چونک کر نوال کی شکل دیکھی۔ جو ہونٹ کا کونا دانت میں دبائے ایڑی پر گھومتے ہوئے ان کی آنکھوں ہی میں دیکھ رہی تھی۔

"بہت شریر ہو تم۔" اشتیاق احمد نے شفقت سے نوال کو ڈپٹتے ہو سر پر چپت لگائی۔

"جناب...!" نوال سر تسلیم خم کرتے ہوئے آداب بجالائی۔

☆

نوال یونی ورسٹی سے لوٹی تو اس کے پاس ایک نئی اسٹوری تھی۔ اسٹوری بھی کیا ایک مشن... پورا ملک سیلاب' بارشوں' طوفانوں کے سبب تباہی کے زیر اثر تھا۔ لہٰذا ایک مستند فلاحی تنظیم اور فوج کے جوائنٹ وینچر کے تحت امدادی سامان کو لے کر کچھ گروپس ان علاقوں کی جانب روانہ کیے جا رہے تھے۔ ان میں گرل گائیڈز' اسکاؤٹس' ڈاکٹرز اور دوسرے بہت سے لوگ بھی شامل تھے۔ جو آفت زدہ علاقوں میں کسی بھی حوالے سے مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ لہٰذا جانے والوں کی لسٹ میں سب سے اوپر نام نوال ضمیر خان کا تھا۔

زینت بیگم کو سنتے ہی ہول اٹھنے لگے۔

"ارے وہ سب آفت زدہ مجبور لوگ گھربار چھوڑ کر کھلے آسمان تلے بیٹھے ہیں۔ تم کہاں جانے لگیں۔"

"ان کی مدد کرنے نانو..." نوال کاغذ قلم لے کر ایک لسٹ بنا رہی تھی۔

"تو رہو گی کہاں؟"

"کیمپ میں نانو..."

"کھانا پینا کیسے ہو گا؟"

"خود پکائیں گے نانو... لکڑیاں جلائیں گے۔ مٹی کے تیل کے چولہے نانو۔"

"ارے بابا... چولہے پھٹ جاتے ہیں۔" زینت بیگم نے دل پر ہاتھ رکھا۔ نوال نے تاسف سے سر ہلایا۔

"میں اپنی سسرال نہیں جا رہی نانو... کہ میرا چولہا پھٹ جائے۔ میں ہیلپ کے لیے جا رہی ہوں۔"

"اللہ نہ کرے کیسی بدفالیں منہ سے نکال رہی ہو۔ خدا تمہیں ہنستا بستا گھر بار دے۔ سب کے دلوں پر راج کرو۔ ایسے نہیں بولتے بیٹا...!" زینت بیگم کو وہم ہی ہو گیا۔ "تم تو پری ہو شہزادی۔ دل میں گھر کرنے والی گڑیا..."

"بس نانو!" نوال سے ان کی پھولتی سانسیں برداشت نہ ہوئیں۔ ابھی بی پی بڑھ جائے یا شوگر گر جائے... "نہیں پھٹے گا میرا چولہا... بلکہ آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں چولہا پھاڑ کے آجاؤں گی' کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں نے کیا ہاتھوں میں چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔" نوال نے دونوں بازو لہرا کر دکھائے۔

"یا اللہ...!" زینت بیگم نے سر پکڑا۔

"لوگ! ماں' باپ کیا کہیں گے' جوان لڑکی کو کدھر بھیج دیا میں نے..."

"نانو...!" اس نے قطعیت سے پکارا "میں کوئی اکیلے تھوڑی جا رہی ہوں پوری ٹیم ہے ٹیم... اور پھر میں نے ایٹتھ اسٹینڈرڈ میں ہنگامی حالات سے نبٹنے کی تربیت لی تھی۔ ایبٹ آباد کے زلزلے کے بعد پوری قوم کو چاہیے تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور سیکھے جو خدانخواستہ ایسے حالات میں کام آئے۔ مگر۔" نوال نے تاسف سے کہا۔ "وہاں میری ضرورت ہے نانو... ناکارہ ہونا جرم نہیں ہوتا... لیکن آپ کار آمد ہیں اور پھر بھی کسی کے کام کے نہیں... اس سے بڑا جرم کوئی نہیں اور ایسے عمل کو بھی کفران نعمت کہتے ہیں۔"

نانو پر تقریر کا اثر ہونے لگا۔ چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

"اچھا... تو پھر جانا کب ہے؟"

"بس دو دن بعد..." نوال نے بتاتے ہوئے نانو کو سیلوٹ بھی کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"جانے دو لیلیٰ! تم نے تو بچی کو بالکل ہی محدود کر کے

رکھ دیا ہے۔" صوفیہ دادی نے نازک کو دیکھتے ہوئے اپنی کزن پلس دوست کو لاپروائی سے کہا نازک پنڈولم بنی ہوئی تھی۔ صوفیہ بیگم بولتیں تو اس کے چہرے پر قائل ہونے کے تاثرات آجاتے اس کی نانو جان بولنے لگتیں تو وہی درست لگنے لگتیں۔

"کیسے جانے دوں صوفیہ... تم نے حالات دیکھے ہیں۔ امن و امان کی خراب صورت حال... پھر جن ایریاز کی طرف یہ جانے کی بات کررہے ہیں وہاں پانی ہے۔ بیماریاں ہیں۔ کھانے پینے کو کچھ نہیں... آرام کے لیے کیمپس او مائی گاڈ... یہ تو خود اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے والی بات ہے۔ نا بابا ناں میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔"

"میں اپنا خیال رکھوں گی نانو جان!" نازک نے منانے کی کوشش کی۔

"کیسے رکھو گی خیال... یہاں ذرا سا موسم بدلے تو تم نڈھال ہو جاتی ہو۔ اتنی کیئر کرنا پڑتی ہے اور ادھر تو ہر چیز بدل چکی ہے گڑیا!" نانو جان نے حقیقت جتائی۔

"اور لوگ بھی تو ہوں گے ناں؟" وہ یہی کہہ سکی۔

اور لوگوں اور تم میں فرق ہے بیٹا... تم اتنی معصوم اور سیدھی سی ہو تمہیں دنیا کی چالاکیوں کی کچھ خبر نہیں۔"

"زندگی بڑے موڑ بدلتی ہے آنٹی... انسان کو ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس طرح نازک کو باؤنڈ کرکے آپ اس کے ساتھ اچھا نہیں کررہی ہیں۔" نوین نے بھی اپنی رائے دی۔

"اللہ نہ کرے اسے ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے۔" لیلیٰ بیگم کو ہول اٹھا "پہلے ہی کیا کم ہے۔ ماں کا کفن میلا نہیں ہوا اور باپ دوسری بیاہ لایا۔ یہ تک نہ سوچا کہ..."

لیلیٰ بیگم کو ایک ہی راگ آتا تھا۔ جیسے وہ صبح، دوپہر، شام کبھی بھی شروع کردیتی تھیں۔ نوین نے ٹھنڈا سانس بھر کے صوفیہ بیگم کو دیکھا اور ان کے چہرے پر بھی اکتاہٹ آگئی تھی۔ جب لیلیٰ بیگم کو ٹوک دیا۔

"بس کرو لیلیٰ! بخش دو اسے اب... کون سا بڈھا ہو گیا تھا۔ جوان آدمی تھا۔ گھر تو اسے بسانا ہی تھا۔ اب کیا وہ بیوی کے لیے جوگ لے لیتا۔ زندگی میں انسان کو آگے بڑھنا ہی ہوتا ہے۔ کل کو نازک کی شادی ہوگی۔ وہ اپنی گھر گرہستی میں لگ جاتی تب وہ اکیلا رہ کر کیا کرتا اور سب سے اہم بات جو میں بہت پہلے کہہ دینا چاہتی تھی۔ بار بار اس کے سامنے اس کے باپ کو برا بھلا مت کہا کرو۔ وہ اس کا باپ ہے۔ اسے نازک کی نظر میں اچھا ہی رہنے دو۔ پتا ہے ناں دو انسانوں کے بیچ میں بدگمانی پیدا کرنے والے کو کتنا برا کہا جاتا ہے۔"

"اور تم نازک..." صوفیہ بیگم نے حیرت سے سنتی نازک کو بھی پکار لیا۔

"تمہارے باپ نے شادی کرکے کچھ برا نہیں کیا۔ ہاں اس نے کچھ جلد بازی کی شاید... کچھ عرصہ ٹھہر جاتا۔ لیکن کرتا تو پھر بھی ناں... تم ابھی بچی ہو۔ اپنے باپ کی صورت حال کو رئیلائز نہیں کرسکو گی' ہاں مگر ایک وقت آئے گا جب سب سمجھ سکو گی۔"

لیلیٰ بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ صوفیہ کی حقیقت بیانی نے آئینہ دکھایا تھا۔ لیلیٰ بیگم بہت دیر تک بول ہی نہ سکیں۔

"تین سال تک چھوٹی موئی بستر پر رہی۔ وہ چاہتا تو تب ہی کرلیتا مگر اس نے اس کی زندگی میں اس کے رتبے کو مان دیا۔ اس کے بعد ہی نکاح پڑھوایا ناں... زندگی میں پڑھوا لیتا تو... دنیا نے کچھ نہیں کہنا تھا۔" صوفیہ بیگم نے بات ختم کردی۔

لیلیٰ بیگم نے پہلو بدلا۔ وہ اس موضوع پر تازہ دم ہو کر بحث کرنا چاہتی تھیں... مگر نازک نے ان کے شروع ہونے سے پہلے فیصلہ کن آغاز کیا۔

"میں جاؤں گی نانو جان! انفش کے ساتھ... ہم اپنے گھر کے اکیلے پن سے گھبرا کر ہی تو رشتے داروں سے ملنے کے لیے نکلے تھے۔ اگر خالی گھر میں رہنا تھا تو فائدہ...؟"

"تو بیٹا! یہاں ہم سب ہیں ناں... نوین اور اس کے پیارے پیارے بچے اور تمہاری صوفیہ نانو اور اشتیاق نانا..

.... اور۔"

"آپ مجھے جانے دیجیے ناں۔" نازک کا ذہن بن گیا تھا۔ اور لیلیٰ بیگم لہجے سے اندازہ کر رہی تھیں۔ نازک ضد پر آگئی تھی۔

شدید گھبراہٹ سے صوفیہ اور نوین کو دیکھا تو وہاں بھی نازک کی طرف داری تھی۔ چند لمحے گومگو کیفیت میں تینوں کے چہرے دیکھتی رہیں۔ پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچیں (صاف انکار) مگر صوفیہ بھی چہرہ ہی پڑھ رہی تھیں ان کی لب کشائی سے پہلے بول اٹھیں۔

"تم اب کچھ نہیں بولو گی لیلیٰ.... اور تم نازک! جا کر اپنی تیاری کرو۔ تمہاری نانی کی تو کچھ سمجھ میں آتا ہی نہیں۔"

☼ ☼ ☼

"یہ.... ؟ یہ کہاں جا رہی ہے؟" نوال کے چہرے سے زیادہ حیرانی اس کی آواز سے ظاہر ہوئی۔ جس نے سب کو ہی چونکایا ماسوائے ایک کے کیونکہ یہ گھوم گھوم کر اپنا جائزہ لے رہی تھی.... اخفش نے نوال کا چہرہ دیکھا اور پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا نازک اندام اپنی موٹی ٹانگوں کو جینز میں پھنسائے 'اپنے نئے جوگرز پر ہر زاویے سے گھوم کر جوگرز کو چیک کر رہی تھی۔ گول دامن کا سرخ کرتا.... اور شیشوں والی کوئی بہت مہنگے امپورٹڈ گاگلز سر پر ٹکے تھے۔

اور سب سے بڑھ کر ایک جوش اور خوشی اس کی ہر حرکت سے عیاں تھی۔

"ہمارے ساتھ اور کہاں؟" اخفش نے اطمینان سے کہا۔

"ہمارے ساتھ؟ کیمپ میں۔" نوال کو یقین نہیں آیا۔

اخفش نے فقط سر ہلایا۔ وہ فون پر کوئی نمبر ملا رہا تھا۔ بے یقینی میں گھری نوال نے گردن گھما کر نازک کو دیکھا۔ جو امپورٹڈ سن بلاک اپنے منہ پر مل رہی تھی۔

"یہ وہاں کرے گی کیا؟" نوال کی آواز چیخ سے مشابہ تھی۔

"وہی جو سب کریں گے۔"

"ہم وہاں ہیلپ کرنے جا رہے ہیں اخفش! یو نو اِٹس آ بگ ٹاسک.... ناٹ آ گیم۔"

"آئی نو ڈیئر....!" اخفش میسج لکھ رہا تھا۔ مگن انداز سے جواب دیا۔

"وہاں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو جانفشانی سے کام کرنا جانتے ہوں۔ جبکہ تمہاری یہ کزن...." نوال کی نگاہیں گھوم پھر کر نازک پر جاتی تھیں۔ وہ اپنی ناخن پالش دیکھ رہی تھی۔

"آئی نو ویٹ...." اخفش نے ذرا سی نگاہ اٹھا کر نوال کو دیکھا' نگاہیں پھر موبائل پر....

نوال نے پھر نازک کو دیکھا۔ ملازم اس کے بیگز لا کر رکھ رہا تھا جیسے نازک کہیں دو ماہ کی چھٹیاں گزارنے جا رہی ہو جبکہ نوال نے ایک بڑا بیگ تیار کیا تھا جسے اس نے پشت پر اٹھانا تھا۔ بیگ میں چند جوڑے' ایک فالتو جوڑا جوتے' کچھ انتہائی ذاتی ضروری سامان تھا چادریں ایمرجنسی لائٹ.... کچھ دوائیاں اور اسی طرح کی چیزیں' جبکہ نازک کے بیگز میں نجانے کیا کیا کچھ تھا۔ جو وہ اتنا بڑا ڈھیر بن گیا تھا۔

لیلیٰ بیگم باہر آئی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک ہینڈ بیگ تھا۔ وہ نواسی کی خوشی میں خوش تو نظر آتی رہی تھی۔ مگر ایک فکر بھی چہرے سے ہویدا تھی۔

"میں نے نوڈلز کے پیکٹ.... انسٹنٹ سوپ کے ساشے' انرجی ڈرنکس اور بسکٹس رکھے ہیں۔ وہاں پتا نہیں کھانے کا کیا سسٹم ہو مگر تمہیں جب بھوک لگے تو بس جلدی سے بنانا اور کھا لینا.... اخفش بتا رہا تھا' وہ سلنڈر کا چولہا لے کر جا رہا ہے' وہ تمہارے کیمپ میں ہی ہو گا۔ مگر دیکھو...."

لیلیٰ بیگم نے چونکنے انداز سے نازک کا ہاتھ جھپٹا۔

"تم خود سے مت جلانا چولہا.... اخفش ہی سے کہنا۔ پانی کی بوتل بھی رکھی ہے۔ اگر صاف پانی نہ ملے تو اسے یوز کرنا اور کوئی ضرورت نہیں ہے اپنی چیزیں شیئر کرنے کی۔"

"او کے نانو جان! میں سب سمجھ گئی۔"

نازک نے مطمئن ہو کر ہاتھ جھاڑے' وہ پنجوں پر ذرا سا اچھلتے ہوئے جسمانی اور ذہنی طور پر کیمپ جانے کے لیے تیار تھی۔ اس نے اپنی نانو جان کو مطمئن کرنے کے بعد جھک کر اپنا بیگ اٹھانا چاہا تب لیلیٰ بیگم چلا اٹھیں۔

نازک تو نازک' صم بکم کھڑی نوال تک اچھل کر ایک قدم پیچھے سرکی تھی۔ (اخفش فون پر بات کرتے ذرا دور جا چکا تھا)

"تم کیوں اٹھا رہی ہو۔ ملازم مر گئے ہیں کیا؟ اے ستو۔" انہوں نے اندر جاتے ملازم کو آواز دی۔ "بی بی کا بیگ گاڑی میں رکھو۔"

"جی۔ میں نے رکھ دیے ہیں۔" ملازم نے گاڑی کی کھلی ڈگی کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے...!" لیلیٰ بیگم کی آنکھیں پھیلیں۔ "یہ بیگ کون رکھے گا۔"

"جی...!" ملازم نے بڑے ہینڈ بیگ کو دیکھا (اسے تو میڈم لوگ شانے پر لٹکاتی ہیں' تب ہی تو اس نے دھیان نہ دیا)

"رکھ دیتا ہوں جی..." وہ بیگ لے کر گاڑی کی جانب گیا۔ نوال نے تھوک نگلا اور اخفش کو دیکھا جو فون پر مصروف تھا۔

"ہاں بس' ہم نکل رہے ہیں... بیس منٹ میں آپ لوگوں کو جوائن کرتے ہیں۔" وہ کیمپ جانے کے حوالے ہی سے بات کر رہا تھا۔

"اور ہاں نازک! میں نے تمہارے لیے ڈسپوزبل برتن رکھے ہیں' کوئی ضرورت نہیں ہے' تمہیں وہاں برتن دھونے کی... ٹھیک ہے۔"

"برتن دھونا میں خود پسند نہیں کرتی۔ آئی لو مائی نیلز... اینڈ آل سو ہینڈز... کتنی تو کیئر کرتی ہوں میں ان کی۔" نازک نے اپنے ہاتھ آگے پیچھے کر کے دیکھے اور دکھائے۔

"ہاں ہاں ماشاء اللہ۔" لیلیٰ بیگم نے ہاتھ کا بوسہ ہی لے لیا۔ اور ساتھ ہی ہوا سے اڑ کر مسلسل ڈسٹرب کرنے والی نازک کی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا' نازک یوں کھڑی تھی جیسے چار سال کی اسکول جانے والی بچی صبح تیار ہوتے وقت ماں کے سامنے بے نیاز سا بت بن کر کھڑی رہتی ہے۔

نوال نے شدید پریشانی میں گھر کر اخفش کو دیکھا' وہ چوکیدار کو گیٹ کھولنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود اندر آرہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے مسکرا کر نازک کو دیکھا تھا اور گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

نانو جان ایک بار پھر نواسی کے کان میں جھکی کچھ کہہ رہی تھیں۔ (ہدایت نامہ) پھر اسے کمر میں ہاتھ ڈال کر گاڑی تک یوں لے کر جانے لگیں۔ جیسے رخصتی کے وقت دلہن کو سہارا دیا جاتا ہے اور اس خیال نے نوال کے رہے سہے ہوش بھی اڑا دیے۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا پھر سر پر پیر رکھ کے اندر بھاگی۔ اخفش اندرونی دروازے سے نکل کر گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نوال نے آدھے رستے ہی میں اس کا بازو پکڑا اور اس سے پہلے کہ کچھ سمجھتا' وہ اسے ایک آڑ میں کھینچ لے گئی۔

"ہم کام کرنے جا رہے ہیں اخفش... تم اس پھپھولا رانی کو کیوں ساتھ لیے جا رہے ہو؟" نوال اس سے اچھا نام اور کیا رکھتی۔

"پھپھولا...؟"

"ہاں ہتھیلی کا چھالا... بلکہ ٹوٹی جوتی کو... ایک قدم آگے نہیں بڑھنے دے گی تمہیں اخفش!" نوال نے آنکھیں بساط بھر پھیلائیں۔

"کون سی ٹوٹی جوتی؟" اخفش نے بے ساختہ اپنے نئے مضبوط جاگر دیکھے۔

"ارے!" نوال نے دانت پیسے "تمہارا جوتا نہیں کہہ رہی۔ اسے کہہ رہی ہوں تمہاری اس نازک بی بی کو۔"

"تم یہ سب نازک کے لیے کہہ رہی تھیں۔" اخفش کی آواز بے یقینی سے پھٹی تھی۔

"ہاں...!" نوال بات سے پھرنے والی تھی ہی نہیں۔ کہہ دیا تو کہہ دیا۔ اب جان جاتی ہے تو جائے۔

"اتنی انسلٹ نوال... کیا بگاڑا ہے اس بے چاری

نے تمہارا۔۔۔ تم نے یوں بیٹھے بٹھائے اتنا سب کچھ سنا دیا اسے۔"

"اسے نہیں سنایا۔۔۔ تمہیں بتایا ہے اور پوچھ رہی ہوں کہ کیا دماغ چل گیا ہے یا دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے جو اس ناکارہ پرزے کو لے جا رہے ہو۔"

نوال کو یکدم احساس ہوا' وقت کم ہے اور اسے کسی بھی طرح اخفش کو باز رکھنا ہے کہ وہ یہ غلطی نہ کرے' ادھر اخفش کی جیسے اب سمجھ میں آیا اس کی تیوری چڑھ گئی۔

"دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں۔"

"یہ کار آمد چیز ہمارے کسی کام کی نہیں یا کم از کم اس کی وہاں ضرورت نہیں جہاں ہم جا رہے ہیں۔"

"تمہیں اعتراض کیا ہے؟" "تمہیں کوئی گود میں اٹھا کر نہیں لے جاتا اسے۔"

"فضول بات مت کرو اخفش! مجھے یہ بتاؤ یہ وہاں کرے گی کیا؟ تم نے اس کا سامان دیکھا ہے۔ لگتا ہے کوئی لینڈ لیڈی ویکیشن گزارنے شمالی علاقہ جات جا رہی ہے۔ اوپر سے گیٹ اپ اور اسٹائل۔۔۔ ہمیں اپنا سارا سامان خود کیری کرنا ہے اور وہ ہینڈ کیری تک کو گاڑی تک نہیں لے جا سکتی۔ ہمیں وہاں کام کرنا ہے۔ ہمارے ہاتھ بھی گندے ہوں گے اور منہ بھی کالے۔۔۔ سن بلاک کا کیا سوال۔۔۔ اللہ جانے نہانے کا بھی موقع ملے نہ ملے۔

اور ایک بیگ اس کے جوتوں کپڑوں کا ہے۔ تو دوسرا کھانے پینے کے سامان کا۔ ہم پکنک پر نہیں جا رہے اخفش انعام! وہاں ایسی لڑکی کا کیا کام جو ہر دن نیل کلر تبدیل کرتی ہے۔ اللہ جانے کیمپ میں زمین پر سونا پڑے گا۔ یا کھلے آسمان تلے۔۔۔ ہاں مچھر' مکھی' یہاں تک ٹھہرے پانی میں سانپ اور مردہ جانور تک بہہ آئیں گے۔ ہم متاثرین کو ریسکیو کریں گے یا تمہاری اس کزن کی ہائے اوئی سنیں گے۔"

"تم بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہی ہو؟" اخفش کے منہ سے نکلا۔

"میں بڑھا نہیں رہی سمجھا رہی ہوں۔ اچھا چلو یہ بتا دو یہ وہاں کیا کرے گی۔ کس کیٹگری میں نام لکھوایا ہے اس کا؟" نوال نے اب صحیح سوال کیا تھا۔

"ریلیف کیمپ میں ایک اسکول بنایا گیا ہے' وہاں پڑھائے گی۔"

اخفش کا جواب مزید سوالات کو ختم کر گیا۔ ہاں' نازک وہاں پڑھانے جیسا کام تو کر ہی سکتی تھی۔ نوال' اخفش کے چہرے کو بغور دیکھتے چپ کر گئی۔ اخفش کی ہمت بڑھی۔

"انویسٹی گیشن مکمل ہو گئی ہو تو چلیں۔۔۔ پتا نہیں کچھ لوگوں کو یہ کیوں لگتا ہے۔ دنیا میں وہی ایک ہیں جو کار آمد ہیں یا یہ کہ دنیا تو بس ان ہی کے کندھوں پر کھڑی ہے۔"

اخفش نے بھڑاس نکالی ساتھ ہی ہاتھ میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"راستہ دو۔" اس نے بدتمیزی سے کہا۔

"ایک منٹ اخفش۔۔۔!" نوال نے پیچھے سے پکارا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے رکنا پڑا' لہجے کی سنجیدگی اور قطعیت بتاتی تھی نوال کے پاس اب بھی کوئی مدلل جواب موجود ہے۔

"میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں کہ اس بی بی کی وہاں ضرورت نہیں۔"

اخفش کی تیوری چڑھی۔

"ان فیکٹ ریلیف کیمپ میں کسی اسکول کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ یہ سب ڈھکوسلے بازی ہے۔ کچے کے جن علاقوں' جھونپڑوں سے یہ لوگ اٹھ کر آئے ہیں۔ وہاں اول تو اسکول ہیں ہی نہیں۔۔۔ یا پھر عمارت تو ہے۔ مگر اسٹاف اور بچے دونوں ندارد۔۔۔ عمارت ٹوٹی ہوئی ہو گی یا پھر بہت ممکن ہے اس میں وڈیرے یا کسی بااثر شخصیت کے ڈھور ڈنگر باندھے جاتے ہوں گے۔

یہ سب نو بجے کے نیوز بلیٹن کا مسالہ ہوتا ہے۔ ریلیف کیمپ میں قائم اسکول ایک بلیک بورڈ رکھ کے بچوں کو بتا دیا اے اپل۔۔۔ بی بیٹ۔۔۔

ریلیف کیمپ میں گڑیا کی شادی۔۔۔ کوئی بتائے فارغ

بچیاں یہی کام کریں گی ناں۔ اب وہ اسمارٹ موبائل پر گیم تو کھیلنے سے رہیں۔ ریلیف کیمپ میں منے کی پیدائش، نام سیلاب خان رکھ دیا گیا۔ ہونہہ اتنا ہی درد دل رکھتے ہو۔ ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے فکر مند ہو تو مستقل بنیادوں پر کام کرو ناں.... یہ کیا چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات۔"

نوال نے دنیا کے بہترین مقرروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ طیش اور جذبے سے رنگت میں سرخی نمایاں ہو گئی تھی۔ اس نے انخفش کو سنانے کے بہانے بھڑاس نکالی تھی نجانے کس کس کی اور کب کب کی۔

"اور سب سے بڑھ کر تقریر کے اختتام پر پھر ایک سوال انخفش کے منہ پر مار دیا اور انخفش ساکت و جامد رہ گیا تھا کہ نوال ضمیر خان چیز کیا ہے؟"

کھلنڈری، شوخ (پھپھوری.... دل ہی دل میں یہ نام بھی رکھا تھا۔ بڑی تسکین ملتی تھی) یا پھر.... واقعی ایک شاندار انسان.... (شاندار لڑکی) وہ کتنی حساس تھی اور کتنی دردمند.... بظاہر ہلکی.... اندر سے گہری.... سمندر سے بھی زیادہ۔

انخفش نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر خود ہی منہ بند کر لیا۔ نوال نے لمبا سا سانس لیا۔

"مجھے نازک سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے انخفش! اگر تم میری باتوں کے تناظر میں دیکھو تو سہی.... ہم ہمالیہ سر کرنے نہیں جا رہے کہ سامان، خوراک، لباس کے لیے پورٹر ہائر کریں گے۔ ہمیں دوسروں کو بچانا ہے ان لوگوں کو جو بڑے لوہے کے کڑاہے میں بیٹھ کر دریائی زمین کو پار کرتے ہیں، کندھے پر بوڑھے باپ کو بٹھا لیتے ہیں۔ گود میں شیر خوار پکڑتے ہیں اور پھر نکلتے نکلتے بکری کے ہراساں ممیاتے بچے کو بھی بغل میں جکڑ لیتے ہیں اور تم میری باتوں کو منفی لیتے ہوئے پریکٹیکل انخفش انعام....

نوال کا لہجہ بھر آیا تھا۔ جذباتیت سے گزرتا مضبوطی کی سرحد سے گزر گیا۔ اور انخفش انعام ششدر رہ گیا تھا۔

حساس سی یہ لڑکی جسے وہ چار سالوں سے جانتا تھا۔ مگر شاید وہ اسے بالکل نہیں جانتا تھا۔ اک مزید عمر کی ضرورت تھی نوال ضمیر کو جاننے کے لیے....

"تم نازک کو ضرور لے کر جاتے مگر اسے یہ بھی تو بتاتے۔ کہاں جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟ وہاں کی ساری سچویشن سمجھاتے۔ اسے اپنی نانو جان کی نہیں تمہاری انسٹرکشنز کی ضرورت تھی اور وہ اتنی ایکسائیٹڈ ہے کہ وہ ایگری کرتی مگر تم نے.... افسوس۔" نوال نے سچ مچ تاسف سے گردن جھٹکی۔ "مجھے بتا دیتے تو میں سب مینج کر لیتی مگر مجھ سے تو خیر تمہیں۔" نوال نے قصداً" بات ادھوری چھوڑ دی اور کار پورچ میں چلی گئی۔ جہاں سب اسے اور انخفش کو ڈھونڈ رہے تھے۔

"کہاں رہ گئے تھے تم دونوں؟" نوین نے اس سے پوچھا، پیچھے آتا انخفش بھی خود کو نارمل کرتا نظر آ گیا تھا۔

"کہیں نہیں۔" نوال نے چہرے کو بحال کیا۔ "کیمپ انچارج کی کال تھی۔ ان سے بات کر رہے تھے۔"

انخفش نے بھی سر ہلا دیا۔ سب انہیں رخصت کرنے کھڑے تھے اور اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔

"چلیں اب!" نوال زینت بیگم سے مل کر انخفش کی جانب متوجہ ہوئی اور پھر اس نے انخفش کی نگاہوں کے تعاقب میں نازک اندام کو دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ وہ اگلی سیٹ پر براجمان اپنے سر پر تنکوں والا ہیٹ درست کر رہی تھی اور ذرا سی گردن گھما کر کار کے شیشے میں یہ بھی جانچ رہی تھی کہ ہیٹ میں کیسی لگ رہی تھی۔ نگاہیں نوال سے ٹکرائیں پھر انخفش سے تب اشارے سے پوچھ بھی لیا۔ کیسی لگ رہی ہوں۔ انخفش تو ساکت سا تھا۔

نوال ہی نے انگوٹھے اور انگلی کا سرکل بنا کر ویل ڈن کا اشارہ دیا۔ ساتھ ہی اک نگاہ انخفش پر ڈالی اور پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لیے آگے آ گئی۔

لیلیٰ بیگم پھر اندر سے کچھ لیے آ رہی تھیں یہ جوس کا لیسٹر پیک تھا۔

"راستے میں پینے کے لیے۔۔۔" نوال نے صبر کے گھونٹ پی کر یہ منظر دیکھا۔ لیلیٰ بیگم اب سنجیدہ تھیں۔ (شاید رخصتی کا خیال آ گیا)

❁ ❁ ❁ ❁

لیلیٰ بیگم چھت پر ٹہل رہی تھیں۔ مگر یہ ہوا خوری نہیں تھی۔ پریشانی، الجھن، ادھیڑبن کی کیفیت۔۔۔ جو کچھ سوچ رہی تھیں وہ الجھے دھاگے کی طرح تھا سرا ہاتھ آتا ہی نہ تھا۔

جو کچھ لیلیٰ بیگم جاننا چاہ رہی تھیں۔ اس کے لیے کون سب سے موزوں ہو سکتا تھا۔ کون۔۔۔ کون؟

لیلیٰ بیگم دوبارہ کرسی پر بیٹھیں اور پیشانی مسلنے لگیں۔ بھوک تو پہلے ہی اڑ چکی تھی۔ اب سر دکھنے لگا تھا۔ آنکھیں موند لیں۔

"مجھے بھی لے کر جا سکتی تھیں۔ میں اخفش بھائی جان سے زیادہ ہی کام کرتا۔" یہ رندھی آواز کا شکوہ بے خود خان کا تھا۔

"تمہارا شناختی کارڈ نہیں بنا بچے ابھی!" زینت بیگم کا لہجہ محبت سے بھرپور تھا بے خود کو پچکار رہی تھیں۔

(لیلیٰ بیگم کے کان کھڑے ہو گئے وہ کرسی سے اٹھ گئی تھیں)

"یہ سب بہانا ہے۔ ایک بار نوال باجی کہتی تو۔۔۔ میں سب کام کر سکتا ہوں۔"

"مرد ہو کر روتے ہو بے خود!" زینت بیگم نے بے خود کی دکھتی رگ پکڑنے کی کوشش کی مگر یہاں تو الٹا اثر ہوا وہ مزید رویا اور روتا چلا گیا۔

"کوئی نہیں ہوں میں مرد۔۔۔ میں بچہ ہوں۔" بے خود واقعی صدمے میں تھا۔ ورنہ اسے خود کو سات برس کی عمر ہی سے مرد کہلوانے کا شوق تھا، اب تو خیر سے پندرہ کا سن چل رہا تھا۔

"ہاں تو پھر بچوں کا کیا کام؟" زینت بیگم نے بات ختم کر دی۔

"آں۔۔۔ ہاں۔۔۔" بے خود نے ششدر ہو کر انہیں دیکھا اور نہایت بے سری تان اڑائی۔ زینت بیگم صبر سے لے کے مکمل ہونے کا انتظار کرتی رہیں۔

"مجھے نوال باجی پر کوئی شک نہیں۔۔۔ وہ تو مجھے لے کر جانا چاہتی ہوں گی۔" بے خود نے آواز متوازن کر کے کہنا شروع کیا۔ "ہو نہ ہو یہ اخفش بھائی جان کی چال ہے۔ انہیں میں پسند ہوں ہی نہیں۔"

"وہ تمہیں میری وجہ سے چھوڑ کر گئی ہے بے خود!"

"آپ کی وجہ سے؟"

"ہاں۔۔۔ کہہ رہی تھی، اسے اپنے بعد میرا خیال رکھنے کے لیے اگر کسی پر بھروسا ہے تو وہ صرف تم ہی ہو۔۔۔ لیکن تمہیں میری فکر ہے ہی نہیں۔۔۔ میرے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتے۔" زینت بیگم کے لہجے میں افسردگی گھل گئی۔

"نہیں تو۔۔۔" بے خود سارا رونا دھونا بھول گیا۔

"کوئی نہ بھی کہے، میں تب بھی خیال رکھتا ہوں۔۔۔ اور اگر نوال باجی نے ایسا سوچا ہے تو بس پھر ٹھیک ہے۔ سب شکایت ختم ہو گیا۔" بے خود ایسے پرسکون ہوا جیسے کبھی بھڑکا ہی نہ ہو۔

"چلو پھر اب تم کھانا کھا لو اور شکل درست کرو۔"

"آپ بھی آجائیں، نیچے چلتے ہیں۔ آپ نے اپنا میڈیسن کھا لیا؟"

"کیسے کھاتی۔ کسی نے دی ہی نہیں۔۔۔" زینت بیگم کا لہجہ لاچاری لیے ہوئے تھا۔

"ایسے کیسے نہیں دی اور کس نے دینی ہے۔ میں دوں گا، ابھی دوں گا۔ اگر کل کو نوال باجی نے پوچھ لیا کہ بے خود خان تمہیں تو نانو کا خیال رکھنا تھا۔"

بے خود کی کوئی بھی بات گھوم پھر کے نوال کی کسی بات پر ہی آکر رکتی تھی، دونوں کی آوازیں معدوم ہونے لگیں۔ تب دوسری جانب سانپ سونگھتی کیفیت میں سنتی لیلیٰ بیگم دبے قدموں درمیانی دیوار تک آگئیں۔

زینت بیگم بڑھاپے کے باعث نپے تلے دھیمے قدم اٹھاتی آگے جا رہی تھیں اور پندرہ برس کا گورا چٹا پٹھان بچہ بے خود خان بہت احترام اور صبر کے ساتھ

ان پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ خیریت سے اتر جائیں۔
تو یہ تو ملازم بچہ تھا۔۔۔ چوکیدار کا پوتا۔۔۔ مگر حیثیت ملازم والی نہیں تھی۔ گھر کے فرد کی طرح کے لاڈ اٹھا رہی تھیں زینت بیگم تو نوال کے بارے میں جاننے کے لیے سب سے بہتر بندہ بے خود خان تھا۔
صوفیہ بیگم نے بتایا تھا۔ اخفش کے لیے اشتیاق احمد اور اخطب کی اولین پسند نوال تھی۔ مگر اخفش نے منع کر دیا۔ نوال نے بھی کر دیا لیلیٰ بیگم کے لیے یہی سوچنے کا مقام تھا۔
جب نوال نے منع کر دیا تو پھر ان کی نواسی نازک اندام کے لیے وہ اخفش کو بھڑکا کیوں رہی تھی۔ بلکہ متنفر کرنے کی کوشش۔

☆ ☆ ☆
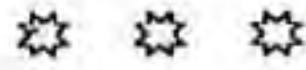
"نوال باجی کو اخفش بھائی پسند ہے ہی نہیں۔۔۔" یہ بے خود کا قطعیت سے بھرپور کسی قدر حقارت لیے لہجہ تھا۔ "اور یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں بھی اب اس کو پسند نہیں کرتا۔" بے خود نے ناگواری سے چہرے کے آگے ہاتھ لہرایا۔
"اچھا۔۔۔" لیلیٰ بیگم کا اچھا بولنے پر اکساتا ہوا تھا۔
"وہ تنگ نظر ہے اور جو تنگ نظر ہوتا ہے' وہ دل کا بھی تنگ ہو جاتا ہے۔"
یہ سنہری قول یقیناً نوال کا تھا جو بے خود نے منہ زبانی یاد کر رکھا تھا۔
"تو یہ بات اخفش جانتا ہے۔" لیلیٰ بیگم کو ہر صورت وہ رائے معلوم کرنی تھی جو اخفش کی تھی۔
"ہاں تو نوال باجی کوئی بات چھپاتی تھوڑی ہے۔ جو اس کے دل میں ہوتا ہے' وہ منہ سے بولتی ہے۔ نوال ضمیر خان منافقت نہیں کرتی۔" آخری جملہ پھر نوال کا فرمان تھا۔
"دراصل نوال باجی صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہتی ہے اور جو وہ کہتی ہے وہ ہمیشہ درست ہوتا ہے۔"
لیلیٰ بیگم نے پہلو بدلا۔ ابھی کل ہی تو نوال کی صحیح اور غلط رائے نازک کے بارے میں سنی تھی اور اب تک بد ہضمی کی شکایت تھی نہ جانے کیسے رفع ہوتی؟
"اخفش بھائی کسی کو اپنے آگے کچھ نہیں سمجھتا اور لڑکیوں کو اوہ۔۔۔ اس کا بس چلے تو لڑکیوں کو ڈبے میں بند کر دے۔"
"ڈبے میں۔۔۔" لیلیٰ بیگم کے کان کھڑے ہوئے (شاید خیال آیا ہو وہ جو اخفش اور نازک کو اکٹھا سوچ رہی ہیں تو اگر اخفش نے نازک کو ڈبے میں بند کر دیا تو؟ اور نازک کے لیے ڈبا۔۔۔ اونہوں۔۔۔ ڈبا تو نہیں کارٹن درکار ہوگا۔۔۔ کارٹن بھی کون سا ڈیپ فریزر والا ناں۔۔۔ اف)۔
"یہ اخفش نے کہا کہ کارٹن میرا مطلب ہے ڈبے میں بند کرنے کا؟"
"نہیں۔۔۔ نہیں نوال باجی کہتی ہے۔"
"اچھا اچھا۔۔۔ تو یہ نوال کی رائے ہے۔" کچھ ہراساں لیلیٰ بیگم نے سکون کا سانس لیا۔
"تم بہت پسند کرتے ہو اپنی نوال باجی کو۔۔۔؟"
"ہاں۔۔۔ کیونکہ وہ ہے ہی پسند کے قابل۔۔۔" بے خود نے تقریباً اچھل کر کہا۔
"ان کو سب ہی پسند کرتے ہیں۔ نوال باجی نے بڑی بیگم صاحبہ اور نوین باجی کو سمجھایا پھر نوین باجی اور اخطب بھائی جان کی شادی کروادی۔ ایسا کام جو کسی سے بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس نے ایک منٹ میں کر دیا ایک منٹ میں۔۔۔ نوین باجی اور خاص طور پر بھائی جان تو ان کا مرید ہے مرید۔۔۔ صوفیہ دادی جان کو وہ ساری دنیا کی لڑکیوں سے اچھی لگتی ہے۔
اخفش بھائی جان کے دادا جان۔۔۔ وہ تو نوال باجی کو سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ لیکن میرے سے تھوڑا کم میں تو جان قربان کر سکتا ہوں۔ وہ میری بہن جیسی ہے میری ٹیچر ہے۔ میری ماں جیسی۔۔۔ میری۔۔۔"
بات بے خود پر آ گئی تھی۔ اب کیسے چپ ہو مگر لیلیٰ بیگم کی الجھن کا ایک آخری دھاگہ باقی تھا۔ کسی قدر بے تابی سے بے خود کو ٹوک دیا۔
"اور اخفش۔۔۔ وہ بھی تو پسند کرتا ہو گا ناں نوال کو۔۔۔ میرا مطلب ہے جب وہ اتنی ہر فن مولا یعنی قابل

READING Section

ہے لائق فائق بھی۔"

"اونہوں۔" بے خود نے ناک پھلائی۔ آنکھیں سکیڑیں۔

"اخفش بھائی تو جلتے ہیں نوال باجی سے۔ صاف بات اگر کہوں ناں تو جتنی نفرت باجی کرتی ہے۔ اس سے زیادہ بھائی جان کرتا ہے۔" بے خود نے صاف گوئی سے کہا۔

"مگر میں تو کہتا ہوں۔" اس نے رازدارانہ انداز سے اردگرد دیکھا اور لیلیٰ بیگم کی طرف جھک آیا "میرے کو تو وہ پورا پاگل لگتا ہے۔ جب ہی تو۔۔۔"

بے خود نے بات ختم ہی کر دی گویا' لیلیٰ بیگم نے مسکرا کر تائید کی ذہن ہلکا پھلکا جو ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

صورت حال اس سے زیادہ خراب تھی جتنی میڈیا پر دکھائی جا رہی تھی۔ بے سرو سامان لوگ پانی کے اترنے کے منتظر تھے۔ مگر اس کا کیا کیجیے کہ پانی اترنے سے پہلے مزید پانی کا ریلا آجاتا اوپر سے مسلسل ہوتی بارش۔۔۔ رحمت کی مد پر نقطہ لگ گیا تھا اور کسی ربر کے مٹانے سے مٹتا نہیں تھا۔ (یا الرحم الرحمین۔۔۔)

بارش بھی رک جاتی پانی بھی نکل جاتا مگر اس انتظار کے درمیانی وقفے میں یہاں پناہ گزیں انسان۔۔۔ اپنے بچے کچھے سامان اور مال مویشی کے ہمراہ بیماریوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ ایک آسمانی آفت۔ ایک جسمانی کمزوری۔۔۔ رنگ رنگ کی بیماریاں' اسہال' بخار' پھنسی پھوڑے' خارش اور نزلہ کھانسی تو ساتھ ساتھ تھی۔

نوال اور اخفش کی ٹیم آرمی کے ہمراہ جب پہنچی تب یہاں پہلے سے موجود فلاحی تنظیم ہاتھ پر ہاتھ دھرے خود امداد کی منتظر بیٹھی تھی۔ راستے بند ہو گئے تھے کہ واحد سڑک سیلاب میں بہہ گئی۔ ان کے پاس موجود سامان' خوراک اور دوائیاں ختم ہو چکی تھیں اور ان میں سے کئی کارکن خود بیمار ہو چکے تھے۔

تازہ دم آنے والی اس ٹیم نے سب سے پہلے تو انہیں روانہ کیا اور پھر خود کام میں جت گئے۔

اور یہاں کام کے لیے جسمانی مشقت کے ساتھ ساتھ' ذہنی مشقت کی بھی ضرورت تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا ابتدا کہاں سے کی جائے؟

واحد سرکاری ہسپتال کے بیڈز تک پانی میں تیر رہے تھے۔ باقی سامان کا تو ذکر ہی کیا؟ سب سے بڑا مسئلہ پانی تھا۔ جہاں پانی تھا تو پانی تھا اور جہاں نہیں تھا وہاں کیچڑ تھی۔۔۔ اور کیچڑ میں بہت کچھ تھا۔

سب کے لیے یہ صورت حال حیران کن تھی۔ مگر اس کیفیت سے نکلنے کے بعد سب کام میں جت گئے تھے۔ ہاں ایک انسان تھا جس کی حیرت جاتی ہی نہیں تھی اور وہ تھی نازک اندام۔۔۔

کہاں گئے وہ کھیت۔۔۔ وہ سبزے کی چادر' مٹی کی خوشبو۔۔۔ درختوں پر لگی پینگ۔ اور مٹیاریں؟

کھیت پانی میں بہہ گئے اور سبزے کی چادر نہ جانے کہاں گئی مٹی کی خوشبو کا تو ذکر ہی کیا؟ سیلن بھرا ٹھہرا پانی۔۔۔ ناگواری سی ناگواری اور پر تیر کر آتے مردار۔۔۔ گائے' بکری' بلی' کتا اور رہے درخت۔

درخت کی جس شاخ پر جس کو جگہ مل گئی اس نے وہیں ٹھکانا بنایا۔

سرکاری اسکول کی عمارت میں بھی پانی بھرا تھا۔ مگر وہ ذرا بلندی پر واقع تھا۔ سو پہلے مرحلے پر اس کا پانی نکالا گیا اور اسے قابل استعمال بنا کر تین چوتھائی حصے میں عورتوں بوڑھوں اور بچوں کو ٹھہرایا گیا۔ جبکہ ایک حصہ ٹیم کے ارکان کو دے دیا گیا۔

دن بھر کی تھکی نوال نے ایک نعرہ بلند کیا اور زمینی بستر پر اس شاہانہ انداز سے نیم دراز ہوئی جیسے ملکہ تاج پوشی کے بعد تخت نشین ہوئی ہو۔ جبکہ دوسری جانب نازک اندام کی چیخ نے سب کو نوال سے غافل کیا۔

"ہم یہاں سوئیں گے اخفش۔۔۔؟"

"ہم نہیں تم۔۔۔ یہ تمہارا بستر ہے۔" اخفش نے ہم کی تصحیح ضروری سمجھی۔

"اوایس میں اپنی ہی بات کر رہی ہوں' میں کبھی زمین پر نہیں سوئی۔"

"یہ محمدی بستر ہے مس نازک!" کسی لڑکی نے کہا۔

"مگر یہ بہت سخت ہے۔" نازک کو اپنا اسپرنگ میٹرس یاد آرہا تھا۔ اور پھر اس فلور کی صفائی بھی۔"

"سب سے اچھا والا کمرہ گرلز کو دیا گیا ہے نازک!" اخفش نے بتانا ضروری سمجھا۔

"زمین پر سونے سے ریڑھ کی ہڈی سیدھی رہتی ہے اور انسان کو اپنی اوقات بھی یاد آجاتی ہے۔" یہ محمدی بستر کہنے والی دینی رجحان کی حامل لڑکی تھی۔

"آپ جانتی نہیں تھیں مس نازک... یہاں کسی بھی قسم کی سچویشن کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔" یہ ینگ ڈاکٹر تھی۔

"نہیں... مجھے تو بس بچوں کو پڑھانا تھا۔" نازک نے اخفش کو دیکھا۔

"اوئے...!" سب لڑکیاں ہنس دیں۔ "تو کیا چوبیس گھنٹے پڑھائیں گی؟ ابھی رات ہے... سوجائیے، صبح اسکول لگے گا۔" کسی نے پچکارنے والے انداز سے کہا۔

نازک نے اخفش کو دیکھا۔ جب سے آئے تھے کام میں لگا تھا۔ تکان اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ نازک کی سوالیہ نگاہوں پر شانے اچکا کر رہ گیا۔ نازک نے باقی سب لڑکیوں کو دیکھا۔ ایک لڑکی نماز کے لیے جائے نماز بچھا رہی تھی۔ ایک اور ڈاکٹر اپنی انگلی پر سنی پلاسٹ لگا رہی تھی۔ ایک دوسری ڈاکٹر سرسوں کا تیل اپنے ہاتھوں پیروں پر مل رہی تھی، کچھ ایسی تھیں جو اخفش کے جانے پر دروازہ بند ہونے کی منتظر تھیں۔

اخفش نے ذرا چور نظروں سے نوال کو دیکھا۔ اس نے بیگ سے ایک بے حد موٹا سرخ سرخ سیب برآمد کیا تھا اور اسے اپنی شرٹ کے دامن سے رگڑ کر صاف کیا تھا۔ نوال نے مقدور بھر جبڑا کھولا اور ایک بڑا ٹکڑا منہ کے اندر... ساتھ ہی اسے مزہ آیا۔ مزے دار...

اخفش کی نگاہوں کے تعاقب ہی میں نازک بھی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اسے یک دم بھوک کا احساس ہوا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں مینیج کرلوں گی۔" بھوک حاوی ہونے لگی تھی۔

اخفش باہر نکل گیا۔ ایک لڑکی نے اٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔ نوال اب لیٹ کر سیب انجوائے کررہی تھی۔

نازک نے بھی اپنا بیگ کھولا۔ تھیلیوں کے کڑکڑانے کی آواز نے سب کو متوجہ کیا۔ یہ چپس کا جمبو پیک تھا۔ پیٹ بھرنے لگا تو غنودگی چھانے لگی۔ پیکٹ ابھی آدھا ہی ہوا تھا کہ وہیں لڑھک گئی۔

دن بھر کی تھکی ماندی لڑکیاں... اتنا لمبا سفر طے کر کے آئی تھیں اور لیٹتے ہی غافل ہوگئیں۔

نوال سب سے پہلے لڑھکی تھی۔ مگر اس کو عجیب سا احساس ہوا تو آنکھ کھل گئی "اوہ... نازک... وہ نیند اور تھکاوٹ کے زیر اثر تو تھی، مگر بستر کی بے آرامی اسے سونے نہیں دے رہی تھی تو نوال اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے ترس سا آنے لگا۔ بے چاری شوق شوق میں کدھر آنکلی۔ نازک ہلکا سا کراہتی بھی تھی۔ نوال کچھ سوچتے باہر نکلی۔

سناٹا... مینڈکوں اور جھینگروں کی آوازیں... پانی کی بو اور کن من برستا پانی... اخفش و دیگر برآمدے ہی میں یہاں وہاں پڑے تھے۔

"اے اخفش... ہیلو اخفش...!" نوال کو ذرا وقت نہ ہوئی اسے پہچاننے میں، تین ٹانگوں والی چارپائی پر وہ چت پڑا خراٹے بھر رہا تھا۔ چوتھی ٹانگ اینٹوں کی تھی۔ جب آواز کا اثر نہ ہوا تب نوال نے چارپائی کو ایک ٹھوکر رسید کی۔ اخفش ہڑبڑا کر اٹھا اور بمشکل چیخ روکی۔ (وہی گھنگریالا جنگل نوال کے حسن پر ذرا شک نہیں مگر نیند سے ہڑبڑائے بندے کو وہ چڑیل ہی دکھائی دے سکتی تھی)

"کیا ہے؟" اخفش خوف زدہ ہوا ہے یہ بات ظاہر نہیں کرنی تھی لہٰذا دبنگ لہجے میں بولا تھا۔

"اسے فرش پر نیند نہیں آرہی۔"

"کس کو؟" وہ نیند میں تھا۔

"نازک کو..." نوال نے دانت پیسے۔

"میری منجی لے جاؤ۔" وہ نیند ٹوٹنے پر بدمزہ تھا۔

"ناٹ اے بیڈ آئیڈیا... مگر تین ٹانگ کی منجی۔ وہ وزن میں تم سے زیادہ ہے ناں؟"

"تم رات کے اس پہر اس کی خرابیاں گنوانے آئی ہو؟"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں۔۔۔" نوال نے ناگواری سے کہا۔ "میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ سے لائے ہو تم۔۔۔ اور اچھی طرح واقف ہو کہ یہ سب وہ مینیج نہیں کر سکے گی۔ سو پلیز۔"

نوال کا لہجہ فکر مند ہو گیا۔ وہ واقعی نازک کو اس تکلیف سے نکلنا چاہتی تھی۔ اور اخفش کو بھی اندازہ ہو گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کیا کرے۔۔۔

"اوہ" اس نے یکدم اپنی چارپائی پر بچھا گدا اٹھا کر نوال کی طرف بڑھایا۔

"یہ بھی۔ بچھا دو۔ تھوڑا بہت فرق تو پڑے گا ہی نا۔"

"ہاں۔۔۔!" نوال خوش ہو گئی۔ گدا ہلکا پھلکا سا تھا مگر اس میں بدبو آ رہی تھی۔ مگر نوال نے مزے سے اٹھا لیا۔

"ویسے ایک بات ہے۔" وہ جاتے جاتے مڑی انداز شریر تھا۔

"مرواتے کیئرنگ ہوں تو اچھا لگتا ہے۔ مجھے نہیں اندازہ تھا کہ تم اندر سے اتنے سوفٹ ہو۔"

یہ تعریف ہی تھی۔ مگر اخفش نے بدگمانی کی عینک پہن رکھی تھی سو نوال کو بری طرح سے گھورا۔

"سو رومینٹک!" نوال نے آنکھیں میچیں اور اندر غائب۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح بہت جلدی ہو گئی۔ آج باقاعدہ کام کا آغاز تھا۔ مختلف کاموں کے لیے ٹیمیں بنا دی گئیں۔ سب سے اہم مسئلہ بیماریاں تھیں۔ مریضوں کو سارا دن اٹینڈ کرنا پڑتا۔ ایک جاتا نہیں کہ دوسرا آجاتا۔

کسی وزیر باتدبیر نے ہیلی کاپٹر سے راشن کے تھیلے پھینکے۔ آدھے گرے پانی میں اور باقی ماندہ کے لیے لوگ یوں بھاگے کہ ایک دوسرے کو کچلتے چلے گئے۔ چند ایک آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ دے مکے پہ مکا، لات کھینچ کر گرا دیا۔ گریبان تار تار کر دیا۔ چہرے پر خراشیں ڈال دیں۔

ہر انسان میں جانور بستا ہے۔ تھوڑا انسان ذرا سا گدھ۔۔۔ کچھ کتے، کچھ بلے۔۔۔ کچھ بھیڑ سے ممیاتے انسان۔ کچھ شیر سے دھاڑتے۔ کچھ اونٹ سے کینہ پرور۔ کچھ لومڑ سے مکار۔۔۔ کچھ کوے سے موقع پرست۔ کچھ کبوتر جیسے بزدل۔۔۔ کچھ الو۔۔۔ کچھ الو کے پٹھے۔

یہ انسان بھی ناں۔۔۔ چولا پہن کر گھومتا فریبی۔۔۔ مکھوٹا لگائے بہروپیا ذرا جو وقت پڑے تو بتاتا ہے، دراصل ہے کیا؟ اور پھر بھوکے سے تحمل کی امید۔۔۔ مفلس سے دریادلی۔۔۔؟ وہ کوئی اور لوگ ہوتے ہیں چیدہ چیدہ۔ یہ سب تو عام انسان تھے۔ لٹے پٹے اور اب زخمی بھی۔۔۔ ہاتھ بھی کچھ نہ آیا، الٹے زخم اور لیسیں۔۔۔

ڈاکٹرز کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔

سامان کم تھا اور ضرورتیں بہت زیادہ۔۔۔

جسمانی زخم بھی مرہم چاہتے تھے اور دلی زخم بھی۔۔۔

اب یہاں جسم کا علاج تو شاید تھا دل پر مرہم کیسے لگے؟

"میری پوتی کے جہیز کی پوری پیٹی بہہ گئی۔" بوڑھی اماں ہاتھ ملتی بھی اور پھر یادداشت پر زور دے دے کر انگلی کی پوروں پر گنتی کر کے سامان گنواتی۔

"شنیل کی رضائیاں۔۔۔ ڈبل پلائی کا ایک کمبل باہر سے منگوایا تھا۔ باقی بستروں کے لیے کپاس خریدی تھی۔ بارش پڑنے سے ایسی بیٹھی جیسے پانی کی تہہ میں پتھر بیٹھتا ہے۔ ہیں ڈاکٹر صاحب! ان فوجی بھائیوں سے کہو، میری پیٹی ڈھونڈ دیں۔"

اب ڈاکٹر صاحب کیا جواب دیں۔ ابھی تو اپنا نیا خطاب ہی ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

دراصل نوال یہاں آتے ہی خود بخود ڈاکٹر صاحب ہو گئی تھی۔ وہ بی پی اور شوگر چیک کرنا جانتی تھی۔ بخار چیک کرتی۔ مرہم پٹی تو کرتی ہی تھی اور جب ایک روز رش بہت زیادہ ہو گیا تب اس نے نسخہ بھی تجویز کرنا شروع کر دیا۔

ساتھ ہی وہ بیماروں کی دل داری بھی کرتی تھی۔ چند دنوں میں ہر دل عزیز ہو گئی۔ عورتوں کے گروپ اسے گھیر کر بیٹھ جاتے اور نجانے کون کون سے قصے بیان کرنے لگتے۔ یہ بھی پوری دلچسپی سے سنتی۔

دوسری طرف اخفش بھی بے پناہ مصروف تھا۔ دیگوں میں کھانا بنتا' سامان کا حساب کتاب... پر اس سے مشکل مرحلہ تقسیم کا تھا۔ اخفش کے اندر تحمل کا مادہ زیادہ تھا (وہ تو بس نوال کی حرکتوں پر بھڑک جایا کرتا تھا ورنہ وہ بہت باحوصلہ' جی دار اور ہر طرح کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی صلاحیت و ہمت رکھتا تھا۔ کیسا بھی طوفان ہو۔ وہ دیوار بن جانے کی ہمت رکھتا تھا۔ جھیل سکتا تھا)

مگر... مگر یہاں آکر عجیب بات ہوئی۔ نوال سے ٹکرار کا موقع تو مل ہی نہ پایا وہ الگ گروپ میں تھی۔ اور کام بہت زیادہ تھا۔ چلتی پھرتی مگن دکھائی دے جاتی تھی۔ مگر اس بار اگر کوئی بندہ... مطلب بندی' اخفش انعام کو تپلی پر چڑھا رہی تھی تو وہ تھی نازک اندام...

اخفش کے صبر کا ایسا کڑا امتحان... ضبط کی ایسی شرط...

اور سب سے بڑھ کر وہ کچھ کہہ نہیں پاتا تھا جبکہ یہاں باقاعدہ سنا دینے والا معاملہ تھا۔ اخفش کو پہلی بار احساس ہوا کہ بہت کچھ کہنے کی خواہش کے باوجود چپ رہنا صبر کی کتنی بڑی قسم ہے... تحمل کا مطلب سمجھ آنے لگا۔ مروت کے معنی کھل گئے' برداشت کا لفظ بولتے میں جبڑے پر زیادہ دباؤ پڑتا ہے۔

یا برداشت کرنے میں ایک ایک ہڈی آپس میں ٹکرا جاتی ہے۔ اب بتاؤ۔

☆ ☆ ☆

"درخت کے نیچے اسکول..." نازک چلاتی تھی۔ ایک تختہ سیاہ کے ساتھ کرسی تھی اور اشتیاق سے منہ کھول کر بیٹھے بچے... ان میں سے کچھ تھے جو اسکول جاتے تھے اور پچھلا بستہ بہہ جانے پر نئی کتابیں پا کر بے پناہ خوش تھے۔ اچھل اچھل کر بتانا چاہتے تھے۔ وہ کتنا کچھ پڑھنا جانتے ہیں۔ کچھ بچے جنہوں نے پہلی بار کتاب کو چھوا تھا۔ وہ کتاب کو الٹ پلٹ کر کے دیکھتے تھے اور بچوں کا یہی اشتیاق وجوش ٹیچر کے لیے ناگواری کا باعث تھا۔

وہ ہربات کی شکایت لے کر اپنی امی... مطلب... اخفش کے پاس آجاتی' اخفش کہیں بھی ہے۔ کچھ بھی کر رہا ہے۔ پہلے نازک کی بات سنے۔

دراصل... نازک ایک شکایتی ٹٹو ثابت ہوئی تھی۔ اور ہر بار داد رسی کے لیے اخفش کا در کھٹکھٹاتی تھی۔ اور اس میں دن رات کی تخصیص نہیں تھی۔

"یہ بچے یونی فارم نہیں پہنیں گے اخفش...؟"

"اور نہ منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ بس آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ پڑھتے کم ہیں' کھی کھی زیادہ کرتے ہیں۔ ایکچوئیلی مجھے لگتا ہے یہ اپنی اسٹڈیز کو لے کر سیریس ہیں ہی نہیں۔"

"لائن بنا کر کھڑے ہونے تک کا نہیں پتا... اور کل تو دو لڑکے صرف قمیص پہنے آکر بیٹھ گئے تھے اخفش..."

"کیا... قمیص؟"

"قمیص نہیں صرف قمیص۔" نازک نے آنکھوں کو بساط بھر پھیلایا "اور میں نے کہا کہ چلو بھاگو' پورے کپڑے پہن کر آؤ تو ایک بولا ہیں ہی نہیں... دوسرے والا اپنی چادر کے دوپٹے سے لنگی باندھ کر آگیا۔"

اخفش نے تھوک نگلا اور اس دیوار کی تلاش کی' جس سے سر مار کے جان دے دے (ویسے دینے کے بجائے یہ جان لینے کا مقام تھا) اخفش کے پاس کھڑے فوجی جوان بغلوں میں منہ دے کر مسکراہٹ چھپانے کی سعی کرنے لگے۔ مگر ایک آدھ کی ہنسی نکل ہی گئی اور اخفش کو شدید خفت میں مبتلا کر گئی۔

(دماغ نے کام نہیں کیا... دیوار نہیں ملی تھی تو پانی میں ڈوب مرتا۔ چلو بھر کی شرط بھی نہیں تھی۔ چاروں طرف پانی ہی پانی...)

پھر ہربات میں ہائی اوئی... اور حیرانی۔

سینئر ڈاکٹر لیفی نے کچھ ایڈمٹ بچوں کو دوا پلانے

کاکام دیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اسے گھن آ رہی تھی۔

"میں تو صرف بچوں کو پڑھانے کے لیے آئی ہوں۔"

"یہ کیا بات کر دی۔ کیمپ کے ہر ممبر کو کوئی بھی کام دیا جائے' وہ کرنا پڑے گا' یہاں ورکرز کم ہیں' ضرورت بہت زیادہ کی۔ اس لیے ہر شخص ہر چیز میں انوالو ہے آپ کیسے خود کو علیحدہ رکھ سکتی ہیں۔"

ڈاکٹر فیضی کی صاف گوئی پر نازک نے دوا کی شیشی پکڑ تو لی مگر انداز میں جو ناگواری تھی۔ وہ عیاں ہو رہی تھی۔ ایک جونیئر نرس نے خاموشی سے اس کے ہاتھ سے دوا لے لی۔ یہ بھی جان چھٹ جانے پر سرپٹ دوڑی۔

پھر بھی ایک کیوں۔۔۔ روزانہ صبح تیار ہو جاتی اچھا سا ڈریس پہن کر۔

"یہاں موبائل کے سگنلز نہیں آتے۔ نیٹ کام نہیں کرتا' مجھے نانو جان سے بات کرنی ہے۔" اب انخفش اس سلسلے میں کیا کرے۔ سب کام کر رہے ہوتے۔۔۔ یہ سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر فون پر گیم کھیلنے لگ جاتی۔ بچوں نے اتنا بڑا موبائل کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ذرا ذرا فاصلے سے کھڑے ہو جاتے پھر سرکتے سرکتے سر پر پہنچ جاتے۔۔۔ یہ بھنا کر اٹھتی۔۔۔ پھر ڈانٹنے بھی لگی۔

بھوک بھی جلدی لگتی تھی۔ انخفش کے نام کی پکاریں لگتیں۔ چولہا جلا کر دے۔ وہ بگنٹ آتا پھر بی بی نوڈلز بناتیں یا کوئی سوپ۔۔۔ کھاپی کر ڈسپوزل برتن باہر۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ چولہا گرلز والے روم میں ہی سیٹ تھا۔ پیٹ پوجا وہیں ہو جاتی۔ مگر بے وقت کی وہ بھوک جو تھوڑی دیر بعد ہی لگ جاتی تھی۔ اسے مٹانے کو۔۔۔ چپس کے پیکٹ۔۔۔ جوس' بسکٹ اور چاکلیٹ۔۔۔ لیے گھومتی' ایسے میں بچے اس کے گرد منڈلانے لگ جاتے۔ بچے بھوکے یا ندیدے نہیں تھے۔ مگر نازک ایک اچنبھا بن کر سب پر طاری ہو گئی تھی۔ اسے دیکھنا اور اس کا مشاہدہ کرنا وقت گزاری کا اچھا مصرف تھا۔

پر مصیبت یہ ہوئی۔ بچوں کے ساتھ ساتھ کیمپ کے نگران فوجی افسر نے بھی اس سب تماشے و حرکات کو بھانپ لیا۔ وہ انخفش کے ہمراہ آئی تھی اور انخفش بے حد محنتی کارکن ثابت ہو رہا تھا۔ بساط سے بڑھ کر کام کرتا تھا۔ افسر دوٹوک تھے اور مزاجاً" تلخ' مگر یہاں لحاظ کر گئے۔ ہر روز صبح ہونے والی میٹنگ میں جب دن کا لائحہ عمل طے کیا جاتا تھا۔ مجموعی طور پر سب کو مخاطب کرتے ہوئے بتا دیا۔

"یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھنے والوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ خود کو درست کریں ورنہ واپس بھجوا دیے جائیں گے۔"

اور یہ آئیڈیا بہت اچھا تھا۔ مگر انخفش' نازک کو اس طرح فوجی ٹرک میں بھر کے بھیج دیتا تو لیلیٰ بیگم کو کیا منہ دکھاتا اور یہ اچھا طرز عمل نہیں تھا۔ وہ ساتھ آئی تھی تو ساتھ ہی واپس جاتی۔

لہٰذا ضروری تھا کہ اسے کسی کام سے لگایا جائے۔

مگر کام۔۔۔ کون سا کام؟ انخفش نے دو دن سوچا۔

اور تیسرے دن نازک کو قلم اور رجسٹر تھما دیا۔ اسے آنے والی دوائیوں کے اندراج کا کام دیا تھا۔ کتنی آمد۔۔۔ کتنا خرچ۔۔۔ نازک کی انگلش اچھی تھی اور لکھنے میں ہاتھ تیز چلتا تھا (ہاں رات میں اسے کلائی پر بام ملتے دیکھ کر کتنی ہی لڑکیاں منہ چھپا کر ہنستی پائی گئی تھیں)

ادھر نازک کو یہ کام پسند آ گیا۔ ایک گھنے پیڑ کے نیچے کرسی ٹیبل رکھ کے وہ لکھتی۔ اسے اب کام میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

مگر کچھ مسائل ہنوز تھے۔ "مچھر کاٹتے ہیں۔ ایک مکھی کو خاص طور پر اس کی ناک پر بیٹھنے میں دلچسپی ہے' بو بہت آتی ہے۔ واش روم کی پراپر صفائی نہیں ہوتی۔۔۔ یہ نہیں ہوتا۔۔۔ وہ نہیں ہوتا۔

ہر روز چاول کی دیگ کیوں پکتی ہے۔ یا گوشت' آلو اور نان۔۔۔ سم تھنگ اسپیشل کیوں نہیں۔۔۔ لائٹ وائٹ کڑاہی۔۔۔ پسندے' چائنیز رائس۔ یا پھر وہ بولتی

انفش سنتا اور سر دھنتا۔ نازک کام سے لگی تب انفش کو کچھ ذہنی سکون ملا۔

نوال نے بھی سراہا۔ اب کیا ناں کرنے والا کام۔۔۔ خود نوال نظر ہی نہ آئی۔ وس جگہ ٹانگیں پھنسا رکھی تھیں۔ پکتی دیگ میں سے کچا پکا آلو نان پر رکھ کے کھاتی اور یہ جا وہ جا۔۔۔ بال اسی دن بنائے تھے جس دن گھر سے نکلی تھی۔

فخر سے ہر ایک کو بتایا "چار دن سے منہ نہیں دھویا۔ پھر بھی چم چم کرتی ہوں۔" اس اطلاع پر سب ہی نے دیکھا۔ پیاری تو وہ تھی' شوکیس میں سجی گھونگھریالے بالوں والی پری۔۔۔

پر انفش نے ذرا غور سے دیکھا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ چہرہ کمزور سا دکھتا تھا اور رنگت جھلس گئی تھی۔ ہاتھ اور پیر بھی کھردرے سے ہو گئے تھے۔

اسے جو بھی کام دیا جاتا' فرماں برداری سے انجام دیتی اور کچھ نہ کچھ کرتی پائی جاتی کہ کسی نے فارغ بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔

ایک فوجی بھائی کو کچھ جادوئی کمالات آتے تھے۔ منہ میں مکئی کے دانے رکھ لیتا اور کان سے نکال کر دکھاتا۔۔۔ ماچس کی تیلیاں جلا دیتا۔۔۔ آگ لگ جاتی۔۔۔ مگر جب ڈبیا کھولو' تیلیاں سلامت۔۔۔ اب یہ کرتب بی بی نوال بچوں کے ہجوم میں کھڑے ہو کر دکھاتی پائی جاتی۔

ہنستی مسکراتی' ماتھے پر شکن لائے بنا تھکاوٹ اور بے آرامی کی کوئی شکایت نہیں۔ مست ملنگ' مگن۔۔ نوال ضمیر۔۔۔ اور انفش کے پاس بھی سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی مگر ایک جائزہ۔۔۔ ایک تقابلی جائزہ وہ بے خیالی میں لیتا تھا۔

☼ ☼ ☼
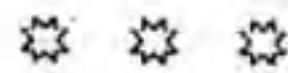
نوال کا ہر فن مولا ہونا۔۔۔ اور بے خطر کود پڑنا سب میں مشہور ہو چکا تھا۔ وہ جادوئی پری تھی' جو ہر کام کر سکتی ہے۔ کچھ بھی تب ہی تو ڈاکٹر سیمی اپنے چوٹ لگے ہاتھ کو آگے دکھاتے ہوئے نوال تک چلی آئیں وہ پریشان لگ رہی تھیں۔ نوال اس وقت بالکل فرصت سے ہاتھوں کی انگلیوں میں دھاگے کا جال بنانا سکھا رہی تھی۔ جال بنانا۔۔۔ پھر اسے اس طرح پلٹنا کہ ایک بل بھی خراب نہ ہو۔

"آپ کیس کر سکتی ہیں ڈاکٹر نوال۔۔۔؟" ڈاکٹر سیمی ہاتھ کی چوٹ میں درد سے نڈھال سی تھیں' پوری طرح سے حاضر دماغ نہیں لگ رہی تھیں۔

"کیس۔۔۔" نوال نے چونک کر دیکھا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔ کون سا کیس ہے' جو میں نہیں کر سکتی؟ دیوانی مقدمہ۔۔۔ فوجداری مقدمہ۔۔۔ کیس ہی کیس۔"

"ڈلیوری کیس ڈاکٹر نوال۔۔۔؟"

"ڈلیو۔۔۔ ر۔۔۔ ی کیس۔۔۔" نوال کے ہاتھ دھپ سے گر گئے۔ کیا کسی مال کی ڈلیوری ہے؟" نوال کو لگا یہ وہ والی ڈلیوری نہیں ہے۔ جو وہ سمجھی ہے۔

"مال کی ڈلیوری کیوں؟ ایک لڑکی کا ڈلیوری کیس ہے۔ ادھر جنوب میں اونچی پہاڑی پر جو گھر ہیں' وہاں ایک لڑکی کا سیون منتھ ہے تو۔۔۔" ڈاکٹر سیمی تفصیل بتا رہی تھیں۔ "کالج میں بیٹھ کر جانا ہو گا ڈاکٹر فوزیہ ساتھ ہوں گی۔ اب یہ تو وہاں جا کر پتا چلے گا۔ کیس کی کیا صورت حال ہے ادھر لانا ہو گا یا وہیں ٹریٹمنٹ ہو گی۔ اگر بات سیزر تک چلی گئی تو۔۔۔" اب ڈاکٹر سیمی خود سے ہمکلام تھیں۔

جبکہ ڈاکٹر نوال۔۔۔ منہ کھولے' آنکھیں پھیلائے ان کے ہلتے لب دیکھ رہی تھیں۔ یعنی کہ ڈلیوری۔۔۔ وہ والی ڈلیوری۔

دھپ۔۔۔ نوال نے گردن ڈھلکا دی۔

☼ ☼ ☼

جس وقت نوال کیسز کی اقسام پر مراقبے کی سی گہرائی لیے غور و فکر کر رہی تھی۔ عین اس وقت نازک اندام۔۔۔ انفش سے پوچھ رہی تھی کہ گھر کب تک جانا ہے' اب وہ تھک چکی ہے۔ نانو جان بھی بہت یاد آ رہی ہیں اور اس کا دل اوب گیا ہے' خود اپنی طبیعت خراب لگنے لگی ہے۔

اس نے شدید ناگواری کا انداز اپناتے ہوئے کافی کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا' جو اخفش کو ناگوار گزرا تھا مگر اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے بتایا۔

"شام تک فیصلہ ہو جائے گا۔" اگر اخفش خود نہ بھی جاسکا تو کم از کم اسے ضرور بھجوا دے گا۔

"دراصل اخفش میں ضرور رک جاتی۔ مگر میری کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو گئی ہیں اور یہاں کھانا صرف تین ٹائم ملتا ہے اور وہ بھی۔۔۔" اس نے آگے نہ جانے کیا کہنا تھا "اور میرے سب کپڑے بھی میلے ہو چکے ہیں (اتنا بڑا ڈھیر لائی تھی) اخفش نے چونک کر اسے دیکھا۔ دیگر لڑکیوں بشمول نوال نے وہاں کی عورتوں کی طرح ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر تھپ تھپ کر کے اپنے ڈھیر کپڑے دھوئے تھے پھر سکھانے کے لیے مختلف جھاڑیوں پر ڈالے اور اپنے کارنامے پر خوش ہو کر دیر تک قہقہے لگائے تھے۔

مگر نازک کے لیے آتے وقت کی تھرل اور ایکسائٹمنٹ ختم ہو چکی تھی۔

اخفش کی تسلی پر وہ شام تک کے انتظار پر راضی ہو گئی۔ سامان بھی باندھ لیا تھا۔

لوگ پانی اترتا دیکھ رہے تھے اور واپسی کا قصد کر رہے تھے۔ بچا کھچا مال واسباب۔۔۔ تب ہی ایک ہوش ربا اطلاع نے سب کو بوکھلا دیا۔

جنوبی پہاڑی کے پیچھے والے بند میں شگاف ہو گیا ہے۔

لڑکی کی ڈلیوری والے پرابلم کے لیے پہلے ایک ہی لانچ روانہ ہو رہی تھی۔ مگر یہ خبر ملنے پر کہ وہاں چند خاندان موجود ہیں اور پانی انہیں بہا لے جائے گا۔ لانچوں کی تعداد تین کر دی گئی۔ پانی کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ سانس لینے کی مہلت بھی نہیں دیتا تھا۔ جو کرنا تھا جلد از جلد کرنا تھا۔

"تو یہ لوگ وہاں بیٹھے کیا کر رہے تھے۔ اب دوسروں کو بھی مصیبت میں ڈال رہے ہیں۔" کوئی چلایا تھا۔

"یہ لوگ اپنی زمین کبھی نہیں چھوڑتے ڈوب کر مرنا پسند کر لیتے ہیں مگر۔"

پتا نہیں کس نے جواب دیا۔ تعریف کی تھی کہ تنقید۔۔۔ معلوم نہیں۔

☆ ☆ ☆

نوال کیس نہیں کر سکتی تھی مگر لانچ میں سوار ہونے والوں میں وہ پہلی تھی۔ آرمی ڈاکٹرز اسے ٹوکتے ٹوکتے رہ گئے۔ وہ اتنی کارگزار اور باکمال لڑکی تھی کہ اس کی موجودگی سب معاملوں کو سلجھا دیتی تھی۔ اور پھر اس کا جوش' جذبہ اور بے غرضی۔۔۔

دوسری لانچ پر اخفش سوار تھا۔ نوال کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

"تم کیا منے کے کان میں اذان دو گے؟"

اخفش خاک نہ سمجھا۔۔۔ "منا کون منا؟"

"ہے ایک۔۔۔" نوال نے بے نیازی دکھاتے ہوئے منہ موڑا' سارا راستہ اخفش بے چارہ منے کو ہی سوچتا رہا۔

لوگ اپنے قیمتی مال واسباب سب سے اونچی جگہ پر رکھے امداد کے منتظر تھے لیڈی ڈاکٹر اور نوال اندر کی جانب بھاگیں۔

لڑکی کا کیس بگڑ گیا تھا۔ اسے فوری طور پر بڑے ہسپتال میں شفٹ کیا جانا ضروری تھا۔ مگر اس حالت میں اسے لانچ تک لانا بھی بڑے جوکھم کا کام تھا۔ مصیبت ہی مصیبت۔۔۔ پیچھے ٹوٹے بند کے پانی کا خطرہ۔۔۔

اور مرے پر سو درے۔ آسمان نے بھی ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ برسنا شروع کر دیا تھا۔ لہٰذا کار روائی میں تیزی وقت کی اہم ضرورت تھی۔

لوگ لانچ پر سوار ہوتے تو اپنا صندوقچہ یا چارپائی بھی رکھنا چاہتے ـــــ مگر فوجی بھائی اس کام میں ماہر تھے۔ سب کچھ کر رہے تھے' وہ اس بات پر بھی راضی تھے کہ دوسرا چکر لگا لیا جائے گا۔ مگر برستا آسمان۔ پھیلتی شام۔۔۔ عقل کا تقاضا یہی تھا جلد از جلد نکل لیا جائے۔

تینوں لانچوں کے انجن ایک ساتھ اسٹارٹ ہوئے تھے۔

کون کہتا۔ یہ دریا نہیں ہے۔ یہ کھیت کھلیان تھے چند روز پہلے۔۔۔ اب جہاں لانچ بھاگتی ہے وہاں ہل چلتا تھا۔

اور جب کسی زمین پر ہل کی جگہ کشتی چلنے لگے تب اس زمین کو اور مکین کو بربادی اور خاتمے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کاش کوئی ہو جو سوچے مگر اس وقت تو۔۔۔

"ہائے میری چھوٹی تو جھولے میں سو رہی ہے۔ یہ ڈلیوری والی ماں کی تڑپتی پکار تھی۔ جو انجن کی گڑگڑاہٹ میں دب گئی۔" ہائے روکو۔۔۔ کوئی تو روکو۔"

وہ اچھلی تھی اور لانچ سے کودنے والی تھی تب ہی نوال کو یاد آیا۔ ہاں ایک بچی چارپائی سے بنے جھولے میں تھی پر اب وہ یہاں نہیں تھی۔ اوہ تو وہ بچی تھی۔ سال ڈیڑھ سال کی بچی۔

اس عورت کی پکار اور اچھلنے کو سب نے درد سمجھا تھا۔ اصل بات تو نوال اور ڈاکٹر فوزیہ نے سمجھی تھی۔ ڈاکٹر فوزیہ نے لانچ چلانے والے کو چیخ چیخ کر روکنے کو کہا۔ وہ اللہ کا بندہ سمجھا۔ عورت کی حالت کے پیش نظر جلدی کا کہہ رہی ہیں۔

عورت بھی لانچ رکنے کی منتظر تھی مگر یہ کیا لانچ تو آگے کو چلنے لگی ہے۔ عورت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔۔ وہ کودنے کو لپکی مگر ڈاکٹر فوزیہ نے اسے جکڑ لیا۔ تب وہ بن جل جیسی مچھلی کی طرح تڑپی۔

"میری چھوٹی جھولے اندر۔۔۔ میری چھوٹی ہائے۔"

وہ ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھی۔

اور بس ایک پل تھا۔ نوال نے پانی میں چھلانگ لگا دی وہ سب کو سرپٹ بھاگتی نظر آتی تھی۔ لانچیں خود بخود رک گئیں۔ سب ناسمجھی سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ مگر بات نہیں کر پا رہے تھے۔ لگاتار بارش۔۔۔ منظر کو دھندلا کر رہی تھی۔ ڈاکٹر فوزیہ نے اپنی لانچ کے فوجی کو بات سمجھائی۔ وہ سنتے ہی پانی میں کودا اور اس جانب بھاگا جدھر نوال گئی تھی۔ مگر آدھے راستے میں ہی رک گیا۔ نوال بھاگی آ رہی تھی اور سینے سے لگی بچی۔۔۔ اوپر بجلی کڑکی تھی اور بارش غضب ناک ہو گئی تھی۔ دور سے آتا ایک سیلابی ریلا تھا۔۔۔ نوال نے بچی فوجی جوان کو دی۔ لانچ اسٹارٹ تھی ایک اشارے کی منتظر۔۔۔

فوجی جوان نے بچی ڈاکٹر فوزیہ کو۔۔۔ وہ خود سوار ہوا اور ہاتھ بڑھا کر نوال کو کھینچا۔ نوال ہلکی پھلکی سی تو تھی۔ منٹ میں اوپر آ گئی اور وہیں ڈھے گئی لانچ پانی میں دھاڑی۔ جھٹکا لگا۔ لانچ نے اسپیڈ پکڑی مگر یہ کیا۔۔۔ نوال۔۔۔ جو ابھی اوندھی پڑی تھی۔ اب کہیں نہیں تھی۔ ابھی تو تھی۔ کیا جھٹکا لگنے سے گر گئی مگر کدھر۔۔۔ لانچ رکتے رکتے بھی کتنا آگے جا کر رکی تھی۔

پر پیچھے تو کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا۔۔۔ نوال نہیں تھی۔ عورت بچی کو سینے سے لگائے اب اپنے درد سے چلا رہی تھی۔ اسے فوری مدد کی ضرورت تھی اور نوال کو۔۔۔

"آپ جائیے۔ میں اسے لیے بغیر نہیں جا سکتا۔۔۔ کبھی نہیں۔"

یہ افخش کے جملے تھے اور اس سے پہلے کہ کوئی اسے روکتا۔ وہ پانی میں کود چکا تھا۔

✡ ✡ ✡

اوپر سے برستی بارش۔۔۔ پانی کا شدید بہاؤ۔۔۔ اندھیری دھاڑتی چنگھاڑتی رات۔۔۔ کیمپ میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ تلاش کے لیے جانے والی آخری لانچ بھی ناکام واپس آ گئی تھی۔ نوال مل نہیں سکی۔۔۔ اور افخش آنے پر راضی نہ ہوا تھا۔

اسے لیے بغیر۔۔۔ نوال کے بغیر کبھی نہیں۔۔۔ اس کے لہجے کے صدمے اور عہد پر دل پھٹ رہا تھا۔ وہ ہاتھوں کا بگل بنا کر بس پکارتا تھا "نوال۔۔۔ نوال۔۔۔!"

ٹارچ کی روشنی پانی پر عکس دکھاتی تھی۔ وہ نہ دکھاتی تھی جو دکھایا جانا چاہیے تھا۔

"پتا نہیں کہاں ہو گی۔ پانی کا بہاؤ اتنا زیادہ ہے اب تک تو کہاں پہنچ چکی ہو گی۔" ایک آفیسر نے دل کڑا کر

کے کہہ دیا۔

"وہ اتنی آسانی سے بہہ جانے والی چیز نہیں سر!" اخفش بولا "آپ جانتے نہیں نوال ضمیر خان کس چیز کا نام ہے۔"

شام رات میں ڈھلی اور رات ہولناکی میں۔۔۔ برستی، گرجتی ٹکڑ کڑاتی گیلی رات اور وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے وہیں رہ گیا تھا۔

زندہ نہ ملے۔۔۔ مری ہوئی مل جائے پر وہ نوال کے بغیر نہیں جائے گا۔ کبھی نہیں۔۔۔

اسے بارش نے بھگو دیا تھا۔ سر سے پیر تک پانی بہتا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں پونچھتا تھا تاکہ منظر صاف دکھائی دے۔ بارش نے بھرم رکھ لیا تھا۔ وہ بارش کے ساتھ ساتھ آنسو بھی پونچھتا تھا۔ اخفش انعام۔۔۔ رو رہا تھا۔ نوال ضمیر کے لیے اور جب اس پر خود یہ انکشاف ہوا تو نگاہ چرانے کے بجائے وہ با آواز بلند رو دیا۔

ہوا میں تلوار چلانا بن رکھا تھا۔ پانی میں کیا گھمائے، بس پکارتا تھا اور پکار پکار کر ہارتا تھا اور ایسے ہی ایک ہارے لمحے میں وہ سر پر ہاتھ رکھ کے یونہی کہیں بیٹھ گیا۔

جادوئی کمالات سیکھ رہی تھی۔ غائب ہونا بھی سیکھ لیا۔

اور کیا نوال ضمیر وہ چیز تھی جو اتنی آسانی سے نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

وہ آنی کو کیا جواب دے گا اور نانو کو۔۔۔ اور دادا جان کو۔۔۔

پر ان کے سوال و جواب سے پہلے خود کو تو بتا دے۔ کہ نوال ضمیر کہیں نہیں تھی۔

یونیورسٹی میں وہ سب سے اپنا اور اس کا رشتہ یوں چھپائے پھرتا تھا جیسے گناہ۔۔۔ اور ابھی چلاتے ہوئے جب اس نے خود کو چھڑایا ان فوجی بھائیوں سے جو اسے کسی صورت چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے تب اس نے سوچا کہ وہ کیا رشتہ بتائے۔ بہن کا" دوست کا" رشتے داری۔۔۔ یا پھر دشمنی کا۔۔۔

ہاں۔ وہ تو اس کی دشمن تھی اور دشمنی کے بھی تو اصول ہوتے ہیں۔ اس نے سوچا اگر نوال کی جگہ وہ بہہ جاتا۔۔۔ ڈوب جاتا تو کیا نوال اسے چھوڑ جاتی' ہاتھ جھاڑتی۔ خس کم جہاں پاک۔۔۔ نہیں کبھی نہیں۔ نوال ضمیر ٹم اخفش انعام کو کبھی چھوڑ کر نہ جاتی۔ صاف کہتی "یہ میں نہیں کر سکتی اس لیے کہ میرا ضمیر ابھی زندہ ہے۔ اور یہ میں نے اپنے باپ کے لیے نہیں کہا۔"

تو وہ اتنا جانتا تھا نوال کو۔۔۔ اتنا زیادہ۔۔۔ پھر کیسی اجنبیت۔۔۔ کیسی بے گانگی' لاتعلقی۔

لیکن نہیں۔ لاتعلقی ہوتی تو اس رات کے سناٹے میں یوں سر پر ہاتھ رکھ کے روتا۔ پکار پکار کے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا اور کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ اس اندھیرے میں کہاں ٹامک ٹوئیاں مارے۔۔۔ صبح کا انتظار کرے پر اگر وہ واقعی بہہ گئی ہے تو کہاں سے ملے گی۔ ڈوب گئی ہے تو کہیں نہ کہیں تو ابھرے گی' تو کیا وہ پانی کے ساتھ ساتھ چلتا جائے اور سمندر میں جا گرے پر اگر وہاں بھی نہ ملی تو۔۔۔؟ اور اس تو کے آگے کی ساری کہانی تھی۔

کب کب اس کا دل نہ چاہا تھا کہ وہ چھڑی گھمائے اور اسے غائب کر دے۔ جب وہ عید کی رات باربی کیو پارٹی میں چھپ کر داخل ہوئی اور تکوں کی پلیٹ اڑا کر بے خود کو مددگار بتائے عیش اڑاتی پائی گئی اور رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر مجال ہے ذرا شرمندہ ہوئی ہو' الٹا اسے مورد الزام ٹھہرا دیا یہاں تک کہ اس کے اپنے دوست اسی کو قصوروار کہنے لگے۔

تب اس سے کوئی جواب نہ بن سکا۔۔۔ کوئی جواز نہ گھڑ سکا۔

جب وہ بس میں سوار ریس لگا رہی تھی۔ جب وہ چرس کا سگریٹ بھرنا سیکھ رہی تھی اور اسے پکار رہی تھی۔ یا جب وہ بکرے خرید لائی تھی۔ جب وہ اس کے موٹاپے کی نشانہ بناتی تھی۔ یا پھر کب کب۔۔۔

تین سال پہلے جب وہ ایبٹ آباد سے کراچی اپنے ڈیڈ ضمیر خان کی خالہ جان یعنی زینت بیگم کے گھر آئی۔ تب زینت بیگم اور نوین کی زندگی میں کیسی رونق اور رنگ بھر گئے۔۔۔ وہ پھلجھڑی جیسی لڑکی تھی۔ زینت بیگم

اور نوین دبی دبائی محدود زندگی گزار رہی تھیں۔ نوین کے والد کی سوچ نے انہیں ایک دائرے میں سمیٹ رکھا تھا۔ چار دیواری کے اندر کی زندگی... نوین کے اندر اعتماد کی کمی نہیں تھی۔ وہ قابل، تعلیم یافتہ ذہین لڑکی تھی۔ مگر گھر کے ماحول اور حالات واقعات نے اسے دبا دیا تھا۔

جبکہ نوال... وہ عورت ہونے کو زندگی کی راہ میں آنے والی مشکلات کا باعث نہیں سمجھتی تھی۔ وہ لڑکی تھی مگر لڑکیوں والے گن نہیں تھے۔ آدھا مرد... دیوار میں ڈرل کر رہی ہے۔ استری اور واشنگ مشین کے سوئچ جوڑ رہی ہے۔ فیوز لگانا بھی جانتی تھی۔ موبائل بھی ٹھیک کرتی اور چارج بھی...

اور ادھر پڑوسی اخفش کو یہ سب بے حد برا لگتا۔ اسے لگتا نوال براہ راست اس کی مردانگی کو چیلنج کر رہی ہے۔

دراصل اخفش عورت کو چادر اور چار دیواری کے اندر ہی محفوظ و مامون سمجھتا تھا۔ وہ عورت میں عورت پن کے برقرار رہنے کا خواہش مند تھا۔ اور اس کے پیچھے اس کی اپنی ماں ہما کی موت تھی۔ وہ شادی سے پہلے ایئر ہوسٹس تھی۔ شادی کے بعد جب دوبارہ جوائن کرنا چاہا تب اخفش کے والد نے منع کیا۔ شادی سے پہلے اس طرح کے شوق چل جاتے ہیں مگر اب اس کا ایک گھر تھا۔ شوہر تھا اور ایک بچہ... اور پھر گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ اسے کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اب کام کی مشقت جھیلے۔ انعام اس کی ہر خواہش پورا کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ مگر وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ بات ضد سے گزرتی ہٹ دھرمی تک جا پہنچی اور ہما نے جوائن کر لیا۔ اب یہ قسمت کا لکھا تھا جہاز کریش ہو گیا اور ہما کی لاش تک نہ مل سکی۔

اخفش کے ذہن میں خیال پختہ ہو گیا۔ اس کی ماں گھر میں رہتی۔ شوہر کی بات مان لیتی۔ ہٹ دھرمی نہ دکھاتی تو آج زندہ ہوتی۔

نوال م اخفش کی سوچوں کا الٹ تھی۔ اور جانے انجانے میں وہ اخفش ہی کے مدمقابل آگئی (یا اسے کم از کم یہ لگا) اٹھارہ برس کی لڑکی قربانی کے لیے بکرے خرید کر لے آئی۔

وہ نانو اور خالہ (نوین) کو باقاعدہ سبق پڑھاتی کہ معمولی ماچس کے انتظار میں مرد کا انتظار کرتے رہنا نری بے وقوفی ہے آپ پیروں میں جوتی پھنسائیں اور گلی کے نکڑ سے لے آئیں۔

"ہائے... لوگ کیا کہیں گے، ماچس خریدنے گھر سے نکلی عورت..." نانو کو شرم آئی تھی یا پتا نہیں کیا۔ اور نوین بھی ہم خیال نظر آ رہی تھی۔ تب نوال نے تپ کر اعلان کیا۔

"پھر آپ دونوں کے لیے فری مشورہ ہے۔ پتھر پر پتھر رگڑ کر آگ پیدا کرنا سیکھ لیں اور وہ میں سکھا دوں گی۔"

اخفش نے سن لیا، سوچا۔ اتنی محنت کی کیا ضرورت ہے۔ گیس آن کر کے نوال بس اپنی زبان سے چولہے کو چھو لے۔ وہ شعلے بھڑکیں گے کہ فائر بریگیڈ بھی ہار مان لے۔

اخفش نے پہلے چہرے کے تاثرات پھر بے الفاظ اور بعد میں ببانگ دہل اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ نوال جتنا عرصہ بحیثیت مہمان رہی۔ اس نے وہ تمام کام اپنے ذمے لے لیے جو اخفش کیا کرتا تھا۔ پڑوسیوں سے دیرینہ تعلقات تھے۔ اخفش کے دادا، دادی اور چاچو حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اس کا تین وقت کا کھانا نوین کے ہاں ہی ہوتا تھا۔ نوال کی موجودگی کی بنا پر اس نے ادھر جانا ہی چھوڑ دیا۔ نانو کو وہ بیٹوں کی طرح پیارا تھا۔ نوین تو بچپن سے اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی۔ لاڈلا... بھائی، بھتیجا، دوست سا اخفش۔

نوال نے اس پر بھی اعتراض کیا۔ "کوئی دوستی نہیں، دراصل آپ اس پر ڈیپنڈ کرتی ہیں۔ سوچتی ہیں اگر وہ نہ ہوا تو دو اکیلی عورتوں کا کیا ہوگا۔ دراصل نوین کے بڑے بھائی نعمان امریکہ میں شادی کر کے وہیں کے ہو رہے تھے اور سال پہلے نوین کے والد کا انتقال، دونوں ماں بیٹی کو مزید اکیلے پن کا شکار کر چکا تھا۔

نوال مہمان تھی۔ اسے جانا ہی تھا۔ جانے سے

پہلے وہ اخفش کے پاس آئی اور اسے بتایا کہ وہ جانتی ہے وہ اسے پسند نہیں کرتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بھی اسے ناپسند کرتی ہے مگر پھر بھی وہ معذرت خواہ ہے۔ اس تکلیف کے لیے جو اس نے جھیلی اخفش نے پورے حق سے معذرت قبول کی۔

تب نوال نے بتایا کہ اس طرز زندگی کے پیچھے اس کے ڈیڈ ضمیر خان کی ایک حادثے میں ٹانگیں ضائع ہو کر گھر بیٹھ جانا تھا۔ وہ عدم تحفظ کا شکار ہو گئے تھے۔ تب آٹھ سالہ نوال اپنے ڈیڈی کی ٹانگیں بن گئی۔

وہ ان کے ساتھ ہر جگہ جاتی اور ہر وہ کام کرتی جو ڈیڈ کے کرنے کے تھے۔ اس کی امی گھریلو عورت تھیں۔ بڑی دونوں بہنیں بھی باہر کی دنیا سے نا آشنا تھیں اور کچھ ضمیر خان کو لگنے لگا تھا کہ وہ دونوں باہر جاتی ہیں تو ہر مرد انہیں ٹٹولتی ہوس بھری نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایسے میں نوال باپ کا بازو بن گئی اور اب یہ اس کا طرز زندگی تھا۔ وہ اس سے پیچھے ہٹ نہیں سکتی۔ حقیقت سے آشنا ہو کر اخفش بن رہ گیا۔

ہاں ہر بات کے پیچھے ایک اور بات ہوتی ہے اور وہی اصل بات ہوتی ہے۔ پہلی بار اخفش کے دل میں نوال کے لیے جگہ بنی اور اس نے نوال کے حالات کو جانا اور سمجھا۔

لیکن یہ پل بھر ہی کی کیفیت رہی ہو گی۔ نوال کے کسی جملے نے پھر اسے تپا دیا۔

اور پھر جاتے جاتے جب نوال کو یہ پتا چلا کہ اخفش کے بے پناہ ہینڈسم چاچو اخطب اب تک لنڈورے (مطلب کنوارے) ہی گھوم رہے ہیں اس نے منہ پھاڑ کے پوچھ لیا کہ اس کے اتنے ہینڈسم چاچو نے اب تک شادی کیوں نہیں کی تب اخفش نے اپنا سوال جڑ دیا کہ اس کی بے حد حسین خالہ (نوین) بھی تو اب تک کنواری گھوم رہی ہیں کیوں؟ نوال بری طرح چونکی۔

"کیا ان دونوں باتوں کا آپس میں کوئی تعلق ہے؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔ "کیا اس کے پیچھے کوئی بات ہے؟"

اخفش نے سر ہلایا "وہی اصل بات ہے۔"

"پر کیا؟" نوال نے پوچھا۔

"اتنی ہوشیار بنتی ہو پتا لگا لو۔" اخفش نے چیلنج کیا۔

"وہ تو میں لگا ہی لوں گی۔" نوال بولی۔

"صرف پتا لگاؤ گی یا انجام تک بھی پہنچاؤ گی۔" اخفش اسے اکسا رہا تھا۔

نوال نے جواب دیا۔ "انجام پر بھی پہنچ جاؤں گی، ایک ہیپی اینڈ۔۔۔"

اور پھر جب اس نے جامعہ میں داخلہ لیا اور کراچی شفٹ ہوئی تو۔۔۔ اس نے حقیقت معلوم کی۔

دانت کاٹی دوستی، محبت کے باوجود نوین کے والدین نے ذات برادری سے الگ ہونے کی بنا پر اشتیاق احمد کے بے حد محبت بھرے انداز سے رشتہ مانگنے پر نا صرف منع کر دیا تھا بلکہ تعلقات میں بھی بال آگیا تھا۔

اور بعد میں نوین نے اعلان کر دیا جو رشتہ باپ نے اپنی زندگی میں انکار کر دیا۔ وہ اسے کیسے اپنا سکتی ہے۔ ادھر اخطب نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔

نوال نے حقیقت سے واقف ہو کر پہلے تو سمجھانے کی کوشش کی اس لیے کہ وہاں امریکہ میں بھائی نعمان خان بھی اس رشتے پر راضی تھے۔ مگر نوین اس رشتے کو باپ کی حکم عدولی سمجھتی تھی۔

یہاں سے نوال کا نوال پن عود کر آیا۔ اس نے اپنی چالیں چلیں۔ ایسے ٹانکے جوڑے کہ آخری پل تک نوین کو پتا ہی نہ چلا کہ اس کا نکاح اخطب کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ وہ تو یہی سمجھتی رہی نوال اور اخطب کا نکاح ہے۔ وہ تو جب مولوی صاحب نے نوین سے پوچھا تب صورت حال ایسی تھی اقرار کے سوا کوئی راہ نہ تھی۔

نوین تو نوین۔۔۔ خود اخطب، اخفش، نانو، دادو اور نوال کے بہت پکے دوست بن جانے والے اشتیاق احمد کو نکاح کے بعد علم ہوا کہ دراصل ہوا کیا ہے۔ سب سے پرے حق دق اخفش، اس کی تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو گئی تھی۔ کوئی انسان ایسے بھی کر

سکتا ہے۔ بلکہ کوئی لڑکی۔

وہ بس سوچتا ہی رہ گیا۔ دوسری طرف نوال نے بے خود خان کے ساتھ مل کر ایک ٹیم سی بنالی اور اخفش کو زچ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھار کھی۔ وہ اسے بتا کر' جتا کر یا چھپا کر بہرحال چڑا ضرور جاتی۔

دونوں یونی کے ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں تھے۔ اشتیاق احمد کو نوال بے حد پیاری تھی۔ جب ہی تو اسے اخفش کے لیے سوچا۔

اور تب اخفش نے فقط خود کشی کا سوچا' مر جائے یا مار دے اور انکار بلکہ صاف انکار نوال کی طرف سے بھی آیا تھا۔

اخفش کو نازک اچھی لگی تھی۔ ایک ایسی نزاکت (جسمانی نہیں) رکھنے والی عورت۔۔۔ جس نے عورت پن کو برقرار رکھا تھا (غلط بالکل غلط نری ست عورت نکمی اور کام چور' لیلیٰ بیگم نے باقاعدہ بگاڑ دی تھی مگر اخفش کو سمجھ نہیں تھی)

وہ ہر معاملے میں نوال کا الٹ تھی۔

کچھ فطرتاً" رہی سہی کسر لیلیٰ بیگم کی قربت نے پوری کر دی تھی۔ جسمانی لحاظ سے بھی نوال گھونگھریالے بالوں والی باربی ڈول۔۔۔ اور ہاں نازک' سو روپے والی وہ' وہ گل گوتھنی گڑیا تھی جسے چھوٹی بے بی گود میں بھر کے ہروقت فیڈر پلاتی ہے۔ ہی ہی ہی۔۔۔

اخفش کے لیے جسمانی فرق شاید معنی نہیں رکھتا تھا (شاید اس لیے کہ وہ خود بھی کافی حد تک سو روپے والے گڈے ہی سے مشابہت رکھتا تھا ہاہاہا) اور جسمانی تضاد کی شاید اتنی اہمیت نہ تھی مگر۔۔۔ ذہنی تضاد سوچ، فکر، نظریات۔۔۔

نوال جفاکش تھی جب ہی تو یہاں تک چلی آئی' دلیر تھی۔ پانی میں کود گئی' نڈر تھی بھاگتی چلی گئی' زندگی اہم ہے۔ جان قیمتی ہے۔ صرف نوال کی نہیں اس شیر خوار بچی کی بھی جو مصیبت سے بے پروا جھولے میں اونگھ رہی تھی۔ زندگی پانی کا بلبلہ ہے اور جس نے پھوٹ ہی جاتا ہے۔ مگر ایسے؟

کیچڑ میں لت پت' وہ ایک بار پھر ہمت کر کے آگیا۔ پانی کے بہاؤ اور شور میں قطعاً" کمی واقعی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے شانے میں شدید درد ہو رہا تھا۔" وہ دلدلی زمین پر کتنی بار گرا تھا۔ پتا نہیں یہ قدموں کی لڑکھڑاہٹ تھی یا سوچوں کا اژدہام۔۔۔ پچھتاوے ناکامی۔

اس نے ان فوجیوں کو خود سے دور کر دیا تھا۔ جو اسے یہاں نہ چھوڑنے پر بضد تھے' اصرار جب زبردستی میں داخل ہوا تو وہ گتھم گتھا ہو گیا۔ ایک کا تو گریبان پکڑ لیا یہ سوچ بھی کیسے لیا۔ وہ نوال کے بغیر جائے گا۔

سب اسے بے وقوف کہہ رہے تھے ہاں وہ تھا اپنی جان کا دشمن۔۔۔ تو کیا زندگی بھر اس احساس کے کچوکے کھاتا؟ اس نے اسے تلاش نہیں کیا اور بس اپنی جان بچا کر نکل آیا۔ تو پھر ایسی زندگی سے دشمنی پال لینا ہی بہتر ہے۔

"نوال۔۔۔ نوال ضمیر خان۔۔۔" اس نے ایک بار پھر گھوم گھوم کر اسے پکارنا شروع کیا۔ اور نوال تو نہیں بولی۔ ایک گائے کے ڈکرانے کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی' جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔

اور اگر نوال ضمیر زندہ ہوتی تو اتنی دیر تک کہیں مخفی یا خاموش نہیں ہوتی۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا۔

نوال رنگ تھی' نشان چھوڑ جانے والا۔۔۔

نوال خیال تھی۔۔۔ خوب صورت غزل میں ڈھل جانے والا۔۔۔

وہ خواب تھی۔۔۔ خوش کن تعبیر کا عکس۔۔۔

ہنسی تھی۔ اعتماد' یقین' سچائی' نوال کیا نہیں تھی۔

آہ! اور اب نوال نہیں تھی۔ کہیں نہیں تھی۔ اس کا دل نچڑ گیا۔

وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والی تھی ہی نہیں۔۔۔ نڈھال و ناکام اخفش نے سوچا۔

"ایک ڈبکی اور لہر میں اتنی طاقت تھی کہ نوال کو بہا لے جائے۔"

"نہیں....." اخفش کے ڈوبتے دل کو اچانک قرار ملا۔

بے حد کالی رات میں سناٹا تھا اور پانی کا شور' مگر اس کی آنکھیں مانوس ہو چکی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا' وہ کسی جزیرے میں ہے۔ چار اطراف پانی اور بس یہ ٹیلا...

اور اگر پانی کے برسنے کی یہی رفتار رہی تو یہ ٹیلا بھی غائب ہو جائے گا۔ اسے اب وہ جگہ تک بھولنے لگی تھی یا پانی میں معدوم ہو گئی تھی جہاں نوال نے ڈبکی کھائی تھی... اور... آہ...

اخفش ٹیلے کے اوپر چڑھنے لگا۔ گائے کے ڈکرانے کی آواز... ایک اور زندہ وجود' سانس لیتا بولتا... اس کا دل چاہا۔ گائے یونہی بولتی رہے۔ اور اسے احساس دلائے زندگی ابھی ختم نہیں ہوئی کہیں نہ کہیں باقی ہے۔ بولتی ہے۔ وہ آواز کے تعاقب میں چلا۔

اور سامنے گائے کھڑی تھی۔ ٹارچ لائٹ پر چونکی تھی اور بولنے لگی تھی۔ شاید وہ بھی کسی دوسرے جان دار کو دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ اخفش کے دل کو کچھ ہوا۔

تنہا رہ جانے پر صرف انسان نہیں ٹوٹتے... انسان نہیں روتے۔ جانور بھی... وہ آگے بڑھتا گائے کے نزدیک آگیا۔ اس نے اس کی پشت سہلانا شروع کی تو گائے نے بھی سر نیچے کر دیا... اخفش نے اپنا بازو اس کی گردن کے گرد پھیلا لیا... لمس میں طاقت ہوتی ہے محبت اور اعتماد...

گائے ایک بار پھر ڈکرائی... وہ گردن گھما گھما کر دیکھ رہی تھی' وہاں کچھ تھا۔ شاید بچھڑا... مگر وہ ایسی بے ترتیبی سے گرا پڑا تھا۔ کیا مر چکا تھا۔

اخفش نے ٹارچ ڈالی اور اگلے ہی پل اس کی چیخ نکل گئی۔

بھوسے کے ڈھیر پر اوندھی پڑی یہ نوال تھی۔ نوال ضمیر خان... وہ بھاگا تھا۔ اس نے اسے سیدھا کیا تھا۔ بے دم ڈھیلی... جدھر ڈال دی۔ ادھر کو چت... بے جان... جیسے مردہ... نہیں۔

اخفش نے اسے سیدھا لٹا دیا۔ اس کی نبض... نبض کہاں تھی۔ بھلا نبض بھی گم ہوتی ہے۔ لیکن گم بھی جاتی ہے۔ بد ترین خدشہ۔ نہیں' وہ حلق کے بل چلایا "نوال... نوال..." جواب ندارد۔

اخفش کے صبر کا خاتمہ ہوا۔ اس نے پے در پے تھپڑ اس کے گالوں پر رسید کیے۔

"آہ... مم... آ... آہ۔"

"نوال...!" اخفش کو یقین نہ آیا' یہ نوال کے منہ سے نکلا ہے۔

"نوال...!" وہ پورے جسم کی طاقت سے پکارنے لگا۔

"آہ...!" یعنی وہ زندہ تھی۔ یعنی نوال تھی۔ ہاں وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اخفش کو پہلا خیال یہی آیا۔

مگر وہ ایک بالکل الگ راستے سے ٹیلے پر اتنا اوپر کیسے پہنچی...

ہاں نوال ہار ماننے والی چیز تھی ہی نہیں۔

مگر ابھی وہ فوری طور پر کیا کرے... یہاں صرف سانس چل رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"اذان کا وقت ہے۔" اخفش نے موبائل پر ٹائم دیکھا۔ مگر گاؤں میں اب بچا ہی کون تھا۔ جو اذان دے؟ لیکن نہیں' وہ ہے نا...

تین زندہ نفوس... ایک اخفش انعام... دوسری نوال ضمیر... اور تیسری ایک گائے اور مسلمان کی گائے بھی مسلمان ہوتی ہے۔ اخفش مسکرایا وہ بہت ہلکا پھلکا تھا ذہنی طور پر... اور جسمانی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

وہ ٹیلے پر اور بلندی تک چڑھ آیا... چار اطراف پانی' جہاں کبھی گھر تھے وہاں اب بس چھتیں نظر آ رہی تھیں۔ درختوں کے تنے پانی کے اندر تھے۔ بس اوپری سبز چھتریاں... دور مسجد کے مینار سیدھے کھڑے تھے دروازے پانی میں ڈوبے ہوئے۔ اخفش قبلہ رخ کھڑا

ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کانوں تک اٹھا کر تکبیر کہی۔

اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔

اشہد ان لا الہ اللہ۔۔۔

گائے نے ایک آواز لگائی اور پھر گردن نیچے کر کے بالکل خاموش ہو گئی نوال کسمسائی پھوڑے کی طرح دکھتے بدن کو برداشت کرتے ہوئے اس نے رخ بدلا۔

ٹیلے کی بلندی پر تکبیر کے لیے اٹھائے ہاتھوں والا ایک سایہ۔۔۔ یہ اخفش تھا۔ اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ یہ اذان بلالی نہیں تھی مگر اس کا جلال۔۔۔ ہر سو حاوی ہونے لگا۔

جہاں کوئی نہیں ہوتا' وہاں میرا اللہ ہوتا ہے' بلکہ اللہ ہر جگہ ہوتا ہے۔ پانی کے اوپر اور پانی کے اندر۔۔۔ پانی کھینچ لیتا ہے۔ نوال نے سوچا۔ پانی پھینک دیتا ہے۔ اللہ کے حکم ہی سے تو یہ اٹھا پٹخ ہوتی ہے۔

الصلوۃ خیر من النوم

اہل عرب نے ان الفاظ کو جادو کہا تھا۔ ہاں اگر یہ جادو تھا تو سر چڑھ کر بول رہا تھا ایک فسوں۔۔۔ ایک یقین، موت سے زندگی۔۔۔ ایک صبح۔۔۔ ایک واپسی زندگی کی طرف۔۔۔ جاگ جانے کا اعلان۔۔۔ ہر صبح ہوتا ہے پھر بھی ہم جاگتے نہیں۔

نماز نیند سے بہتر ہے مگر ہماری نیندیں۔۔۔ آہ۔۔۔ خواب غفلت۔۔۔

اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔

کیسی زندگی کی طرف بلاتی' جگاتی آواز تھی۔ سناٹے میں زندگی۔۔۔ موت کی گود سے پھوٹتی زندگی۔

سماعتوں کو کھولتی۔۔۔ روح کو جھنجھوڑتی' بلاتی' پکارتی زندگی۔۔۔

کیسی آواز تھی۔۔۔ زندگی ہی زندگی۔۔۔ وقتی زندگی سے ابدی زندگی۔۔۔ کیسی زندگی؟

نوال کی گردن ٹیلے کی جانب ڈھلکی ہوئی تھی اور آنکھ سے پانی گرتا تھا۔ پانی۔۔۔ زندگی۔۔۔ نہ ہو تو۔۔۔ اور ہو تو۔۔۔ زندگی۔۔۔

اذان مکمل ہو گئی تھی۔ اخفش اس کی طرف آرہا تھا۔

اس نے ٹارچ کی روشنی نوال کے چہرے پر ڈالی۔ نوال کی آنکھ میں آنسو۔۔۔؟

"رو رہی ہو؟ بہت درد ہو رہا ہے؟"

"ہوں۔" اس نے ہونٹ کا کونا کچلا۔۔۔

"بس تھوڑی دیر۔ ابھی صبح ہو جائے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اخفش نے انگلی کی پور سے آنسو پونچھا۔

"صبح تو ہو گئی۔" نوال نے بہت مدھم لہجے میں کہا۔

"کب۔۔۔؟" اخفش نے آسمان دیکھا۔ "ابھی اندھیرا ہے۔"

"نہیں' جب تم نے اذان دی۔ صبح ہو گئی۔" نوال بولی۔

"او ہاں۔۔۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ "میں نے برتن ڈھونڈ لیے ہیں۔ ابھی گائے سے دودھ نکالوں گا۔ تم پینا۔ ایک دم فٹ فاٹ ہو جاؤ گی۔"

"تمہیں دودھ نکالنا آتا ہے؟" نوال نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔" اخفش نے پہلی بار اپنی شرمندگی کو چھپایا نہیں۔

"تو پھر کیسے؟"

"گائے کی منت کروں گا۔ دے دے گی۔" اخفش نے واقعتاً" منت ترلے کا پروگرام ہی سوچ رکھا تھا۔ نوال کے لبوں پر مسکراہٹ چمکی۔

"تمہیں نکالنا آتا ہے۔ دودھ؟" اخفش نے ذرا چونک کر پوچھا۔

"ہوں۔۔۔"

"واقعی۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔!"

"یار! کون سا کام ہے جو تم نہیں کر سکتیں؟" اخفش نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نوال نے نظریں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"میں اذان نہیں دے سکتی۔" وہ نجانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ "تم نے اذان کیوں دی اخفش۔۔۔؟"

"اذان۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔"

احفش سوچ میں پڑ گیا۔ شاید اسے علم نہیں تھا۔ اس نے کیوں دی۔ نوال اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"اس لیے کہ۔۔۔ اذان تو دینی ہی تھی۔ مجھے لگتا ہے، اذان نہ دی جائے تو صبح نہیں ہو سکتی۔"

"دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کی صبح اذان کے بغیر بھی ہو جاتی ہے۔" نوال نے یاد دلایا۔

"وہ صبح نہیں ہوتی۔" احفش بولا۔ "وہ ایک کائنات کا سائیکل ہے۔ جو چلتا رہتا ہے۔ سورج آتا ہے۔ سورج جاتا ہے۔ اور ویسے بھی ایک مسلمان موجود ہو اور اذان نہ دے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔" احفش نے ذرا سینہ تان کر کہا۔

"اور ویسے بھی میں سمجھتا ہوں۔۔۔ اذان صبح ہوتی ہے۔ آغاز ہوتی ہے عہد اور یقین ہوتی ہے۔ اعلان ہوتی ہے کہ اللہ ہے۔" احفش اندھیرے کی چادر میں پڑنے والی ہلکی سی سلوٹ کو مشرق کی جانب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اذان آدھا کام تھی۔ نماز پڑھ کر مکمل ہوتا۔

"اللہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے ناں۔۔۔!" نوال کے لہجے میں کھویا پن تھا۔ وہ ذہنی طور پر ابھی تک اپنی حالت کے صدمے میں تھی۔

"ہاں۔۔۔!" احفش کسی حد تک نوال کے انداز سمجھ رہا تھا۔ اس کا انداز پچکارتا سا تھا۔

"پانی کے اندر بھی ناں۔۔۔!" نوال کو یاد آ رہا تھا۔ وہ پانی کے اندر۔۔۔ بہت اندر جا رہی تھی جیسے اسے کوئی کھینچ رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور پھر اتنی سکت بھی گئی۔ اور سانس رکنے لگی اور اسے سب کے چہرے یاد آنے لگے' پوری زندگی نظروں کے سامنے آ گئی اور ڈیڈ جب انہیں پتا لگے گا کہ نوال۔۔۔ ڈوب گئی اور مرنا ہی تھا تو کسی اور طرح مر جاتی' یہ کیا کہ ڈوب مری۔۔۔ اسے اپنے لیے موت کا یہ طریقہ پسند نہیں آیا۔

اور پھر اس نے کلمہ بھی پڑھ لیا۔ شکر اتنی مہلت مل گئی۔ اس کی آخری سوچ۔۔۔ اور کہیں وہ بچی تو پانی میں نہیں گر گئی۔ نہیں گرے تو اس کی ماں نے اپنی آغوش میں بھر لیا تھا۔ ہاں تو یعنی کہ بس وہی۔۔۔ نوال ضمیر تھی جو ختم ہو رہی تھی۔ اور غوطے کھاتے جسم کے ساتھ ذہن بھی غوطہ کھانے لگا۔

زندہ رہنے کی خواہش نے جو طاقت بھری تھی اور اس کے ہاتھ پیر چلائے تھے اور بڑے چلائے تھے۔ وہ ڈھیلے چھوڑ دیے اور وہ بہہ رہی تھی۔ اور کہیں دور جا رہی تھی۔

مگر۔۔۔

مگر۔۔۔ یہ کیا۔ جب آنکھ کھلی تو خشکی پر کہیں اوندھی پڑی تھی۔ اور پھر گائے ہی کی آواز پر ٹیلے تک کا سفر۔۔۔ اور اب۔۔۔

"پانی کے اندر۔۔۔ بھی اللہ ہوتا ہے ناں۔" اس نے احفش کے آگے سوال دہرایا جو اس کے چہرے کو پڑھتے ہوئے دل کا حال سمجھ رہا تھا۔

"اللہ کہاں نہیں ہوتا نوال!" اس نے ایک جملے میں بات ختم کر دی۔

"تو پھر دنیا کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟" نوال کا سوال۔۔۔ اس ایک سوال کے جواب کے لیے ایک زندگی تو بہت کم ہوتی اور احفش کیا جواب دیتا۔

"آ جائے گی۔" اس نے بہت پیار سے کہا۔ "تم سمجھ گئی ہو ناں۔"

"ہاں!" نوال نے سر ہلایا۔ "اور تمہیں بھی۔"

"ہاں مجھے بھی۔۔۔" احفش نے جواب دیا۔

"کب۔۔۔ کیسے؟" نوال کا ذہن کہیں اور سے واپس آ ہی نہ رہا تھا۔

"جب تم ڈوبیں۔ اور جب تم مل گئیں۔"

"کیا۔۔۔ مطلب؟" نوال کے سر میں شدید ٹیس اٹھ رہی تھیں۔ وہ کراہی تھی۔

"پھر کبھی بتاؤں گا۔ ابھی نماز پڑھ لوں؟ اور تم آرام سے لیٹو۔۔۔ ٹھیک ہے۔" وہ اسے کسی کانچ کی گڑیا کی طرح محسوس کرتا ہوا بولا تھا۔

"ہوں۔" نوال نے آنکھیں موندیں' سوچوں اور گفتگو نے اس کی نقاہت کو حد سے سوا کر دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

اسے رات ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زخمی ہے۔ مگر دن کی روشنی نے اسے شدید صدمے میں مبتلا کر دیا۔ نیل، سوجن، خراشیں اور زخم... وہ دکھتا پھوڑا بنی اخفش کا دل چیر رہی تھی۔

"وہ ہماری مدد کو آئیں گے نوال! تم ہمت رکھنا۔ میرا فون بھی بند ہو چکا ہے..." وہ بہت فکر مند تھا۔ نوال نے سر ہلایا۔

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ہم دونوں کبھی اس طرح ہوں گے۔" وہ اسے باتوں سے بہلا رہا تھا۔ جو اپنی ظاہری حالت سے قطع نظر ہمت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"دونوں نہیں... تینوں۔" نوال نے گائے کو دیکھا۔

"ہاں!" وہ ہنسا "ہم تینوں۔"

اخفش کھڑا ہو گیا۔ اسے تاحد نگاہ پانی نظر آتا تھا۔ ٹوٹے تیرتے درخت۔ کچھ ساز و سامان... ہاں دائیں جانب دور ایک سڑک تھی۔ مگر وہاں تک کیسے جایا جائے۔

سناٹا خاموشی...

"ہم تم اک جنگل سے گزریں اور شیر آجائے۔" اخفش گنگنایا۔

"شیر سے میں کہوں گی، مجھے چھوڑ کے تمہیں کھا جائے۔" نوال کی آواز مدھم تھی۔ مگر جواب نے اخفش کے کان کھڑے کر دیے۔

"ہیروئین نے کہا تھا۔ تمہیں چھوڑ کر مجھے کھا جائے اور تم۔" اس کا جملہ خفا تھا مگر انداز نہیں۔

"پہلی بات۔ میں ہیروئین نہیں... دوسرے مجھے کھائے گا شیر تو کیا خاک پیٹ بھرے گا ہڈیوں کا پنجر ہوں۔ ہاں اس پر چوٹ کی تھی تم ضرور اس کی شکم سیری کر سکتے ہو۔"

نوال نے مدھم نقاہت زدہ لہجے میں اٹک اٹک کر بھی مگر اس سے عجیب بات یہ ہوئی کہ اخفش خفا نہیں ہوا بہت بلند آواز سے ہنس دیا۔

"اس کا مطلب ہے طبیعت بہتر ہو رہی ہے۔ سب سے پہلا اثر زبان کی کارکردگی پر آیا ہے۔" نوال مسکرا دی۔

"اور تم نے یہ کیوں کہا کہ تم ہیروئین نہیں ہو۔ ہیروئین اور کیسی ہوتی ہے۔ دوسروں کی جانیں بچانے والی... اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے سوچنے والی۔"

"تم یہ سب میرے لیے کہہ رہے ہو؟" نوال کا جسم نڈھال تھا۔ دماغ واقعی کام کرنے لگا تھا۔

"ہاں!" اخفش نے اعتراف کیا۔ اس نے ساری رات اسے ڈھونڈتے ہوئے خود سے تمام اعترافات کر لیے تھے۔ اب کیوں جھجکتا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگا کہ تم کو بھی تو کچھ ہو سکتا تھا۔ تم کسی اور سے بھی کہہ سکتی تھیں بچی کو لانے کے لیے۔" اخفش نے پوچھا۔

"کہہ دیتی... میں کسی پلان کے تحت تو نہیں بھاگی تھی۔ بعض فیصلے بروقت کرنے ہوتے ہیں بچی کے لیے جانا بھی ایسا ہی ایک فیصلہ تھا اور دوسرے میں سمجھتی ہوں۔ دوسروں پر اعتماد کرنے سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ انسان خود اپنے آپ پر بھروسا کرے۔"

نوال ایسا جواب ہی دے سکتی تھی۔ نوال کو سمجھنے کے لیے ایک رات کم تھی۔ اس کے لیے تو پوری زندگی چاہیے تھی... زندگی بھر کا ساتھ۔

وہ کھردری زمین پر چت پڑی تھی۔ ایک ہاتھ پیٹ پر دھرا تھا۔ آسمان کو دیکھ لیتی یا پھر بہتے پانی کے ریلے کو... کبھی نقاہت سے آنکھ بند بھی کر لیتی۔

مگر وہ بے فکر تھی۔ اسے کوئی خوف نہیں تھا کہ اتنی ناگفتہ بہ حالت میں وہ پانی کے بیچ و بیچ پھنسی ہے۔ اور اس کی جگہ اگر کوئی اور ہوتی۔

ہائے وائے... شور شرابا... شکوے شکایت... رونا دھونا... کیا کیا نہ ہوتا۔ مگر نوال ضمیر... وہ واقعی خاص لڑکی تھی۔

خالص جیسے جنگل کا شہد...

نتھری ستھری جیسے آبشار کا پانی۔۔۔
قیمتی جیسے سیپ کا موتی۔۔۔
انمول خزانہ۔۔۔ دعا۔۔۔

ہاں دعا جو احفش انعام نے ساری رات مانگی تھی۔ کیوں مانگی تھی۔ کیا اس لیے کہ اسے جواب دہی کا ڈر تھا۔ وہ نانو سے کیا کہتا یا نوین کا سامنا کیسے کرتا پھر دادا جان اور ضمیر خان۔۔۔ "نہیں۔" احفش کے اندر کسی نے سرکشی سے نفی کی۔

ان سب لوگوں کو۔۔۔ اور تمام دنیا کو دینے کے لیے اس کے پاس جواب تھے مگر مسئلہ یہ ہوا کہ اس کے پاس خود اپنے آپ کو دینے کے لیے کوئی جواب نہیں تھا۔

وہ کیسے خود کو سمجھاتا کہ اس نے نوال ضمیر کو کھونے دیا۔ کھو دیا؟ نہیں۔۔۔

اس کے پاس خود کو مطمئن کرنے کے لیے جواب نہیں تھا۔ سب سے مشکل کام اپنے آپ کو سمجھانا ہوتا ہے۔ اپنے دل کو۔ اپنی نظر کو۔۔۔

وہ نظر جو بار بار اس پر اٹھتی تھی۔ وہ دل جو اس کی اور امنڈتا تھا، دھڑکن کی نئی لے۔

اور احفش انعام اور نوال کے لیے ایسی سوچیں۔۔۔

یہ حیرت آمیز سوال۔۔۔ شرمندگی نہیں خوشی تھا۔

اور پتا نہیں وہ نوال سے یہ سب کیسے کہے گا اور کہہ بھی دے تو کیا وہ مان جائے گی۔

بڑا مشکل مرحلہ۔۔۔ اف

مگر ابھی کیا کرے۔ یہاں سے کیسے نکلے؟

"میں سوچ رہی ہوں احفش۔۔۔" نوال کی آواز پر وہ چونکا۔ "یہاں گاؤں میں بہت بڑا توا ہوتا ہے۔ جس کو الٹا کر کے بہت سی روٹیاں بناتے ہیں تو اگر ہمیں وہ مل جائے تو۔۔۔ ہم اسے کشتی کی طرح یوز کر کے دور سڑک تک جا سکتے ہیں۔"

"ہائیں!" احفش بری طرح چونکا آخر ایسے آئیڈیے اسے کیوں نہیں سوجھتے اسے خود پر افسوس ہوا۔

"ہاں مگر۔۔۔ یہ گائے؟"

"اس کی رسی کھول دیں گے ناں۔۔۔ یہ ٹیلے پر ہی چرتی رہے گی۔ پانی اترتے ہی اس کے مالک یہاں پہنچ جائیں گے۔"

نوال واقعی جن کا بچہ تھی، جو سب خبر رکھتی تھی یا اسے اللہ نے خاص قوت مشاہدہ دی تھی۔

"اور بالفرض اگر توا نہیں ملتا ہے تو۔۔۔؟" احفش نے پوچھا۔

"تو۔۔۔" نوال نے کروٹ لی۔ تکلیف نے پورے چہرے کو سلوٹ زدہ کر دیا۔ احفش بے تابی سے آگے آیا مگر نوال نے ہاتھ اٹھا کر اسے راستے ہی میں رک جانے کا اشارہ کیا۔ احفش ٹھہر گیا۔

"تو ہم یہیں رہ جائیں گے۔ وہی زندگی جب انسان دنیا میں ہر دن مشقت سے جیتے تھے۔ روز رزق کی تلاش۔۔۔ اور ہمارے پاس تو ایک گائے بھی ہے۔"

نوال نے پیار سے گائے کو دیکھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا ہمارے بیچ ہمیشہ گائے بکرے کیوں آتے ہیں۔"

"اس لیے کہ تم خود ایک ہینڈسم گائے ہو۔"

"میرے موٹاپے کو ہٹ کر رہی ہو۔"

"نہیں۔۔۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں، تم کیا ہمیشہ ایسے ہی رہو گے، وزن کم کرنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔"

"اب سوچوں گا۔" وہ کسی عہد کو دل ہی دل میں دہرا رہا تھا۔

"اب کیا ہوا ہے۔"

"وہ جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" احفش مسکرایا۔

"کیا؟" نوال کچھ نہیں سمجھ رہی تھی۔

"یہی کہ میں تمہیں تسلیم کرنے لگا ہوں۔"

"اچھا!" نوال کو حیرت ہوئی۔ "پہلے نہیں کرتے تھے؟"

"ہاں پہلے نہیں کرتا تھا۔"

"کیوں۔۔۔؟"

احفش چپ رہا۔ نوال بھی چپ ہو گئی۔ پھر کچھ

سوچتے ہوئے لب کھولے۔
"کسی کو تسلیم نہ کرنے کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ آپ اس سے گھبراتے ہیں' اسے کم تر سمجھتے ہیں یا پھر برتر۔"

نوال نے جملہ ادھورا چھوڑا۔۔۔ انخفش اب بھی نہ بولا۔ نوال کچھ سوچ کر مسکرائی۔
"میں کم تر ہو نہیں سکتی۔ یہ میں جانتی ہوں۔ برتر ہوں' یہ تم کبھی بتاؤ گے نہیں۔" نوال نے بات ختم کر دی' بلاوجہ وہ اسے امتحان میں ڈالے کہ وہ سچ جھوٹ کا آمیزہ تیار کرے مروت میں۔۔۔
"اور اگر میں کہوں میں مان گیا ہوں۔ تم برتر ہو' تو۔۔۔"

"یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہو گا۔" نوال اسے جانتی تھی۔
"یہ اس صدی کا سب سے بڑا سچ اور اقرار ہے نوال۔"

انخفش کا لہجہ اور آنکھیں رنگ بدل گئیں۔ نوال اب بھی نہ چونکتی آخر کو وہ نوال ضمیر خان تھی' جس کا ضمیر یعنی اس کی عقل' سوچ' فہم ابھی برقرار تھی۔
"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ناں؟" وہ دونوں کہنیوں کے بل ذرا اوپر کو اٹھتے ہوئے بولی۔
انخفش نے فقط سر ہلایا۔ وہ نوال کو بغور دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار۔۔۔ زندگی میں پہلی بار نوال نے پلکیں جھپکیں۔ پہلو بدلا اور پھر نگاہیں چرائیں یعنی کہ کمال ہو گیا۔
"یہ پہلی نظر کی ناپسندیدگی تھی نوال۔۔۔ میری طرف سے تمہارے لیے۔ جو بعد میں خود رو جھاڑی کی طرح بڑھتی چلی گئی۔ کانٹوں سے بھری جھاڑی۔۔۔ مجھے ہمیشہ لگا تم میری مردانگی کو چیلنج کرنے کے لیے سب کچھ کرتی ہو۔ لیکن مجھے اب پتا چلا۔ تم مردوں کو نہیں حالات کو چیلنج کرتی ہو۔ تمہاری لڑائی فرد سے نہیں معاشرے سے ہے۔
میں یہ نہیں کہوں گا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی لڑکیاں دیکھیں مگر تم سی ایک بھی نہیں دیکھی اور مجھے لگتا ہے۔ آئندہ کبھی دیکھوں گا بھی نہیں۔۔۔ باقی کی زندگی کے لیے تم ایک ہی کافی ہو نوال۔۔۔!"
یہ اظہار و اقرار کے لیے انتہائی نامناسب جگہ و موقع تھا مگر وضاحت دینے کے لیے اب کیا وہ کسی مضمون دان سے صفحہ لکھوا کر لاتا۔

جو دل میں آرہا تھا وہی بول دیا' جبکہ دوسری طرف نوال کی مردانہ وار زندگی میں اس طرح کا موقع پہلی بار بنا تھا اور وہ۔۔۔ بھی انخفش انعام۔
(اور تھی تو وہ بھی ایک لڑکی ہی ناں۔۔۔ نظر نہ پہچانتی)

"تم اکیلی لڑکی دیکھ کر فلرٹ کی کوشش کر رہے ہو انخفش!" اس نے لہجہ دبنگ بنایا۔
انخفش ہنس دیا "تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم وہ لڑکی ہو جو اکیلے پن کا خوف کھائے گی۔ اور بے وقوفی تو وہ کرے جو تمہیں جانتا نہ ہو میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اب بھی حال اور حالات دونوں کو بھول کر مجھے اس پانی میں غوطے دے سکتی ہو اور مجھے ابھی مرنے کا کوئی شوق نہیں۔"
وہ سچ کہہ رہا تھا۔
"تم شاید بھول رہے ہو۔۔۔ میں نازک اندام نہیں ہوں۔" نوال بہت دیر بعد بولی۔
انخفش بہت دل سے مسکرایا اور یہ بڑی افسانوی ہیرو ٹائپ کی مخصوص مسکراہٹ تھی (موٹا ہیرو) نوال پہلی بار سٹپٹائی۔
"میں جانتا ہوں۔ تم نازک اندام ہو بھی نہیں سکتیں۔"
"مطلب؟" نوال نے تیکھے چتون سے اسے دیکھا (وہ نوال کو نازک سے کمتر تو نہیں کہہ رہا کہیں۔۔۔)
"مطلب۔۔۔ مطلب یہ کہ نازک۔۔۔ نازک ہے اور نوال۔۔۔ نوال ہے۔"
"کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ غوطہ میں نے کھایا تھا مگر ابھرے تم نہیں ہو اب تک؟"
نوال نے شہادت کی انگلی کنپٹی کے گرد پیچ کس کی طرح موڑی۔
"دماغ چل گیا ہے۔ بجائے اس کے۔۔۔ کہ اس

مشکل سچویشن سے نکلنے کا سامان کرو ، نجانے کہاں کہاں کی ہانک رہے ہو۔"

نوال کی جسمانی نقاہت برقرار تھی اور اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ مگر اس نے اپنے مخصوص با اعتماد انداز کو اختیار کرتے ہوئے اخفش کو لتاڑا تھا مگر دوسری جانب اخفش۔۔۔

اخفش کا دل بدلا تھا۔۔۔ دل سیدھی سے سیدھی بات میں بھی اپنی مرضی کے نئے معنی نکال رہا تھا۔

"مشکل سچویشن کیوں؟ ابھی خود ہی تو کہہ رہی تھیں آدم و حوا کی طرح زمین پر دو انسان بن کر رہیں گے۔"

"آدم و حوا۔۔۔؟ یہ میں نے کب کہا۔" نوال چلائی۔

"ابھی تو کہا تھا۔ اور ہمارے پاس تو ایک گائے بھی ہے۔" اخفش کی طمانیت کی حد تھی۔ وہ تو زندگی بھر کی پلاننگ کر چکا تھا گویا۔

"اور پھر پانی اترے گا اور دونوں اپنے اپنے گھر کی راہ لیں گے۔" نوال نے آئینہ دکھایا جیسے چڑایا۔

"محبت کا دریا ایک بار چڑھ جائے تو پھر کبھی نہیں اترتا۔" اخفش نے بے فکری سے کہا۔

"محبت۔۔۔؟" نوال کے لب ہلے "کس سے؟"

"تم سے۔۔۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" نوال نے کڑک لہجہ اختیار کیا۔

"کل شام کی۔۔۔" ڈھیلے پن سے بیٹھا ادھر ادھر دیکھتا اخفش ایک دم سیدھا ہو بیٹھا اور سنہری آنکھوں کے اندر جھانکا۔

"کل شام جب مجھے پتا لگا کہ تم کھو گئی ہو۔۔۔ ڈوب گئی یا بہہ گئی ہو تب اور جب میں سب سے لڑ رہا کہ نوال کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا اور ایک فوجی بھائی کا گریبان پکڑ لیا۔ اور جب میں دلدلی زمین پر لت پت چلتا تمہیں پکارتا تھا اور روتا تھا اور پھر ہانپ کے بیٹھ جاتا تھا اور پھر جب دوبارہ عزم سے اٹھ کھڑا ہوتا تھا کہ تمہیں ڈھونڈ کر ہی دم لوں گا اور پھر جب۔"

"یہ سب تم کر رہے تھے؟" نوال ساری تکلیف بھلا کے اٹھ بیٹھی۔

اخفش نے بی بے بچے کی طرح سر زور زور سے ہلایا۔

"میرے لیے..." نوال نے ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر تصدیق چاہی۔

وہ اب تک اس سب قصے کو بے یقینی سے بس سن رہی تھی پہلی بار گمبھیرتا کا احساس ہوا۔

"نہیں نوال!" اخفش کے لہجے میں زمانے بھر کی سنجیدگی اُمڈ آئی۔

"اپنے لیے... میں اپنے لیے تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ خدا کی قسم اگر تمہیں کچھ ہو جاتا یا تم نہ ملتیں۔ اس سے آگے میں سوچ ہی نہ پا رہا تھا۔ اور پھر جب تم مل گئیں۔ مجھے اپنی پوری زندگی میں اتنا سکھ اور اتنی سچی خوشی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔" اس کا لہجہ سچائی کا مظہر تھا۔

"تم بھی تو کچھ کہو۔" اسے نوال کی خاموشی کھلی تھی۔

"اوہ... وہ دیکھو ہیلی کاپٹر..."

نوال نے الگ ہی بات کی۔ اخفش بری طرح چونکا۔

ہاں بہت دور آسمان پر ہیلی کاپٹر تھا دور... دور اور پھر نزدیک پھر ٹیلے کے عین اوپر... پھر نزدیک ہوتا ہوا۔

"یہ ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں نوال!" اخفش کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

"ہاں...!" نوال کے چہرے پر جوش اتر آیا۔ آواز بہت قریب آ گئی۔

"ہیلی کاپٹر سر پر منڈلانے لگا پھر اس میں سے سیڑھی نکلی پھر دو جوان...

"لانچ لانا مشکل ہے پانی کا بہاؤ نامناسب ہے۔ ہم آپ کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہی ریسکیو کر سکیں گے۔" کوئی بتا رہا تھا۔

"مگر... یہ زخمی ہے؟" نوال کی زبان یقیناً فعال ہو چکی تھی۔ مگر جسمانی چوٹیں... وہ سیدھی کھڑی نہ ہو پائی اور چلنے کی کوشش میں تو دھڑام سے گری تھی۔

"دیکھیے موسم کے تیور اچھے نہیں۔ ابھی آسمان صاف لگ رہا ہے مگر گرج چمک ہے جتنی جلدی ہو یہاں سے نکل جانا بہتر ہے۔ میدان کی حالت... ہمارے پاس وقت بھی کم ہے اور سہولتیں اس سے بھی کم... ابھی بند کے قریب ایک گھر کی چھت سے بھی چند لوگوں کو ریسکیو کرنا ہے۔ بارش ہو گئی تو ہیلی کاپٹر بھی نہیں آسکے گا۔"

نوال ایک بار پھر بے دم سی بیٹھی تھی۔ اس بار گرنے سے زخم دوبارہ تکلیف دینے لگے تھے۔ نجانے کہاں کہاں درد اٹھنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆
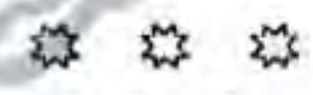
سارے گھر نے سانس روک کر... بلکہ منہ پر ہاتھ رکھ کے چیخیں روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اس منظر کو ٹی وی اسکرین پر دیکھا تھا۔ یہ لائیو ٹیلی کاسٹ نہیں تھا مگر ہر بار زینت بیگم اور صوفیہ دادی کا دل اچھل کر حلق میں آجاتا اور وہ زیرلب آیات پڑھ کر ٹی وی پر بھی پھونکنا شروع کر دیتیں۔

لیلیٰ بیگم نے ہر بار منہ بنا کر یاد دلایا تھا۔

"یہ ریکارڈڈ سین ہے اور اب تو وہ دونوں کیمپ ہسپتال میں ہیں اور کل صبح تک گھر پہنچنے والے ہیں۔" نازک نے بھی منہ بنایا تھا۔

اس نے اپنی نانو جان کو بہت رو رو کر بتایا تھا واپسی کے سفر میں وہ بہت مشکلوں سے سب کے ساتھ پھنس پھنسا کر گھر پہنچی ہے (ابھی ہی پہنچی تھی)۔

اور بھی بہت سے شکوے شکایات جو لیلیٰ بیگم کے دل پر آرے چلا رہے تھے۔

"یہ اخفش تو بڑا ہی غیر ذمے دار نکلا۔ کیسے بچی کو تنہا چھوڑ گیا۔

اور اب کیسے اس فتنی (نوال) کو لپٹائے سیڑھی سے لٹکا کھڑا ہے۔ ارے اس نوال کو سہارے کی بھلا کیا ضرورت... سو مردوں کا ایک مرد اور ایک میری نازک... آئے ذرا تو پوچھوں گی کہ تمہاری ذمہ داری میں بھیجا تھا میاں... خود تم سیر سپاٹوں کو نکلے۔ اور..."

"پتا نہیں۔۔۔ میری بچی کس حال میں ہوگی۔ رات بھر ڈوبی رہی پھر زخمی اور بھوکی پیاسی۔۔۔" زینت بیگم کا افسوس۔

"آنٹی جی! یہ پرانی ویڈیو ہے۔ اس وقت تو نوال آرمی ہسپتال میں تمام تر سہولتوں کے ساتھ زیرِ علاج ہے۔ اور کل تک یہاں شفٹ ہو جائے گی۔"

اخطب نے کتنی ہی بار بتایا تھا۔ مگر ساس اور صوفیہ دادی کچھ سمجھنے کو تیار نہیں تھیں۔ چینل بدل بدل کر یہی منظر دیکھتی تھیں اور روتی تھیں۔

"نوال اور کسی کا سہارا لے۔۔۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا اور ادھر اسے سیفٹی بیلٹ کے ذریعے احنفش سے باندھا گیا ہے باقاعدہ۔" تو ین کا رونا اور طرح کا تھا۔

اور اس جملے پر رونا ایک بار پھر شروع ہو جاتا۔ ادھر ضمیر خان بمعہ اہلیہ پہنچنے والے تھے۔ فکر ہی فکر۔

"پتا نہیں کس تکلیف میں مبتلا رہی میری بچی۔۔۔ یہ تو وہی جانے ناں۔ ہم تو بس اندازہ ہی لگا سکتے ہیں۔" نانو کی ایک ہی گردان تھی۔

اور بچی واقعی مشکل میں تھی۔ ہیلی کاپٹر سے نکلی سیڑھی بہت آہستگی سے اوپر کو اٹھ رہی تھی۔ یہ چند منٹوں کا ہی کام تھا۔ مگر جن پر بیت رہی تھی بالخصوص نوال۔۔۔ اس پر دو مصیبتیں پڑی تھیں۔ دو باتیں۔ ایک احنفش کو حیران کر گئی۔ دوسری نوال کو پریشان کر گئی۔

ہیلی کاپٹر کا بے پناہ شور اور ہوا۔۔۔ اور اس میں احنفش کان سے ہونٹ جوڑ کر پوچھ رہا تھا۔

"تمہیں ڈفرنٹ کرنا اچھا لگتا ہے ناں۔۔۔ اگر میں دنیا کا سب سے انوکھا کام کروں تو۔۔۔"

"کیا؟" نوال نے حلق کے بل چلا کر کہا تھا۔

"تمہیں پرپوز کروں؟"

"کیا؟" وہ پھیپھڑوں کے بل چلائی تھی۔

"تمہیں پرپوز کر رہا ہوں۔" وہ بھی سارے جسم کی طاقت لگا کر بول رہا تھا۔ اور یہ دنیا کا سب سے ڈفرنٹ اسٹائل ہوگا کسی لڑکی کو پرپوز کرنے کا۔"

"کیا کرنے کا؟" ہوا سے منہ پر آتے بال آنکھوں اور منہ کے اندر پڑ رہے تھے۔ سخت مصیبت۔۔۔

"او خدا۔۔۔!" احنفش کی آنکھوں میں بھی ہوا خنجر کی طرح چبھ رہی تھی۔ مرچیں لگ رہی تھیں "مجھ سے شادی کرو گی؟"

"کیا؟" اب کی بار نوال نے سن بھی لیا تھا اور کیا سوالیہ نہیں حیرانی تھا۔

احنفش نے سوال دہرایا۔ "مجھ سے شادی کرو گی؟"

"کب۔۔۔؟"

"گھر جا کر۔۔۔"

"نہیں۔۔۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر۔۔۔ مجھ سے؟" احنفش کو صدمہ ہوا۔

"نہیں۔۔۔" اونچا بولنے سے گلے میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔

"پھر۔" احنفش کو وجہ جاننے کی بے تابی تھی۔ مگر نوال کے جواب سے پہلے وہ دونوں ہیلی کاپٹر کے اندر تھے۔

"تمہیں کس چیز سے ڈر لگ رہا تھا نوال؟" نوال

اور ڈر۔۔۔ اخفش کی سوئی ڈر پر اٹک گئی تھی۔

"ایسے ہوا میں لٹکنے سے مجھے ڈر لگ رہا تھا اخفش۔"

نوال کا لہجہ اور پھٹی آنکھیں خوف کو ظاہر کر رہی تھیں۔ جبکہ اخفش کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا نوال کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ جواب بھی جھرجھری لے رہی تھی۔

ابھی جو پل بھر پہلے وقت گزرا تھا۔ وہ سب۔۔۔

"اور تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔۔۔"

بہت دیر بعد اخفش نے پوچھا۔

"کون سی بات۔۔۔؟"

"وہی جو میں کہہ رہا تھا۔"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"تم نے سنا نہیں۔" اسے کہہ کر اتنا مزہ آیا تھا اور اگلی نے سنا ہی نہیں۔

"وہی پرپوزل۔۔۔"

"کس کا پرپوزل۔۔۔" نوال کنپٹی کو داب رہی تھی۔

"تم نے واقعی نہیں سنا تھا۔" اخفش کو صدمہ ہوا اور شک بھی ہوا کہ شاید وہ اسے چلا رہی تھی۔

نوال نے جواب دینے کے بجائے آنکھیں میچ اور ہونٹ بھینچ کر نفی میں سر ہلایا۔ یوں لگا وہ کسی درد میں مبتلا ہے۔ ضبط کر رہی ہے۔

اور ادھر اخفش نے بھی یک دم ہونٹ بھینچ لیے۔

اب وہ کچھ نہ بولے گا۔ کیا دہرائے۔ اب سوچ سمجھ کر بولنا پڑتا۔ وہ جملے زیادہ اچھے اور فطری تھے۔ جو اس نے ہوا میں جھولتے یوں ہی کسی جذب کی کیفیت میں کہے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر کی کھڑکی سے دور نیچے زمین کو دیکھنے لگا۔ ذہن یک دم خالی سا ہو گیا تھا۔

چہرے پر شکستگی سی آ گئی تھی۔ پھر اس نے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا لیا۔ وہ بھی ذہنی اور جسمانی مشقت جھیل کر نڈھال تھا۔ تکان عود کر آئی تھی۔ اس نے آنکھیں موندی تھیں۔

اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر تھکان کا مظاہرہ کرتی نوال نے انگلیوں کی جھری سے اخفش کو دیکھا تھا اور چہرے کے رنگ بدلتے تاثرات سے نتیجہ اخذ کیا تھا۔

شکستگی۔۔۔ مایوسی۔۔۔ مشکل۔۔۔ امید۔

"اور میں نے سب سن لیا تھا اخفش۔۔۔! جو تم یوں ہوا میں لٹکتے کہہ رہے تھے۔ اور سب دیکھ لیا تھا۔ جو فکر، پریشانی اور لگاؤ تمہاری آنکھوں اور حرکات سے جھلک رہا تھا۔ مگر یہ وقتی کیفیت بھی تو ہو سکتی ہے۔

عجیب و غریب حالات کی عجیب بات۔۔۔ جذباتیت۔۔

کچھ وقت گزرتا۔۔۔ زندگی معمول پر آتی۔ وہی گھر۔ وہی لوگ۔ وہ باتیں۔۔۔

نوال اپنے رنگ میں۔۔۔ اور اخفش اپنے۔۔۔

پھر اگر اخفش دوبارہ یہی بات کرتا تب وہ ضرور سوچتی، تب وہ ضرور جواب دیتی۔ ہاں یا ناں؟ اس کا فیصلہ تو پھر وقت نے کرنا تھا۔

"ہاں مگر اخفش۔" نوال کے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلے۔

"تمہاری کیئر۔۔۔ تمہاری فکر۔۔۔ اور وہ ساری جدوجہد۔۔۔ تلاش۔ سب میں نے دیکھیں اور سچ کہوں۔۔۔ تو شاید میں تمہیں جانتی بھی نہیں۔ جو تم نظر۔۔۔ تم اتنے کیئرنگ ہو گے مجھے پتا نہیں تھا اور رومانٹک بھی ہو۔ اس پر میں حیران ہوں۔۔۔ بے یقین ہوں۔۔۔ ہاں کچھ وقت گزرے تو پھر شاید تسلیم کر لوں۔۔۔ مگر کچھ وقت۔۔۔

جذباتیت اچھی لگتی ہے مگر دیرپا نہیں ہوتی۔ انسان کو سب رشتے بنے بنائے ملتے ہیں بس یہی ایک رشتہ بنانا پڑتا ہے اور یہی سوا اکثر ٹوٹتا ہے۔ اور نوال کو ایسا رشتہ نہیں بنانا تھا۔ وہ صاف گو تھی۔۔۔ صاف دل۔۔۔ حقیقت پسند۔۔۔

ایسی صورت حال میں اس طرح پرپوزل نے نوال کو گدگدایا تو تھا۔ ہاں وہ بھی زندگی میں بہت غرور سے بتائے گی کہ اخفش نے اسے کیسے اور کب پرپوز کیا مگر وہی کچھ وقت گزرے تو۔۔۔

اور یہ بھی ہے کہ۔

لڑکیاں اتنی جلدی مانتی اچھی بھی تو نہیں لگتیں۔

☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

یہ رسم ہے

قبل از وقت تھا۔

نمرہ مکمل طور پر ان ماں بیٹیوں کی پسند تھی' سنجیدہ' بردبار اور خوش شکل نمرہ پہلی نظر میں ہی ان کے دل کو بھا گئی تھی اور شادی کے بعد گزرنے والے ہر دن نے ثابت کیا کہ ان کا فیصلہ کتنا درست تھا۔ عارفہ کی نسبت نمرہ تحمل اور برداشت والی تھی۔ ساس کو اکیلا دیکھ کر دوسرے دن سے ہی ہاتھ بٹانے والی عادت نے'

"نمرہ میرا سوٹ استری کر دیا ہے؟" حمیدہ بیگم نے اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھا تھا۔ نمرہ جو صبح سے ہی کچن میں گھسی ہوئی تھی اور تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ کچن کے دروازے پہ آ کر بولی تھی۔

"جی امی! رات کو ہی کر دیا تھا۔ الماری میں ہینگ ہے آپ چلیں' میں لے کر آتی ہوں۔" نمرہ نے سعادت مندی سے کہا تو حمیدہ بیگم سر ہلاتی واپس مڑ گئی تھیں۔ اتوار کا دن ہونے کے باوجود صبح سے بہت چہل پہل تھی گھر میں۔ وجہ تھی کھیر پکوائی کی رسم!

نمرہ کی شادی کو پندرہ دن گزر چکے تھے۔ ویسے تو وہ شادی کے دوسرے دن سے ہی حمیدہ بیگم کے ساتھ مختلف کاموں میں ہاتھ بٹانے کی غرض سے لگی رہتی تھی' کیوں کہ بڑا بیٹا قاسم اور اس کی بیوی عارفہ' اپنی شادی کے تین سال بعد ہی الگ ہو گئے تھے۔ حمیدہ بیگم اور عارفہ میں آئے روز ان بن رہتی تھی۔ ساس' بہو کے روایتی جھگڑوں سے گھر کا سکون تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ دونوں شادی شدہ بہنوں کو بلوا کر ہر روز عدالت لگتی۔ قاسم اور عارفہ کو برا بھلا کہا جاتا۔ ایسے میں سب سے چھوٹا نبیل جو ماں سے بہت قریب تھا' بہت جلتا کڑھتا تھا۔ اس کے نزدیک حمیدہ بیگم مظلوم اور عارفہ بھابھی ظالم تھیں۔

قاسم نے آئے روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر اپنے آفس کے قریب کرائے پہ گھر لے لیا اور آفس دور ہونے کا بہانہ کر کے آرام سے الگ ہو گیا۔ حمیدہ بیگم کو بھی اپنی راجدھانی میں بہو کی مداخلت قطعی ناپسند تھی' اس لیے انہوں نے بھی وقتی دکھ کے بعد شکر کا کلمہ پڑھا تھا اور دونوں ماں بیٹا سکون سے رہنے لگے۔ دونوں بیاہی بیٹیاں سبین اور شاہین اسی شہر میں ہونے کی وجہ سے آئے روز بچوں اور میاں سمیت آتی ہوتیں۔ حمیدہ بیگم کا دل بہت خوش اور مطمئن رہتا تھا۔

نبیل کے لیے لڑکی دیکھتے وقت بھی مختلف خدشے دل کو دہلاتے رہتے۔ نبیل ماں کا فرماں بردار اور لاڈلا تھا مگر آنے والی کیسی ہو گی' اس بارے میں کچھ کہنا

حمیدہ بیگم کو احساس دلا دیا تھا کہ وہ ذمہ دار طبیعت اور حساس دل کی مالک ہے۔ ورنہ آج کل کی لڑکیاں تو شادی کے سال بعد بھی بچی بنی پھرتی ہیں۔ نازو نخرے ہی کم نہیں ہوتے' مگر نمرہ نے اس سوچ کو بدل دیا تھا کہ آج کل کی لڑکی ہوتے ہوئے بھی وہ کافی سمجھ دار اور سگھڑ تھی۔

کھیر نمرہ نے رات کو ہی بنا کر فریج میں رکھ دی تھی اس کا مشورہ بھی حمیدہ بیگم نے دیا تھا۔ کیوں کہ اگلے دن کاموں کی بہت لمبی فہرست' نمرہ کو اکیلے ہی نپٹانی تھی۔ صبح اٹھتے ہی حمیدہ بیگم اور نبیل کو ناشتا کروا کر نمرہ کچن میں گھس کر دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ مہمانوں کے آتے ہی خاطر تواضع کا سلسلہ شروع ہو جانا تھا۔

کام کرنے والی بانو بھی نمرہ کی ہدایت کے مطابق صبح جلدی آکر صفائی کرنے کے بعد کچن میں نمرہ کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ کچھ دیر میں ہی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے قاسم بھائی اور عارفہ بھابھی بمع فیملی (تین بچوں کے) تشریف لائے۔ آتے ہی چائے کی فرمائش کر دی۔ نمرہ نے خوش دلی سے سر ہلایا اور چائے بنا کر دیگر لوازمات ٹرالی میں سجائے اور سرو کرنے چل پڑی۔ اسی دوران دونوں نندیں بمع شوہر اور بچوں کے آگئیں۔ ان سب کو کولڈ ڈرنک سرو کر کے نمرہ کچن میں چلی گئی' تاکہ باقی رہ جانے والے کام مکمل کر سکے۔ حمیدہ بیگم صاف ستھرے جوڑے میں ملبوس اپنے تخت پہ شان سے براجمان' اپنے سب بچوں کو اکٹھا دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔

ہنسی مذاق' باتوں کے ساتھ ساتھ بچوں کا شور شرابا اپنی جگہ تھا۔ نمرہ نے بانو کے ساتھ مل کر میز پہ برتن رکھے۔ اسی وقت نبیل کی خالہ اقبال بیگم بھی اپنی بہو فائقہ اور بیٹا شکیل کے ساتھ آگئیں۔ انہیں بھی حمیدہ بیگم نے بلایا تھا۔

کھانا بہت خوش گوار ماحول میں کھایا گیا۔ نمرہ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ سب نے تعریف کی اور کھیر پکوائی کی رسم کی وجہ سے سب نے ہی کچھ نہ کچھ ضرور دیا۔ کھانے کے بعد مرد حضرات تو ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ملکی و سیاسی صورت حال پر تبصرے کرنے لگے۔

اور باقی خواتین حمیدہ بیگم کے تخت کے پاس لاؤنج میں بیٹھ کر خوش گپیوں میں لگ گئیں۔ نمرہ نے سب کو چائے سرو کی۔ بانو کو برتن دھونے پہ لگا کر' اپنا کپ لے کر سب کے درمیان آبیٹھی۔ صبح سے صرف دو سلائس ہی کھائے ہوئے تھے اس نے مگر ابھی بھی تھکاوٹ کی وجہ سے اسے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔

اسے دیکھ کر اقبال بیگم مسکرا کر بولیں۔

"ماشاء اللہ حمیدہ! تمہاری بہو بہت سگھڑ اور سلیقہ مند ہے۔ اتنے افراد کو دیکھ کر بھی گھبرائی نہیں پھرتی سے سب کام مکمل کیے۔"

اپنی تعریف پہ نمرہ جھینپ سی گئی۔ سسرال میں سب لڑکیاں ہی کام کرتی ہیں اور کرنا بھی پڑتا ہے' مگر بہو کے کام کو سراہنا یا تعریف کرنا بہت دل گردہ کا کام ہے۔

"یہ تو ٹھیک کہا آپ نے! نمرہ بہت ذمہ دار ہے۔" حمیدہ بیگم نے طنزیہ نظروں سے عارفہ کی طرف دیکھ کر کہا تھا جو "ہونہہ" کہہ کر منہ پھیر گئی تھی۔

"چلو! پھر آج سے طے ہوا کہ اب تم اس تخت پہ بیٹھ کر صرف آرام کرو گی اور نمرہ سارا گھر سنبھالے گی۔"

اقبال بیگم نے ہنستے ہوئے کہا تو ایک لمحے کے لیے حمیدہ بیگم چپ ہو گئیں جیسے انہیں یہ بات پسند نہ آئی ہو۔ اسی وقت بڑی بیٹی ثمین بھی بولی تھی۔

"ہاں امی! خالہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ساری زندگی ہم نے آپ کو بہت محنت اور مشقت کرتے ہوئے دیکھا۔ ابو کے مرنے کے بعد بھی جس طرح آپ نے اپنی فہم و فراست سے وقت گزارا' وہ قابل تعریف ہے۔ ہماری بہت بڑی خواہش تھی کہ آپ کا بڑھاپا سکون اور آرام سے گزرے اور اب اگر اللہ نے یہ موقع دیا ہے تو آپ کفران نعمت مت کریں۔"

ثمین نے نم آنکھوں کے ساتھ جذباتی تقریر کر کے

سب کو آبدیدہ کر دیا تھا۔ شاہین بھی بہن کی ہاں میں ہاں ملانے لگی اور تو اور نبیل نے بھی پاس سے گزرتے بہن کی جذباتی تقریر سے متاثر ہو کر ماں کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے فیصلہ سنایا تھا۔

"امی بس بہت ہو گیا! اب آپ صرف حکم چلائیں گی تخت پہ بیٹھ کر اور ہم سب تعمیل کریں گے۔ ہم نے بھی اپنا فرض ادا کرنا ہے کیوں نمرہ؟"

نبیل نے حیران بیٹھی نمرہ سے سخت لہجہ میں پوچھا تو وہ سب کی نظریں خود پہ مرکوز دیکھ کر گڑبڑا کر اثبات میں سر ہلانے لگی تھی۔ حمیدہ بیگم پچاس کے پیٹے میں ہونے کے باوجود جسمانی طور پر فٹ تھیں مگر اتنی ہمدردی اور محبت و فکر پا کر ان کا دل قائل ہو گیا اور انہیں سچ میں احساس ہوا کہ وہ بہت تھک گئی ہیں اپنی راجدھانی چھوڑنا دل گردے کا کام تھا مگر دل پہ پتھر رکھ کر حمیدہ بیگم نے یہ کام بھی کیا اور سب کچھ نمرہ پر چھوڑ کر فراغت کے مزے لینے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"اعجاز! یہ کب لی؟"

حمنہ نے پورچ میں کھڑی بچوں کی خوب صورت اسپورٹس بائیک کھڑی دیکھی تو حیرت سے چیخ پڑی' جبکہ اعجاز نے قہقہہ مارا اور دس سالہ علی کو گود میں اٹھا کر بے تحاشا پیار کیا۔

"علی کے لیے میں نے خاص لندن سے آرڈر پہ منگوائی ہے۔" علی حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بائیک پہ ہاتھ پھیر کر دیکھ رہا تھا۔

"اعجاز! وہ سب تو ٹھیک ہے' مگر یہ بہت مہنگی ہو گی اور ابھی آپ کا بزنس بھی خسارے میں جا رہا ہے تو..." حمنہ نے متذبذب لہجے میں کہا۔

"اُف حمنہ! میرے بیٹے کی خوشی خراب مت کرو۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ میرا بیٹا کسی چیز کی فرمائش کرے اور میں پوری نہ کروں' میں کماتا کس کے لیے ہوں! اگر میرا بیٹا ہی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے ترسے!"

اعجاز نے حمنہ کو ٹوکتے ہوئے کہا تھا تو حمنہ کچھ کہتے کہتے رک سی گئی۔ بچے کی خواہشات پانی کے بلبلے کی طرح بنتی اور ختم ہو جاتی ہیں۔ نہ ان کی خواہشات کی کوئی حد ہوتی ہے اور نہ فرمائشوں کی مگر سمجھ دار والدین' بچپن سے ہی بچوں کو اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ بے جا لاڈ' بے جا توقعات کو جنم دیتا ہے۔

کچھ دن پہلے ٹی وی میں اسپورٹس بائیک دیکھ کر علی نے لینے کی ضد کی تھی اور اعجاز نے پوری بھی کر دی تھی۔

بائیک پہ ہاتھ پھیرتا' خوشی سے کھلکھلاتا علی سوچ رہا تھا کہ "میں بہت خاص ہوں اور میرے بابا ہمیشہ میری ہر خواہش کو پورا کریں گے۔" اس کے معصوم ذہن نے امیدوں اور توقعات کے سب رشتے باپ سے جوڑ لیے تھے' مگر رشتے صرف احساس اور محبت پہ بنتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

کرنل امتیاز شیخ ساٹھ سال کے ہونے کے باوجود بہت چاق و چوبند تھے۔ دو سال پہلے بیوی کی وفات نے انہیں غم ضرور دیا تھا مگر انہوں نے سمجھ داری سے خود کو تعمیری سرگرمیوں میں مصروف رکھا ہوا تھا۔ دن کو اپنے دوست کے پرائیویٹ کالج میں لیکچرز دیتے تھے۔ شام کو بھی اکثر اسٹوڈنٹ گھر آ جاتے تھے۔ رات تک محفل جمتی تھی۔

کرنل امتیاز کے تین بیٹے تھے۔ دو اپنی فیملی کے ساتھ یوکے میں برسوں سے مقیم تھے اور چھٹیوں پہ گھر آتے تھے' جبکہ تیسرا بیٹا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کراچی میں مقیم تھا اور چھٹیوں میں لاہور کا چکر لگا لیتا تھا۔

گھر کی دیکھ بھال اور کھانا پکانے کے لیے دو میاں بیوی' اپنے بچوں کے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں رہائش پذیر تھے۔

"بابا جان! آپ تو ہم سے بھی زیادہ مصروف رہتے ہیں' میں اور وقار کب سے آپ سے تفصیلی بات کرنا

چاہ رہے تھے مگر آپ ملتے ہی نہیں۔"
کرنل امتیاز کو سونے سے پہلے بڑے بیٹے راحیل کا فون آیا تو وہ ہنس پڑے۔
"بس دن کیسے گزر جاتا ہے پتا ہی نہیں چلتا۔"
کرنل امتیاز نے اپنے دائیں طرف دیوار پہ لگی اپنے پیاروں کی تصویروں پہ نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔
"بابا جان! ہم سب نے بہت غور و فکر کیا ہے! ایاز کی بھی یہ ہی خواہش ہے کہ اب آپ سب کام وغیرہ چھوڑ دیں اور گھر پہ بیٹھ کر مکمل آرام کریں۔ ہم ہمیشہ کی طرح آپ کو باقاعدگی سے پیسے بھیجتے رہیں گے۔"
راحیل نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا تو کرنل امتیاز گہری سانس لے کر رہ گئے۔
"وہی پرانا مطالبہ.....!"
"بیٹا! تم سے کس نے کہا ہے کہ میں یہ سب پیسوں کے لیے کرتا ہوں۔ الحمد للہ میں نے اتنا کمایا اور جوڑا ہوا ہے کہ اپنا بڑھاپا بغیر کسی کی مدد کے آرام سے گزار سکتا ہوں' مگر بچے! ذہنی سکون' ان پیسوں میں نہیں ہوتا۔ یہ پیسہ میری تنہائی' میرا اکیلا پن نہیں بانٹتا ہے۔"
کرنل امتیاز نے نرم لہجے میں سمجھایا' مگر راحیل بضد تھا ساتھ ہی اس کی بیوی شہلا بھی۔
"بابا جان! لوگ ہمیں باتیں کرتے ہیں۔ سب پوچھتے ہیں کہ تم لوگ ان کو پیسے وغیرہ نہیں بھیجتے ہو اسی لیے وہ اس عمر میں بھی کام کر رہے ہیں' پلیز ہماری عزت کا ہی پاس رکھ لیں۔ دنیا اس بات کو نہیں سمجھتی ہے۔"
شہلا نے جھنجلا کر اور آخر میں منت کرتے ہوئے کہا تھا۔ کرنل امتیاز اس وقت تو ٹال گئے' مگر آنے والے دنوں میں تینوں بیٹوں اور ان کی بیویوں نے ان کا پیچھا لے لیا تھا' بلکہ ایاز تو خاص دو دن کی چھٹی لے کر آبھی گیا اپنے بیوی بچوں سمیت۔ بابا جان ان سب کے مسلسل اصرار اور دباؤ کے بعد بالآخر مان ہی گئے اور جاب چھوڑ دی۔ آہستہ آہستہ شام کو آنے والے اسٹوڈنٹ نے بھی آنا چھوڑ دیا' مگر تینوں بیٹوں کے ڈرافٹ بہت باقاعدگی سے وقت پہ ہر مہینے آجاتے تھے۔ لوگ حیرت سے دیکھتے' دعا کرتے تھے کہ اللہ سب کو ایسے ہی فرماں بردار اور فکر کرنے والے بیٹے دے۔

☼ ☼

"نمو! کبھی دو گھڑی میرے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔ صبح سے اکیلی پڑے پڑے گھبرا جاتی ہوں۔"
حمیدہ بیگم نے چائے کا کپ رکھتی نمرہ سے کہا تھا جو بے زاری سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔
"امی! بار بار تو آپ آواز دے کر بلا لیتی ہیں اور کیسے پاس بیٹھوں۔"
نمرہ کے جواب نے حمیدہ بیگم کو آگ لگا دی تھی۔
"میں کب تمہیں آواز دیتی ہوں۔ مرضی ہوتی ہے تو تم روٹی پانی دے جاتی ہو۔ سارا دن تو میں کمرے میں اکیلی پڑی دیواریں تکتی رہتی ہوں۔"
حمیدہ بیگم نے منہ بنا کر کہا تو اسی وقت چار سالہ زویا کے رونے کی آواز پہ نمرہ باہر نکل گئی' جبکہ حمیدہ بیگم منہ بناتے ہوئے چائے پینے لگی تھیں۔ پانچ سال گزر چکے تھے۔ پہلے پہل تو حمیدہ بیگم نے فراغت کے خوب مزے لیے۔ اگر کبھی وہ نمرہ کی مدد کے خیال سے سبزی بنانے لگتیں تو یا تو نبیل غصے ہوتا یا پھر فون پہ بیٹیاں بولنا شروع کر دیتی تھیں۔ آہستہ آہستہ حمیدہ بیگم گھر سے بالکل لاتعلق ہو کر رہ گئیں۔ نمرہ کے جڑواں بچے ہوئے تھے۔ احمد اور زویا جو بہت ذہین اور شرارتی تھے۔ حمیدہ بیگم چھوٹی چھوٹی بات پہ بھی نمرہ کو آواز دے دیتی تھیں کہ نمرہ اکثر چڑ جاتی کہ اتنا سا کام تو بندہ خود بھی کر لیتا ہے' مگر بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ بچوں کے آنے سے مصروفیت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

حمیدہ بیگم تنہائی اور اکیلے پن سے گھبرا کر دن بہ دن چڑچڑی اور بد مزاج ہو گئی تھیں۔ فارغ رہ رہ کر ان کا دماغ عجیب سی منفی سوچوں میں الجھا رہتا اور اکثر ایسے

میں بیٹیوں اور دونوں بیٹوں کی بھی شامت آجاتی تھی جو ماں کی بد مزاجی کی وجہ سے دور دور رہنے لگے تھے۔ احمد اور زویا شرارتی بہت تھے' اور حمیدہ بیگم بہت جلد اکتا جاتی تھیں۔

اب حمیدہ بیگم' نبیل سے بھی الجھنے لگیں۔ جو رات دن' محنت و مشقت کرکے کماتا تاکہ گھر والوں کو سکون اور آرام مہیا کرسکے' مگر ماں کے شکوے اور ناراضی اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ اس لیے (وہ کوئی بے ادبی نہ کر بیٹھے) ماں کے پاس بہت تھوڑی دیر بیٹھتا اور اٹھ جاتا۔

فارغ بیٹھ بیٹھ کر حمیدہ بیگم کا وزن بڑھ گیا اور جوڑوں میں درد و تکلیف کی شکایت رہنے لگی۔ ڈاکٹرز واک کرنے کا کہتے' مگر اپنی سہل پسندی کی وجہ سے وہ نظر انداز کر جاتی تھیں۔

ان کے کمرے میں نبیل نے ہر نعمت' ہر چیز رکھ دی تھی کہ ماں کو کوئی تنگی نہ ہو۔ رہی سہی کسر کیبل پہ آنے والے انڈین سوپ سیریل نے پوری کردی تھی۔

نمرہ اکثر چڑ جاتی تھی کہ دادی کے پاس جاکر بچے بھی ان فضول ڈراموں سے بہت کچھ سیکھنے لگے تھے۔ اس کا یہ حل نکلا کہ بچوں کا وہاں داخلہ ہی ایک طرح سے ممنوع ہوگیا۔

اب اکثر حمیدہ بیگم سوچتیں کہ اس آرام سے' بہتر تو وہ محنت تھی' جب وہ اپنے ہاتھ' پاؤں کو مصروف رکھتی تھیں۔ محتاجی معذوری میں ہو یا محبت میں' بہت ذلیل و خوار کرواتی ہے اور کبھی بھی ذہنی سکون اور اطمینان نہیں دیتی ہے۔

دوسری طرف نبیل آئے روز بہنوں کو فون کرکے اپنے دکھڑے روتا تھا کہ ماں کی اتنی خدمت کرنے کے باوجود وہ خوش نہیں رہتی ہیں۔ ہر وقت لڑتی' جھگڑتی اور شکوے کرتی رہتی ہیں۔ نہ خود خوش ہوتی ہیں اور نہ کسی اور کو خوش رہنے دیتی ہیں۔

جبکہ حمیدہ بیگم کی بیٹیوں کو یہ شکوہ تھا کہ نبیل بیوی کی خاطر بدل گیا ہے۔ نہ کچھ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور دونوں نے مل کر ماں کو تنہا اور اکیلا کردیا ہے۔

☆ ☆ ☆
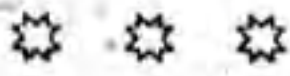
"مجھے نہیں پتا میں بھی اسی کالج میں داخلہ لوں گا جس میں میرے باقی دوست جائیں گے۔"

علی نے باپ کے سامنے حتمی لہجے میں کہا تھا۔ میٹرک میں اوسط نمبر لینے کے بعد وہ جس کالج میں داخلہ لینا چاہتا تھا وہاں اسے اچھی خاصی رشوت دینی پڑتی' مگر وہ شہر کا بہترین کالج تھا اور ساری زندگی بہترین سے بہترین چیز لینے والا علی' کسی بھی عام چیز پہ کیسے راضی ہوسکتا تھا۔

"دیکھو بیٹا! سارے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے' مگر میرا وعدہ رہا کہ ایف ایس سی کے بعد جس کالج میں کہو گے ایڈمیشن لے دوں گا ابھی میرا بزنس بہت خسارے میں جارہا ہے کہ گھر چلانا مشکل ہے اور اتنی بڑی رقم....."

اعجاز نے پریشانی سے پیشانی ملتے ہوئے کہا۔ حمنہ خاموشی سے باپ بیٹے کو سن رہی تھی۔

"پلیز پاپا! میرے ساتھ یہ ڈرامے مت کریں۔" علی نے گستاخی سے کہا۔

"تمیز سے بات کرو علی! تمہارے پاپا ہیں۔" حمنہ نے اسے ڈانٹا تھا۔

"پلیز مما آپ تو رہنے ہی دیں! دنیا جہاں کے والدین اپنے بچوں کے لیے کیا کیا نہیں کرتے اور ایک یہ ہیں!"

علی نے تلخی سے کہا جبکہ اعجاز نے حیرت سے اپنے جوان ہوتے بیٹے کے لہجے میں اپنے لیے حقارت دیکھی تھی۔

"علی میرے بچے! بس کچھ مہینوں کی بات ہے پھر سب پہلے جیسا۔"

اعجاز نے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا۔

"پاپا میں آپ کے مسئلوں کی وجہ سے اپنا مستقبل تو تاریک نہیں کرسکتا ہوں۔ اپنے دوستوں کو کیا بتاؤں

گا؟ کہ میرے باپ کی اتنی اوقات ہی نہیں ہے کہ کالج میں داخلہ لے کر دے سکے؟ کیا ہی کیا ہے آپ نے آج تک میرے لیے؟ اور آج جب کچھ کرنے کا وقت آرہا ہے تو آپ کے بہانے! مائی فٹ!"

علی نے غصے سے سامنے پڑی میز کو ٹھوکر ماری تھی اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

"تم نے دیکھا؟ اس نے کس لہجے میں بات کی مجھ سے؟"

اعجاز نے صدمے سے چور کانپتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ حسنہ نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اپنے مجازی خدا کی طرف دیکھا تھا۔

"وہ کہتا ہے کہ میں نے اس کے لیے کیا کیا ہے؟ تم بتاؤ! تم تو گواہ ہو اس کے شب و روز کی کیا کوئی ایسا لمحہ یا دن جب اس کے منہ سے نکلی خواہش کو بغیر پورے کیا گزارا ہو؟ علی! میرا بیٹا! میرا مان۔۔۔ یہ تربیت تو نہیں کی تھی میں نے اس کی۔"

اعجاز مرد ہو کر رو پڑا تھا۔ ساری زندگی کی کمائی کھوٹے سکوں میں بدل جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ زندگی کریلے کے پانی جیسی کڑوی اور ناقابل برداشت لگنے لگتی ہے۔

"ہماری تربیت یہ ہی تو تھی! صرف لینا ہی لینا! ہم نے کب اسے رشتوں کی اہمیت سکھائی تھی؟ ہم نے صرف خواہشوں کی دوڑ میں بھاگنا سکھایا تھا۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے نا! جو سکھایا' جو سمجھایا' اس نے فرماں بردار بچوں کی طرح اسی پہ عمل کیا اور وہ ہی لوٹایا؟ پھر ملال کیسا۔۔۔؟"

حسنہ کی آواز میں کنکریاں تھیں۔ کنکریوں کی بوچھاڑ تھی' مگر کیوں' کب اور کیسے؟ جیسے سوالوں کے درمیان اسے ساری زندگی بھٹکنا تھا' مگر محبت کے زہر کا اثر جس کی رگوں میں پھیل کر اسے نیلا کر چکا تھا اس کا تریاق کسی کے پاس نہیں تھا۔

"محمد بخش! ڈاکٹر آیا تھا؟ کیا کہہ رہا تھا اب بابا جان کیسے ہیں؟ دیکھو انہیں کسی چیز کی کمی نہ ہو' وقت پر کھانا اور دوائی دے دینا۔ ہم کوشش کریں گے کہ جلد پاکستان کا چکر لگائیں' مگر اس بار ممکن نہیں ہے۔"

محمد بخش روز کے کتنے ہی فون وقار اور راحیل کے اٹینڈ کرتا تھا۔ ایاز بھی بلاناغہ باپ کی خبر لیتا رہتا تھا۔ کرنل امتیاز شیخ جن کی ساری زندگی متحرک گزری تھی۔ بیٹوں کی مان کر' ان کی ضد پہ' مجبور ہو کر فراغت میں وقت گزارنے لگے' مگر پانی ساکن ہو جائے تو کائی لگ جاتی ہے۔ یہی ان کے ساتھ ہوا۔ آہستہ آہستہ تنہائی کے زہریلے ناگ نے ڈسنا شروع کیا۔ پہلے کرنل امتیاز' گھر' برآمدے میں قید ہوئے' پھر آہستہ آہستہ خاموشی بڑھنے لگی اور وہ گم صم سے رہنے لگے۔ وہ اکثر سوچتے کہ بیٹوں کی بات مان کر غلطی کی ہے۔ صحت اور تندرستی حرکت میں تھی اور حرکت میں ہی برکت ہوتی ہے۔

مگر تنہائی کا زہر ایسا پھیلا کہ کرنل امتیاز ذہنی دباؤ کا شکار ہو کر بستر سے لگ گئے۔ بائیں طرف فالج نے حملہ کیا اور معذوری ان کا مقدر بن گئی۔ ان کے تینوں بیٹے ہر چیز کا خیال رکھتے تھے۔ محمد بخش سے ایک ایک لمحے کی رپورٹ لیتے تھے' مگر وہ اپنے باپ کو وہ نہ دے سکے جو اس کا حق تھا۔ جیسے بچپن میں ماں باپ' بچے کی جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ محبت' شفقت کا رشتہ بھی رکھتے ہیں اور وہ ہی بچے بڑے ہو کر صرف پیسے کو ہی ماں باپ کی ضرورت سمجھتے ہیں۔

مگر نجانے کیوں ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ ہم اچھے بھلے کار آمد ذہنوں اور جسموں کو بڑھاپے کا لیبل لگا کر' فراغت اور تنہائی کے قید خانے میں ڈال کر ناکارہ بنا دیتے ہیں۔

ایسی ہی مثالوں سے بھرا ہمارا معاشرہ' جہاں ہم قدم قدم پہ رشتوں کو بے جا محبتوں کا زہر پلا کر نیلا کر دیتے ہیں اور یہ زہر زہر محبتیں جو نہ جینے دیتی ہیں اور نہ مرنے۔۔۔!

آپ بھی اپنے آس پاس ذرا غور سے دیکھیں! کہیں آپ بھی تو ایسی ہی کسی "زہریلی محبت" میں حصہ دار تو نہیں بن رہے۔۔۔؟

مہوش افتخار

مہر ایک کالج میں لیکچرار ہے۔ اپنی کزن جائشہ کی منگنی کی تقریب میں اس لیے شرکت نہیں کرنا چاہتی کہ وہ حنان سے سامنا نہیں چاہتی جو جائشہ کا بھائی ہے۔ یہ جان کر حنان ملک سے باہر ہے۔ وہ تقریب میں شرکت کے لیے چلی جاتی ہے۔ لیکن حنان وہاں آجاتا ہے۔ مہر اسے دیکھ کر اپنے گھر واپس آنے کے لیے نکلتی ہے تو حنان سے سامنا ہوتا ہے۔ مہر کے نفرت بھرے رویے پر وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس توہین کو معاف نہیں کرے گا۔ حنان، زیب بیگم اور صغیر صاحب پر زور دیتا ہے کہ اب مہر کی زندگی کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ وہ کب تک اس طرح کی زندگی گزارتی رہے گی۔ مہر کا نکاح بچپن میں ہوچکا ہے۔

انجم بیگم اور زیب بیگم دونوں بہنیں ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ مہر کی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہو، لیکن صغیر صاحب اس کے لیے راضی نہیں۔ زیب بیگم کو حنان کے گندے کردار کا بھی اندازہ ہے۔

سیم اپنے ماں، باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ ناز و نعم میں پرورش پائی۔ اس کی زندگی کی اولین ترجیح دولت ہے۔ وہ امریکہ میں تنہا رہتا ہے اور اپنی ذاتی فرم کا مالک ہے جس میں اس کا دوست مارک شریک ہے۔ وہ آزاد زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے

مکمل ناول

سوزی سے اپنی پسند سے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی لیکن پھر اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ایک بار گرل لورین اس کی زندگی میں آئی۔ وہ اس کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہتی ہے۔ پھر ایک دن اس کے فلیٹ کا صفایا کر کے اس کو کچرے کے ڈھیر پر پھنکوا دیتی ہے۔ زمین پر اس کے وجود پر ٹھوکریں مارتی ہے۔ سیم ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی آنکھ اسپتال میں کھلتی ہے۔ اس کا پارٹنر اور دوست مارک اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

سیم پر اس حادثے کا گہرا اثر ہے۔ وہ گم صم ہے۔ اسے بار بار وہ خواب یاد آتا ہے جو اس نے بے ہوشی کے عالم میں دیکھا تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ تاریک انجان گلیوں میں دو بھوکے کتے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ وہ چلا چلا کر مدد مانگ رہا ہے لیکن سب دروازے بند ہیں۔ تب اچانک ایک دروازہ نمودار ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھتا ہے لیکن اندر نہیں جاتا۔ دوبارہ بھاگنے لگتا ہے۔ تب وہ کچرے کے ڈھیر پر جا گرتا ہے اور تیز بو اس کی ناک اور منہ میں گھسنے لگتی ہے۔

اس حادثے کے بعد سیم پہلی بار اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور تب اس کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ کس پناہ گاہ کے دروزا[illegible]

دوسری قسط

مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں، جب جائشہ اور نورہ نے مہر کو گھر ڈراپ کیا تھا۔ اس کے بے حد اصرار پر بھی وہ دونوں اندر نہیں آئی تھیں۔ ان کے گاڑی آگے بڑھانے کے بعد وہ شاپنگ بیگز اٹھائے گیٹ سے اندر چلی آئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ان دونوں کے ساتھ بازار میں گھومتے ہوئے اس نے اچھی خاصی خریداری کرلی تھی۔ جو ہمیشہ کی طرح اس کی ذاتی چیزوں سے زیادہ انجم بیگم، ابراہیم صاحب اور گھر کے لیے نت نئی چیزوں پر مشتمل تھی۔

اسے سامان سے لدا پھندا دیکھ کے دل شیر سرعت سے آگے آیا تھا۔ مہر چیزیں اس کے حوالے کر کے سیدھی ہوئی تو نظریں سامنے پورچ میں اپنی گاڑی کے برابر کھڑی ابراہیم صاحب کی گاڑی سے جا ٹکرائیں۔ وہ بے اختیار چونک گئی۔ یہ وقت ان کے آفس سے واپسی کا تو نہیں تھا۔

"بابا کب آئے؟" اس نے پلٹ کر دل شیر کی طرف دیکھا۔

"آپ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی آگئے تھے بی بی۔" اس کے جواب نے مہر کو پریشان کر دیا۔

"کیوں خیر تھی؟"

"جی... جی... وہ صغیر صاحب اور بیگم صاحبہ آئی تھیں نا۔" اور مہر اس اطلاع پہ ٹھٹک کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"کتنی دیر بیٹھے تھے وہ لوگ؟" اس کے بے تاثر لہجے پہ دل شیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہی کوئی گھنٹہ ڈیڑھ بی بی۔"

مہر کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے انجم بیگم کا صبح سے مضطرب اور خاموش انداز گھوم گیا، ساتھ ہی شام میں ان سے ہونے والی اپنی گفتگو اس کے ذہن میں تازہ ہوئی تو جیسے کچھ کھٹک سا گیا۔

"کہیں ان لوگوں نے مجھے قصداً تو باہر نہیں بھیجا تھا؟" اس خیال کے آتے ہی اس کا چہرہ تن گیا۔ لب بھینچے وہ تیز قدموں سے آگے بڑھی۔ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی انجم بیگم کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"تو آپ لوگ صبح سے یہ سب پلان کیے بیٹھے تھے۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہی تھی۔

"جاؤ جا کے پہلے نماز پڑھو۔" اس کی بات کو نظر انداز کیے انجم بے تاثر لہجے میں بولیں تو مہر کا ضبط جواب دے گیا۔

"میری بات کا جواب دیں مما جان! کیوں کیا آپ لوگوں نے ایسا؟" وہ زور سے بولی تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ابراہیم ملک کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔ وہ ابھی چند لمحے پہلے ہی گھر لوٹے تھے۔

"ہم نے جو مناسب سمجھا' وہ کیا۔" ان کی آواز اچانک کمرے میں گونجی تو مہر کے ساتھ ساتھ انجم بیگم نے بھی چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ان کی بات پہ مہر کے چہرے پر دکھ کی کیفیت پھیل گئی۔

"معذرت کے ساتھ بابا جان۔ لیکن میرے حق میں آپ لوگوں نے نہ کل کوئی مناسب فیصلہ کیا تھا اور نہ آج۔" اور ابراہیم صاحب کا چہرہ بے اختیار پھیکا پڑ گیا۔

"ہم اپنی غلطی مانتے ہیں۔ اس لیے آج ہم نے اس رشتے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔ ان کی بات پہ مہر کی رنگت زرد پڑ گئی۔ "اس منحوس رشتے سے تمہاری جان چھوٹے گی تب ہی ہم تمہارے مستقبل کا کوئی بہتر فیصلہ کر سکیں گے۔"

"میرا مستقبل... ہا!" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "ایک بات بتائیں بابا جان۔ کیا ہوں میں آپ سب کے لیے؟ کوئی کٹھ پتلی یا کوئی مذاق؟ میری آبادی' میری بربادی کہیں پہ تو فیصلے کا حق مجھے دے دیں۔" بے بسی کے مارے اس کی آواز چیخ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے تو پھر فیصلہ کرو... یا تو یہ رشتہ ختم ہو گا یا پھر تم قاضی ولا کے لیے روانہ ہو گی۔" ابراہیم صاحب نے آگے کنواں پیچھے کھائی کے مصداق اس کے لیے دو راستے رکھے تو مہر کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس نے ان کی توقع کے عین مطابق جواب دیا تھا ابراہیم صاحب نے "فوراً" سے پیشتر نتیجہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"تو پھر یہ طے ہوا کہ تم یہ رشتہ ختم کرنے والی ہو۔"

"میں ایسا کچھ..."

"مہر!" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ اس زور سے دھاڑے کہ مہر اپنی پوری جان سے کانپ کر رہ گئی۔ انجم بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "نہ یہ' نہ وہ۔ تم آخر چاہتی کیا ہو؟ سارا خاندان ہمیں باتیں بنا رہا ہے۔ شک کر رہا ہے ہماری نیت پہ' بولو میں انہیں کیا جواب دوں۔" غصے سے اسے گھورتے ہوئے وہ ایک قدم آگے آئے تو انجم بیگم نے تیزی سے آگے بڑھ کے اسے اپنے بازو کے حصار میں لے لیا۔ ان کا سہارا ملتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

"زندگی کو تماشا بنا کے رکھ دیا ہے تم لوگوں نے' لیکن ایک بات کان کھول کے سن لو۔ میں اب یہ بچپنا مزید برداشت نہیں کرنے والا۔ یہ معاملہ اب ہر حال میں نپٹے گا اور اگر کسی نے میرے خلاف جانے کی کوشش کی تو میں اس سے اپنا ہر تعلق ختم کر لوں گا۔" انجم بیگم کی آنکھوں میں ڈولتی نمی نظر انداز کیے وہ پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

دروازے کی زوردار آواز پہ انجم بیگم کے اٹکے ہوئے آنسو چہرے پہ بہہ نکلے تھے۔ بے اختیار روتی ہوئی مہر کو سینے سے لگائے وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھیں۔

☼ ☼ ☼

صغیر صاحب اپنی اسٹڈی میں بظاہر فائلیں کھولے بیٹھے تھے۔ لیکن پچھلے ڈھائی گھنٹوں سے ان کا ذہن بہت سی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس معاملے میں حتمی فیصلہ لے کر انہوں نے بہت بڑی ذمہ داری اپنے کندھوں پہ لے لی تھی۔ گو کہ وہ کسی کے آگے جواب دہ نہ تھے۔ مگر پھر بھی اگر آنے والے وقت میں ان کا یہ فیصلہ کسی بہتری کی سبیل نہ بن پاتا تو وہ اپنی ہی نظروں میں معتوب ٹھہر جاتے اور یہی سوچ انہیں مسلسل

مضطرب کیے ہوئے تھی۔

زیب تو سارا راستہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی تھیں۔ وہ ایک لفظ نہ بولی تھیں۔ گھر پہنچ کے وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

وہ کتنی ہی دیر چپ چاپ تنہا لاؤنج میں بیٹھے رہے تھے اور پھر تھک کر اپنا دھیان بٹانے کو اسٹڈی میں آ کر فائلیں کھول کے بیٹھ گئے تھے۔ مگر ذہنی کش مکش پر قابو نہ پا سکے تو کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موندلی تھیں۔ یوں بیٹھے انہیں نجانے کتنی دیر گزر گئی تھی۔ جب دروازے پہ دستک کے بعد جائشہ کی آواز سنائی دی تھی۔

''ڈیڈی!''

''آجاؤ بیٹا!'' سر اٹھاتے ہوئے انہوں نے جواب دیا تو دروازہ کھول کے جائشہ اندر چلی۔

''کیا بات ہے ڈیڈی! آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ ادھر امی اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی ہیں۔۔۔ وہاں کوئی بات تو نہیں ہوئی نا؟'' انہیں دیکھتے ہوئے اس نے پریشانی سے سوال کیا تو صغیر صاحب نے اک گہری سانس لی۔

''تم نے کھانا لگوایا ہے؟''

''جی میں آپ کو اسی لیے بلانے آئی تھی۔'' ان کے بات پلٹ دینے پر جائشہ حیران ہوتی دھیرے سے بولی تو صغیر صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''چلو آؤ' پہلے کھانا کھاتے ہیں۔'' اسے اپنے بازو کے حصار میں لیے وہ دروازے کی جانب بڑھے۔ جائشہ بھی خاموشی سے ان کے ساتھ چل دی۔

وہ دونوں لاؤنج میں داخل ہوئے تو حنان شلوار قمیص میں' آستینیں چڑھاتا سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دیتے رک کر اسے دیکھنے لگے۔ جو آج خلاف معمول اپنے سیر سپاٹوں کی بجائے جلدی گھر آگیا تھا۔

''آج تم اس وقت کیسے گھر آگئے؟''

''بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' اس نے بہانا بنایا۔ صغیر صاحب اثبات میں سرہلاتے آگے بڑھ گئے تو حنان بھی ان کے پیچھے چل دیا۔

ڈائننگ روم میں نویرہ پہلے سے ان سب کی منتظر تھی۔

''امی نہیں آئیں؟'' اس کے سوال پہ حنان کے کان کھڑے ہوگئے۔

''اوں ہوں' تمہارے کمرے سے نکلنے کے بعد انہوں نے منع کر دیا تھا۔'' جائشہ نے کرسی کھینچی۔ اس کی بات پہ نویرہ خاموش ہوگئی۔ اس نے زیب بیگم کی کتنی منتیں کی تھیں کہ وہ تھوڑا سا کھانا کھالیں مگر۔۔۔ مزید کچھ کہے بغیر سب نے کھانا شروع کیا۔ تو دونوں بہنوں نے پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پتا نہیں وہاں کیا ہوا تھا جو امی اور ڈیڈی دونوں کو ہی چپ لگ گئی تھی۔

''پھر کیا بات ہوئی وہاں پہ؟'' اپنا تجسس دبائے حنان نے چند لمحوں کے صبر کے بعد سوال کیا تو دونوں لڑکیوں نے بے اختیار باپ کی طرف دیکھا۔

''کل بھائی جان کا وکیل آرہا ہے۔ میں نے یہ نکاح ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' انہوں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا تو سب کا مارے بے یقینی کے منہ کھل گیا۔

''کیا!'' نویرہ کے لبوں سے سرسراتا ہوا فقط یہی لفظ نکل پایا تھا۔

✿ ✿ ✿

''سیم۔'' اپنے شانے پہ کسی کے ہاتھ کا دباؤ اور اپنے نام کی پکار پہ گہری نیند سوئے ہوئے سیم کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''ہوں۔'' مندی مندی آنکھوں سے اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا تھا۔ جہاں مارک کھڑا تھا۔ اس پہ نگاہ پڑتے ہی سیم کے سوئے ہوئے حواس قدرے جاگ گئے تھے۔

''ہاں۔''

''سوری یار! میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ لیکن میں آفس جا رہا ہوں۔ تمہیں اس لیے جگا کر جا رہا ہوں کہ جب تم اٹھو تو پریشان نہ ہو۔'' مارک نے نرمی سے

کہا۔

"اوکے۔" سیم نے کروٹ لی۔

"ناشتے کا سارا سامان فریج میں رکھا ہے۔" مارک نے مطلع کیا تو آنکھیں بند کیے پڑے سیم کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اوکے مام۔۔۔" اس کے شوخ انداز پہ مارک بھی خوشگوار حیرت لیے مسکرا دیا۔ رات کے برعکس اس کی طبیعت میں خاصی بہتری محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اس خیال کا اظہار اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

"ہاں' ہاں اڑا لو میری محبت کا مذاق۔" مارک نے قصداً" ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ سیم کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"قسم سے یوں دہائیاں دیتے ہوئے میری بیوی لگ رہے ہو۔"

"بکو مت۔" اس کی پشت کو مصنوعی خفگی سے گھورتے ہوئے وہ گھوم کر بیڈ کی دوسری جانب آکھڑا ہوا۔ "کبھی ماں' کبھی بیوی۔ تمہیں لگ رہا تو میں جناب کو بزنس پارٹنر نہیں لگ رہا۔۔۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔ آفس کب سے جوائن کرنے کا ارادہ ہے؟" اس کے جل کر کہنے پہ سیم نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔

"فی الحال تو میرا صرف ریسٹ کرنے کا ارادہ ہے۔"

"شاباش ہے! اور کام کون کرے گا؟" اس نے استہزائیہ انداز میں سیم کو دیکھا۔

"تم ہو نا۔" سیم نے حظ اٹھایا۔

"ہاں میں ہوں نا' ہر مرض کی دوا!۔۔۔ تمہیں سنبھالوں' تمہارے گھر کو سنبھالوں' تمہارے آفس کو سنبھالوں۔ کیوں نا میں تمہیں گود لے لوں سیم؟" وہ کلس کر بولا تو سیم نے اپنی گہری ہوتی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔

"ہاں یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے ممکی۔"

"سیم!" اس کے آنکھیں نکالنے پہ وہ ہنس دیا۔

"اوکے بابا کوشش کرتا ہوں ایک دو دن تک آنے کی۔"

"کوشش نہیں ہر حال میں آنا ہے۔" وہ پلٹ کر اپنی ٹائی لینے کو آگے بڑھا۔

"اور آج شام میرے کزن نے آنا ہے۔ یاد ہے نا تمہیں؟"

"ہاں' یاد ہے۔" وہ سیدھا ہوتا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اٹھا کر دم لیا ہے تم نے۔" اس نے مارک کی پشت کو گھورا جو ٹائی کی ناٹ باندھتے ہوئے مسکرا دیا۔

"اچھا کیا ہے۔ دیکھو ذرا کیسا چمکیلا دن نکلا ہے باہر اور تم یہاں بستر میں پڑے ہو۔" ٹائی چھوڑ کے اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو کمرہ چمکتی روشنی سے بھر گیا۔

"زبردست!" سیم کی نظریں نیلاہٹیں چھلکاتے آسمان پہ ایک پل کو جم سی گئیں۔ "یہ تو واقعی باہر گھومنے پھرنے کا دن ہے۔"

"ہاں تو ناشتے کے بعد واک کے لیے نکل جاؤ۔ دیکھو یار غلطیاں سب سے ہوتی ہیں اور ان کے نتائج بھی ہم سب کو جھیلنے پڑتے ہیں۔ تم اس حادثے کو بھول کر باہر نکلنے کی کوشش کرو۔"

"ہوں۔۔۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے خود پہ سے لحاف ہٹایا۔

"شکر ہے خدا کا تمہیں میری کوئی تو بات سمجھ میں آئی" مارک نے بے اختیار شکر کا کلمہ پڑھا۔

"میں اب جا رہا ہوں تم اگر باہر جاؤ۔۔۔ تو پلیز اپنے بلاک کے پارک تک ہی جانا اور یہ سیل فون اپنے ساتھ لے جانا۔" اس نے قریبی میز پہ اپنا سیل رکھ دیا تو سیم کی آنکھوں میں ممنونیت کا احساس اتر آیا۔ مارک سچ میں ایک بہترین انسان اور باکمال دوست تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کے سیم نے خود کو ذہنی طور پہ تیار کرتے ہوئے اپنے جوگرز پہنے تھے' مارک کا موبائل اٹھا کر اس نے عادتاً" اپنے والٹ کے لیے ادھر ادھر ہاتھ مارے تو یاد آیا کہ وہ تو اسی رات ہی اس سے چھین لیا گیا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے قصداً" خود کو مزید کچھ سوچنے سے روکا تھا' اور اندر

ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔
الماری میں موجود لاکر کھول کر پیسے نکالنے پر اسے احساس ہوا تھا کہ ہسپتال سے لے کر اب تک مارک ہی تمام اخراجات اٹھائے ہوئے تھا۔ اپنی اس لاپروائی پہ اسے از حد شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ وہ واقعی مارک اور جوزی کی نا صرف ذاتی بلکہ کاروباری زندگی بھی ڈسٹرب کیے ہوئے تھا اور یہ نادانی اسے مزید زیب نہیں دیتی تھی۔
دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتے ہوئے اس نے کل سے ہی آفس جوائن کرنے کی ٹھانی تھی۔
وہ اپارٹمنٹ لاک کر کے نیچے آیا بلڈنگ سے نکلنے پر ہوا کے خوشگوار جھونکے نے اس کا استقبال کیا تھا۔
بے اختیار اک گہری سانس کھینچتے ہوئے سیم نے دلچسپی سے اپنے اردگرد دیکھا تھا۔
آج نجانے کتنے عرصے بعد وہ یوں واک پہ نکلا تھا۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ اسے یہ تفریح بہت اچھی لگ رہی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل وہ ایسی تھکی ہوئی تفریحات کو بزرگوں' بیماروں اور بورنگ لوگوں سے منسوب کیا کرتا تھا۔ مگر آج اسے پارک کی پرسکون اور خوشگوار فضا میں' درختوں کی سبز چھاؤں تلے' پرندوں کی آوازیں سنتے ہوئے احساس ہوا تھا کہ کبھی کبھی ہر ہنگامے سے دور' کچھ نہ سوچنا اور دھیرے دھیرے بے مقصد قدم اٹھانا بھی کتنے لطف کا باعث بن سکتا ہے۔ بالآخر وہ ایک ترتیب سے لگے بنچوں میں سے ایک پہ بیٹھ گیا اور اپنے دونوں بازو بینچ پہ پھیلا دیے تھے۔
وہ اپنے دھیان میں بیٹھا تھا جب قریب ہی کسی نے گٹار پہ بڑی خوب صورت دھن چھیڑی تھی۔ وہ بے اختیار چونک گیا تھا۔ سیدھے ہوتے ہوئے اس نے اپنے دائیں بائیں اور پھر پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔۔۔ تبھی اس کی نظر پارک کی حد پہ لگے جنگلے میں سے نظر آتے فٹ پاتھ پہ کھڑے ہوئے ایک لڑکے کی پشت سے ٹکرائی تھی۔ جس کے ہاتھ میں گٹار تھا اور نیچے زمین پہ اس گٹار کا خالی کیس کھلا پڑا تھا۔
چند لمحوں کی اوپننگ کارڈز بجانے کے بعد اس کی آواز شامل دھن ہوئی تو سیم مبہوت ہو گیا۔ لڑکے کی آواز بے حد خوب صورت تھی۔ سیم نا چاہتے ہوئے بھی سُر میں ڈوبے اس گیت کو سننے لگا۔ جو جنگ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ یکجہتی کی داستان سنا رہا تھا۔

"اے پہاڑ کی کہر آلود آنکھوں
میرے بھائی کی روح پر گہری نگاہ رکھنا
اور جب آسمان آگ اور دھوئیں سے بھر جائے
تم ڈیورن کے بیٹوں کی حفاظت کرنا۔
اگر یہیں زندگی کا خاتمہ ہے
تب ہم سب کو ایک ساتھ جلنا چاہیے
اور اگر آج کی رات ہمیں مرنا ہے
تب ہم سب کو ایک ساتھ مرنا چاہیے۔"

سیم بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس لڑکے کے سامنے کھڑا ہو کے اسے سنے۔ جواب اگلا بند گا رہا تھا۔

"آہ! اگر میرے لوگوں کو آج گرنا ہے
تو میں بھی یقیناً "یہی کروں گا۔۔۔"

سیم نے اپنے قدموں کی رفتار بڑھائی۔

"ہاتھ مضبوطی سے تھام لو اور ہم دیکھیں گے
پہاڑوں کے اس پار بتیوں کو نارنجی ہوتے ہوئے۔۔"

اس کی آواز سنتے ہوئے وہ تیز قدموں سے پارک کا گیٹ عبور کر گیا۔

"اب میں دیکھ رہا ہوں آگ
پہاڑوں کے اندر
میں دیکھ رہا ہوں آگ
درختوں کو جلاتی ہوئی۔۔۔"

فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے بالآخر سیم اس لڑکے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ لیکن جونہی اس کی نظر لڑکے کے چہرے سے ٹکرائی' وہ ایک پل کے لیے ساکت رہ گیا۔ وہ تیئس' چوبیس سال کا لڑکا اندھا تھا۔ سیم کی آمد سے بے خبر وہ اگلی لائن گا رہا تھا۔

"اور میں دیکھ رہا ہوں آگ
روحوں کو جلاتی ہوئی

میں دیکھ رہا ہوں آگ
ہوا میں پھیلتی ہوئی
اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے یاد رکھو گے۔۔۔"
سیم کے دل کو عجیب سا احساس گھیرنے لگا۔ اس کی نظریں اس لڑکے کے چہرے کو بغور تک رہی تھیں۔
"میں دیکھ رہا ہوں آگ
ایک شہر کو جلاتے ہوئے
اور میں دیکھ رہا ہوں آگ
پہاڑوں کے اس پار نارنجی ہوتے ہوئے
اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے یاد رکھو گے۔۔۔"
اس نے گانا ختم کیا تو سیم کے ہاتھ میکانکی انداز میں بج اٹھے۔ اچانک ملنے والی داد پہ وہ لڑکا پہلے چونکا اور پھر سنبھل کر مسکرا دیا۔
"شکریہ!"
"بہت اچھا گاتے ہو تم۔" سیم کی تعریف پہ اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔
"یہ میری جانب سے تمہارا انعام۔" سیم نے جیب میں سے سو ڈالر نکال کر نیچے کھلے کیس کے بجائے اس کے ہاتھ میں تھمائے تو وہ نوٹ کا احساس پا کے مزید خوش ہوگیا۔
"بہت شکریہ سر! آپ بہت اچھے ہیں۔" اس کی سادہ سی تعریف پہ سیم مسکرا دیا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔
"ایک بات پوچھوں اگر تم برا نہ مانو تو؟"
"ضرور سر!"
"یہ شاعری تمہاری اپنی ہے؟"
"بالکل سر۔"
"پھر ایک بات بتاؤ۔ تم تو اندھے ہو یار! پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم آگ کو دیکھ رہے ہو 'درختوں کو جلاتے ہوئے' روحوں کو جلاتے ہوئے؟" سیم نے اس عجیب سے احساس کو لفظوں میں ڈھالا جو اسے 'اس لڑکے کے الفاظ اور اس کی معذوری دیکھ کر ہوا تھا۔
"میرا مطلب ہے نہ تو تم نے آگ کو دیکھا ہے اور نہ ہی تم یہ جانتے ہو کہ جلنا کس عمل کو کہتے ہیں پھر تم

یہ مثالیں کیسے دے رہے ہو؟" اس کی بات پہ وہ لڑکا مسکرا دیا۔

"بے شک میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن ان دونوں کے بارے میں سنا تو ہے نا سر۔"

"اور اگر بالفرض تم نے آگ کے بارے میں کبھی کچھ نہ سنا ہوتا تو؟"

"تو پھر جب کبھی میرا آگ سے واسطہ پڑتا اور وہ میرے جسم کے کسی حصے کو تکلیف پہنچاتی تو میرا شعور از خود مجھے خبردار کر دیتا کہ یہ چیز جو بھی ہے 'باعث آزار' ہے۔ اور اگر مجھے دوبارہ اس درد 'اس جلن سے بچنا ہے تو مجھے اس سے دور رہنا ہوگا۔" وہ رسان سے بولا تو سیم چونک گیا۔

"یعنی تمہارا برا تجربہ تمہارے شعور کی آنکھ کھولنے کا باعث بن جاتا؟"

"بالکل سر! جو باتیں عام آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں وہ شعور کی آنکھ دیکھ لیتی ہے اور جب یہ کسی چیز کا تجزیہ کرتی ہے تو پھر عام آنکھوں کی طرح کسی بھی پوائنٹ کو مس نہیں کرتی۔"

"یعنی اس کے تجزیہ میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔" سیم کھویا کھویا سا بولا تو لڑکا مسکرا دیا۔

"بالکل!" اس کی بات پہ سیم ایک پل کو خاموش ہو گیا۔ اس کے ذہن میں اپنی سوچیں 'اپنے احساسات گردش کرنے لگے۔ بے اختیار اس کی نظریں پرسوچ انداز میں سامنے کھڑے لڑکے پہ آٹھہریں۔ جو شاید اس کی اس معاملے میں مدد کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بات کو کس پیرائے میں بیان کرے۔

"اچھا ایک مسئلہ ہے۔" اس نے گفتگو کا آغاز کیا اور تبھی ایک طریقہ اسے "فوراً" سے سوجھ گیا۔ کیوں نا وہ اس سارے معاملے کو اپنے کسی دوست سے منسوب کر کے کہہ سنائے؟ اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور اگلے ہی پل اس کی ساری جھجک دور ہو گئی۔

"مجھے اس میں تمہارا مشورہ درکار ہے۔ کیا میری مدد کرو گے؟" سیم نے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"اس وقت؟"

"ہاں۔ میں تمہیں تمہارے ٹائم کے لیے پے کر دوں گا۔" سیم نے اپنی عادت کے مطابق آفر کی تو وہ لڑکا مسکرا دیا۔

"آپ کہیں سر! پیسے کی کوئی بات نہیں۔"

"ارے اس ہی کی تو ساری بات ہے۔" سیم اس غریب لڑکے کی بڑی بات پہ مسکرایا۔

"معذرت کے ساتھ سر! لیکن پھر آپ نے اپنا مسئلہ پیسے کے ساتھ مل کر کیوں نہیں حل کر لیا؟" اور اس کی بات پہ سیم لاجواب ہو کے اس کا منہ تکنے لگا۔

"آپ بولیں سر۔ میں سن رہا ہوں۔"

"کیوں نا ہم پارک میں بیٹھ کر بات کریں؟" سیم کی تجویز پہ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گلے میں لٹکا گٹار اتار کے وہ زمین پہ جھکا تو سیم بے اختیار ہی اس کی مدد کو نیچے بیٹھ گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" گٹار کیس میں بند کرتے ہوئے اس نے ایک نظر اس لڑکے کو دیکھا جو ایک طرف رکھی اپنی وائٹ چھڑی اٹھا کر کھول رہا تھا۔

"مائیکل۔" چھڑی کھول کے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ سیم کیس اسے پکڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر دونوں پارک کی طرف چلنے لگے۔

سفید چھڑی کی ٹک ٹک اور مائیکل کا بنا کسی چیز سے ٹکرائے بڑی سہولت سے آگے بڑھنا' سیم کو حیران کر رہا تھا۔ کسی نابینا شخص کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ اور یہ پہلا اتفاق ہی اس پہ اس تیسری آنکھ کی وضاحت کر گیا تھا' جس کی قوت بینائی اس اندھے کو راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پرکھنے کی طاقت عطا کر رہی تھی۔ یوں کہ وہ اندھا ہو کر بھی اندھا نہیں رہا تھا۔ اور وہ آنکھوں والا ہو کر بھی ٹھوکر کھا گیا تھا۔

پارک میں پہنچ کے سیم اسے لیے ایک بینچ پہ آ بیٹھا تھا۔

"جی سر! اب کہیں۔"

"ایسا ہے مائیکل کہ میرا ایک بہت قریبی دوست ہے۔" سیم نے کھنکھارتے ہوئے بات شروع کی۔

"اس کی زندگی اور شخصیت دونوں میں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن پچھلے دنوں اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ جس کے بعد اس کا زندگی کو دیکھنے کا انداز ہی بدل گیا۔ اس حد تک کہ وہ اپنے اس انداز فکر سے خود ہی گھبرانے لگا۔" مائیکل نے یک لخت ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"آپ اس تبدیلی کو واضح کریں گے؟"

"یعنی اسے اچانک سے ان چیزوں کا بھی احساس ہونے لگا۔ جن کے بارے میں اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ جیسے 'جیسے کہ موت۔'" سیم بے اختیار اٹکا۔ وہ اتنے دنوں میں آج پہلی بار اپنے احساسات کو زبان دے رہا تھا۔ اور اسے بہت عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

اسے یکایک موت سے خاص کر بے بسی 'بے کسی اور تنہائی کی موت سے خوف آنے لگا۔ اپنے فیصلے جن کے بارے میں اسے کبھی کوئی شبہ نہ رہا تھا ان میں اسے ڈھیروں خامیاں نظر آنے لگیں... اپنے نظریات 'اپنی ترجیحات' ہر چیز اسے غلط 'ایک دم بودی لگنے لگیں۔" وہ تھک کر خاموش ہوا تو مائیکل نے گہری سانس لی۔

"یعنی کہ اس کی کامیاب زندگی اچانک گھاٹے کے سودوں سے تعبیر ہونے لگی۔"

"ہاں ایسا ہی ہونے لگا۔" اس نے بوجھل لہجے میں تائید کی۔ مائیکل بے اختیار چونک گیا۔

"ایک بات بتائیں سر۔ یہ سوچیں آپ کے دوست کے لیے پریشان کن سہی۔ لیکن ان کے بارے میں اس کا دل کیا کہتا ہے؟"

"اس کا دل؟" سیم لحظہ بھر کو اٹکا اور پھر جی کڑا کر کے وہ اعتراف کر لیا جو وہ رات تک خود سے کرنے کو تیار نہ تھا۔ "اس کا دل جانتا ہے کہ یہ سوچیں غلط نہیں ہیں۔" اس کی بات پہ مائیکل مسکرا دیا۔

"تو پھر میرے نزدیک آپ کا دوست بہت خوش قسمت ہے سر۔"

"کیا؟" سیم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بالکل سر۔ یہ حادثہ فی الوقت اس کے لیے اذیت کا باعث سہی۔ لیکن یہ وہ برا تجربہ ہے۔ جس نے اسے اس کی غلطیوں کو دیکھنے والی آنکھ عطا کی ہے۔ اسے اس خواب غفلت سے جگایا ہے۔ جس سے اگر وہ نہ جاگتا تو شاید زندگی کی آخری سانس تک غلط راہ پہ چلتا رہتا۔ اپنی غلطیوں کو 'وقت رہتے ہوئے' سدھارنے کا یہ موقع قسمت کتنے لوگوں کو دیتی ہے سر؟" اس نے سوال اٹھایا تو بغور اس کی بات سنتا سیم ساکت ہو گیا۔ اس نہج پہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"ہم اندھوں کو جب ہمارا شعور کوئی سبق سکھاتا ہے سر' تو ہم اس سبق کو گرہ سے باندھ لیتے ہیں' کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو دوبارہ ٹھوکر کھائیں گے... ہم خواہشات کے پیچھے بھاگنا فوراً ہی نہیں کر سکتے سر' ہمارے اندھیرے ہمیں اس بہادری کی اجازت نہیں دیتے اور آپ کی روشنی آپ لوگوں کو ڈرنے نہیں دیتی۔ اور یہی بہادری آپ کی غلطی ہوتی ہے' کیونکہ خواہشات کو پانے کی طلب سب سے پہلے عقل کو مارتی ہے اور عقل کا اندھا آنکھ کے اندھے سے زیادہ بری ٹھوکر کھاتا ہے۔ آپ کا دوست غلط تھا اس لیے یہ ٹھوکر کھائی۔ لیکن اس ٹھوکر نے اس کی عقل کی بینائی لوٹا دی جو سب کو واپس نہیں دی جاتی۔ اس لیے وہ سچ میں ایک خوش قسمت انسان ہے۔ بس اسے چاہیے کہ اس سبق کو اب گرہ سے باندھ لے اور اپنی صحیح سمت کا تعین کر لے۔ کیونکہ قسمت اس کے ساتھ ہر بار اتنی ہی نرمی سے پیش آئے یہ ضروری نہیں ہے۔" اور دم سادھے بیٹھے سیم کے ارد گرد' گزری رات کے اندھیرے میں دستک دینے والی آواز ایک بار پھر گونجنے لگی۔

ٹوٹتا ہے جب جام آرزو
تب در آگاہی کھلتا ہے۔

اور سیم بری طرح چونک گیا۔ "یہ اتنے مشکل الفاظ اسے حرف بہ حرف کیسے اور کہاں سے یاد آگئے

تھے؟ یہ کہاں کی کوڑی کہاں آملی تھی؟" حیرت سے سوچتے ہوئے اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکی تھیں۔ تبھی ایک اور آواز اس کے آس پاس ابھری تھی۔ اس کی اپنی آواز۔

"مطلب؟"

"جس دن اپنی آرزوئیں ' اپنی خواہشات کے پیالے کو توڑ دو گے ' اس دن زندگی تم پر حقیقت کے دروازے کھول دے گی۔" اور وہ نا سمجھی کے عالم میں بولنے والے کا چہرہ تکتے گیا تھا۔

لیکن آج یہاں اس خالی پارک کے بینچ پہ ایک اندھے شخص کے برابر بیٹھے اسے اچانک ان مشکل جملوں کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کر دی گئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے یہ پیالہ خود نہیں توڑا تھا بلکہ قسمت نے خود آگے بڑھ کے اس پیالے کو چکنا چور کر دیا تھا۔ اس کے ہوش میں آنے کا سامان کر دیا تھا۔ تو کیا سچ میں وہ ایک خوش قسمت انسان تھا؟ بے یقینی سے سوچتے ہوئے اس نے مائیکل کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں سر؟" وہ نرمی سے مسکرایا تو سیم کو پہلی بار اس کے چہرے پہ موجود سکون کا احساس ہوا۔ اتنی بڑی محرومی کے باوجود اتنا سکون! ان دونوں کا تل میل وہ بھی ایک ہی چہرے پہ۔ سیم کے اندر ابھرے عجیب سے احساسات جگا گیا تھا۔

"اپنی خوش قسمتی کا یقین کرنا چاہ رہا ہوں۔ یہ حساب لگانا چاہ رہا ہوں کہ میں نے اس کی کیا قیمت ادا کی ہے؟" وہ موت کے منہ سے واپس آیا تھا۔ تب کہیں جا کے آگہی نے اپنا در وا کیا تھا۔ اپنے ساتھ برتی جانے والی اس سختی پہ اس کا دل ملال سے بھر گیا تھا۔

اس کی بات پہ مائیکل نے اک گہری سانس لی۔ وہ شروع میں ہی جان گیا تھا کہ یہ اس کے کسی دوست کا نہیں بلکہ خود اس کا مسئلہ ہے۔

"قیمت؟ آپ کو پتا بھی ہے کہ قدرت غلط کاموں کی تصحیح کن قیمتوں پر کرتی ہے؟" بنا کچھ جتائے اس نے استفہائیہ انداز میں سوال کیا تو سیم کا سر خود بہ خود نفی میں ہل گیا۔

"نہیں۔"

"اگر آپ کی قسمت میں زندگی بھر کی کوئی معذوری نہیں لکھی گئی۔ آپ کے مال و دولت اور رتبے میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور آپ کے پیاروں کو آپ سے چھینا نہیں گیا تو یقین مانیں سر! آپ کو یہ خوش قسمتی قدرت نے یونہی دان کی ہے۔"

اور اس کی بات سنتا سیم ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"واقعی! اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی تاوان کے طور پہ بھرنی پڑ جاتی تو؟" یکایک اسے خود کو ملنے والی تکلیف ایک ہلکا سا جھٹکا لگنے لگی اور ساتھ بیٹھا نوجوان ستر' اسی سالہ درویش۔ بھلا اسے یہ آگاہی کہاں سے ملی تھی؟

"اتنی چھوٹی سی عمر میں تم اتنی گہری باتیں کیسے کر لیتے ہو مائیکل؟" وہ اپنی حیرت کو زبان دینے سے خود کو روک نہ پایا تھا۔ اس کے سوال پہ مائیکل ہنس پڑا۔

"شعور کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا سر۔" اور سیم اپنی جگہ پہ خجل سا ہو گیا۔

"صحیح کہہ رہے ہو۔ ورنہ اس وقت میں تمہارے برابر بیٹھا یہ سوال نہ پوچھ رہا ہوتا۔" اور اب کی بار مائیکل کا قہقہہ بے اختیار گونج اٹھا۔ اس کی ہنسی سیم کو بھی مسکرانے پہ مجبور کر گئی۔

"گھر جائیں سر! اور اگر کسی چیز کا حساب لگانا ہی ہے تو اس بات کا حساب لگائیں کہ اگر آپ نے یہ غلط فیصلے نہ کیے ہوتے تب آپ کیا کھوتے اور کیا پاتے۔ مجھے یقین ہے آپ کو بہت سی الجھنوں کے سرے مل جائیں گے۔" وہ نرمی سے بولا۔

"ہوں۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سیم نے اک گہری سانس لیتے ہوئے ممنون نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "میرے پاس الفاظ نہیں ہیں مائیکل! جن میں ' میں تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔ میری اس تکلیف میں تم نے کس طرح سے میری مدد کی ہے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"آپ کی یا آپ کے دوست کی سر؟" وہ شرارت سے بولا تو سیم لحظہ بھر کو ٹھٹکا اور جیسے ہی اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا' وہ شرمندگی سے سرخ چہرہ لیے ہنس پڑا۔

"میں تمہیں سچ میں کبھی نہیں بھولوں گا بروٹس۔" اس نے مائیکل کے بازو پہ دوستانہ انداز میں مکا مارا۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

"میں بھی سر۔" اور زندگی میں پہلی بار سیم کی آنکھوں میں کسی کے لیے حقیقی ستائش آن ٹھہری تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح "قاضی ولا" میں اپنے ساتھ بوجھل سی خاموشی لے کر طلوع ہوئی تھی۔ گزری رات بہت سے لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ ایسے میں اگلے دن نہ تو گھر میں علی الصبح کی چہل پہل تھی اور نہ ہی ناشتے کی میز پہ معمول کی رونق۔ ہر کوئی خاموشی سے اپنی اپنی پلیٹ پہ جھکا ناشتے میں مصروف تھا۔

"حنان نہیں اٹھا؟" صغیر صاحب نے ملازم کے ہاتھ سے اخبار لیتے ہوئے سوال کیا۔

"حنان صاحب تو صبح ہی چلے گئے تھے صاحب جی۔"

"کہاں گیا ہے؟" صغیر صاحب کے ساتھ باقی سب نے بھی چونک کر ملازم کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں جی۔" اس کی لاعلمی پہ صغیر صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"یہ لڑکا بھی نا۔۔۔ جاؤ فون لے کر آؤ۔" ان کی ہدایت پہ ملازم اگلے ہی لمحے کارڈلیس لے آیا۔

فون ہاتھ میں لے کر انہوں نے حنان کا نمبر ملایا۔ لیکن متواتر بیل کے باوجود جب دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی تو انہیں غصہ آگیا۔

"حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔" فون میز پہ پٹختے ہوئے انہوں نے زیب بیگم کی طرف دیکھا۔

"آپ فکر مت کریں۔ مصروف ہوگا کہیں۔"

"ہاں سارا ملک یہی تو چلا رہا ہے۔" خفگی سے بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے چائے کا کپ اپنی جانب سرکایا۔ ان کے چہرے کا غیر معمولی تناؤ ان کی ذہنی کیفیت کا ترجمان تھا' جسے جائشہ اور نویرہ نے باآسانی محسوس کر لیا تھا۔ مگر کچھ کہنے کی ہمت دونوں میں نہ تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کے وہ تیار ہو کر آفس چلے آئے تھے۔ اپنی پی اے سے دن بھر کا شیڈول سنتے ہوئے بھی ان کا دھیان مسلسل ابراہیم صاحب کی طرف تھا۔ ایسے میں حنان اندر داخل ہوا تو ان کا سارا غصہ اس کی جانب منتقل ہو گیا۔

"کہاں تھے تم؟" پی اے کے کمرے سے نکلتے ہی انہوں نے سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا جو بوجھل قدموں سے چلتا ان کے مقابل آبیٹھا تھا۔

"سائٹ پر تھا۔"

"اتنی صبح وہاں کیا کرنے گئے تھے؟" ان کے سوال پر حنان کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یونہی۔" وہ آہستگی سے بولا تو صغیر صاحب چونک گئے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے قدرے نرمی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" پیپر ویٹ گھماتے ہوئے اس نے نظریں چرائیں۔

"حنان! مجھے مزید پریشان مت کرو۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کچھ نہیں ہوا۔" جھنجلا کر اس نے پیپر ویٹ کو چھوڑ کے ان کی طرف دیکھا۔

"حنان!" ان کے غصے سے ڈپٹنے پر اس نے ایک گہری سانس لی۔

"میں مہر کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں ڈیڈ۔" ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے گویا صغیر صاحب کے اعصاب پہ بم گرا دیا تھا۔

"کیا؟" انہوں نے بے یقینی سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

"میں' میں مہر سے محبت کرنے لگا ہوں ڈیڈ۔" جھجکتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی۔ تو صغیر

صاحب کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" ان کی خشمگیں نظروں کے جواب میں وہ محض شانے اچکا کر رہ گیا۔

"حد ہوتی ہے۔۔۔ کتنی آسانی سے تم نے اتنی بڑی کہہ دی۔ تمہیں معلوم بھی ہے کہ اس فضول گوئی کا کتنا برا نتیجہ نکل سکتا ہے؟" اس کی خود غرضی انہیں مشتعل کر گئی تھی۔

"کوئی برا نتیجہ نہیں نکلے گا۔ اگر آپ اس بات کو اپنی خواہش کہہ کے سب کے سامنے رکھیں گے۔" حنان نے اپنے ارادے سے انہیں آگاہ کیا تو صغیر صاحب بری طرح بدک گئے۔

"ہاں میرا دماغ خراب ہے نا۔ جو میں یہ بات کہہ کر اگلوں کو اپنی نیت پر شک کرنے پہ مجبور کر دوں۔ وہ تو یہی کہیں گے نا۔۔۔" اچانک ان کا موبائل بجنے لگا تو ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسکرین پہ گھر کا نمبر دیکھ کے انہوں نے فون کان سے لگالیا۔

"ہیلو!" لیکن دوسری طرف زیب بیگم کی بھرائی ہوئی آواز سن کے وہ پریشان ہو گئے۔

"سب ٹھیک تو ہے زیبی؟" ان کی بات پہ حنان نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔

"کیا!" دوسری طرف سے تفصیل سن کر ان کے منہ سے فقط یہی نکل پایا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ تم دونوں ڈرائیور کے ساتھ نکلو۔ میں سیدھا ہاسپٹل آتا ہوں۔ کون سے ہاسپٹل میں ہے؟" اور حنان پریشانی سے سیدھا ہو بیٹھا۔

"میں پہنچتا ہوں۔ تم فکر مت کرو۔" انہیں تسلی دیتے ہوئے انہوں نے عجلت میں فون بند کیا۔

"مہر بخار کی حالت میں سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہو گئی ہے۔ اسے ہسپتال لے گئے ہیں کیونکہ اسے ہوش نہیں آرہا۔" جلدی جلدی ٹیبل کی دراز لاک کرتے ہوئے انہوں نے پوری تفصیل حنان کے گوش گزار کی تو وہ بھی گھبرا گیا۔

"او گاڈ۔ کہاں لے کر گئے ہیں اسے؟" جواباً صغیر صاحب نے شہر کے مشہور ہسپتال کا نام لیا تو وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی آپ کی ساتھ چل رہا ہوں۔" اس نے جیب سے گاڑی کی چابیاں نکالیں۔ صغیر صاحب اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چل دیے۔

وہ دونوں ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچے تو زیب اور جائشہ پہنچ چکی تھیں۔ سب کو کوریڈور میں دیکھ کر وہ تیز قدموں سے ان کی جانب چلے آئے۔ انہیں دیکھ کر ابراہیم صاحب اور روتی ہوئی زیب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"مہر کو ہوش آیا؟" قریب پہنچتے ہی صغیر صاحب نے پریشانی سے سوال کیا تو متفکر سے ابراہیم ملک کا سر نفی میں ہل گیا۔

"ابھی نہیں ڈاکٹرز ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"اچھا ہے۔ نہ ہی ہوش میں آئے تو اچھا ہے۔" کرسی پہ بیٹھی انجم اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولیں۔ سب نے بے اختیار پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

"دیکھ لیا اپنی ضد کا نتیجہ آپ دونوں نے میری بچی کو اس حال تک پہنچانے والے صرف اور صرف آپ دونوں ہیں۔" ابراہیم صاحب اور صغیر قاضی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ غصے سے سرخ چہرہ لیے بولیں تو دونوں نے نظریں چرالیں۔ جبکہ زیب بیگم کے آنسوؤں میں شدت آگئی۔

"اب کیوں نظریں چرا رہے ہیں آپ لوگ، کہیں نا ڈاکٹرز سے کہ لگائیں اسے زہر کے انجکشن، تاکہ گلو خلاصی ہو ہم سب کی۔" ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہ ان کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔

"انجم پلیز۔۔۔" ابراہیم صاحب نے ان کا ہاتھ تھامنا چاہا، لیکن وہ بے اختیار پیچھے ہٹیں۔

"مت چپ کروائیں مجھے ابراہیم۔ مت چپ کروائیں۔" ان کی آنکھیں پھر سے برسنے لگیں۔

"آپ کو کیا پتا وہ بچی دن رات کس عذاب سے گزر رہی ہے۔ وہ کتنی تکلیف میں ہے آپ کو کیا خبر!"

"کیوں نہیں۔ سب جانتا ہوں میں تب ہی تو۔۔۔"

"کچھ نہیں جانتے۔ یہی تو افسوس ہے کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔" انہوں نے ایک سلگتی نظر حنان پہ ڈالی۔ تو اس کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔ لیکن چونکہ وہ اس وقت کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اسی لیے خاموش کھڑا ضبط کرتا رہا۔

"بس میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔۔۔ آج کے بعد مہر کی زندگی کا ہر فیصلہ وہ خود لے گی۔ ہم میں سے کوئی بھی اس سے کسی بھی معاملے میں زور زبردستی نہیں کرے گا۔"

وہ دوٹوک لہجے میں بولیں تو ابراہیم صاحب سمیت سبھی خاموش ہو گئے۔ لیکن حنان کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔ اس نے ایک کھا جانے والی نظر انجم بیگم پہ ڈالی اور لب بھینچے تیز قدموں سے کوریڈور کے دوسری جانب آکھڑا ہوا۔

"یہ لڑکی۔۔۔!" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اندر جا کے بیچ میں مہر کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالے۔

☼ ☼ ☼
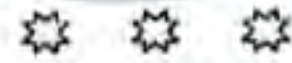
دونوں بازو سر کے نیچے رکھے وہ بیڈ پہ چت لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اسے گھر آئے گھنٹہ ڈیڑھ ہونے کو تھا مگر اس کا ذہن تاحال پارک میں اپنی اور مائیکل کی ہونے والی گفتگو میں پھنسا ہوا تھا۔

اس کے پچھلے کئی دنوں کا ذہنی تناؤ ہوا میں دھواں بن کے غائب ہو گیا تھا۔ اپنی خوش بختی کا احساس اسے اندر سے مضبوط کر گیا تھا۔ اب اسے اپنی سوچ میں آنے والی تبدیلی سے نہ تو گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی انجانا سا خوف۔ بلکہ اپنی اور مائیکل کی گفتگو کو دہراتے ہوئے وہ ماضی کی کتنی ہی باتوں کو بلا جھجک سوچ گیا تھا۔ نکتے سے نکتہ نکلتا گیا تھا۔ اور سود و زیاں کے وہ کھاتے جنہیں مائیکل نے کھولنے کا مشورہ دیا تھا از خود کھلتے چلے گئے تھے۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ آج جس مقام پہ وہ بالکل اکیلا کھڑا تھا وہاں ہر گز نہ ہوتا اگر جو وہ اپنے ماں باپ کے خلاف جا کے سوزی سے شادی نہ کرتا۔ سوزی کے عشق میں اس نے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔ اپنے ماں باپ سے لاتعلقی اختیار کی تھی۔ اپنی ایک الگ ریاست قائم کی تھی جس کا وہ تنہا وارث و مختار تھا۔ لیکن کیا یہ سب اس نے سچ میں صرف سوزی کی خاطر کیا تھا؟ کیا سوزی حقیقت میں اسے اتنی ہی پیاری تھی؟ بیٹھے بیٹھے اس کے دل نے سوال کیا تو سیم نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔

نہیں۔ اس نے یہ سب اپنے لیے اور اپنی محبت میں کیا تھا۔ کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھا، جو اپنا پہلا عشق آپ ہوا کرتے ہیں۔ ان کے لیے اہم ہوتی ہیں تو ان کی خواہشات اور ان کی ترجیحات۔ جن کی اگر نفی کی جائے تو وہ خودسری اور سرد مہری کی انتہاؤں کو پہنچ جاتے ہیں اور ان انتہاؤں پہ انہیں اپنے سوا کوئی یاد نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ سوزی تو بس ایک بہانہ بنی تھی۔ ورنہ اصل جنگ تو اس کی انا کی تھی، جسے اس کے باپ نے چیلنج کرنے کی غلطی کر دی تھی۔ نتیجے میں وہ ہر رشتے کی تمیز بھول گیا تھا۔ وہ بنا سوچے، بنا پرکھے ہر چیز کو برباد کرنے پہ تل گیا تھا۔ صرف اور صرف برباد اور ایسا کرتے ہوئے اسے کتنا سکون، کتنا مزہ آیا تھا۔۔۔ یہ سوچ کر اسے اب شرمندگی ہو رہی تھی۔ بے حد شرمندگی کیا وہ دو انسان جو اس کے ماں باپ تھے اور جنہوں نے اپنی پوری زندگی ۔۔۔ سوائے اس کے گرد چکرانے کے اور کچھ نہ کیا تھا اتنے برے سلوک کے مستحق تھے؟ دل نے دوسرا سوال اٹھایا تو سیم نے مارے اذیت کے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

اور تبھی اس کی بند آنکھوں کے پیچھے اس کا خواب ایک جھماکے سے روشن ہو گیا۔

بھوک، کتے، بھاگتے قدم، مدد کو کھلتا دروازہ، اس کے قدموں کا دہلیز کو چھونا اور اس کا اس مدد کو ٹھکرا دینے کا غلط فیصلہ۔۔۔ یعنی وہ دروازہ۔ وہ پناہ گاہ۔۔۔ آن واحد میں

برل کا گمشدہ حصہ اپنی جگہ پہ آ کے بیٹھا تو سیم کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئیں۔

اس کا مطلب ہے کہ اگر وہ اس دروازے سے اندر داخل ہو جاتا تو خواب اور حقیقت دونوں میں ہر مصیبت سے امان پا جاتا۔ لیکن وہ اس دروازے کو کھلا چھوڑ کے واپس لوٹ آیا تھا۔ بھوکے کتوں کے درمیان، بڑھتے اندھیروں کے درمیان اور بالآخر کچرے کا ڈھیر اس کا مقدر بنا تھا۔ خواب میں بھی اور حقیقت میں بھی۔ یعنی وقت نے اسے اور اس کے فیصلے کو غلط ثابت کر دیا تھا اور اب غور طلب بات یہ تھی کہ اگر وہ غلط تھا تو اس جنگ میں صحیح کون ثابت ہوا تھا؟ اس کے دل نے تیسرا اور اہم ترین سوال اٹھایا تو سیم کو اپنے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"او خدا نہیں! کم از کم یہ نہیں۔" کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے اس جیسا خود پرست شاید اپنے ہوش میں پہلی بار اوپر والے کے سامنے گڑگڑایا تھا۔ لیکن قبولیت کی گھڑی گزر چکی تھی۔ برل مکمل ہو گیا تھا اور تصویر بند پلکوں کے پیچھے بھی واضح تھی۔۔۔ اس کی سب سے بڑی غلطی کی تصویر۔ واضح اور شفاف اس کے سامنے رکھ دی گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

قریباً" ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹرز مہر کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ اس کی ذہنی حالات انہیں خاصی الجھی ہوئی لگی تھی۔ اس لیے انہوں نے اسے نیند کا انجکشن لگا کے سلا دیا تھا۔ ویسے بھی سیڑھیوں سے گرنے سے اسے اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں، سو ڈاکٹرز نے اسے ایک دن مزید اسپتال میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس کے ہوش میں آنے پر حنان کے سوا سبھی نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ اس اطلاع کے بعد حنان وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس کے لیے مزید وہاں رکنا مشکل ہو گیا تھا۔ سوئی ہوئی مہر کے چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پہ لگی چوٹوں کے نشان اور نیل دیکھ کے بھی کا

ملال بڑھ گیا تھا۔ خاص کر صغیر صاحب کا۔ جو اس سارے حادثے کا ذمہ دار خود کو سمجھتے ہوئے بے حد دلگرفتہ ہو گئے تھے۔ زیب، انجم اور ابراہیم صاحب وہ ان تینوں کا سامنا کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ ان کے احساسات سے زیب بخوبی واقف تھیں۔

وہ ان کے شوہر تھے اور وہ ان کے مزاج کے ہر رنگ سے واقف تھیں۔ اس وقت کون سی بات ان کے دل کو لگی تھی، زیب اچھی طرح جانتی تھیں۔ لیکن اس بار وہ چاہ کر بھی ان کا بوجھ نہیں بانٹنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ وہ چاہتی تھیں کہ ان کے اندر اپنے فیصلے کی سنگینی اور بدصورتی کا جو احساس جاگا ہے وہ قائم رہے، تاکہ دوبارہ ان سب کی زندگیاں حنان کے ہاتھوں کھلونا بننے سے محفوظ رہیں۔

✡ ✡ ✡

مارک نے تیسری بار اپنا سیل نمبر ملایا تھا۔ لیکن اس بار بھی مسلسل جاتی بیل کے باوجود جب دوسری طرف سے سیم نے فون نہیں اٹھایا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا ریسیور پریشانی سے کریڈل پہ پٹخ دیا۔

"کیا مصیبت ہے۔" غصے سے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے اس نے اپنی سیکریٹری کو بلایا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں جینی۔ تم پلیز بعد میں مینیج کر لینا۔" وہ اپنی جگہ سے عجلت میں اٹھا اور پھر اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

سیم کے گھر کی طرف گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ خاصا جھنجلایا ہوا تھا۔ یہ ساری سچویشن دن بہ دن اس کے لیے مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ جہاں ایک پل کو اسے لگتا کہ سیم کی طبیعت سنبھل گئی ہے، وہیں اگلے لمحے کوئی نہ کوئی بات اسے اپنی رائے بدلنے پہ مجبور کر دیتی۔ اب بھی اسے رہ رہ کر سیم کے حوالے سے مختلف واہمے پریشان کر رہے تھے۔ ایسی ہی الجھی ہوئی سوچوں میں گھرا وہ بالآخر منزل پہ آ پہنچا تھا۔

سیم کے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر اس نے گھنٹی

بجانے کے بجائے جیب سے چابی نکالی تھی اور دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا تھا۔

"سیم!" پریشانی سے اسے پکارتے ہوئے اس نے ایک نظر خالی لاؤنج پہ ڈالی تھی۔ سرعت سے آگے آتے ہوئے اس کی نظر سامنے موجود میز پہ پڑے اپنے سیل فون سے ٹکرائی تھی۔ اور اسے تھوڑا حوصلہ ہوا تھا۔ شاید وہ اندر ہی کہیں تھا۔

وہ تیز قدموں سے سیم کے بیڈ روم کی طرف بڑھا تھا۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا سیم کو کاؤچ پہ بیٹھا دیکھ کے اس کے دل نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا۔ وہ نجانے کس دھیان میں گم بیٹھا تھا۔

"حد ہوتی ہے لاپروائی کی سیم۔ میں کب سے تمہیں..." بولتے ہوئے وہ اس کے سامنے آیا۔ لیکن جونہی اس کی نظر اس کے چہرے پہ پڑی وہ اپنا جملہ پورا کرنا بھول گیا۔

اس کے چہرے اور آنکھوں کی سرخی اس کے رونے کی گواہ تھی۔

"کیا ہوا سیم، تم ٹھیک تو ہو؟" وہ تیزی سے اس کے نزدیک آیا تو اسے سیم کے سامنے کھلے لیپ ٹاپ کا احساس ہوا۔ جو کہ بالکل نیا تھا۔

"یہ کہاں سے آیا؟" وہ چونکا۔ سیم کا اپنا لیپ ٹاپ تو دیگر چیزوں کے ساتھ چوری ہو گیا تھا۔ تو کیا وہ بازار گیا تھا؟

"میں خرید کر لایا ہوں۔" وہ بھاری آواز میں بولا تو مارک پریشان ہو گیا۔

"تم اکیلے بازار کیوں گئے سیم؟"

"فار گاڈ سیک میکی مجھے بیماروں کی طرح ٹریٹ کرنا بند کرو۔" سرعت سے ٹانگیں سمیٹتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ اٹھا کر کاؤچ پہ رکھا۔

"او کے نہیں کرتا۔" مارک نے اک گہری سانس لی۔ "لیکن مجھے بتاؤ۔ کیا پہلے تم اس طرح بیٹھ کر روئے ہو کبھی؟"

"پہلے زندگی نے میرے منہ پہ حقیقت کا طمانچہ بھی تو نہیں مارا تھا۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا مارک کا ضبط جواب دے گیا۔

"سنو۔ خود سنو۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا یہ نارمل گفتگو ہے؟" اس کے سوال پہ سیم لحظہ بھر کو تھم سا گیا۔

"وہ عورت صرف میرا پیسہ اور میری قیمتی چیزیں چرا کر نہیں بھاگی، بلکہ وہ مجھ پہ میری اوقات اور میری عقل کی حقیقت واضح کر کے بھاگی ہے۔ اس کے جوتے کی نوک نے جب مجھے یہاں۔" سیم نے اپنی پسلیوں کو چھوا۔ "یہاں ضرب لگائی تھی نا تو درد سے زیادہ ذلت کے احساس نے میرے روم روم کو بھگو دیا تھا۔ آنسو، خوف اور درد کا ملا جلا ذائقہ کیا ہوتا ہے یہ اس رات میں نے جانا تھا اور بے بسی کیسی بساند بھری کیفیت کا نام ہے، اس کا احساس مجھے اس کچرے کے ڈھیر پر گر کر ہوا تھا... اور تم کہتے ہو کہ میں پہلے کی طرح نہیں رہا؟"

شدت جذبات سے سیم کی آواز گھٹ سی گئی تھی اور مارک وہ تو جیسے پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔

"ہسپتال کے بستر پہ، گھر کی تنہائی میں، سوتے جاگتے ہر لمحہ، ہر پل میں نے اپنی سو کالڈ کامیاب زندگی میں کامیابی کو پاگلوں کی طرح تلاش کیا ہے۔ اپنا احتساب کیا ہے اور نتیجہ پتا ہے کیا نکلا؛... ٹوٹل فیلیئر (بالکل ناکام) کمپلیٹ لاسٹ (مکمل نقصان)" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "میں زندگی میں اپنی آرزوؤں کے پیالے کو بھرنے میں، اتنا مگن، اتنا گم رہا کہ جب یہ پیالہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹا تو سوائے تنہائی اور تہی دامنی کے میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ میں نے اپنا ہر قیمتی اثاثہ ان بے معنی خواہشات کی نذر کر دیا... دیکھو تم خود دیکھو۔" اس نے کاؤچ پہ رکھا لیپ ٹاپ اٹھا کے مارک کی نظروں کے سامنے کیا۔ تو اس کی ساکت پتلیوں میں جنبش سی ہوئی اور وہ اسکرین پہ جا ٹھہریں۔ ایک سیکنڈ۔ دو سیکنڈ۔ تیسرے سیکنڈ اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل سی گئیں۔

"یہ، یہ تو..." پہچان کا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ وہ

اسکرین پہ موجود چہرے کو دیکھتا حیران رہ گیا تھا۔ حیران اس بات پر نہیں کہ یہ چہرہ اچانک کیسے سامنے آگیا تھا۔ بلکہ اس بات پر کہ وہ چہرہ سیم کے لیپ ٹاپ پہ کیا کررہا تھا۔

"اور یہ' یہ دیکھو۔" مارک کی بات کا جواب دیے بنا اس نے اسکرین پر تصویر کے برابر انگلی رکھی تو مارک کی نگاہیں میکانکی انداز میں مطلوبہ نقطے پہ جا ٹھہریں اور پھر ساکت ہوگئیں۔

"اب پتا چلا میں آج کیوں بیٹھ کر رو رہا ہوں؟" اس نے دلگرفتی سے پوچھا تو مارک کی خاموش نظریں اسکرین سے ہٹ کر سیم کے چہرے پر آٹھہریں۔ اس کا رونا اور اس کی باتیں کچھ بھی اسے اب پہلے کی طرح عجیب اور بے معنی نہیں لگ رہا تھا۔

"میری غلطیوں نے بالآخر مجھے غلاظت کے ڈھیر پہ تنہا لا پھینکا مارک۔ اب میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں یہ غلط فیصلے نہ لیتا تو بدلے میں کیا پاتا۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ حتمی لہجے میں بولتے ہوئے اسے حیران کرگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب مہر نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ اسے بیدار ہوتا دیکھ کر تسبیح کرتی انجم بیگم کا ہاتھ لحظہ بھر کو ساکت ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے انہوں نے خوشی سے بھرپور آواز میں بہن کو پکارا تھا۔

"زیب! مہر اٹھ گئی ہے۔" اور زیب بیگم کا مرجھایا ہوا چہرہ یک لخت کھل اٹھا تھا۔ دونوں بے چینی سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھی تھیں۔ جو چہرے اور آنکھوں میں الجھن لیے ناسمجھی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"مہو... میری جان۔" انجم نے بے اختیار ہو کے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔

"مما جان میں کہاں ہوں؟" اس نے انجم بیگم کا چہرہ تکتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہاری طبیعت تھوڑی خراب ہوگئی تھی۔ اس لیے تمہیں اسپتال لے کر آنا پڑا۔" محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے نرمی سے جواب دیا تو مہر کی نظریں ان سے ہوتی ہوئی زیب بیگم کے چہرے پر جا ٹھہریں جو آنکھوں میں آنسو لیے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ دفعتاً" کمرے کا دروازہ کھول کے ابراہیم صاحب اندر داخل ہوئے تھے اور ان دونوں کو مہر کے سرہانے کھڑا دیکھ کر پریشان ہوگئے تھے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے مہر کی؟" تیزی سے آگے آتے ہوئے انہوں نے سوال کیا لیکن جونہی ان کی نظریں اس کے چہرے سے ٹکرائیں وہ خوشی سے کھل اٹھے۔

"ارے میری بیٹی اٹھ گئی۔" ان کے بے قراری سے آگے بڑھنے پر مہر کی نگاہیں ان کی جانب اٹھی تھیں اور پھر وہیں ساکت ہوگئی تھیں۔

ابراہیم صاحب کا شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پہ آ ٹھہرا تھا اور ایک جھماکے کے ساتھ اس کی خود فراموشی کی کیفیت میں ان کے تند و تیز لہجے کی یاد نے دراڑ سی ڈال دی تھی۔ اس کے دل میں ایک انی سی چبھی تھی۔ اور گزشتہ رات کی ساری اذیت اس کے وجود میں پھر سے آسمائی تھی۔ اس کے چہرے کی بدلتی رنگت نے انجم اور زیب کے ساتھ ساتھ ابراہیم صاحب کو بھی چونکا دیا تھا۔

"کیا ہوا میری جان۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" انہوں نے نرمی سے اس کا گال چھوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو در آئے۔

"کیوں؟ کیوں لائے آپ لوگ مجھے یہاں' کیوں مجھے مرنے نہیں دیا... کیوں؟" ایک جھٹکے سے ان کی جانب سے رخ پھیرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تو ابراہیم ملک کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ جبکہ دونوں خواتین کے آنسو بے اختیاری کے عالم میں بہہ نکلے۔

"نہ میری بچی نہ' اللہ تمہیں ہماری زندگی بھی لگا دے... تمہاری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوگا... سنا تم نے کچھ بھی نہیں ہوگا۔" جھک کر اسے خود

میں سموتے ہوئے انجم بیگم نے تڑپ کر اسے تسلی دی تھی۔ ان کی ممتا بھری آغوش کا احساس پا کے مہر کے آنسو مزید شدت سے بہہ نکلے تھے۔

اسے یوں درد سے نڈھال 'تڑپتا' بلکتا دیکھ کر ابراہیم صاحب کے لیے مزید وہاں رکنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ سرعت سے پلٹے تھے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ مہر کی خفگی اور تکلیف نے ان کا دل جیسے مسل ڈالا تھا۔ وہ راہداری میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر آ کے گر سے گئے تھے۔

یکایک ان کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ اور حلق میں آنسوؤں کا گولا سا آن پھنسا تھا۔ یہ ایک باپ کی بے بسی کی انتہا تھی' جسے دنیا کے سامنے آشکار ہو جانے سے بچانے کے لیے انہوں نے اپنی مٹھی سختی سے لبوں پر جما دی تھی۔ نتیجتاً" لبوں کی لرزش چھپ گئی تھی' بھرم قائم رہ گیا تھا۔ لیکن سینے پر بڑھتے ہوئے بوجھ کے احساس کو خاموشی سے جھیلنا' انہیں ضبط کی کڑی منزل پر لے گیا تھا۔ انہوں نے تو صرف مہر کا بھلا چاہا تھا' لیکن بہتری کی چاہ میں وہ اسے بری طرح چوٹ پہنچا گئے تھے۔ انہیں رہ رہ کر اپنے رویے کی سختی کا احساس ستا رہا تھا۔ مگر اس کے علاوہ ان کے پاس دوسرا کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کے بربادی اور بے آبادی کی طرف بڑھتا بھی تو نہ دیکھ سکتے تھے۔

کاش کہ ان کے بس میں ہوتا تو وہ ماضی میں رونما ہونے والے چند بدصورت واقعات کو کسی حرف غلط کی طرح مٹا دیتے اور اپنے حال کا رخ ہی بدل ڈالتے۔ مگر قسمت کے آگے بھلا کسی کی چلی ہے جو ان کی چل پاتی۔ اپنے ہاتھوں اپنے اور اپنی اولاد کے نصیب میں کون تکلیفیں رقم کرنا چاہتا ہے؟

بے شک حال کی جھولی میں ملال کے بہت سے لمحے ہوتے ہیں۔ بہت سے کاش بہت سے اگر مگر ہوتے ہیں لیکن بہرکیف ہونا وہی ہوتا ہے۔ جو اللہ نے لکھ رکھا ہوتا ہے۔ سو یہاں بھی وہی ہوا تھا جو پہلے سے طے شدہ تھا اور جسے کاتب تقدیر نے انہی حادثات کے ساتھ ان کی قسمتوں میں رقم کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مشینوں میں جکڑے وجود کے گرد ڈاکٹرز' اور نرسیں گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ لیکن بستر پہ دراز عورت کی رنگت پل پل بدلتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹرز مایوس ہو کے خود ہی اس کے پاس سے ہٹ گئے تھے۔ انہیں اپنی جگہ چھوڑتا دیکھ کے شیشے کے پار آنسو بہاتی زیب نے پریشانی سے پاس کھڑے شوہر کا بازو تھام لیا تھا۔ جن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

ڈاکٹرز دروازہ کھول کے باہر چلے آئے تھے۔ انہیں دیکھ کے زیب کو اپنی سانس پل بھر کے لیے رکتی محسوس ہوئی تھی۔

"معذرت کے ساتھ صغیر صاحب! لیکن پیشنٹ کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ آپ لوگ ان سے مل لیں۔" سینئر ڈاکٹر نے تاسف بھرے انداز میں کہتے ہوئے صغیر قاضی کا شانہ تھپتھپایا تھا اور زیب کا ہاتھ اپنے نیم والبوں پہ آن ٹھہرا تھا۔

☼ ☼ ☼

"قاضی ولا" بھانت بھانت کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ جن کے درمیان وہ چپ چاپ بیٹھی تعزیت وصول کر رہی تھیں۔ وہ ہی رسمی جملے' وہی صبر اور حوصلے کی تلقین' وہ ہر آکر بیٹھنے والے کی باتوں اور سوالوں کا جواب بظاہر بڑے حوصلے سے دے رہی تھیں۔ لیکن اندر ہی اندر ان کا دل اس لمحے کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ جب کل وہ لوگ ہسپتال سے جنازہ لے کر گھر آئے تھے اور اس سے ان کا پہلا سامنا ہوا تھا۔ وہ سامنا جس کے ہونے سے وہ سب سے زیادہ وحشت زدہ تھیں۔ ایک ایسے گیارہ سالہ بچے کا سامنا' جو اپنی بیمار ماں کی ہسپتال سے واپسی کا شدت سے منتظر تھا۔ لیکن جسے ایمبولینس سے نکلنے والے کفن میں لپٹے لاشے نے سارے بے یقینی کے گنگ کر دیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں منجمد حیرت اور خوف نے زیب کا دل نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی تھیں تاکہ اسے اپنے سینے سے لگا سکیں۔ لیکن وہ اس وقت ساکت ہو گئی تھیں۔ جب اس نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"آپ نے مجھ سے پرامس کیا تھا نا کہ آپ میری مما کو صحیح صحیح واپس لائیں گی؟" تنفر سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے وہ بولا تو زیب کے ارد گرد موجود کتنی ہی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ جبکہ زیب کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ انہوں نے بے اختیار ہاتھ دوبارہ آگے بڑھا کر اسے تھامنا چاہا لیکن۔۔۔

"چھوڑیں مجھے!" اس کے چلا کر پیچھے ہٹنے پر زیب کا خالی ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔ وہ ایک ٹک اس کی آنکھوں سے برستے نفرت کے شعلے دیکھ رہی تھیں۔ "مجھے پتا تھا آپ بہت بری ہیں۔ پھر بھی میں نے آپ سے پرامس لیا تھا۔۔۔ مجھے لگتا تھا کہ آپ میری مما سے پیار کرتی ہیں۔ اس لیے اپنا پرامس ضرور پورا کریں گی۔ لیکن آپ نے مجھ سے اپنا پہلا ہی پرامس توڑ دیا۔ میں آپ سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ چلی جائیں آپ یہاں سے چلی جائیں!"

وہ آگے بڑھ کے ان کی ٹانگوں کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے لگا تھا۔ اس کا یہ اظہار نفرت زیب کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر گیا تھا۔ آنسو ان کی آنکھوں سے بے اختیاری کے عالم میں بہنے لگے تھے۔

"نہ میری جان نہ۔ ایسے نہیں کرتے بیٹا۔" کتنے ہی ہاتھ اس چھوٹے سے بچے کی طرف بڑھے تھے۔

"چھوڑو مجھے۔ میں نے مما کے پاس جانا ہے۔ مما! مما!" بری طرح مچلتے ہوئے وہ دھاڑیں مار مار کے رو پڑا تھا۔ تو قیتیہ دو مضبوط اور شفیق بازوؤں نے اس کے بلکتے وجود کو متاع حیات کی طرح خود میں سمیٹ لیا تھا۔ انہوں نے پھر کیسے سنبھالا تھا زیب نہیں جانتی تھیں۔ لیکن کل سے وہ منظر ان کے اندر جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ ان ننھے ہاتھوں کی نفرت بھری طاقت نے ان کے وجود کی ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔ وہ اپنی عزیز دوست سے کیا ہوا وعدہ کیسے ایفاء کرنے والی تھیں۔ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"کیا بات ہے؟ اتنی گم صم سی کیوں ہو؟" رات گئے جب وہ گھر، مہمانوں اور بچوں کی مصروفیت سے فارغ ہو کے کمرے میں آئی تھیں تو ان کے دل گرفتہ چہرے اور مسلسل خاموش لبوں نے صغیر صاحب کو سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میں سنی کو کیسے سنبھالوں گی صغیر؟" وہ روہانسی سی ان کی طرف پلٹی تھیں۔ "وہ تو مجھ سے پہلے ہی اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا اور اب تو وہ میری شکل تک دیکھنا نہیں چاہتا۔" بے بسی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے زیب کے آنسو ان کے چہرے پہ پھسل آئے تھے۔

"حوصلہ کرو زیبی۔" صغیر قاضی نرمی سے کہتے ان کے پاس آبیٹھے تھے۔ ان کی جذباتی حالت ان کی اندرونی کشمکش کی غماز تھی۔ صغیر صاحب کا ہاتھ تسلی آمیز انداز میں ان کے شانے پر آٹھہرا تھا۔ "وہ بچہ ہے زیب، اس کا روٹھنا، بہلنا اور منانا کوئی مشکل بات نہیں۔"

"آپ نہیں جانتے صغیر! وہ سمجھ داری کی عمر میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کی اپنی پسند ناپسند ہے۔ کہا تھا یاسمین سے کہ بچوں سے کچھ نہ چھپائے مگر۔۔۔ وہ اپنی چیزوں، اپنے رشتوں کو لے کر عام بچوں سے زیادہ پوزیسو ہے۔ اپنی ماں کی جگہ کسی اور کو وہ کبھی بھی اتنی آسانی سے نہیں دے گا اور پھر اس کا مزاج۔ وہ کتنا ضدی اور من مانی کرنے والا بچہ ہے۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں۔"

وہ ان کی طرف دیکھ کر روتے ہوئے بولیں تو صغیر صاحب نے اک بوجھل سانس لی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ سنی عام بچوں سے زیادہ اڑیل فطرت رکھتا تھا۔ اس کی ماں کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بے حد بگاڑ دیا تھا۔ ایسے میں زیب کے لیے اسے سنبھالنا سچ میں ایک امتحان ثابت ہونے والا تھا، وہ بھی اس صورت میں جب کہ سنی کسی سچائی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ تو کیا انہیں اسے

ساری حقیقت بتا دینی چاہیے تھی؟ پیشانی سہلاتے ہوئے انہوں نے پریشانی سے روتی ہوئی زیب کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن فی الوقت وہ ان کے کہے کی تصدیق کر کے انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"اچھا روؤ تو مت۔ میں خود اسے آہستہ آہستہ پیار سے سمجھاؤں گا۔" انہوں نے نرمی سے ان کی پشت سہلائی تھی۔ لیکن زیب جانتی تھیں کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہونے والا تھا۔ گزشتہ تین ماہ میں وہ اتنا تو جان ہی گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ایئرپورٹ پہ معمول کے مطابق خاصا رش تھا۔ یہاں سے کچھ ہی دیر بعد کراچی کے لیے فلائٹ روانہ ہونے والی تھی۔ جس میں انجم اپنی فیملی کے ساتھ جا رہی تھیں۔ انہیں چھوڑنے کے لیے زیب اور صغیر صاحب بچوں کے ہمراہ آئے ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ انجم مستقل بنیاد پہ یہاں سے جا رہی تھیں اس لیے قدرتی طور پہ سب ہی کے چہرے ملول اور دل اداس ہو رہے تھے۔ زیب کی آنکھیں تو بار بار آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔ وہ آج کل جذباتی طور پہ ویسے بھی بے حد کمزوری کا شکار تھیں۔ ایسے میں اپنے واحد خونی رشتے کی دوری کا احساس انہیں سخت تکلیف پہنچا رہا تھا۔

"آپا! آپ تب جا رہی ہیں جب مجھے آپ کے ساتھ کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔" ان کا ہاتھ تھامے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں تو انجم کی اپنی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔

"اللہ تمہارے شوہر، تمہارے بچوں کو سلامت رکھے۔ تم کیوں اکیلی ہونے لگیں؟" ان کی محبت بھری خفگی پہ صغیر قاضی قصداً ہلکے پھلکے لہجے میں بولے۔

"لیں۔ وہ شوہر کی شکایتوں کے زمرے میں ہی تو رو رو کے کہہ رہی ہے کہ اب وہ اکیلی رہ گئی اور آپ اسے میرا ہی حوالہ دے کر حوصلہ دے رہی ہیں۔" ان کی بات پر سب ہی ہنس پڑے۔ حتیٰ کہ روتی ہوئی زیب بھی مسکرا دیں۔

"ذرا پتا تو چلے میں نے آپ کی کس وقت شکایتیں کی ہیں؟" آنکھیں صاف کرتے ہوئے انہوں نے شوہر کی جانب دیکھا۔

"یہ کیوں نہیں کہتیں بیگم صاحبہ کہ ہم نے آپ کو شکایت کا موقع ہی کب دیا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے ہوشیاری سے سارا کریڈٹ خود لے گئے تو ابراہیم ملک قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔

اسی لمحے کراچی جانے والے مسافروں سے چیک ان کی درخواست کی گئی تو ابراہیم ملک نے آگے بڑھ کے صغیر صاحب کو خود سے لگایا۔

"زیبی کا خیال رکھنا صغیر۔"

"آپ فکر مت کریں بھائی جان۔" وہ مسکرا کر بولے تھے۔

"پریشان نہ ہونا بیٹا، ہم تم لوگوں سے رابطے میں رہیں گے۔" ان کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے جھک کر پاس کھڑی دس سالہ مہر کو چومتے ہوئے گود میں اٹھا لیا تھا۔

"تم سنی اور مہر کے حوالے سے کبھی پریشان مت ہونا۔ وقت آنے پر ہم یہ کام ان شاء اللہ دھوم دھام سے پورا کریں گے۔" ان کی بات پر روتی ہوئی زیب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نیچے جھک کر اس سنہری آنکھوں والے چہرے کو چوم لیا تھا جو بغور سب کو تک رہی تھیں۔

"خالہ کی جان، خالہ کو یاد کرے گی نا؟" اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پہ زیب نے بے اختیار ہو کے اسے پھر سے چومتے ہوئے خود میں بھینچ لیا تھا اور پھر بہت سی دعاؤں کے حصار میں وہ تینوں ان کی نظروں سے دور ہوتے چلے گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

ایئرپورٹ سے واپسی پہ ان کا استقبال ایک ابتر لاؤنج نے کیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے کرسٹل پیسز، پھٹے

ہوئے میگزین اور بکھرے ہوئے کشنوں نے ایک لمحے کے لیے زیب کو دروازے کے پاس ہی بت بنا دیا تھا۔ انہیں راستے میں رکتا دیکھ کے پیچھے آتے صغیر صاحب نے الجھ کر ان کی طرف دیکھا تھا جو جاشی کو گود میں اٹھائے ادھ کھلے دروازے کے وسط میں کھڑی تھیں۔

"کیا ہوا؟" وہ بولتے ہوئے آگے آئے تھے۔ لیکن جونہی انہوں نے ہاتھ بڑھا کے دروازے کو دھکیلا تھا' اندر کے منظر نے انہیں بھی لحظہ بھر کو ساکت کر دیا تھا۔

ان کی موجودگی زیب کا سکتہ توڑنے کا باعث بنی تھی۔ وہ بنا ان کی جانب دیکھے اک گہری سانس لیتی آگے بڑھی تھیں۔ ان کا چہرہ مکمل طور پر پرسکون تھا۔

"شمیم!" انہوں نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں ملازمہ کو پکارا تو صغیر قاضی کی نظریں بے اختیار ان پر آٹھہریں۔ جن کی پیشانی ہر شکن سے بے نیاز تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی انہیں اپنے اندر ملال کے ساتھ ساتھ غصے کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

ان کی پکار پہ پریشان حال ملازمہ دوڑی چلی آئی تھی۔

"سلام بیگم صاحبہ! وہ جی یہ دیکھیں سنی صاحب نے کیا کیا۔"

"کب اٹھا تھا وہ؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے زیب نے بالکل نارمل لہجے میں سوال کیا تو ایک پل کو ملازمہ حیرت سے ان کا منہ تکنے لگی۔ وہ تو ان کے سخت رد عمل کا سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ لیکن یہاں تو۔ تعجب سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے ایک نظر دروازے میں کھڑے صاحب پہ ڈالی تھی۔

"ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی۔"

"سنی۔!" صغیر صاحب کی بابلند پکار پہ جہاں شمیم کی ڈر کے مارے آواز بند ہوئی تھی۔ وہیں زیب بیگم نے گھبرا کے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"کہاں ہے یہ؟ شمیم فوراً لے کر آؤ اسے۔" وہ غصے سے دروازہ بند کرتے آگے آئے تھے۔

"کوئی ضرورت نہیں شمیم۔" زیب نے سرعت سے پلٹتے ہوئے آگے بڑھتی ملازمہ کو روکا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ بچہ ہے وہ۔" وہ صغیر صاحب کی جانب آئی تھیں۔

"تمہیں اس وقت بولنے کی ضرورت نہیں!" ان کے قطعی لہجے پہ زیب نے ان کے تنے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر پلٹ کر شمیم کو بلایا تھا۔

"انہیں باہر لان میں لے جاؤ۔" دونوں سہمی ہوئی بچیوں کو اس کے حوالے کر کے وہ صغیر صاحب کے مقابل آکھڑی ہوئی تھیں۔

"کیا کریں گے آپ۔ ڈانٹیں گے یا ماریں گے اسے؟" ان کے سوال پہ صغیر صاحب کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔

"آپ پلیز سمجھنے کی کوشش کریں صغیر! ہم سب ایک مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔ ایسے میں آپ کے یہ دونوں عمل ہماری مشکل میں سوائے اضافے کے اور کچھ نہیں کریں گے۔ اس بچے کے دل میں اگر ایک بار آپ کے لیے نفرت اور بدگمانی کا بیج جڑ پکڑ گیا تا تو ہم پھر ساری زندگی بھی اگر کوشش کرتے رہیں گے تب بھی اس جڑ کو اس کے اندر سے اکھاڑ نہ پائیں گے۔"

ان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ رسان سے بولیں تو صغیر صاحب کے چہرے پہ سوچ کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ جنہیں محسوس کر کے زیب کا ہاتھ نرمی سے ان کے بازو پہ آٹھہرا۔

"آپ کمرے میں چل کر فریش ہوں۔ میں آپ کے لیے اچھی سی چائے لاتی ہوں۔ پھر ہم مل کر سوچتے ہیں کہ ہمیں اس مسئلے کو کیسے ہینڈل کرنا ہے۔"

ان کے تسلی آمیز انداز پہ صغیر قاضی کے لبوں پہ محبت بھری مسکراہٹ آٹھہری۔ وہ خود دن رات سنی کو لے کر کتنی پریشان تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ لیکن فی الوقت صرف ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو وہ کتنے سلجھے ہوئے انداز میں صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے اس درجہ محبت اور

خلوص پہ صغیر صاحب کو ٹوٹ کے پیار آیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے زیب! تم میری زندگی کا بہترین فیصلہ بنتی جارہی ہو۔" ان کے شانوں پہ ہاتھ جمائے وہ محبت پاش نظروں سے ان کا صبیح چہرہ دیکھنے لگے۔ جس پہ ان کی نگاہوں کی حدت نے گلابی رنگ بکھیر دیا تھا۔

"تمہاری اچھائی اور نرمی کا تو میں بہت پہلے ہی قائل ہو گیا تھا۔ لیکن جس خلوص اور حوصلے سے تم اب میرے گھر کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ واقعی قابل تحسین ہے۔"

"اچھا!" وہ ہونٹوں پہ شرگیں مسکان لیے فقط یہی کہہ سکی تھیں۔ صغیر صاحب نے ان کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔

"بالکل۔ میں حقیقتاً" اللہ کے بعد یاسمین کا شکر گزار ہوں، جس نے میرے لیے تمہارا انتخاب کیا۔" اور ان کی اس درجہ محبت اور عزت نے زیب کی آنکھیں نم کر دیں۔

"یا اللہ مجھے ہمیشہ میرے شوہر کی توقعات پہ پورا اترنے کی توفیق عطا فرمانا۔" اس پل انہیں اپنے کندھوں پہ ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سنی اپنی حرکت اور گھر پہ صغیر صاحب کی موجودگی دونوں سے باخوبی واقف تھا۔ اسی لیے ساری شام اپنے کمرے کے باہر پھٹکا تک نہ تھا۔ زیب کے کہنے پہ شمیم اسے "اس کے کمرے میں ہی رات کا کھانا کھلا آئی تھی۔ لیکن جس وقت وہ اس کے لیے دودھ کا گلاس لے کر جانے لگی تھی تب صغیر صاحب نے اسے منع کر کے خود اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا تھا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" جاشی کو کھانا کھلاتی زیب نے پریشانی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن وہ بنا کوئی جواب دیے ڈائننگ روم سے باہر نکل گئے تھے۔

دروازے پہ دستک کی آواز پر ویڈیو گیم کھیلتے سنی نے پلٹ کر دائیں جانب دیکھا تھا اور شمیم کی جگہ صغیر صاحب کو دیکھ کر اس کی رنگت فق ہو گئی تھی۔ وہ شام میں ان کی غصے بھری پکار سن چکا تھا۔

"دھیان سے بھئی۔ بونا سیڑھیوں سے گر جائے گا۔" وہ اس کے چہرے پہ پھیلا ڈر دیکھ چکے تھے، اسی لیے قصداً" نارمل لہجے میں بولتے ہوئے دروازہ بند کر کے اندر چلے آئے تھے۔

"یہ بونے والا گیم نہیں ہے۔" دھیرے سے کہتا وہ رخ موڑ کے ہاتھ میں پکڑی گیم پر نظریں جما گیا تھا۔

"اچھا تو پھر کون سا گیم ہے؟" دودھ کا گلاس ایک طرف رکھی میز پر رکھ کے وہ بیڈ پہ اس کے برابر آبیٹھے تو سنی نے جھجکتے ہوئے سر اٹھا کے ان کی طرف دیکھا۔

"آپ مجھے ڈانٹنے آئے ہیں کیا؟" بلاشبہ وہ ایک ذہین بچہ تھا۔

"تو آپ جانتے ہو کہ آپ نے غلط حرکت کی ہے۔" اس کے گول مٹول چہرے پہ نگاہیں جمائے صغیر صاحب نے نرم لہجے میں کہا تو سنی کی معصوم آنکھوں میں شرمندگی پھیل گئی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔

"سچ بتاؤں تو میں آپ کو واقعی ڈانٹنے والا تھا۔ لیکن پتا ہے، مجھے کس نے روکا؟" صغیر صاحب نے رک کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"کس نے؟" سنی نے حیرت سے سوال کیا۔

"آپ کی زیب آنٹی نے۔" اور بغور ان کی بات سنتا سنی ایک پل کو خاموش ہو گیا۔ "وہ آپ سے بہت پیار کرتی ہیں بیٹا۔ اس لیے تو آپ کو بھی ان سے پیار کرنا چاہیے۔" انہوں نے اسے بازو کے حلقے میں لیا۔

"لیکن مجھے وہ اچھی نہیں لگتیں۔" اس کے لہجے میں بے زاری در آئی۔

"مگر کیوں؟"

"کیونکہ وہ ہماری فیملی میں گھس آئی ہیں اور اب جاتی ہی نہیں ہیں۔ اوپر سے مما کو بھی ماردیا انہوں نے۔" اس کے چہرے پہ غصے کے ساتھ ملال بھی

پھیل گیا۔

"بُری بات سنی ایسے نہیں کہتے۔" انہوں نے تادیبی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آپ کی مما جب بیمار تھیں تو کتنا خیال رکھتی تھیں وہ ان کا۔"

"ہاں تو پھر ٹھیک کیوں نہیں کیا انہوں نے مما کو؟ کیوں اپنا پرامس توڑا؟" اس نے دوبدو سوال کیا۔ صغیر صاحب اک گہری سانس لے کر رہ گئے۔

"اس لیے بیٹا کہ ٹھیک اللہ پاک کرتے ہیں۔ انسان نہیں۔"

"بس مجھے نہیں پتا۔ آپ ان سے کہیں کہ چلی جائیں یہاں سے۔ ہمیشہ کے لیے چلی جائیں!"

وہ اپنے مخصوص ہٹیلے انداز میں بولا تو صغیر قاضی کتنے ہی لمحے اسے بے بس نظروں سے دیکھتے رہے۔ یوں جیسے سوچ رہے ہوں کہ انہیں کچھ کہنا چاہیے یا نہیں اور پھر آن واحد میں وہ جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ گئے۔

"وہ یہاں سے کہیں نہیں جا سکتیں بیٹا۔" وہ دھیرے سے بولے تو سنی بری طرح جھنجلا گیا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ کیونکہ آپ کی مما انہیں آپ کی نئی امی بنا کر گئی ہیں بیٹا۔"

"کیا؟" سنی کی آنکھیں باپ کے چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔

یہی وہ سچائی تھی جو یاسمین اپنے پیارے بیٹے کو بہت طریقے سے خود بتانا چاہتی تھیں لیکن وقت نے انہیں مہلت ہی نہ دی اور اب یہ چیز زیب کے لیے ایک امتحان بن کر رہ گئی تھی۔

وہ جو اس گیارہ سالہ بچے کے یقین کی کسوٹی پہ پہلے ہی کھری اتر نہ پائی تھیں۔ اس انکشاف کے بعد تو بالکل ہی بے اعتبار ٹھہرا دی گئی تھیں۔ بلکہ ایک وہ ہی کیا سنی تو اپنے باپ تک سے نالاں اور گریزاں ہو گیا تھا۔

ان دو دنوں میں اس نے خود کو کمرے سے اسکول تک محدود کر لیا تھا۔ اسے راضی کرنے کی ہر تدبیر ناکام رہی تھی۔ اس کی یہ ناراضی زیب جیسی نرم اور حساس خاتون کا دل مزید پریشان کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ سنی کی شخصیت پہ کسی قسم کے منفی اثرات نہیں چاہتی تھیں۔ کیونکہ وہ یاسمین سے کیا اس کے بچوں کی بہترین پرورش کا وعدہ ہر حال میں نبھانا چاہتی تھیں۔ ایسے میں انہیں دونوں بچیوں کا ردعمل الگ ہولائے جا رہا تھا جو تاحال حقیقت سے بے خبر تھیں۔ کاش انہوں نے صغیر صاحب سے یہ شادی ہی نہ کی ہوتی۔ لیکن تب کیا ان کے پاس اس سے بہتر کوئی اور راستہ موجود تھا؟

☆ ☆ ☆

"کیا؟" زیب نے سامنے بیٹھی اپنی بچپن کی سہیلی کو یوں دیکھا تھا گویا ان کی دماغی حالت پہ شک ہو۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" ان کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔

"دماغ ہی تو نہیں ٹھیک۔" یاسمین پھیکی سی مسکراہٹ لیے بولیں۔ تو زیب کو بے اختیار اپنے جملے کی غلطی کا احساس ہوا۔

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ شرمندہ ہوئیں۔

"جانتی ہوں تمہارے تمام مطلب۔" یاسمین یک لخت نارمل لہجے میں بولیں۔ زیب نے انہیں دیکھتے ہوئے اک گہری سانس لی۔

"تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو یاسمین؟" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں؟ کیا برائی ہے اس میں؟" وہ بھی مکمل طور پر سنجیدہ ہو گئیں۔

"بات برائی اچھائی کی نہیں ہے۔ تم ہم یہ دیکھو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم اپنے ہی شوہر کی شادی کی بات کر رہی ہو اور وہ بھی مجھ سے! لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم"

"خدانخواستہ میں کوئی غلط یا انوکھی بات تو نہیں کر رہی۔۔۔ بہت سی بیویاں اپنے شوہروں کی خود شادیاں

کرواتی ہیں۔۔۔ کبھی اولاد کے لیے، کبھی اولادِ نرینہ کے لیے اور کبھی یونہی ان کی منشاء پہ انہیں دوسری شادی کی اجازت دے دیتی ہیں۔ اس میں اتنی حیرت یا ناگواری والی بات کیا ہے؟" یاسمین نے سکون سے ان کی طرف دیکھا۔

"مجھے نہیں پتا۔ لیکن میرے لیے اس میں ناگواری والی بات ہے میں احمد کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی۔" وہ نظریں چراتے ہوئے قطعیت سے بولیں۔ یاسمین نے اک گہری سانس لی۔

"احمد بھائی کی جگہ اور کوئی لے بھی نہیں سکتا۔ تمہاری اور ان کی گیارہ سالہ رفاقت تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب وہ تمہارے ساتھ نہیں رہے۔ تمہارے غم نے اماں جان کو ختم کر دیا۔ اب تم ہی بتاؤ اتنی لمبی زندگی کیسے گزارو گی؟"

"کسی طور گزر ہی جائے گی۔ میں بھی کوئی انوکھی بیوہ نہیں ہوئی۔" وہ تلخ ہوئیں۔

"وہ کسی طور کیا ہو گا زیب؟ تم جوان ہو۔ اکلوتی اولاد تمہاری چھوٹی۔ ماں کا تمہاری انتقال ہو گیا۔ باپ بھائی تمہارے کوئی نہیں۔ اکلوتی بہن اور بہنوئی تمہارے دور جانے والے ہیں۔ سسرال والے تمہیں پوچھنے کو تیار نہیں۔ ایسے میں وہ کسی طور کیا ہو سکتا ہے زیبی؟" یاسمین حقائق گنوانے پہ آئیں تو پھر بولتی چلی گئیں۔

"پتا نہیں۔ مجھے نہیں پتا۔" وہ بے اختیار گھٹنوں پہ پیشانی ٹکائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں تو یاسمین نے دکھی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کیوں خود کو بند گلی میں کھڑا کرنے پہ تلی ہوئی ہو زیب۔ دیکھو انجم آپا اور ابراہیم بھائی دونوں تمہاری طرف سے کتنے پریشان ہیں۔۔۔ اماں کے انتقال نے حالات کو یکسر بدل دیا ہے زیبی۔"

"چپ ہو جاؤ یاسمین۔ خدا کا واسطہ ہے چپ ہو جاؤ!" ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے وہ غصے سے چلائیں۔ یاسمین بے اختیار خاموش ہو گئیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ لیکن میرے پروپوزل پہ غور کرنا اور یہ بات یاد رکھنا کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے زیب۔ اشد ضرورت!" ان کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ دھیرے سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور پیچھے زیب دونوں ہاتھوں میں سر گرائے کتنی ہی دیر روتی رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ہفتے کا دن تھا۔ انجم آپا اور ابراہیم بھائی اس کی تنہائی کے خیال سے ویک اینڈ گزارنے اماں کی طرف چلے آئے تھے۔ رات کھانے کے بعد لاؤنج میں گپ شپ کرتے اور ٹی وی دیکھتے ہوئے کافی کا بڑا مزیدار دور چلا تھا۔ جس کے بعد وہ دونوں بہنیں سب کے سونے کے بعد ٹیرس پہ چلی آئی تھیں۔

"ایک بات پوچھوں زیبی؟" ادھر ادھر کی باتوں کے دوران انجم نے اچانک سوال کیا تو زیب قدرے حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"پوچھیں آپا! اس میں بھلا اجازت کی کیا بات ہے؟"

"تم نے یاسمین کے پروپوزل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" ان کے چہرے پر نظریں جمائے وہ دھیرے سے بولیں تو زیب بری طرح چونک گئیں۔

"آپ اس بارے میں جانتی ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ تم سے بات کرنے کے بعد وہ میری طرف آئی تھی۔" ان کے جواب نے زیب کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار کر دیں۔

"پاگل ہو گئی ہے وہ تو۔ یہ کوئی بات ہے بھلا۔"

"زیب! اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔" انجم نے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"پلیز آپا!" زیب نے خفگی سے بہن کی جانب دیکھا۔ جس کا دوسری طرف کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔

"تم جانتی ہو، اس نے صغیر کو بھی راضی کر لیا ہے۔"

"کیا؟" اس انکشاف نے زیب کا رنگ اڑا دیا۔ وہ

کتنے ہی پل بولنے کے قابل ہی نہ رہیں۔
"اف میرے اللہ! میں اس شخص کا سامنا اب کیسے کروں گی!" سر تھامتے ہوئے ان کی آواز مارے بے بسی کے بھر آئی۔
"اس میں ایسی کیا بات ہے۔ کوئی تم نے خود تو اپنا پیغام اسے نہیں بھجوایا۔"
انجم قصداً" سختی سے بولیں تو زیب نچلا لب دانتوں تلے دبائے رخ پھیر گئیں۔ انجم نے بے اختیار اک گہری سانس لی۔ وہ ان کی دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر سکتی تھیں۔
"دیکھو زیبی! تم ایک بار حالات کو یاسمین کی نظر سے بھی دیکھو۔ وہ ایک ایسی عورت ہے، جس کا کینسر آخری اسٹیج پہ پہنچ چکا ہے۔ میکے میں اس کی چار بھاوجوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ صغیر اپنی فیملی میں اکلوتا ہونے کی وجہ سے تن تنہا ہے۔ ایسے میں اگر وہ منطقی ہو کے سوچ رہی ہے اور اپنی زندگی میں ہی اپنے دونوں بچوں کو محفوظ اور قابل بھروسہ ہاتھوں میں سونپنا چاہتی ہے تو کیا غلط ہے؟ کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ چاہے صغیر آج بیوی کا دم کیوں نہ بھرے، لیکن بہر کیف وہ آنے والے وقت میں اتنے چھوٹے بچوں اور گھر کو تنہا تو نہیں سنبھال سکتا؟ اور یاسمین میں کسی انجانی عورت کو اپنے بچے سونپنے کا حوصلہ نہیں۔۔۔ ارے میں تو سلام کرتی ہوں اس کی بہادری اور اس کی ہمت کو، جو اتنے حوصلے سے آنے والے وقت کی تیاریاں کرتی پھر رہی ہے۔ ورنہ کسی عورت میں اتنی دوراندیشی اور دل گردہ ہوا کرتا ہے؟"
زیب کے بازو پہ ہاتھ رکھے وہ نرم لہجے میں تصویر کا دوسرا رخ ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔ تو نا چاہتے ہوئے بھی زیب کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہو گیا اور وہ بہن کی طرف دیکھنے لگیں۔
"زیبی میری جان یہ اس کا تمہاری ذات پہ بھروسہ اور محبت ہی ہے، جو وہ تم میں اپنا آپ دیکھ رہی ہے۔ سوچو ذرا کتنا کڑا وقت ہے اس پر، جو اپنی زندگی میں اپنے بچوں کے لیے اپنا متبادل ڈھونڈ رہی ہے۔ ایسے میں اگر اس کا دل تمہاری جانب مائل ہوا ہے تو بحیثیت ایک عورت اور انسان کے یہ تمہارے لیے کتنے فخر کی بات ہے۔ وگرنہ اس کے خاندان یا صغیر کی فیملی میں بہنوں، بیٹیوں کی کمی ہے کیا؟ اور پھر وہ صرف اپنا ہی نہیں بلکہ تمہارا بھی بھلا چاہ رہی ہے، اس کے گھر کو اگر تمہاری ضرورت ہے تو تمہیں بھی اس گھر کی ضرورت ہے زیبی۔" ان کا ہاتھ تھامے انہوں نے رسان سے کہا۔
زیب کی نظریں بے اختیار جھک گئیں۔
"اور میری اولاد! اس کا کیا ہو گا؟" زیب نے پسپا سے لہجے میں سوال کیا تو انجم کے لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولیں۔
"تم نے کیا انہیں اتنا ہی خود غرض سمجھ رکھا ہے؟ یاسمین اور صغیر دونوں کا یہی کہنا ہے کہ وہ تم سے پہلے تمہاری اولاد کو قبول کریں گے۔" اور زیب خاموشی سے بہن کو تکنے لگیں۔
"اور اگر ہماری اولادوں نے ہی اس تبدیلی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو؟" اور اتنی دیر میں پہلی بار انجم جواباً" کچھ بول نہ پائی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"بچوں کو کوئی کچھ نہیں بتائے گا۔"
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے یاسمین؟" انجم نے اچنبھے سے یاسمین اور ان کے برابر بیٹھے صغیر قاضی کی طرف دیکھا۔ "بچوں کو ذہنی طور پہ تیار کرنا بہت ضروری ہے۔"
"ایک بات بتائیں آپا، ہم بچوں کو کیا کہہ کر تیار کریں گے۔۔۔ دوسری ماں یا سوتیلا باپ؟ اس تعارف کے بعد آپ ہی کہیں بھلا کوئی بچہ ذہنی طور پہ کبھی تیار ہو پائے گا؟" یاسمین نے ان کی جانب دیکھا تو وہاں موجود سبھی افراد خاموش ہو گئے۔
"کہہ تو آپ بالکل ٹھیک رہی ہیں یاسمین۔" ابراہیم صاحب نے بے اختیار ان کی تائید کی۔ "لیکن پھر یہ سب کیسے ہو گا؟"

"بھائی جان میں چاہتی ہوں کہ بچے ایک دوسرے کو اور زیب اور صغیر کو خود پرکھیں اور قبول کریں۔ زیب کا تعارف میں اپنے گھر میں اپنی پیاری دوست کی حیثیت سے کروانا چاہتی ہوں اور میرے خیال سے زیب کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ بچے ایک بار جب سب سے مانوس ہو جائیں گے اور آپس میں گھل مل جائیں گے تو ہمارے لیے انہیں سمجھانا اور ان کے لیے ان رشتوں کو دل سے قبول کرنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔"

"صحیح کہہ رہی ہو۔ ساری بات ہی دل سے قبول کرنے کی ہے۔" انجم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرے خیال میں یاسمین ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔ بچے بہت چھوٹے تو ہیں نہیں۔ اس لیے ان پر اتنی بڑی تبدیلی مسلط کرنے کے بجائے انہیں رفتہ رفتہ خود ہی اس کا حصہ بننے دیا جائے۔"

اور پھر یہی ہوا تھا۔ بچوں کے علم میں لائے بغیر زیب، صغیر قاضی اور یاسمین صغیر، تینوں ایک دوسرے کی زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ اس نئی تبدیلی کو دونوں بچیوں نے بڑی خوشدلی سے قبول کیا تھا اور جلد ہی آپس میں گھل مل گئی تھیں۔ لیکن سنی جیسے ضدی اور بونز سوچے کے لیے اپنے گھر میں دو اجنبیوں کی آمد کو قبول کرنا ہرگز آسان نہ تھا۔ وہ ہر چوتھے دن اپنی ماں سے ان کی واپسی کے متعلق سوال کرنے بیٹھ جاتا تھا۔ جواباً یاسمین اسے مسلسل ٹوکتی اور سمجھاتی رہتی تھیں۔ زیب بھی اس کے قریب آنے کے مختلف حیلے بہانے تلاش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن سنی کو قائل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ یاسمین کا بے حد لاڈلا اور بگڑا ہوا تھا۔

پھر ایک روز یاسمین کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ ان کا مرض دنوں میں شدت اختیار کر گیا تھا۔ ہر چیز پس پشت چلی گئی تھی۔ یاد رہ گئی تھی تو صرف یاسمین کی ذات جو بہت تکلیف میں تھی۔ ایسے وقت میں زیب نے ایک بہن کی طرح اپنی سہیلی کو سنبھالا تھا۔ ان کی دن رات کی خدمتوں نے خاندان کے ان تمام لوگوں پر یاسمین کے فیصلے کی درستی کو ثابت کر دیا تھا، جنہوں نے صغیر قاضی کی دوسری شادی کی مخالفت کی تھی۔

ماں کی طبیعت خرابی سے سہم کر سنی نے بھی زیب کی ممتا بھری آغوش میں پناہ لی تھی۔ اس نے زیب سے وعدہ لیا تھا کہ وہ جلد اس کی ماں کو ہسپتال سے ٹھیک کروا کے گھر لے آئیں گی وہ ماں کے مرض کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن یاسمین کی موت نے زیب کو اپنا وعدہ نہیں نبھانے دیا تھا۔ وہ سنی کی خواہش پوری نہ کرپائی تھیں اور اس کی معصوم نظروں میں جھوٹی اور بے اعتبار ٹھہری تھیں۔ لیکن صغیر صاحب کے اس انکشاف کے بعد کہ وہ اس کی ماں کے عہدے پہ فائز ہو چکی' زیب کو اس کی معصوم نگاہوں سے چھلکتی نفرت میں اپنے لیے ایک اور ٹائٹل نظر آیا تھا۔ وہ ٹائٹل جو وہ جانتی تھیں کہ اب ساری زندگی نہیں بدلنے والا۔ خواہ وہ کچھ بھی کرلیتیں۔ اور وہ لقب تھا ایک غاصبہ کا۔ ایک ایسی عورت، جس نے اس کی ماں کے بعد اس کے باپ اور اس کے گھر پہ قبضہ کرلیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مت روئیں، اللہ نے چاہا تو آہستہ آہستہ حالات نارمل ہو جائیں گے۔" زیب فون کان سے لگائے انجم سے بات کر رہی تھیں۔ ان کی تسلی پہ انہوں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔

"مجھے نہیں لگتا آپا۔ پندرہ دن ہو گئے ہیں اس بچے نے مجال ہے، جو مجھ سے ایک جملہ بھی کہا ہو۔۔۔ اتنے چھوٹے سے بچے کا اتنا شدید ردعمل' اتنی ضد' میں تو حیران رہ گئی ہوں۔"

"صغیر کیا کہتا ہے اس بارے میں؟"

"وہ تو خود پریشان ہو گئے ہیں اس کے رویے کی قطعیت سے بڑی مشکل سے جا کے تو اس نے ان سے بات چیت شروع کی ہے۔" زیب کی بات پہ انجم بھی پریشان ہو گئیں۔

"تم لوگ کسی سائیکالوجسٹ کی مدد کیوں نہیں لیتے؟"

"میں تو یہ بات صغیر سے نہیں کہہ سکتی آپا!" وہ دھیمے لہجے میں بولیں تو انجم بھی چپ ہو گئیں۔

"اچھا چھوڑیں ان باتوں کو۔ آپ وہاں کی سنائیں؟ دل لگ گیا آپ کا؟"

"کیسا دل اور کہاں کا لگنا۔ ابراہیم جو صبح سے جاتے ہیں تو شام میں اور کبھی کبھار تو رات میں واپس آتے ہیں۔ ہم دونوں سارا دن گھر میں ہوتے ہیں۔ بہت ہوا تو پارک تک چلے گئے۔ یا قریبی مارکیٹ تک، نہ کوئی جان نہ کوئی پہچان۔ ہاں ویک اینڈ پہ ابراہیم ہمیں گھمانے پھرانے لے جاتے ہیں۔"

"اس کے ایڈمیشن کا کیا بنا؟" زیب نے سوال کیا۔

"ابھی فارملیٹیز ہیں۔ کچھ ٹائم لگے گا۔ تب تک میں اسے گھر پہ ہی پڑھا رہی ہوں۔"

"یہ اچھا کر رہی ہیں۔ اس کے کوئی دوست وغیرہ بنے؟"

"ہاں ایک دو بچے ہیں آس پڑوس میں۔ لیکن یہاں کا ماحول اُف میری توبہ! میں تو کہتی ہوں ابراہیم سے پتا نہیں کہاں آ پھنسے ہیں ہم۔" انجم کے لہجے کی بیزاری نے زیب کو مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔

"آپ جہاں پھنسی ہیں نا وہاں پھنسنے کے لوگ خواب دیکھتے ہیں۔"

"چھوڑو، ہوں گے کوئی سطحی قسم کے لوگ۔ میرے تو نہ ایسے کوئی خواب تھے اور نہ آرزو۔ یہ تو تمہارے بھائی کو دوست کے ساتھ کاروبار کی دُھن یہاں تک کھینچ لائی ورنہ اگر میرا بس چلے تو منٹ نہ لگاؤں واپسی میں۔"

"کسی نے صحیح کہا ہے انسان کسی حال میں خوش نہیں۔" زیب بے اختیار ہنس پڑیں۔

"یہ تو ہے۔" انجم بھی مسکرا دیں۔ "اچھا زیبی باہر دروازے پہ دستک ہو رہی ہے۔ میں رکھتی ہوں۔"

"او کے آپا! اپنا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔" دوسری طرف سے بھی الوداعی کلمات کہنے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا گیا تو زیب کریڈل پہ فون رکھتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تب ہی لاؤنج کا داخلی دروازہ کھول کے صغیر قاضی اندر چلے آئے۔ وہ خاصی عجلت میں تھے۔

"زیبی! فٹافٹ میرا بلیک ڈنر سوٹ نکال دو۔ مجھے ایک بزنس ڈنر پہ جانا ہے۔"

"اچھا جی آپ فریش ہوں، میں نکالتی ہوں۔" وہ ان کے پیچھے چلتی سیڑھیاں چڑھ گئیں۔

انہیں کمرے میں گئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی، جب بچوں کی چیخ و پکار پہ وہ دونوں گھبرا کے باہر نکل آئے۔ شور کی آوازیں سنی کے کمرے سے آتی سن کر وہ اس کے کمرے کی جانب بھاگے۔ جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے میں آنے کی؟" سنی، جاشی کے ساتھ کھڑی دس سالہ بچی کو گھور رہا تھا۔ جس کی رنگت مارے خوف کے زرد پڑ گئی تھی۔ بے اختیار صغیر صاحب نے آگے بڑھنا چاہا تھا۔ لیکن نجانے کس احساس کے زیرِ اثر زیب نے ان کا بازو تھام کر انہیں سر کے اشارے سے اندر جانے سے منع کر دیا تھا۔

"وہ بھائی! لاؤنج میں آپ کا گیم پڑا تھا۔ ہم وہ آپ کو دینے آئے تھے۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا تو سنی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"نہیں ہوں میں تمہارا بھائی، سمجھیں!" دانت پیستے وہ آگے آیا تو وہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بے اختیار آنسو جمع ہونے لگے۔

"مت کریں بھائی۔ کیوں ڈانٹ رہے ہیں آپ اسے؟" سات سالہ جاشی نے سنی کی پیچھے سے شرٹ کھینچی۔

"تم چپ کرو!" اس نے پلٹ کر غصے سے جاشی کو گھر کا۔ "خبردار جو تم نے اس گندی لڑکی کی سائیڈ لی!"

"لوں گی وہ فرینڈ ہے میری۔" جاشی بھاگ کے دوسری طرف اس کے برابر آ کھڑی ہوئی۔

"کوئی فرینڈ نہیں ہے یہ تمہاری۔ یہ تمہاری اسٹیپ سسٹر ہے۔" سنی نے غصے سے بہن کو گھورتے

ہوئے کہا تو اس کے منہ سے "اسٹیپ سسٹر" کا لفظ سن کے جہاں زیب ہکا بکا رہ گئیں وہیں صغیر صاحب کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"جھوٹ بول رہے ہیں یہ۔ میں تمہاری کوئی اسٹیپ سسٹر نہیں ہوں جاشی۔" اس نے تڑپ کر اس گندے الزام کو خود پہ سے ہٹایا تھا۔ بھلا وہ کوئی سنڈریلا کی اسٹیپ سسٹرز جیسی تھی.... بدصورت، چالاک اور بری۔

"ہونہہ! بلکہ صرف تم ہی نہیں بلکہ تمہاری امی بھی اسٹیپ مدر ہیں، ہماری!" سنی کی بات پہ زیب اور صغیر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پلٹ کے دیکھا تھا۔ جبکہ اندر موجود بچی اس نئے الزام پر تڑپ اٹھی تھی۔

"کوئی نہیں جی۔ میری امی بہت اچھی ہیں۔ وہ کسی کی اسٹیپ مدر نہیں۔" اس نے غصیلی نظروں سے سنی کو دیکھا۔

"ہاں جی، زیب آنٹی بہت اچھی ہیں۔" جاشی نے فوراً تائید کرتے ہوئے اپنی سہیلی کا بازو تھاما۔ دوست کا سہارا ملتے ہی وہ بچی یک لخت بہادر ہو گئی۔

"آپ خود ہوں گے اسٹیپ برادر گندے، برے اور...." اگلے ہی پل غصے میں کھولتے سنی کا ہاتھ گھوما اور اس کے چہرے پہ چٹاخ کی آواز سے تھپڑ پڑا۔ تھپڑ لگتے ہی وہ پھپک کے رو پڑی اور صغیر صاحب ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے سرعت سے اندر چلے آئے۔

"سنی!" تنبیہی انداز میں اسے پکارتے ہوئے انہوں نے آگے بڑھ کے اس روتی ہوئی گڑیا کو گود میں اٹھا لیا۔ "آپ کی ہمت کیسے ہوئی بہن پہ ہاتھ اٹھانے کی؟" وہ اسے گھورتے ہوئے دھاڑے تو جاشی بھاگ کر زیب کی ٹانگوں سے جا لپٹی۔ زیب کا ہاتھ بے اختیار اس کے سر پہ آ ٹھہرا۔ جبکہ نگاہیں اندر کمرے میں جمی تھیں۔

"کوئی نہیں ہے یہ میری بہن۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتا وہ ڈھٹائی سے بولا تو صغیر صاحب کا ضبط جواب دے گیا۔

"بدتمیزی کرتے ہو!" انہوں نے آگے بڑھ کے اس کے بازو کو ایک جھٹکا دیا تو وہ بے اختیار رو دیا۔ زیب فوراً جاشی کو ایک طرف کرتی اندر چلی آئیں۔

"صغیر! کیا کر رہے ہیں آپ؟" انہوں نے سرعت سے روتے ہوئے سنی کو اپنی جانب کھینچا۔ لیکن وہ ان کی گرفت میں بری طرح مچلنے لگا۔

"چھوڑیں مجھے۔ نہیں آنا میں نے آپ کے پاس۔"

"سنی!" صغیر صاحب غصے میں کھولتے آگے کو آئے۔ انہیں بڑھتا دیکھ کے زیب نے سنی کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ روتا ہوا کمرے سے باہر بھاگ گیا اور پیچھے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

"لائیں اسے مجھے دیں۔ آپ کو دیر ہو رہی ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد زیب نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا تو صغیر صاحب نے ان کے ہاتھوں کو نظرانداز کرتے ہوئے گود میں اٹھائی گڑیا کا چہرہ چوما۔

"میں فی الحال اپنی بیٹیوں کو آئس کریم کھلانے لے جا رہا ہوں۔ تم چلو گی؟" اور زیب نے اپنے شریک سفر کے پرخلوص چہرے کو تکتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"لیکن سنی کے لیے یاد سے پیک کروا کے لائیے گا۔" وہ دھیرے سے بولیں تو صغیر قاضی بے اختیار مسکرا دیے۔ وہ واقعی ان کے بچوں کی بہترین ماں تھیں۔

☆ ☆ ☆

وقت چند ماہ آگے سرکا تھا اس تکلیف دہ انکشاف کے بعد کہ سنی کے ذہن میں سگے اور سوتیلے کا فرق واضح طور پہ موجود ہے، صغیر صاحب اور زیب نے خود بٹھا کے دونوں بچیوں کو ان دونوں کے درمیان موجود ایک اور پیارے سے رشتے کا احساس دلایا تھا۔ انہیں یہ بتایا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی صرف سہیلیاں ہی نہیں بلکہ بہنیں بھی ہیں اور وہ سب ایک ہی فیملی کا حصہ ہیں۔ جس میں صغیر صاحب سب کے ڈیڈی اور زیب سب کی امی ہیں۔

زیب کے مشورے پہ صغیر قاضی شہر کے مشہور سائیکالوجسٹ کے پاس منی کا مسئلہ لے کر گئے تھے۔ ان کے مشوروں سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ باپ اور بہن کے ساتھ ٹھیک سلوک کرنے لگا تھا جبکہ زیب کے لیے اس کے انداز میں خاموشی اتر آئی تھی۔ اس کی اتنی سی تبدیلی پر ہی ان دونوں نے سکھ کا سانس لیا تھا اور ابھی ان کے درمیان ایک اور خبر ہلچل مچانے آ گئی تھی۔

"کیا؟" صغیر صاحب نے خوشگوار حیرت سے منہ لٹکائے بیٹھی زیب کی طرف دیکھا۔

"جی۔ میری رپورٹ پازیٹو ہے۔"

"او میرے خدا! اتنی خوشی کی خبر۔ اور تم اتنا بُرا سا منہ بنا کے بیٹھی ہو؟" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ان کے قریب چلے آئے۔

"آپ سمجھ نہیں رہے۔ میں بہت عجیب سا فیل کر رہی ہوں۔ اتنے عرصے بعد۔"

"اوں ہوں۔" صغیر صاحب نے بے اختیار ان کے لبوں پر انگلی رکھ دی۔ "اللہ پاک ہم پہ مہربان ہوا ہے زیب۔ اس کی ناشکری مت کرو۔" اور زیب چاہ کر بھی مزید کچھ نہ کہہ پائیں۔

"ہمارا ساتھ مکمل کرنے کے لیے شکریہ۔ میں سچ میں بہت، بہت خوش ہوں۔" فرط جذبات میں انہوں نے مسکراتے ہوئے انہیں خود سے لگا لیا تھا۔ ان کی اس درجہ خوشی اور اطمینان پر زیب صغیر کا دل بھی اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

نیویارک شہر میں یہ ایک عام سا نائٹ کلب تھا۔ جہاں قانونی اور غیر قانونی سبھی کام ہوتے تھے اور اس جیسے ایڈونچر کے شوقین کم عمر لڑکے کو یہاں کی غیر قانونی شہرت ہی کھینچ کے لائی تھی۔ وہ اپنے تینوں دوستوں کے بلاوے پہ، جن کی عمریں تیرہ چودہ کے لگ بھگ تھیں۔ آج پہلی بار اپنے ماں باپ سے چھپ کے ایسے کسی ایڈونچر پہ نکلا تھا اور اندر پہنچ کے

اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں' وہاں موجود حسیناؤں کے حلیے دیکھ کے وہ کتنی دیر کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے کھلے منہ اور پھٹی آنکھوں کو دیکھ کے بغور اس کی حالت زار کا جائزہ لیتے' اس کے تینوں دوست ہاتھ پہ ہاتھ مار کر قہقہہ لگا کے ہنس پڑے تھے۔

"منہ تو بند کر لو یار' کہیں مکھی نہ چلی جائے۔" اس کے ایک دوست نے شرارت سے آگے بڑھ کے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے اوپر کیا تو باقی دونوں لڑکے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ جبکہ وہ خود اپنے حواسوں میں لوٹ آیا۔

"واؤ!" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکتے ہوئے پہلے اپنے دوستوں کی طرف اور پھر دوبارہ سامنے اسٹیج کی جانب دیکھا۔ "میرا مطلب ہے۔۔۔" اس نے نگاہیں ہٹائے بغیر کوئی اور تعریفی کلمہ سوچنا چاہا۔ مگر جب ذہن ساتھ نہ دے پایا تو فقط کندھے اچکا کر ہی کہہ سکا۔

"جسٹ واؤ مین!" اور وہ تینوں ایک بار پھر گلا پھاڑ کے ہنس پڑے۔

"ابھی سے واؤ مت کہو' ابھی تو تمہیں بہت کچھ دکھانا اور چکھانا ہے۔" اور سیم کی آنکھوں میں انوکھی چمک اتر آئی۔ وہ کسی کٹی تتلی کی طرح اپنے دوستوں سے بندھا بھٹکتے اور بہکتے لوگوں کو مشتاق نظروں سے تکتا' ایک جانب بنے لمبے سے بار کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"کیا لو گے تم؟" وہاں موجود پینے والوں کو ایک طرف ہٹاتے' وہ چاروں کاؤنٹر کے ساتھ آلگے تو اس کے دوست نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے کیا پتا۔ میں نے پہلے کب پی ہے۔" اور اس کا دوست تاسف سے سر ہلاتا بیرے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جبکہ سیم دلچسپی سے سامنے دیوار کے ساتھ سجی بوتلوں کو دیکھنے لگا۔ تبھی ایک خیال آنے پر وہ اپنے دوسرے دوست کی جانب جھکا۔

"یہ لوگ ڈرگز وغیرہ کہاں رکھتے ہیں؟" تیز میوزک کی وجہ سے وہ اس کے کان میں گھسا۔

"وہ اندر چھپا کے بیچی جاتی ہیں۔"

"ہم بھی لیں؟" اس نے اشتیاق سے کہا تو اس کے دوست نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ کوئی نادان بچہ ہو۔

"تمہارے پاس اتنے پیسے ہیں؟" اور سیم بے اختیار شرمندہ ہو تا سیدھا ہو گیا۔

بیرے نے ان کا آرڈر لا کے ان کے سامنے رکھا۔ تو سیم کی پوری توجہ' سارا اشتیاق شیشے کے اس بڑے سے گلاس پہ مرکوز ہو گیا' جس کی باہری سطح پہ مشروب کی ٹھنڈک کے باعث پانی کے قطرے پھسل رہے تھے۔ جبکہ اندر بھرے سنہری براؤن مائع پہ اسے لمحہ بھر کو کہانیوں میں سنے طلسماتی سنہری پانی کا گمان ہوا تھا۔۔۔ برائی واقعی بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ اس کے دل نے بے اختیار اس کے باپ کے منہ سے سنے جملے کی تصدیق کی تھی۔ اس سے نظریں چرانا بڑے بڑوں کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تو پھر ایک کچی عمر کا بچہ تھا۔

"واؤ! کتنا خوب صورت ہے یہ۔" اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا تھا۔ اس نے بھلا یہ نظارہ کب دیکھا تھا۔

"کیا یہ گلاس؟" اس کے دوست نے حیرت سے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پہ وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

"پاگل ہو تم۔ بالکل پاگل!" اس کے شانے پہ ہاتھ مارتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کے سامنے پڑا گلاس اٹھا کر ہوا میں بلند کیا۔

"ٹو سیم!" اس کے پر جوش نعرے پہ ان تینوں نے بھی اپنے اپنے گلاس اٹھا کے ہوا میں اونچے کیے۔

"ٹو می!" مسکراتے لبوں کے ساتھ اس کی آواز ان تینوں کی آواز میں شامل ہوئی تھی۔ اور پھر اس نے اس چمکتے مشروب کا بڑا سا گھونٹ اپنے اندر اتارا تھا۔ مشروب کی تیزی نے بڑی سرعت سے اس کے حلق میں سفر کیا تھا۔ اسے بڑی زور کا ٹھسکا لگا تھا۔ اس کی حالت زار پہ ایک بار پھر اس کے دوستوں کی ہنسی بے اختیار گونجی تھی۔

"ویلکم ٹو دا ورلڈ آف یور ڈریمز مائی فرینڈ!"

(تمہارے خوابوں کی دنیا میں تمہیں خوش آمدید میرے دوست!) ہنستے ہوئے اس کے دوست نے بری طرح کھانستے سیم کی پشت پہ ہاتھ مارا تھا۔

☆ ☆ ☆

صبح کاذب کا وقت تھا جب زیب کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ صغیر صاحب نے ایمرجنسی میں اپنی خالہ کو فون کر کے بچوں کے پاس آنے کے لیے کہا تھا اور خود زیب کو ہسپتال لے کر بھاگے تھے۔ ایسے میں سنی جب اسکول کے لیے اٹھا تھا تو گھر میں دادی جان اور ملازموں کے سوا کسی کو نہ پا کے وہ فردوس بیگم کے پاس چلا آیا تھا۔

"سب کہاں ہیں دادی جان؟"

"تمہاری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیٹا۔ اس لیے تمہارے ڈیڈی انہیں ہسپتال لے کر گئے ہیں۔" فردوس بیگم نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ہسپتال اور طبیعت خرابی کا سن کے سنی کی آنکھوں میں یک لخت چمک سی اتر آئی۔

"کیا وہ بھی مرنے والی ہیں دادی جان؟" اس نے اشتیاق سے سوال کیا تو فردوس بیگم بے اختیار دہل گئیں۔

"اللہ نہ کرے بیٹا۔ وہ تو تمہارے لیے نئے بہن بھائی لینے گئی ہیں۔" انہوں نے اسی سوال کو اس کے اندر کا خوف جان کر شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ ان کے انکار نے سنی کے اشتیاق پر اوس گرا دی تھی۔

"انہیں کس نے کہا ہے کہ نئے بہن بھائی لائیں۔ ہمیں نہیں چاہئیں۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹا۔ یہ تحفہ تو اللہ تعالیٰ خود بھیج رہے ہیں تمہارے لیے۔ تمہارے ڈیڈی کے لیے۔"

ان کی بات پہ وہ بے اختیار چونکا۔

"ہماری فیملی کے لیے؟" اس نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ "یعنی میرے لیے جاشی کے لیے اور ڈیڈی کے لیے؟" اس نے اپنے تئیں اپنی ذاتی فیملی کی وضاحت کی تو اس کے اصل مفہوم سے بے خبر فردوس بیگم ہنس پڑیں۔

"ہاں بھئی تم تینوں کے لیے۔ اب جاؤ اور جا کے منہ دھولو۔" انہوں نے اس کا چہرہ سہلایا تو دادی جان سے تصدیق پا کے سنی مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

زیب اور صغیر قاضی کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور بیٹی سے نوازا تھا۔ ننھی پری کی آمد نے "قاضی ولا" میں رونق کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ سنی بھی اپنی چھوٹی بہن کو پا کے خاصا خوش تھا' وہ اور بات تھی کہ کسی کو بھی اس کے اطمینان اور خوشی کی اصل وجہ معلوم نہ تھی۔ اس کے ردعمل نے زیب اور صغیر دونوں کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ورنہ اس تمام عرصے میں سنی کے ردعمل کو لے کے زیب بے حد پریشان رہی تھیں۔ لیکن اب اسے دیکھ کر انہیں لگتا تھا جیسے اللہ نے ان کی اس مشکل کو آسان کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ گنگناتے ہوئے جس وقت گھر میں داخل ہوا دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ اپنا اسکول بیگ صوفے پہ اچھالتے ہوئے اس نے ایک نظر خالی پڑے کچن میں ڈالی تھی۔

"مام! کہاں ہیں آپ؟" پلٹ کر اپنی ماں کو پکارتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھا تھا۔

"میں نیچے ہوں بیٹا۔" ان کا جواب تہہ خانے سے آیا تو اس کے بڑھتے قدم پل بھر کو رکے اور پھر نیچے جاتے زینے کی جانب اٹھنے لگے۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" وہ سیڑھیاں اتر کر ان کے پاس آ کھڑا ہوا جو ایک جانب رکھی الماری میں سے کچھ چیزیں نکال رہی تھیں۔

"میں۔۔۔" سیدھی ہوتے ہوئے وہ اپنے خوبرو بیٹے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"میں نے یہاں کچھ گفٹ آئیٹمز رکھے تھے وہ نکال رہی تھی۔ تم بتاؤ آج اتنی دیر کیوں ہو گئی آنے میں؟" انہوں نے اپنی سانس برابر کی۔

"آج کوچ نے پریکٹس رکھ لی تھی۔ اس لیے دیر ہو گئی۔" وہ اپنے اسکول کی باسکٹ بال ٹیم میں تھا۔ "اس بیگ میں کیا ہے؟" اس نے باہر نکالے گئے سامان میں سے ایک بڑے سے نیلے بیگ کی طرف اشارہ کیا تو اس کی ماں اس بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگیں۔

"اس میں تمہارے بچپن کی چیزیں ہیں۔"

"دکھائیں۔۔۔" وہ اشتیاق سے آگے بڑھا تو انہوں نے بیگ اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔ وہ وہیں کارپٹ سے ڈھکے فرش پہ ایک جانب بیٹھ کر بیگ کھولنے لگا۔

"او! یہ میرے فراک ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے تہہ کیے ہوئے بالکل چھوٹے چھوٹے فراکوں کا ایک ڈھیر نکالا تو اس کی ماں ہنستے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھیں۔

"ہاں۔"

"لیکن میں تو لڑکا ہوں۔" اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

"جسٹ بارن بے بیز کو فراک ہی پہناتے ہیں۔ اب چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔" ان کی وضاحت پہ وہ مسکراتے ہوئے پرشوق نظروں سے ایک ایک کر کے انہیں دیکھنے لگا۔ پھر بیگ میں ہاتھ ڈال کر اور چیزیں نکالتا چلا گیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے لکڑی کا ایک منقش باکس نکال کر اسے اشتیاق سے دیکھا۔

"یہ تمہاری نانی اماں کا ڈبا تھا۔" اس کی ماں نے ڈبا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔

"اس میں کیا ہے مام؟" ماں کے تاثرات پہ وہ قریب کھسک آیا۔

"خود کھول کے دیکھ لو۔" انہوں نے مسکراتی نظروں سے ڈبا اس کے حوالے کیا تو وہ سامنے رکھ کے اسے کھولنے لگا۔ چھوٹا سا لاک کھول... کے اس نے ڈھکن اٹھایا تو اندر تصویروں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔

"یہ تو فوٹوگرافز ہیں۔" اس کی بات پہ اس کی ماں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کے تصویریں اٹھا لیں اور ایک ایک کر کے انہیں دیکھنے لگا۔ اس کی مام بھی تصویروں پہ جھک آئیں۔ لیکن جوں جوں تصویریں آگے بڑھتی گئیں اس کی مسکراہٹ سمٹنے لگی۔ حتیٰ کہ اس نے بیچ میں ہی ہاتھ روک دیا۔

"رک کیوں گئے بھئی؟" اس کی مام نے حیرت سے نظریں ہٹا کے اس کی جانب دیکھا اور اس کے چہرے کو ہر تاثر سے عاری پا کے وہ بے اختیار ٹھٹک گئیں۔

"وہ مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ مال جانا تھا۔" تصویریں ڈبے میں رکھتے ہوئے وہ یک لخت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "آپ کو کچھ منگوانا تو نہیں؟" اس نے ماں کی طرف دیکھا تو بغور اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"او کے پھر شام میں ملاقات ہوتی ہے۔" وہ جھک کر ان کا گال چومتا سیڑھیاں پھلانگ گیا تو وہ پرسوچ نظروں سے سامنے پڑی تصویروں کو تکتے ہوئے اس کی اس عجیب حرکت کے بارے میں سوچنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

قائداعظم کی تصویر سے آراستہ، مختلف ٹرافیوں اور شیلڈز کو دیوار گیر الماری میں سجائے یہ بڑا بارعب سا کمرہ اسکول پرنسپل کا تھا۔ جہاں صغیر قاضی اسے داخلے کی غرض سے لائے ہوئے تھے۔ ان کے برابر کرسی سنبھالے وہ دلچسپی سے اردگرد کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔ ساتھ ہی کبھی کبھار ان دونوں کی گفتگو بھی سن رہی تھی جو کافی دیر سے جاری تھی۔

"آپ جانتے ہیں صغیر صاحب! سال کا مڈ چل رہا ہے۔ ایسے میں نیو ایڈمشن لینا ہمارے لیے خاصی دقت کا باعث ہے۔" پرنسپل صاحب نے مسکراتے ہوئے دبے الفاظ میں معذرت کی کوشش کی کیونکہ صغیر قاضی کے نا صرف دونوں بچے یہاں پڑھتے تھے بلکہ وہ ان کے اس مہنگے اور معروف تعلیمی ادارے کے ڈونر بھی تھے۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری یہ بیٹی بھی اس سال سے ہی آپ کا اسکول جوائن کرے۔" انہوں نے اپنی بات دہرائی تو پرنسپل صاحب نے اک گہری سانس لی۔

"آپ نے اپنے دونوں بچوں کی طرح شروع سے ہی اسے یہاں داخل کیوں نہیں کروایا؟... انفیکٹ میرے تو آج ہی علم میں آیا ہے کہ آپ کی ایک اور بیٹی بھی ہے۔"

ان کی بات پہ جہاں صغیر صاحب پل بھر کو مشکل میں پڑ گئے وہیں اس کا دھیان ٹیبل پہ رکھے پاکستان کے جھنڈے سے ہٹ کر ان کی جانب مبذول ہو گیا۔ اسکول کا ڈونر ہونے اور بچوں کے یہاں پڑھنے کی وجہ سے پرنسپل صاحب ان کے ساتھ ساتھ اسکول میں بچوں کے سلسلے میں زیب کی آمد و رفت ہونے والی تھی تو ان کا کم از کم پرنسپل صاحب سے تعارف تو ضروری تھا۔

"ایسا ہے کہ ان کی مدر کی خواہش تھی کہ یہ اس سکول میں پڑھے۔" سوچ کر بولتے ہوئے وہ لحظہ بھر کو رکے تھے۔ "اکچولی شی از مائی اسٹیپ ڈاٹر۔" پل کے توقف کے بعد انہوں نے قصداً انگلش میں جملہ کہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ ان کے ساتھ بیٹھے وجود نے "اسٹیپ ڈاٹر" پہ ٹھٹھک کے ان کی جانب دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی!" زیب کچن میں رات کے اس وقت اکیلی کھڑی چھوٹی کے لیے پانی ابال رہی تھیں۔ جب وہ خاموشی سے چلتی ہوئی ان کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔

"جی بیٹا۔" انہوں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا تھا جو اپنے رات کے پاجامہ سوٹ میں ننگے پاؤں شاید بستر سے اٹھ کر آئی تھی۔

"امی! آپ نے اور ڈیڈی نے تو کہا تھا کہ ہم سب ایک فیملی ہیں۔ پھر سنی بھائی مجھے سسٹر کے بجائے اسٹیپ سسٹر اور ڈیڈی خالی ڈاٹر کے بجائے اسٹیپ ڈاٹر کیوں کہتے ہیں؟" ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے بوجھل لہجے میں سوال کیا تو زیب بیگم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور نظریں اس کے معصوم پریشان چہرے پہ جم سی گئیں۔

"بتائیں نا امی... کیا میں واقعی سنڈریلا کی گندی اور بری بہنوں جیسی ہوں جو یہ لوگ مجھے "اسٹیپ" کہتے ہیں؟" ان کی خاموشی پہ وہ بے چینی سے دو قدم آگے آگئی تو زیب نے دل میں اٹھتی ٹیسوں کو دباتے ہوئے اسے خود سے لگا لیا۔

"نہیں میری جان! ایسا بالکل نہیں ہے۔ آپ بہت اچھی بہت پیاری ہو بیٹا!" ان کی آواز کوشش کے باوجود بھر آئی تھی۔

"پھر یہ سب مجھے "اسٹیپ" کیوں کہتے ہیں؟" وہ زور لگا کے ان کے بازوؤں سے نکلی تھی۔ اس کی تکرار پہ زیب کے ذہن سے ایک ایک کر کے سارے مناسب لفظ کہیں دور بھاگ نکلے تھے۔ نجانے دنیا بہت سی چیزوں کو اتنے کڑوے کسیلے نام کیوں دے دیتی ہے کہ پھر اگر کوئی چاہے بھی تو ان کے تلخ معنوں کو کسی بھی محبت بھرے لفظ کی چاشنی سے کم نہیں کر سکتا۔ ان کا نام ہی ان کا تعارف ہوتا ہے... نام لیا خاکہ واضح! پھر چاہے کوئی اس خاکے سے دور تک میل نہ کھاتا ہو، اسے اس لیبل کی تلخی کو تاعمر جھیلنا پڑتا ہے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عاصمہ فرحین

"اماں! اماں! آج کیا پکے گا؟" جب دو تین دفعہ آواز دینے پر بھی جواب نہیں ملا تو رمشا نے برتن دھونا ترک کیا اور کچن سے نکل آئی۔

تین کمروں اور صحن میں جھانکتے ہوئے جب اسے اماں نظر نہیں آئیں تو اس نے سوچا کہ کہیں وہ اوپر تو نہیں ہیں۔ اس سوچ کے زیرِ اثر اس نے اوپر کا رُخ کیا۔ اماں اسے ڈیپ فریزر کھولے' وہیں کھڑی نظر آگئیں۔ وہ کیا کر رہی تھیں۔ یہ اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ غصے نے ایک لمحے کو اس کے چہرے کو سرخ کر دیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہو گئی۔ اماں کے قریب پہنچ کر اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنا سوال دُہرایا۔

"اماں! آج کیا پکے گا؟"

زیبی بیگم کو اس کے آنے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس لیے سٹپٹا گئیں اور بولیں۔

"اری کم بخت! دیکھ بھی لیا کر۔ کیسے مر' مر کر آ رہی ہے۔ میرا تو کلیجہ نکل دیا۔" رمشا کے چہرے پر سایہ لہرا گیا۔

"اماں! کب سے تو آوازیں دے رہی ہوں اور آپ بھی تو مجھے بتا کر نہیں آئیں کہ اوپر جا رہی ہوں۔" رمشا خفا ہوتے ہوئے بولی۔

"اچھا بس بس۔ وہ رباب گوشت لے کر آئی تھی۔ وہ ہی رکھ رہی تھی۔" (اب ان سے کوئی پوچھے کہ گوشت رکھتے ہوئے بھی گھنٹہ ہو جاتا ہے) رمشا کے چہرے پر بے پناہ بے زاریت تھی۔

"آج کیا پکے گا؟"

"میرا کلیجہ پکا لے۔" زیبی بیگم نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"لائیں۔ لادیں۔ پھر مجھے نہ بولیے گا کہ کھانا دیر سے کیوں پکا۔" رمشا بھی ناگواری سے بولتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

☆ ☆ ☆

یہ ایک لوئر مڈل کلاس کی کچی پکی آبادی تھی۔ جہاں زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ عبدالغفور بھی اس آبادی کے پرانے رہائشوں میں سے ایک تھے اور ایک پرائیویٹ کمپنی میں بطور کلرک ملازمت کرتے تھے۔ ان کے دو ہی بچے تھے۔ رضوان اور رمشا۔ رضوان نے تو ایف اے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا اور مختلف کورسز کر کے وہ ایک کمپنی سے تین سال کے کنٹریکٹ پر سعودی عرب چلا گیا تھا۔ جبکہ رمشا نے ایف اے کالج سے کرنے کے بعد پرائیویٹ بی اے میں داخلہ لے لیا تھا کیوں کہ بقول اس کی اماں کے اب ان سے کام کاج نہیں ہوتا تھا۔ جہاں تک عبدالغفور اور زیبی بیگم کا تعلق تھا تو ان دونوں کے مزاج میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ عبدالغفور جتنے شریف اور منکسرالمزاج تھے۔ زیبی بیگم اتنی ہی بدمزاج اور جھگڑالو عورت تھیں۔

عبدالغفور نے تمام زندگی اکلِ حلال کی روزی کو اپنا شعار بنائے رکھا اور وہ ابھی تک اس پر عمل پیرا تھے مگر رضوان سعودی عرب کیا گیا' زیبی بیگم کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ انہوں نے گھر کو غیر ضروری سامان سے بھرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے ڈیپ فریزر خریدا کیوں کہ چھوٹے سے فریج میں ان تین نفوس کا گزارہ مشکل تھا (یہ ان کا خیال تھا)۔ ڈیپ فریزر نیچے رکھنے کے بجائے اوپر چھت پر بنے

اسٹور میں ایک طرف کے حصے کو صاف کر کے رکھا گیا تاکہ اوپر کنڈے کی بجلی سے چلتا رہے۔ انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ہر بقر عید کے موقع پر اپنے محلے داروں سے گوشت رکھوانے کے صلے میں وہ غنڈہ ٹیکس بھی وصول کرتی تھیں۔

"کیا بنا رہے ہو؟" جواب آتا۔

"کباب"

"اچھا! ذرا مجھے بھی چکھانا۔ کیسے بنائے ہیں؟" رمشا کے ہاتھ کے کھا کھا کر تو میرے منہ کا ذائقہ خراب ہو چکا ہے۔"

"گوشت تو رکھوا رہی ہو۔ پر اپنی اماں سے کہہ دینا میری لیے بھی سالن بھیج دیں۔"

"آخر محلے والوں کا بھی تو فرض ہے' ہم نے تمہارا گوشت رکھ لیا' کوئی پیسے تھوڑی لیے ہیں۔ لین دین سے تو محبت بڑھتی ہے۔"

"اتنا اتنا بل آتا ہے۔ کہاں سے دوں؟ رمشا کے ابا تو ابھی تک وہی لا رہے ہیں جو پانچ سال پہلے لاتے تھے۔ اب رمشا کے لیے بھی تو جوڑنا ہے نا۔ کل کلاں کو اس کی پھوپھی تاریخ مانگنے آگئی تو۔۔۔ کیا خالی ہاتھ رخصت کروں گی۔ کل تو میں نے اور رمشا نے پیاز اور ٹماٹر سے روٹی کھائی تھی۔" (یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں مگرمچھ کے آنسو آگئے)۔

رمشا نے بھی یہ سن کر کانوں کو ہاتھ لگایا مگر کوئی اپنی سگی ماں کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ رمشا عادت و مزاج میں بالکل اپنے باپ پر گئی تھی۔ زیبی بیگم کی تقریر کے نتیجے میں مزیدار کوفتوں کا سالن گھر میں آگیا۔ اگر ان کی عادت زبان کی حد تک محدود رہتی تو ٹھیک تھا مگر اب وہ ہاتھوں کا استعمال بھی کرنے لگی تھیں۔ ادھر کوئی گوشت رکھوا کر گیا ادھر دو چار بوٹی یہاں سے۔۔۔ دو چار بوٹی وہاں سے نکال کر اپنا ایک دن کا سالن وہ بنا ہی لیا کرتی تھیں۔

کوئی کیسی بھی گانٹھ لگاتا' کسی بھی قسم کی نشانی لگاتا مگر ان کی فنکارانہ صلاحیتوں سے پیچھے ہی رہتا۔ کبھی کبھار ایک آدھ شکایت آبھی جاتی تو نبٹنا بھی انہیں خوب آتا تھا۔

"لو بھلا۔ گوشت تو کیا خاک ہوتا ہے۔ لوگ تو بانٹتے ہی چربی اور ہڈیاں ہیں اور نام میرا مفت کا بدنام ہوجاتا ہے۔ مجھے کیا مرنا نہیں ہے' جو ایسے کام کروں گی۔" (مگر وہ ایسے کام کرنے سے باز کب آتی تھیں) کبھی کبھار تو کسی کی ایک ڈش کا مینو اس طرح غائب ہوتا کہ پھر ہاتھ نہ آتا۔

"اری! وہ تیرا قیمہ تھا؟ میں نے تو عدی (عدنان) کو دے دیا۔ کل تو وہ کہہ رہا تھا کہ کبابوں کا قیمہ دے دیں۔ وہی پیلا شاپر والا نا جس پر لال کپڑے کی گانٹھ لگی ہوئی تھی۔ اب تو جلدی جا۔ اب تک تو ہضم کرچکے ہوں گے۔" جب تک مدعی پہنچتے کیس ختم ہوجاتا۔

عدی کی ماں لاکھ سمجھا سمجھا کر تھک جاتی کہ زیبی خالہ سے وہ اپنا ہی قیمہ لائے تھے مگر آنکھوں پر لفظوں کی پٹی اس طرح بندھ جاتی کہ زبان پر ایک دوسرے سے گولہ بارود برسائے جاتے۔ اس میں بھی زیبی بیگم ایک ہاتھ سے دو شکار کرتی تھیں۔ ناراض ہونے والا خاندان کچھ عرصے کے لیے ان سے منہ موڑ لیتا تو وہ ایسے بچوں کے ہاتھوں انہیں اطلاع پہنچواتی جو ان کے گھر جاتے ہی نہیں تھے۔

"اری جا نرگس! ذرا عدی کی ماں کو بول دے۔ صبح سے لائٹ گئی ہوئی ہے' آکر گوشت لے جائے۔ فریج میں ٹھنڈک بھی نہیں ہے' ایسا نہ ہو کہ گوشت خراب ہوجائے۔"

اب زیبی بیگم کو معلوم تھا کہ نرگس مرجائے گی مگر عدی کے گھر نہیں جائے گی۔ وہ محلے کے کسی اور بچے سے کہہ دے گی۔ اگر عدی کی اماں کا نصیب اچھا ہوا اور وہ وقت پر گوشت لینے پہنچ گئیں تب تو ٹھیک ورنہ وہ ہنڈیا پکی زیبی بیگم کے گھر۔

اور اگر عدی کی اماں کو دیر ہوجاتی تو ڈائیلاگ اس طرح ہوتے "ہائے! تمہیں نرگس نے نہیں بتایا۔ کتنی دفعہ کہا تھا اسے۔۔۔ لائٹ گئی ہوئی ہے۔ عدی کی اماں کو جا کر بول دے مگر۔۔۔" یہ کہہ کر وہ کسی یوگا ایکسپرٹ کی طرح ایک لمبا سانس لیتیں۔

"مگر کیا۔۔۔؟ زیبی خالہ!" عدی کی ماں کا سانس اٹک گیا۔

"وہ جب تمہارے گھر سے کوئی نہیں آیا اور گوشت میں سے بدبو آنے لگی۔ تو وہ میں نے بلی کے آگے ڈال دیا۔"

"کیا؟" زیبی بیگم نے جتنی اطمینان سے جواب دیا تھا۔ اتنی ہی زور کی چیخ عدی کی ماں کے منہ سے برآمد ہوئی تھی۔

"اری چل' رہنے دے۔۔۔! ویسے بھی کون سا تیرے پیسوں کا تھا۔۔۔ قربانی کا تھا۔ اب بلیوں کا بھی حق بنتا ہے نا۔" زیبی بیگم نے اسے پچکارا مگر عدی کی ماں

دل ہی دل میں اس وقت کو کوسنے لگی جب وہ بقرعید کا گوشت رکھوانے آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

بے چارے زیبی خالہ کے ستائے ہوئے پڑوسی ہر سال تہیہ کرتے کہ وہ زیبی (نیتی) بیگم کے گھر گوشت نہیں رکھوائیں گے مگر کیا کرسکتے تھے؟ یہ محلے کا واحد اکلوتا ڈیپ فریزر تھا۔ گوشت رکھوانا ان کی مجبوری تھی اور اس مجبوری سے فائدہ اٹھانا زیبی بیگم کی مجبوری تھی۔ آج بھی بقرعید کا تیسرا روز تھا۔ جب رمشا انہیں پکارتی ہوئی اوپر چلی آئی تھی اور کچھ دیر پہلے ہی رکھوائی گئی تھیلیوں میں سے انہیں گوشت نکالتے دیکھ چکی تھی۔

غصے سے لال پیلی ہوتی ہوئی واپس آکر اس نے ٹی وی آن کرلیا تھا اور چینل سرچ کرنے لگی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد زیبی بیگم اتریں تو ان کے ہاتھ میں ایک گوشت کا ایک شاپر تھا۔

"یہ لے۔" شاپر رمشا کو پکڑا دیا۔ "میرا دل تو کباب کھانے کا کررہا ہے مگر اب ٹائم نہیں ہے۔ کڑاہی گوشت پکالے۔ اور یہ کیا؟ میری بیٹی نے اپنے بال بھی نہیں بنائے۔" انہوں نے اس کے بال اپنے ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے کہا مگر رمشا نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور اپنے بقایا کام نبٹانے کے ساتھ ساتھ کڑاہی گوشت کی تیاری کرنے لگی جبکہ زیبی بیگم ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہوگئیں اتنے میں دروازہ بجا۔

"ایک تو ان محلے والوں کو بھی چین نہیں ہے، دن رات کا سکون غارت کردیتے ہیں۔" زیبی بیگم نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے عدی کھڑا تھا۔

"اے کیا ہے؟" وہ زور سے دھاڑی تھیں۔

"خالہ! امی نے کبابوں کا گوشت منگوایا ہے۔" وہ اپنے پیلے دانتوں کی چھب دکھاتے ہوئے بولا۔

"اب پھر اوپر چڑھو۔" بڑبڑ کرتے ہوئے انہوں نے عدی کو گوشت کا شاپر تھمایا۔

"اپنی ماں کو کہنا' خالہ کہہ رہی تھیں کہ کباب چکھانا۔ پچھلی دفعہ بھی اچھے بنائے تھے۔"

"خالہ! کیا ہمارا ہی فرض ہے کباب کھلانے کا' کبھی ہمیں بھی تو رمشا آپی کے ہاتھ کے کباب بھجواؤ نا۔" دس سال کا عدی ہاتھ نچا کر بولا۔

"مردود ادھر آ۔ زبان لڑاتا ہے میرے ساتھ۔" زیبی بیگم نے جس سرعت کے ساتھ اپنی چپل اتار کے اسے ماری تھی' اتنی ہی تیزی سے وہ اپنے آپ کو بچاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

"اب تو بچ گیا۔ آئندہ کیسے بچے گا؟" زیبی بیگم مڑیں تو پیچھے کھڑی رمشا' جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی کچن سے باہر نکلی تھی ہنس رہی تھی۔

"اب تیرے ہنسنے کی کسر باقی ہے' جا اگر سالن پک گیا ہے تو مجھے لا دے۔ بھوک لگ رہی ہے۔" اور رمشا سمجھ گئی کہ اماں کا اشارہ کس طرف ہے؟ وہ کچن میں گئی ہنڈیا بھننے میں تھوڑی کسر باقی تھی۔ اس نے چولہا تیز کردیا۔

"رمشا کہاں رہ گئی؟" زیبی بیگم کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"ایک تو اماں بھی نا۔" اس نے ناگواری سے ایک پلیٹ اٹھائی چولہا ہلکا کیا۔ پلیٹ میں بوٹیاں نکالیں اور زیبی بیگم کے پاس لے آئی۔

"خوشبو تو بہت اچھی آرہی ہے۔" زیبی بیگم نے پلیٹ کو اپنے نتھنوں سے قریب کیا۔

چولہا ہلکا کرکے وہ بھی زیبی بیگم کے ساتھ قریبی صوفے پر بیٹھ گئی کیوں کہ یہ بھی زیبی بیگم کی ایک خاص عادت تھی کہ ہنڈیا بھونتے ہوئے پلیٹ بھر بوٹیاں نکلواتیں۔ مزے لے لے کر کھاتیں اور حسب عادت بتاتیں کہ نمک کم ہے' مرچ زیادہ ہے' تھوڑی پسی ہوئی کالی مرچ ڈال دینا وغیرہ وغیرہ۔

ٹی وی پر ڈرامہ چل رہا تھا۔ زیبی بیگم تو منہمک تھیں ہی۔ رمشا بھی مشغول ہوگئی۔ ہنڈیا کو بھی بھول گئی۔ اچانک کچن میں سے کچھ گرنے کی آواز سنائی دی تو زیبی بیگم چونک گئیں۔

"ہائے رمشا! تُو یہیں بیٹھی ہے؟"

"اماں! کچھ بھی نہیں ہے۔" رمشا ٹی وی پر نظریں جمائے ہوئے بولی، لیکن زیبی بیگم کو تسلی نہیں ہوئی جب نظر گود میں پڑی پلیٹ پر پڑی تو وہ اسے رکھنے کچن کی طرف چل پڑیں۔

"آ... ہا... ہا... آ... یہ کیا ہوا؟ منحوس بلی، بتاتی ہوں تجھے...." چپل اٹھا کر بھورے اور سفید بالوں والی بلی کو ماری جس پر عدی کے گھر کا قربانی والا گوشت کھانے کا الزام تھا۔ زیبی بیگم کی آواز پر رمشا چونک کر کھڑی ہوئی۔ دیکھا کہ بلی منہ میں بوٹی دبائے پلک جھپکتے میں زیبی بیگم کی پہنچ سے دور نکل گئی۔ رمشا جلدی سے کچن میں داخل ہوئی تو یہاں ایک نیا ہی منظر اس کا منتظر تھا۔ پتیلی کا ڈھکن زمین پر گرا ہوا تھا اور زیبی بیگم چولہے کے قریب کھڑی ہوئی بلی کو کوس رہی تھیں۔

"ارے ستیاناس ہو، اس بلی کا... آدھی سے زیادہ ہنڈیا چٹ کر گئی۔ ایسی بے خبری بھی کیا رمشا... جو کھانا پکاتے... پکاتے... بھول گئی۔"

"لیکن اماں میں نے آنچ بہت کم کی تھی، پھر اس کی نظر چولہے کے سوئچ پر گئی تو جان گئی کہ آخر ہوا کیا ہے؟" سوئچ جوں کا توں تھا۔

غریب عوام کے ساتھ حکومتیں روز نیا کھیل کھیلتی ہیں، بجلی کی آنکھ مچولی تو گرمی، سردی جھیلنا پڑتی ہی تھی۔ اب گیس کی لوڈ شیڈنگ بھی ان کے علاقے کا معمول تھا۔ اس کا کوئی مقررہ وقت نہیں تھا۔ بس اچانک گیس غائب۔ چاہے چائے پک رہی ہو یا ادھ سیکا پراٹھا... ناشتا کرنا ہو یا رات کو کھانا، کھانا۔ گیس کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔

اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ رمشا چولہا ہلکا کر کے آئی اس دوران گیس چلی گئی اس لیے سالن آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو تا گیا اور بلی کو لنچ کرنے کا موقع مل گیا۔ تھوڑی دیر تک تو زیبی بیگم واویلا مچاتی رہیں اور رمشا دبک کر بیٹھی رہی۔

"چل تیری چاچی کے گھر چلیں۔" اچانک زیبی بیگم کو کچھ نیا سوجھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔

"مگر اماں اس طرح اچانک؟" رمشا بولی تو زیبی بیگم نے اسے اس طرح گھورا کہ وہ گڑبڑا گئی۔

"آج بقر عید کا تیسرا دن ہے۔ کہیں وہ لوگ بھی کسی سے ملنے نہ گئے ہوں۔ آج کے دن چاچی اپنے بھائی کے گھر جاتی ہیں۔" اس بار رمشا نرمی سے بولی۔

"تو ایسا کرو کہ فون کر لو۔" زیبی بیگم جلدی سے بولیں۔ آخر انہیں اپنی پیٹ پوجا بھی تو کرنی تھی۔ رمشا نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ آج اپنی بہن کے گھر گئی ہوئی ہیں۔

"جھوٹ بول رہی ہے... اسے پتا چل گیا ہو گا کہ میں آ رہی ہوں... لیکن اب اس کی خیر نہیں ہے... چل رمشا تیار ہو جا..." زیبی بیگم غصے سے بولیں۔

تیار ہو کر زیبی بیگم باورچی خانے میں گھس گئیں۔ رمشا بھی ان کے پیچھے آ گئی۔

"اماں! یہ کیا کر رہی ہیں؟" بلی کا جھوٹا سالن جب ڈش میں نکال کر زیبی بیگم نے ہرے دھنیے اور ادرک سے گارنش کیا تو رمشا سے رہا نہیں گیا۔

"عدی کو بہت شوق تھا نا! تیرے ہاتھ کا پکا کھانا کھانے کا... اب کھائے گا نا... انگلیاں چاٹتا رہ جائے گا۔" زیبی بیگم طنزیہ مسکرائیں۔

"مگر اماں! یہ غلط ہے۔" رمشا ڈش ان کے ہاتھ سے چھیننے لگی۔

"رمشا! اگر میرے معاملات میں دخل اندازی کی، تو وہ حشر کروں گی کہ یاد کرے گی۔" زیبی بیگم ایک خونخوار بلی کی طرح رمشا پر جھپٹیں۔ ناچار رمشا کو خاموش ہی ہونا پڑا۔ گھر کو تالا لگا کر زیبی بیگم عدی کے گھر کے دروازے کو کھٹکھٹانے لگیں جسے عدی نے ہی کھولا تھا۔ زیبی بیگم کی شکل دیکھتے ہی اس نے دروازہ بند کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے رمشا کی آواز نے اس کے ارادے پر پانی پھیر دیا کیوں کہ زیبی بیگم نظروں ہی نظروں میں اسے اشارہ کر چکی تھیں کہ یہ کام اس کو کرنا ہے۔

"یہ چابی رکھ لو... اور یہ سالن بھی۔ خاص

تمہارے لیے لائی ہوں۔" بی اے کا انگلش کا پیپر دینا رمشا کو اتنا مشکل نہیں لگا تھا جتنی یہ تین لائنیں بولنا۔

"ہاں! اور جب ابا آئیں تو یہ انہیں چابی دینا اور کہنا کہ ہم شکور چچا کی طرف گئے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

شکور چچا کا گھر پورے ڈیڑھ، دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ بس میں خوار ہوتی ہوئی جب دونوں ماں بیٹی ان کے دروازے پر پہنچی تو گھڑی سات بجا چکی تھی۔ بھوک سے ان کا برا حال ہو چکا تھا مگر دروازے پر لگے تالے کو دیکھ کر ایسا لگا کہ "کاٹو تو لہو نہیں"

رمشا نے تیز نظروں سے زیبی بیگم کو گھورا جن کے چہرے پر، شرمندگی کے بجائے بھوک سے بارہ بج رہے تھے۔ واپس بس اسٹاپ تک کا سفر زیبی بیگم نے ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح کیا تھا۔ اب بھی وہ ایک بس کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھیں کہ رمشا نے رکشا روک لیا۔

"اس کا کرایہ کون دے گا؟" زیبی بیگم کی کچھ حسیات ابھی باقی تھیں۔

"میں دے دوں گی اماں! اپنے جمع شدہ پیسوں میں سے۔" اس نے چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔

☼ ☼ ☼

رات ساڑھے نو بجے جب دونوں ماں بیٹی گھر واپس پہنچیں تو دن بھر کی بھوک اور تھکاوٹ نے ان کا بہت برا حال کر دیا تھا۔

عبدالغفور دروازہ بند کر کے پلٹے ہی تھے کہ اندر سے زیبی بیگم کی آواز آئی۔

"ارے! انہیں دیکھو۔۔۔ کیسے مزے سے کھانا کھا رہے ہیں؟ کوئی خبر بھی ہے کہ بیوی اور بیٹی کا کیا حال ہے؟ ہمارا تو بھوک سے ستیاناس ہو چکا ہے۔" نان اسٹاپ بولتی زیبی بیگم نے چادر اتار کر پھینکی اور "آؤ دیکھا نہ تاؤ" کھانا کھانے بیٹھ گئیں، جبکہ رمشا اپنی ماں کے ارشادات پر جھلاتی ہوئی واش روم میں گھس گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو عبدالغفور ان کے لیے ٹھنڈا ٹھنڈا شربت بنا کر لا چکے تھے۔ ٹھنڈا شربت جیسے ہی معدہ میں گیا تو دماغ بھی ہلکا پھلکا ہو گیا۔ حواس بحال ہوئے تو رمشا نے دیکھا کہ زیبی بیگم کے آگے وہی ڈش رکھی تھی جو انہوں نے عدی کے گھر پر دی تھی اور اب اس میں سے سالن کا آخری نوالہ تک زیبی بیگم صاف کر چکی تھیں۔ اب ٹھنڈا شربت نوش فرمایا جا رہا تھا۔

"اماں یہ کیا؟" رمشا چیخی۔

"اے! کیا ہوا؟" زیبی بیگم نہ سمجھنے والے انداز میں بولیں۔

"یہ تو ہمارے گھر کی ڈش ہے نا؟ جو میں نے عدی کو دی تھی۔" رمشا تیز لہجے میں بولی۔

"جب میں آفس سے لوٹا تو عدی نے مجھے چابی دی پھر میں نے سوچا کہ اپنے لیے بازار سے کھانا لے آتا ہوں۔۔۔ تم لوگ تو تھے نہیں مگر بھلا ہو عدی کا۔۔۔ اس نے مجھے یہ ڈش دے دی کہ یہ رمشا آپی دے کر گئی ہیں اور ساتھ میں تین چپاتیاں بھی اپنی اماں سے پکوا لایا۔۔۔ بس اب میں کھانے ہی والا تھا کہ تم دونوں آ گئیں اور تمہاری اماں نے کھانا کھا لیا۔"

"اب رمشا تم کیا کھاؤ گی؟ میں تمہارے اور اپنے لیے بازار سے کچھ لے آتا ہوں۔ آخر ہم باپ بیٹی نے بھی تو کچھ کھانا ہے نا۔" عبدالغفور نے سادہ لہجے میں تفصیل بتاتے ہوئے اب رمشا سے پوچھا تھا مگر رمشا کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا اور زیبی بیگم۔۔۔ آپ یقیناً" سمجھ گئے ہوں گے۔

صدف آصف

"کیا میں حالات کو بدل سکوں گا یا وہ بدل جائے گی؟"
ذی جاہ نے آئینے میں دیکھ کر خود سے سوال کیا۔
"وہ بدل بھی گئی تو کیا ہوا محبت تو برقرار رہے گی نا۔"
اس کے عکس نے پلٹ کر زبان چڑائی۔
"جب کسی سے پیار ہو جائے تو اس کی تمام اچھائیوں اور برائیوں کو قبول کرنا پڑتا ہے اور محبت میں یہ کچھ اتنا مشکل کام بھی نہیں، مجھے اپنی سویرا پر مکمل بھروسا رکھنا ہوگا۔" ذی جاہ نے ردائے سراب اوڑھ کر خود کو تسلی دلاسے دیتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔
اس سوال جواب کے پیچھے ایک بڑی وجہ چھپی تھی،

ناولٹ

سویرا کے دن بہ دن بدلتے انداز پر اس کے دل میں خطرے کی گھنٹی۔ ٹن ٹن کر کے بجنے لگی تھی، جانے تبدیلی کا عمل اس کی طرف سے شروع ہوا؟ یا ذی جاہ نے بہت ساری حقیقتوں کا غیر جانبداری سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔

پچھلے کئی سالوں سے ذی جاہ کی کل کائنات سمٹ کر سویرا منصور تک محدود ہو گئی تھی، بے حد مصروف زندگی گزارنے کے باوجود وہ سویرا کی یاد سے ایک پل کے لیے بھی غافل نہ ہو پاتا۔ جب بھی حالات کی کٹھنائیوں سے تھک کر آنکھیں بند کرتا، سویرا کی ہوش اڑاتی پرچھائیں، چھم سے خیالوں میں سما جاتی، یکلخت تکلیف وہ لمحے سرد کیفیت میں بدلنا شروع ہو جاتے۔

سویرا جو پچھلے کئی سالوں سے ذی جاہ کو بڑی شدتوں سے چاہتی آئی تھی، خود بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ اصل بات کیا ہے؟ شاید محبت کے اس کھیل سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی، جس میں دور دور تک ملن کا فسانہ نہیں اور ہجر کے قصے طویل تر ہو چلے تھے۔

☆ ☆ ☆

"خالہ جی۔۔۔ اے خالہ جی۔۔۔ کہاں غائب ہو گئیں؟"
شاہا نے کھڑکی سے منہ نکال کر کئی بار آواز لگائی اور گلابی ایڑی اٹھا کر برابر والے گھر کا اندر تک کا جائزہ لیا' پر وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"شاہا۔ ادھر آؤ' ذرا چھوٹی کا یونیفارم کاٹ دو۔۔۔ میں ابھی سی لوں' کل اسے اسکول پہن کر جانا ہے۔" فرزانہ نے چوکنی ہو کر اسے پکارا' جواب یقیناً "برابر میں جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔

"ایک منٹ۔۔۔ پتا نہیں خالہ جواب کیوں نہیں دے رہی ہیں؟" اس کی ساری فکر برابر والے گھر پر مرکوز تھی۔

"ہر وقت پڑوسیوں کی تاک جھانک میں نہ لگی رہا کرو' ذرا اپنے گھر کے کاموں پر بھی توجہ دو" فرزانہ نے جل کر اسے سنائی۔

"امی چیک تو کر لوں۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو۔" وہ ماں کو جواب دیتی' تیزی سے پلٹی۔ ایسا پاؤں رپٹا کہ دھم سے گر پڑی' کپڑے جھاڑتی ہوئی دوبارہ اٹھی اور باہر نکل گئی' اس کی اپنی تکلیف پر پڑوسن کی فکر بھاری تھی۔

"ہائے رے! ایک تو اس لڑکی کو قرار نہیں۔" فرزانہ نے بیٹی کو لنگڑا کر سامنے جاتے دیکھا تو سرہلا کر اظہار افسوس کیا۔

شاہا کے ذہن میں ہفتے بھر پہلے والا واقعہ تازہ ہوا تو دل میں ہول اٹھنے لگے' جب مونا باجی کی برسی والے دن بانو خالہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ وہ بیماری کی حالت میں اکیلی گھر میں پڑی رہیں' شاہا نے صبح سے مشین لگائی تھی' بارہ لوگوں کے ایک ہفتے کے جمع شدہ کپڑے دھونا کوئی آسان کام تھا' وہ شام تک فارغ ہوئی تو تھک کر چور ہو گئی۔ اس کا خالہ کی طرف ایک چکر بھی نہ لگ سکا۔

شہاب خالو جب قبرستان سے واپس لوٹے تو بیوی کو بخار میں دھت پڑا دیکھا' ہڑبڑا کر شاہا کے ابا پرویز کلیم کو کئی آوازیں لگائیں' وہ لوگ جلدی سے آسیہ بانو کو لے کر اسپتال بھاگے۔ فوراً" طبی امداد دی گئی تب ان کی حالت بہتر ہوئی۔

پرویز کلیم نے اس دن خاص طور پر بیوی اور بڑی بیٹی کو پڑوسن خالہ کا خیال رکھنے اور ان کے گھر میں روزانہ ایک بار چکر لگانے کی تاکید کی' وہ منچلی' ایسا حکم بجالائی ایک چھوڑ دن میں کئی بار چکر لگانے لگی۔ فرزانہ ٹوکتیں تو شاہا' باپ کا حوالہ دے کر ماں کا منہ بند کر دیتی۔

☆ ☆ ☆

سویرا اور ذی جاہ کی ملاقات ایک نمائش میں ہوئی' جہاں دور حاضر کے چند مشہور مصوروں کے فن پارے نمائش کے لیے پیش کیے گئے تھے' تقریب میں تصاویر کا جائزہ لیتے ہوئے دونوں کا کئی بار ٹاکرا ہوا تو نگاہوں میں شناسائی کی چمک ابھری۔ ایک جگہ کھڑے ہوئے تو بات چیت بھی ہونے لگی' پہلی ملاقات میں سویرا کے حسن' نزاکت اور انداز نے ذی کو متاثر کیا' وہ لیونڈر کی لطیف خوشبو سے مہکتی اسے مسحور کرتی چلی گئی۔

دونوں ہی ادب کے شیدائی اور ہم ذوق نکلے۔

سویرا کو بھی ذی جاہ کی وجاہت نے بہت مرعوب کیا تھا' اس نے اپنے پورے سرکل میں ۔۔۔۔ اتنا وجیہہ مرد پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' مگر۔ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتی تھی' وہاں اسے جذبات پر کنٹرول رکھنے کی تربیت حاصل تھی اسی لیے ذرا سی بے اعتنائی دکھاتے ہوئے وہ بظاہر ذی سے رسمی بات چیت تک محدود رہی' اس کے باوجود اپنے سحر سے بچ نکلنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔

کافی دیر بعد جب دونوں واپسی کے لیے ایک ساتھ قدم بڑھاتے ہال کے دروازے سے باہر نکلے تو سویرا مزید رابطہ بحال رکھنے کے لیے فون نمبر کا تبادلہ کرنا نہ بھولی۔ اس دن کے بعد سے دھیرے دھیرے دونوں میں بے تکلفی کی فضا قائم ہوتی چلی گئی' سویرا نے کئی بار حائل فاصلوں کو کم کرنے کے لیے ذاتی کوششوں

سے راہیں ہموار کیں' وہ اکثر کسی کنسرٹ' مشاعرے یا نمائش وغیرہ کے دعوت نامے بھیج کر ذی جاہ سے ملنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتی۔

ذی شروع میں تو اس کے التفات دکھانے پر جان کر انجان بنتا رہا۔ اسے اگنور کرتا' پر سویرا بڑے پیار سے اس کے ناز نخرے اٹھانے لگی۔ ذی جاہ چھوٹی چھوٹی سی بات پر منہ پھلاتا اکڑ دکھاتا۔ پھر بھی سویرا کو اس کی کوئی ادا بری نہیں لگتی۔

سویرا کو زندگی میں ہر طرف سے اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ پہلی بار کسی کا اکھڑپن اور نخرے سہنا ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوا۔

"ذی پر ایٹی ٹیوڈ بہت جچتا ہے۔" سویرا اپنی فرینڈز کو بتاتے ہوئے بڑا فخر محسوس کرتی' جو ذی جاہ کو دیکھتے ہی سراہنے لگ جاتیں۔

ذی جاہ۔ ان دنوں اپنے اندر کی تنہائی سے بیزار اور حالات کی وجہ سے زود رنج ہو چلا تھا' نہ چاہتے ہوئے بھی سویرا کے پیار کی شدتوں کے آگے ہارنے لگا' اس کی جانب خود بخود بڑھتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼ ☼

"خالہ جی۔" شاہا زور زور سے پکارتی ہوئی سفید گرل کی کنڈی کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"اوں۔۔۔ ہوں۔" آسیہ بانو نے سلام پھیر کر آیت الکرسی پڑھتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

"شکر ہے یہاں سب خیریت ہے' ورنہ میں تو ڈر رہی گئی تھی۔" شاہا نے انہیں کمرے کے کونے میں نماز پڑھتا دیکھا تو جان میں جان آئی۔

"یا اللہ۔۔۔ زرینہ کب سدھرے گی؟" وہ خاموشی سے کونے میں رکھے اسٹول پر پیر اوپر کر کے بیٹھ گئی' پورے گھر کا جائزہ لیا تو اظہار افسوس کرنا لازم ہوا۔

"کیا ہوا بٹیا۔۔۔ کس بات پر افسوس کر رہی ہو؟" آسیہ بانو نے اس کے زور سے بولنے پر وہیں سے پوچھا۔

"آج ماسی منحوس نے پھر چھٹی مار لی؟" شاہا نے سر پر ہاتھ مارا اور آستین چڑھا کر ٹی وی لاؤنج سے پھیلاوا سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں آج بھی نہیں آئی' میں نے کافی دیر انتظار کیا۔ ارے رہنے دو۔ تمہارے اپنے گھر کا کام کم ہے' یہاں بھی لگ جاتی ہو۔ میں تو خود ہی ہمت کر کے صفائی شروع کرنے والی تھی۔" آسیہ بانو نے جائے نماز لپیٹ کر رکھی' اور اسے صفائی میں جتا دیکھ کر بات بنائی۔

"ہائے بڑھاپا اور میری بیماریاں۔" بولنے کو تو بول دیا۔ مگر گھٹنے کا درد جاگ اٹھا' انہیں شرمندگی نے آگھیرا۔

"خالہ جی یہ پوستی ماری زرینہ' آپ کی نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے۔۔۔ اس نے ہفتے میں ایک چھٹی کا وطیرہ بنا لیا ہے۔ ایک بار تنخواہ کاٹ کر دیکھیں' تیر کی طرح نہ سیدھی ہو جائے تو میرا نام بدل دیجئے گا۔" شاہا نے غصے سے بولتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا' پھر جھاڑو لگانا شروع کر دی۔

"نہ بٹیا اتنا پیارا نام ہے شاہا میں نہیں بدلتی۔" آسیہ بانو نے پکا منہ بنا کر اسے چھیڑا تو وہ ہنس دی۔

"خالہ جی میں سیریس ہوں۔" شاہا دوبارہ اصل مسئلے کی جانب پلٹی۔

"ہونہہ میں سوچتی ہوں۔۔۔ زرینہ اکیلی کمانے والی ہے' اس پر چھ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ' ایک دن کے پیسے کاٹ کر بھلا مجھے کون سے خزانے مل جانے ہیں۔" آسیہ بانو نے شاہا کے لیے لال شربت کھولتے ہوئے کہا تو وہ ان کی معصومیت پر ہنس دی۔

"میری بھولی خالہ وہ بہت تیز عورت ہے' آپ کی شرافت اور نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔" شاہا نے اپنے طور پر سمجھانا چاہا۔

"نہ بیٹا بلاوجہ کی بدگمانی نہیں کرتے۔" آسیہ سب کو اپنی طرح سمجھتی تھیں' اسے جھٹلایا۔ نظر کمزور تھی' پانی میں چینی اور شربت کم تھا' مگر چمچہ چلاتی رہیں۔

"اوہ میرے اللہ۔۔۔ پتا بھی ہے' آپ کی زرینہ بیگم اگلی بلڈنگ کے سب گھروں میں کام کر کے گئی ہے۔ اسے صرف یہاں آتے مصیبت پڑتی ہے۔" شاہا نے

انہیں سچائی بتائی۔

"اچھا! تمہیں کیسے پتا چلا؟" آسیہ بانو نے شربت کا جگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے حیرت سے آنکھیں جھپکیں اور پلیٹ میں شاہا کی پسند کے بسکٹ نکالے۔

"میں نے کالج سے واپسی پر اسے صائمہ باجی کے فلیٹ کے سامنے جھاڑو لگاتے دیکھا تھا وہ بڑی کام چور ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتی کہ ایک بیمار اور اکیلی عورت کیسے اتنا کام کرسکے گی؟" شاہا کا غصہ ان کے کمزور وجود کو دیکھتے ہوئے سوا نیزے تک جا پہنچا۔

"ہائیں میں اس سے کل پوچھوں گی۔" آسیہ بانو کو افسوس ہوا۔

"جی... نرمی نہیں، تھوڑا سخت لہجے میں ڈانٹیے گا۔ یہ آپ کی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ جو وہ اتنی سر چڑھ گئی ہے۔" شاہا نے منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر بسکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور انہیں سمجھانے کا کام بھی جاری رکھا۔

"آں... ہاں۔" آسیہ گڑبڑائیں، کسی سے سخت لہجے میں بات کرنا ان کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔

"ہونہہ، رہنے دیں آپ سے یہ کام نہیں ہونے والا۔ کل امی ہی اس سے نمٹیں گی پھر وہ اتوار والے دن کی چھٹی کرنا بھی بھول جائے گی۔" شاہا شرارتی انداز میں بولی اور مزے سے گرم اور پھیکا مشروب حلق سے نیچے اتارا، جس میں اس بوڑھی عورت کے خلوص کی چاشنی رچی بسی تھی۔

☼ ☼ ☼

دن بھر کا تھکا ماندہ سورج اپنا سفر ختم کرکے اونگھنے لگا، اس نے باہر جھانکا، سیاہی اجالے پر حاوی ہو رہی تھی، کچھ دیر پہلے پاکستان میں اماں سے بات ہوئی تھی، ان کے لہجے کی اداسی نے اس کے اندر بھی بے بسی کی کیفیت طاری کردی، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر منہ اوپر کیا، اکا دکا چمکتے ستاروں کی ناکافی روشنی اور دور تک پھیلی بے چینی، اسے اپنا آپ بھی برا لگا۔

ماں، باپ سے دوری نے اندر کی گھٹن کو بڑھا دیا تھا۔ مونا باجی کے جانے کے بعد وہ دونوں کتنے دکھی اور حساس ہوگئے تھے، اس پر بیٹے کا ایسا فیصلہ۔ ان کی مرضی کے خلاف وہ اتنی دور آتو گیا، ہر مہینے بڑی مستعدی سے معقول رقم ابا کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر بھی ہو جاتی، پھر بھی دل مطمئن نہیں ہوتا، ضمیر کچوکے لگاتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر تکلیف کا مداوا پیسے سے نہیں ہوتا، وہ اس مقام پر آکر مجبور ہوگیا۔

شاید یہ ذی جاہ کی خام خیالی تھی کہ چند سال... بس چند سالوں کی مشقت، کئی مشکلوں کا حل ڈھونڈ نکالے گی۔

اس کی شروع سے اپنے ابا سے بہت دوستی تھی، مگر جانے کیا ہوا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی باپ کو اپنے اور سویرا کے تعلق کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا، پر دلوں کے رابطے زبان سے ادا کیے گئے الفاظ کے محتاج نہیں ہوتے، ابا بن کہے بہت کچھ سمجھ گئے اور خاموشی سے اس کی راہ سے ہٹ گئے، مگر بھولی ماں ہر بار بیٹے سے وطن لوٹنے کی درخواست کرتی تو وہ چور سا بن جاتا، کسی ایک کے لیے راحت ڈھونڈتے ڈھونڈتے، اذیت کا سبب بن کر وہ الگ الگ حصوں میں بٹتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"خالہ جی امی نے آج آلو کے پراٹھے پکائے ہیں۔ یہ دو میں خالو کے لیے لائی ہوں، وہ شوق سے کھاتے ہیں نا۔" شاہا عادت کے مطابق پلیٹ پر اخبار میں لپٹے پراٹھے رکھ کر باہر سے ہی اعلان کرتی اندر گھسی۔

"نہ، نہ... بٹیا یہ کیا غضب کردیا فوراً واپس لے جاؤ، ان کو ڈاکٹر نے سختی سے گھی، تیل سے پرہیز بتایا ہے، اگر آگئے تو ایک منٹ میں کھا پی کے برابر کردیں گے۔" آسیہ بانو نے گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں... تو کھانے کے لیے ہی تو لائی ہوں۔" شاہا کھلکھلائی۔

"ان کو تو ہر وقت تلی ہوئی چیزیں کھانے کا چسکا ہے، اس کے بعد بھلے پوری رات مجھے جگاتے یا ٹہلتے

ہوئے گزرے۔" آسیہ بانو کا انداز زچ ہونے والا تھا۔

"ہائے اللہ... خالو کو ایک پراٹھا تو کھانے دیں، کبھی کبھی ڈاکٹر کی بات سنی ان سنی کر دینی چاہیے۔" شاہا نے پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر کرسی سنبھالتے ہوئے شہاب احمد پر ترس کھایا جو بیوی کی سختیوں کا شکار تھے۔

"واللہ... کیا خوشبو ہے بیٹی ہو تو تم جیسی، ایسی لذیذ چیزیں پکا کر لاتی ہو کہ دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔" شہاب احمد نے گھر میں گھستے ہی نتھنے سکیڑے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی۔

"ہوں... ہوں ہاتھ نہیں لگائیے گا۔" آسیہ بانو نے وارننگ دی مگر وہ پلیٹ پر قبضہ جما چکے تھے۔

"واہ... مزہ آگیا ورنہ تمہاری خالہ نے تو ہمیں کھانے پینے کو ترسا دیا ہے۔" شہاب احمد شاہا کو سراہتے ہوئے، بڑے بڑے نوالے بنا کر دونوں پراٹھے، ہری چٹنی سے چٹ کر گئے۔

"ہاں میں تو آپ کی دشمن ہوں۔" آسیہ بانو درمیان میں بولتی رہ گئیں، شاہا کا خالو کی تیزی دیکھ کر ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

"بانو ہم سے تو نہیں مگر اس پیٹ سے آپ کی ضرور کوئی دشمنی ہے۔" شہاب احمد نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور مسکرائے۔

"یہ ٹھیک ہے بھئی۔ ان کی وجہ سے میں خود بھی بلاوجہ پرہیزی پھیکے سیٹھے کھانے کھاؤں اور جناب بد احتیاطی کریں۔ خود کو اپنی صحت کی کوئی فکر نہیں تو مجھے کیا؟" آسیہ بانو ان دونوں سے روٹھ کر کونے میں جا بیٹھیں، شاہا کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا، شہاب احمد انجائنا کے مریض تھے، اسی لیے بانو خالہ پریشان رہتیں۔

"خالہ جی... سوری... میری غلطی تھی، پچ میں آئندہ ایسی کوئی چیز نہیں لاؤں گی جو خالو کو کھانا منع ہو۔" شاہا نے شہاب احمد کے اشارے پر آسیہ بانو کے برابر میں بیٹھ کر منانا شروع کیا مگر انہوں نے منہ پھلائے رکھا۔

"ارے بچی سے غلطی ہو گئی۔ اب مان بھی جائیں۔" شہاب احمد کے شرارتی انداز پر وہ جل بھن گئیں۔

"مجھے شاہا سے کوئی شکایت نہیں۔ مگر آپ کو سمجھنا چاہیے، ہم دونوں یہاں اکیلے رہتے ہیں، اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو گیا تو میں کہاں پریشان ہوتی پھروں گی۔" آسیہ بانو روہانسی ہوئیں۔ شہاب احمد نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"خالہ جی، میں ہوں نا، آپ دونوں اکیلے کہاں ہیں۔ کیا میں آپ کی کچھ نہیں لگتی؟" شاہا نے ان سے چمٹ کر منہ پھلا کر جذباتی کرنا چاہا تو بانو نے شاہا کی صبیح پیشانی پر چٹاچٹ کئی بوسے لے ڈالے۔ شہاب احمد بھی مسکرا دیے۔

"میری بٹیا رانی۔ تمہارے دم سے تو اس گھر میں رونق ہے۔" آسیہ بانو نے اسے کس کر لپٹایا، دل سے دکھ کے سارے بادل چھٹ گئے۔ دونوں کی نگاہیں بیک وقت اٹھیں اور سامنے لگی ذی جاہ کی بڑی سی تصویر پر جم گئیں۔ وہ مسکراتا ہوا بڑا وجیہہ لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
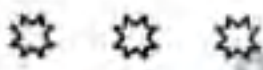
تھوڑی دیر قبل ذی جاہ کی سویرا سے بات ہوئی تھی، اس کی خوشی مایوسی میں ڈھل گئی، ہر بار ایک جیسے تقاضے، ایک سی باتیں، وہ جو پہلے سویرا کی محبت کی شدتوں سے ڈرتا تھا، اب اس کے اندر کی مادیت پسندی کے بڑھتے جنون سے خوف زدہ ہونے لگا تھا۔

پہلے اس کی باتوں کا محور ذی جاہ کی ذات ہوتی تھی، وہ ہمیشہ ذی جاہ کو یہ ہی باور کراتی آئی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ مگر اب اس کا بدلتا لہجہ ذی کے اندر بے چینی کو ہوا دینے لگا۔

"کہاں گم ہو یار... قہوہ پی لو۔" ناصر نے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور جانچتے ہوئے پوچھا، وہ ابھی کام سے واپس لوٹا تھا اور دو کپ قہوہ بنا کر اس کے برابر میں آ کر کھڑا ہوا۔

"کچھ نہیں یار... بس ایسے ہی۔" اس نے بارہویں فلور کی کھڑکی سے باہر جھانکا، روشنیوں کا

سیلاب سا اُمڈا آرہا تھا۔

"مجھ سے بھی چھپاؤ گے۔" ناصر نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔

"جو تم ساری باتیں جانتے تو ہو۔ اماں وہاں پریشان ہیں۔ ادھر سویرا کا جلدی مچانا۔" وہ اپنے دل کا بوجھ دوست کے سامنے ہلکا کرنے لگا۔

"مجھے تو اس لڑکی پر حیرت ہوتی ہے' جو عشق کے اتنے بڑے بڑے دعوے کرنے کے باوجود' تمہاری چھوٹی سی پریشانی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی۔" ناصر نے منہ بنایا۔

"مشکل یہی ہے کہ سویرا میری کوئی بات سمجھنے کو تیار نہیں' جو کچھ مجھے نظر آتا ہے' وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔" ذی جاہ احمد نے جلبلا کر کہا۔ ناصر کی ہنسی چھوٹ گئی' وہ اپنے روم میٹ اور دوست کی مشکل سمجھتا تھا' ایک طرف محبت تو دوسری طرف ماں باپ۔

"یار اگر وہ منھی بنی ہوئی ہے تو تم اپنے مسائل پر اس سے منہ کھول کر بات کرو۔" ناصر سے ذی کی اتری صورت دیکھی نہیں گئی۔

"کیا سمجھاؤں... سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں تو صرف یہاں کی چکاچوند کے خوابوں سے جگمگاتی ہیں' میں جب بھی اسے زندگی کا دوسرا رخ دکھانا چاہتا ہوں' وہ جھٹ سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔" ذی جاہ نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی' ناصر نے اسے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"اب تو دماغ پھٹنے لگا ہے۔" ذی جاہ نے بالوں کو مٹھی میں بھر لیا۔

"مجھے لگتا ہے تمہیں ایک بریک کی ضرورت ہے۔ پیسہ کمانے کے چکر میں تم کافی عرصے سے پاکستان نہیں گئے۔ اچھا ایک کام کرو' چھٹی لے کر کچھ عرصے کے لیے گھر چلے جاؤ' آنٹی انکل کے ساتھ وقت گزارو۔ خود میں نئی توانائی محسوس کرو گے۔" ناصر نے مشورہ دیا تو وہ سر ہلانے لگا۔

"ہاں یار' ابا آج کل کافی بیمار رہنے لگے ہیں۔ اب تو جانا ہی پڑے گا۔" وہ جو ہچکچا رہا تھا' ایک دم حتمی فیصلے تک جا پہنچا۔

"اچھا ایک کام کرنا۔ جانے سے پہلے یہاں سے محترمہ کے معیار کی ڈھیروں امپورٹڈ اشیا کی شاپنگ بھی کر لینا' امید ہے کہ اپنی پسند کے تحفے پا کر' وہ تمہاری پریشانیوں کو سکون سے سن لے۔" ناصر نے کچھ سوچ کر کہا تو ذی کو اس کا مذاق اڑاتا لہجہ عجیب لگا۔

سویرا کی مادیت پسندی ناصر پر بھی ظاہر ہونے لگی تھی' ذی جاہ کو دکھ ہوا مگر وہ سچ بول رہا تھا' اس لیے برداشت کرنا پڑا۔

"ایک بات اور یاد رکھنا ہر بات فطری انداز میں وقت پر ہونے دو' یہ جو تم زبردستی اپنا قدم بڑھانے کی کوشش کر رہے ہو' ایسا نہ ہو کہ ایک دم نیچے گر جاؤ' میں جانتا ہوں کہ اونچائی سے نیچے کی طرف جانے کے عمل کی اذیت سہنا تمہارے بس کی بات نہیں' اس لیے سویرا جیسا بننے سے بہتر ہوتا کہ تم اسے اپنے رنگ میں ڈھال لیتے۔ جانتے ہو نا تمہاری ذات سے دو بوڑھے افراد بھی جڑے ہوئے ہیں۔ بھلے میری بات تمہیں ابھی بری لگ رہی ہے۔ مگر آنے والی زندگی کی مسافتیں تمہیں بہت کچھ خود ہی سکھا دیں گی۔" ناصر نے اٹھتے اٹھتے بڑی سنجیدگی سے کہا تو وہ سوچ میں گم ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

ذی جاہ بغیر اطلاع دیے پاکستان پہنچ گیا' اپنے فلیٹ کے دروازے کے سامنے بڑا سا سوٹ کیس رکھ کر سکون کی سانس لی' دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا' کھٹ سے دروازہ کھلا' آسیہ جو چادر پہن کر ہاتھ میں ٹوکری لیے کہیں جانے کے لیے باہر نکل رہی تھیں' بیٹے کو سامنے کھڑا دیکھ کر بھونچکا رہ گئیں۔

"میری پیاری اماں" بیٹا لپک کر ماں سے لپٹ گیا' صحرا سے نخلستان تک پہنچنے کا سرور وجود میں دوڑنے لگا۔

"ایسے اچانک' اطلاع تو دے دیتے۔" اس کی یوں آمد پر آسیہ کے منہ سے خوشی کے مارے الفاظ ہی

نہیں نکل رہے تھے۔ کبھی اس کے لمبے چوڑے وجود کو اپنی کمزور سی بانہوں میں چھپاتیں تو کبھی ماتھے پر بوسہ لینے لگ جاتیں' وہ انہیں ساتھ لگائے لگائے اندر داخل ہوا۔

"خالہ جی کون آیا ہے؟" باہر کی ہلچل پر شاہا کو تجسس ہوا کچھ دیر بعد شور مچاتی کچن سے باہر نکلی۔

"اوہ... آپ۔" سامنے کھڑے ذی جاہ کو دیکھ کر ایک دم جھجک کر پیچھے ہو گئی' وہ تو تصویر سے بھی زیادہ خوبرو نکلا تھا۔

گلابی دوپٹے کے ہالے میں 'شفاف' بھولا' معصوم سا چہرہ' وجود پر کم عمری کی چھاپ' چمکدار آنکھیں' گلابی لبوں پر بے ریا سی مسکراہٹ' وہ بھی حیرانی سے کچن کے دروازے پر کھڑی اجنبی لڑکی کو گھورنے لگا' جس کے ہاتھ آٹے سے سنے ہوئے تھے اور وہ بڑے استحقاق سے اس کے گھر میں موجود تھی۔

"شاہا بیٹا' ذی کے لیے شربت بنا لاؤ۔" آسیہ نے اسے دیکھ کر ہدایت دی تو وہ واپس مڑ گئی۔

"یہ لیں۔" شاہا نے شیشے کا جگ گلاس اس کے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھا' ذی نے ایک سانس میں شربت پیا جو اس کی ماں کی تواضع کا پسندیدہ انداز تھا۔

"بیٹا تھک گئے ہو گے۔ جاؤ جا کر نہا لو' تمہارے ابا بھی نماز پڑھ کر آنے والے ہیں' میں اس کے بعد کھانا لگاتی ہوں۔" آسیہ نے بیٹے کو ٹہوکا دیا۔

"جی اماں میں نے تو یہاں آنے کے شوق میں پلین میں لنچ بھی نہیں کیا۔ گھر کا کھانا کھائے ہوئے اتنا ٹائم جو ہو گیا۔" سوٹ کیس اٹھا کر اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے اس نے اشتیاق سے مڑ کر کہا۔

"اب کیا کروں... ؟ میں نے تو صرف کریلے پکائے ہیں' ذی تو چھوئے گا بھی نہیں" آسیہ نے شاہا کو دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

"خالہ جی میں ایک منٹ میں آئی۔" شاہا نے دانتوں میں انگلی دبائی' پھر انہیں ہکا بکا چھوڑ کر جلدی سے باہر دوڑ لگا دی۔

☆ ☆ ☆

"واہ اماں! مزہ آگیا' کتنے دنوں بعد آپ کے ہاتھوں کا بنا یخنی پلاؤ اور سویاں کھائی ہیں۔" ذی جاہ نے پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد مسکرا کر ماں کو دیکھا۔

"لو جی! تم بھی دھوکا کھا گئے... ارے یہ سب تو شاہا بیٹی کے ہاتھوں کا جادو ہے۔ اب تمہاری اماں میں اتنی سکت کہاں ہے جو وہ ایسی مداراتیں کرتی پھریں۔" شہاب احمد نے مسکرا کر بیوی کو چھیڑا۔

"ہاں... ہاں کیوں کروں؟ آپ کو تو بس روزانہ قورمہ' بریانی کھانے کا دل چاہتا ہے' بھلے اس کے بعد سینہ مسلتے پھریں۔" آسیہ بانو نے فوراً" بدلہ لیا... ذی جاہ ہنستا چلا گیا' کتنے عرصے بعد ایسے اپنائیت بھرے ماحول کا لطف اٹھایا تھا۔

"ابا... یہ تو "بری بات ہے" اماں آپ کی صحت کے خیال سے ہی تو روکتی ٹوکتی ہیں۔" ذی جاہ نے باپ کو اشارہ کرتے ہوئے ماں کا دل رکھا۔

"میرے بچے' یہ اپنے ساتھ دشمنوں والا سلوک کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کی ساری ہدایات کھانے کی ٹیبل پر بیٹھتے ہی بھول جاتے ہیں۔ مجھ پر بس نہیں چلتا تو بیچاری شاہا سے چپکے چپکے فرمائشی پروگرام چلاتے ہیں۔" آسیہ بانو نے بیٹے کو سامنے پا کر شوہر کی ساری شکایتیں لگانا شروع کر دیں۔ ذی کا ذہن دوبارہ شاہا پر جا اٹکا۔

"اچھا... ویسے یہ محترمہ کون ہیں' جنہوں نے میرے ابا اماں پر پکا قبضہ جمایا ہوا ہے" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں... ذی کہتا تو تو سچ ہے۔ واقعی اس لڑکی نے ہم دونوں بوڑھا بوڑھی پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو دکھ بیماری میں ہماری دیکھ بھال کون کرتا؟ بڑی ہی نیک لڑکی ہے' دن میں کئی بار آتی ہے اور بغیر جتائے گھر کے بہت سارے کام چپ چاپ کر کے چلی جاتی ہے۔ میرے دکھ سکھ بھی سن لیتی ہے۔ ورنہ اکیلا پن مجھے دیمک کی طرح چاٹ جائے۔" شاہا کو سراہتے ہوئے شکوہ ان کی آنکھوں سے ٹپکا' بیٹے پر نگاہ پڑ گئی۔

"اصل میں پرویز کلیم کی فیملی تمہارے ابو دبئی

جانے کے چند ماہ بعد ہی ہمارے برابر والے فلیٹ میں شفٹ ہوئی ہے اس لیے تمہاری ان لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکی" شہاب احمد نے بیٹے کو شرمندہ دیکھا تو جلدی سے بات بدلی۔

"ان لوگوں کے بارے میں فون پر بتایا تو تھا" شوہر کی تنبیہی نگاہوں پر آسیہ نے بھی سنبھل کر یاد دلایا۔

"اچھا بتایا ہو گا مگر مجھے یاد نہیں۔" وہ ذہن پر زور دینے لگا' وہاں کی زندگی اتنی مصروف اور تھکا دینے والی تھی کہ وہ ماں کا دل رکھنے کے لیے لمبی لمبی کال تو کرتا' ان کی ساری باتیں بھی سنتا' مگر نیند میں آدھی باتیں اس کے سر پر سے گزر جاتیں۔

"ویسے اماں ایک بات ہے۔ کھانا بالکل آپ کی طرح پکاتی ہے... میں تو دھوکا کھا گیا" ذی نے چٹخارہ بھرا تو شہاب احمد ہنس دیے۔

"ہاں تو کیوں نہ پکائے... میں نے ہی تو اسے سب کچھ سکھایا ہے۔" آسیہ اپنی تعریف پر خوش ہو کر بولیں۔

"واہ... جب ٹیچر اتنا اچھا ہو گا تو بات کیسے نہیں بنے گی" ذی نے باپ کو دیکھتے ہوئے ماں کو مسکا لگایا۔

"بچی کرے بھی تو کیا' دس بھائی بہن ہیں۔ بیچاری ماں کے اپنے جھمیلے۔ شروع میں تو اسے چائے تک بنانا نہیں آتی تھی' میری طبیعت خراب ہوئی تو۔ اس نے انسانی ہمدردی کے تحت ایک دو دفعہ کھانا پکانے کی کوشش کی' تمہارے ابا کی زبان اس عمر میں بھی تر نوالے مانگتی ہے' برے برے منہ بنا کر اس کی کچی پکی روٹی حلق سے اتارنے لگے' وہ شرمندہ ہو گئی' بعد میں ایک دن خود ہی بولی' خالہ جی آپ کے ہاتھ میں کتنا ذائقہ ہے۔ مجھے بھی اپنے جیسے کھانے پکانا سکھادیں۔ بس پھر میں نے اس کی تربیت کی ٹھانی' ماشاءاللہ بچی نے سال بھر میں سب سیکھ لیا۔ اب تو مجھ سے بھی اچھا پکانے لگی ہے۔ ساتھ ساتھ کپڑے سینے پرونے میں بھی ماہر ہو گئی ہے" آسیہ نے تفصیل سے ساری بات بیٹے کے یوں گوش گزار کی کہ اس کے کانوں میں

خطرے کی گھنٹی بجی۔ سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ تو چہرے پر شاہا کے لیے خالص محبت بھری چمک دکھائی دی۔

"کاش شادی کے بعد سویرا اور اماں میں بھی ایسی دوستی قائم ہو جائے" ذی جاہ نے دل سے وہ دعا مانگی' جس کے قبول ہونے کا اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔ ایک دم گھبرا کر چہرہ ماں کی گود میں چھپا لیا جو عادت کے مطابق شاہا کی تعریفوں میں مگن تھیں۔

"آج ہی دیکھ لو۔ جب تم اچانک آگئے تو میرے ہاتھ پیر پھول گئے' اتنی جلدی کیا پکاؤں' مگر شاباش ہے اس بچی پر دوڑ کر گھر سے ٹکرے لے کر آئی' گوشت کی یخنی چڑھائی' دوسری طرف گھی میں سویاں بھون کر اس کا زردہ بنایا' سلاد اور رائتہ تیار کیا۔ بس اسے ایک گھنٹا لگا اور سارا انتظام ہو گیا" آسیہ بانو کے لہجے میں اپنی شاگرد کے لیے فخر بول رہا تھا۔

"اچھا جی! یعنی اب سب کچھ شاہا ہے' بیٹے کی یاد بھی نہیں آتی" ذی اس لڑکی کے تواتر سے جاری ذکر پر بور ہونے لگا تو منہ بنا کر شکوہ کیا۔

"ایسی بات نہیں... بیٹا تم تو ہمارا اپنا خون ہو۔ ہم تم کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ مگر میں اس معاملے میں تمہاری اماں کی تائید کروں گا' ایسے خود غرضی کے دور میں جب لوگ بنا مطلب کے بات کرنا پسند نہیں کرتے' وہ ہمارا اتنا خیال رکھتی ہے' شاہا نے ہمارے دل جیت لیے ہیں' ایسے خالص جذبے اب کہاں میسر ہیں" شہاب احمد نے ٹیبل سے ٹوتھ پک اٹھاتے ہوئے بظاہر سرسری بات کی' مگر کچھ خاص جتاتا سا انداز تھا' وہ چونک اٹھا' باپ کو بچپن سے جانتا تھا اس کا دل ایک دم پریشان ہونے لگا۔

☼ ☼ ☼

ذی جاہ کو اپنے والدین سے بڑی شدید محبت تھی' بڑی بہن مونا کے بھری جوانی میں کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر موت کے منہ میں جانے کے بعد سے وہ تینوں ہی ایک دوسرے کے لیے جینے کی وجہ بنے ہوئے تھے۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر وہ ہمیشہ چھوٹا سا

بچہ بن جاتا' بہن کا غم بھلائے نہیں بھول رہا تھا' ایسے کٹھن وقت میں' اچانک سویرا اس کی زندگی میں شامل ہوئی اور ذی کو اس حد تک اپنا اسیر کر لیا کہ وہ ایک لمحہ بھی اس کے بغیر رہنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ سویرا نے اس کے دکھی دل پر اپنی محبت کے پھائے رکھ کر گویا اسے خرید لیا۔

مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب ذی جاہ اپنے اور اس کے درمیان فرق سے اچھی طرح سے باخبر ہوا' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پیچھے ہٹنے لگا۔

ذی جاہ مڈل کلاس سے تعلق رکھتا تھا' سویرا کے شاندار فیملی بیک گراؤنڈ سے آگاہ ہونے کے بعد اسے شدید دھچکا پہنچا۔ وہ سمجھ گیا کہ طبقاتی فرق آگے جا کر جدائی کی وجہ بن سکتا ہے۔ منصور شیخ کا کروفر اس سے برداشت نہیں ہوا' جانے ان دونوں کے والدین اس رشتے کے لیے آمادہ ہوں یا نہ ہوں۔ کئی طرح کے خدشات اس کے اندر سر اٹھانے لگے۔ جدا ہونے کی بات سن کر سویرا منصور کی انا مچل اٹھی اسے ذی جاہ کی محبت سے دست برداری عجیب لگی' جو چند مہینوں سے ان کے بیچ' پنپ رہی تھی۔

سویرا نے کچھ سوچ کر بڑی محبت سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی وفا کا یقین دلایا' ذی کے مضبوط ہاتھوں پر نرم و گداز ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ کا پختہ یقین دلایا تو وہ مجبور ہو گیا' تمام شکوک کو سر جھٹک کر دل سے نکال دیا اور سویرا سے الگ ہونے کا ارادہ بدل دیا۔ اس کے مزید سمجھانے پر مستقبل کو مستحکم بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو گیا۔

اپنے پیار کے حصول کے لیے ایسی کڑوی گولی نگلنے پر مجبور ہوا' جس میں والدین سے دور جانا پڑا۔ اسے سویرا پر بڑا مان تھا' وہ اپنے لیے سویرا کی محبت اور جنون سے بخوبی واقف تھا' اسے یقین تھا کہ شادی کے بعد وہ بیوی کی حیثیت سے اس کے والدین کا بہت زیادہ خیال رکھے گی' مگر اس سے قبل منصور شیخ کی نگاہوں میں مقام بنانا ضروری تھا' اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ماں باپ کو بھی دنیا بھر کا سکھ دینا چاہتا تھا۔ اسی لیے دبئی کی ایک بڑی کمپنی سے آنے والی جاب کی پرکشش آفر کو قبول کر لیا۔

☼ ☼ ☼

"بانو آپا دروازے پر کیوں کھڑی ہیں... آیئے نا" آسیہ نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا تو فرزانہ نے انہیں بلا لیا۔

"وہ... شاہا آج پورے دن سے دکھائی نہیں دی۔ مجھے فکر ہوئی کہ کہیں طبیعت تو خراب نہیں؟" آسیہ کی نگاہیں' چاروں طرف شاہا کو ڈھونڈنے لگیں۔

"بس آپا اندر پڑی ہے" فرزانہ نے نگاہیں چرائیں' آسیہ کو لگا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔

"کیا ہوا ہے؟ وہ ایسی لڑکی تو نہیں جو بستر پکڑے لیٹی رہے" آسیہ نے فرزانہ کو ٹٹولا۔

"آپا... کیا پوچھتی ہیں... یہ آج کل کے بچے' کسی کی ایک نہیں سنتے۔ بس خود کو عقل کل سمجھتے ہیں۔" فرزانہ نے سر پر ہاتھ مار کر ابلتے غصے کو دبایا۔

"ایسی کیا بات ہو گئی؟" آسیہ کے مجبور کرنے پر فرزانہ ایک دم شروع ہو گئیں۔

"اب دیکھیں اس کی پھوپھو' رفیعہ اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی مگر شہزادی کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔ بھلا بتائیں۔ اس کے بعد بھی اوپر تلے کی تین بیٹیاں ہیں' ایک کو دھکا دوں گی تو دوسری اس کی جگہ آ کھڑی ہو گی۔" فرزانہ کے درد بھرے انداز پر آسیہ سُن رہ گئیں' انہوں نے تو کبھی شاہا کی شادی کا سوچا ہی نہ تھا۔

"اچھا... رفیعہ اپنے دوسرے نمبر والے بیٹے کا رشتہ لائی ہے۔ کیا کرتا ہے وہ؟" آسیہ نے دماغ پر زور دے کر پوچھا۔

"نہیں' رفیعہ آپا شاہنواز کا رشتہ لے کر آئی ہیں" فرزانہ ایک دم بجھ سی گئیں' بڑی مشکل سے بولیں۔

"بڑے والے شاہنواز کا... مگر اس کی تو ایک سال پہلے شادی ہو چکی ہے۔ بیوی کا نام غالباً" سلمٰی ہے نا" وہ بھونچکی رہ گئیں' ان کی رفیعہ سے بھی سلام دعا تھی'

شاہنواز کی شادی میں وہ بھی شریک ہوئی تھیں' اسی لیے ساری باتیں یاد آگئیں۔

"جی۔۔۔ اسی سے شادی کا ارادہ ہے" فرزانہ نے دھیرے سے نگاہیں نیچی کرکے سرہلایا۔

"ہائے اللہ! تم کیا سوکن پر بیٹی دے رہی ہو۔۔۔ وہ تو اپنی شاہا سے عمر میں بھی اتنا بڑا ہے" آسیہ نے سینے پر ہاتھ مارا اور دکھی ہو کر پوچھا۔

"نہیں آپا! اس کی اپنی بیوی سے بنی نہیں' سلمیٰ بہت زبان دراز عورت نکلی' شاہنواز بھی مزاج کا گرم ہے۔ جھگڑا تو کافی دنوں سے چل رہا تھا۔ آخر پچھلے مہینے شاہنواز نے بیوی کو طلاق دے دی" فرزانہ نے وہ بھید کھول ہی دیا' جو چھپایا نہیں جا رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ مگر ایک بات یاد رکھنا' لڑائی جھگڑوں میں صرف ایک فریق کی غلطی نہیں ہوتی اور تم تو خود کہہ رہی ہو کہ شاہنواز تیز مزاج کا ہے' پھر ایسی جگہ بیٹی بیاہتے تمہارا دل نہیں ڈر رہا۔" آسیہ نے فرزانہ کو عجیب نظروں سے دیکھا۔

"آپا' آپ کیا سمجھتی ہیں۔ مجھے شاہا سے محبت نہیں' ارے نو مہینے پیٹ میں رکھنے کی تکلیف میں نے ہی سہی ہے۔ مگر کیا کروں اس تین کمروں کے فلیٹ میں رشتے کے لیے قدم رکھنے والے پہلے ہی سمجھ جاتے ہیں کہ یہاں سے من چاہا جہیز ملنے کی کوئی امید نہیں' شاہا کے ابا نرے ایک ایماندار سرکاری نوکر' بچوں کو سدا حق حلال کا نوالہ کھلایا۔ اب شادی کے لیے اتنا سارا پیسہ کہاں سے جوڑیں؟ پھر ایک بیٹی تھوڑی ہے۔ اس لیے شاہا کو گھر میں بٹھا کر بوڑھا کر دینے سے بہتر ہے کہ جیسے تیسے بیاہ دیا جائے۔ ویسے بھی' رفیعہ آپا تو دو جوڑوں میں نکاح پڑھانے پر تیار بیٹھی ہیں۔" وہ اداسی سے بولیں' پھر دوپٹہ میں منہ چھپا کر پھپک کر رو دیں۔

"ہاں۔ کہتی تو سچ ہو۔ پھر بھی بیٹی کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھانا' شاہا بہت پیاری بچی ہے' کہیں اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔" آسیہ بانو کے لہجے میں دکھ سمٹ آیا' بڑھ کر فرزانہ کے کاندھے کو تھپکا اور سر جھکا کر واپس جانے لگیں۔

"آپا۔ ایک منٹ بات سننا" فرزانہ کی پکار پر ان کے بڑھتے قدم زمین پر جم گئے۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ شاہا بہت محنتی اور صابر بچی ہے۔ میرا مطلب ہے' جس گھر میں جائے گی' اسے روشن کردے گی اگر کوئی ایسا گھرانہ نگاہ میں ہو۔۔۔ جو سادگی سے اسے رخصت کرا کر لے جائے تو میں آج ہی رفیعہ آپا کو انکار کہلوا دوں۔" فرزانہ کا پسینہ پسینہ ہو کر ہاتھ ملنا' ملتجی انداز' وہ سوچنے پر مجبور ہو گئیں۔

"یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔" کچھ سوچ کر چہرہ ایک دم کھل اٹھا' جاتے جاتے آس کے جگنو فرزانہ کو تھما گئیں۔

☼ ☼ ☼

ذی جاہ وطن پہنچنے کے بعد پہلی فرصت میں سویرا سے ملاقات کے لیے بے چین ہو اٹھا' اسے کال ملا کر اپنے آنے کی خوش خبری سنائی اور ملنے کے وقت کا تعین کرکے اس کے گھر جا پہنچا۔

"مما' پاپا اب میری شادی کے معاملے پر بہت سیریس ہو گئے ہیں۔" سویرا نے اسے چائے پکڑاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ذی جاہ کو اس بار کی ملاقات میں سویرا کے رویے میں ہمیشہ جیسے والہانہ پن کی کمی محسوس ہوئی' شاید دوری نے محبت کا سحر کم کر دیا تھا۔

"ایک منٹ تم شاید بھول گئیں میں نے تم سے پورے پانچ سال کا وقت مانگا تھا۔ ابھی کافی وقت باقی ہے۔" ذی جاہ نے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی اور بھاپ اڑاتی گرم چائے کو لبوں سے لگا کر خود کو جلالیا۔

"میں کچھ نہیں بھولی۔۔۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے مگر حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ویسے بھی میرے والدین ہمارے عہدوپیاں کے پابند نہیں ہیں۔ وہ اپنے دوست کے بیٹے سے میری شادی کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔" سویرا کے نرم و نازک ہونٹوں سے ایسی سخت باتیں سن کر وہ امتحان میں پڑ گیا۔

"یہ وقت بھی آنا تھا" ذی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے

سوچا۔ ڈھلتی شام کے سنہرے پن نے سویرا کے وجود کو اپنے اندر سمو کر حسین تر بنا دیا تھا۔

"سویرا۔ ایک بات بتاؤ میں اپنا وطن ماں باپ اور لگی لگائی اتنی اچھی جاب چھوڑ کر باہر کمانے کیوں گیا؟"

ذی کی نگاہیں اس پر تھیں دھانی شرٹ اور بلیک ٹراؤزر سویرا پر بہت جچ رہا تھا کالے گھنے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا نازک سی گردن پر کالا تل گلے میں پڑی سنہری زنجیر اس میں جھولتا "ایس" کا پینڈینٹ وہ سویرا کا اتنا عادی ہو چلا تھا کہ جدائی کا تصور ہی اس کا دل بند کر دینے کے لیے کافی تھا۔

"جی جناب... کیوں گئے؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اترائی۔

"میری جان کی دشمن۔ صرف تمہارے لیے۔ وہاں جا کر خود کو انسان سے پیسہ کمانے والی مشین میں ڈھال لیا... تاکہ جب تمہارا ہاتھ مانگنے آؤں تو انکل آنٹی کے پاس انکار کا کوئی جواز نہ رہے اتنی تگ و دو کے باوجود میں اس پوزیشن میں نہیں آسکا کہ تمہارے سارے خواب ایک جھٹکے میں پورے کر سکوں اس لیے مجھے ابھی مزید وقت درکار ہے۔" ذی نے اپنی چوڑی پیشانی پر ابھری ہوئی رگ انگلی سے دبائی جو اس کے ذہنی خلفشار کی عکاسی کر رہی تھی۔

"ساری باتیں مانتی ہوں... مگر میرے گھر والے ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ ویسے بھی ان کے پاس تم سے بہت بہتر آپشن موجود ہے۔" سویرا کا انداز اس کے دل پر لگا۔

"اپر کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود اگر تم اتنی ہی مجبور ہو گئی ہو تو اپنے والدین کی مرضی پر سر جھکا دو۔" وہ ایک دم بھڑک اٹھا اور جانے کے لیے کھڑا ہوا سویرا تھوڑا گھبرائی پرانا تعلق روگ نہ بن جائے۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا مگر تم بھی تو سمجھنے کی کوشش کرو" سویرا نے بالوں کو اٹھا کر جوڑے کی شکل دی۔

"اچھی طرح سے سمجھ گیا ہوں۔ اب مجھے اجازت دو۔ ایک دوسرے کا وقت برباد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

ذی جاہ کا وہی اکھڑ انداز جس پر سویرا کو بھی ٹوٹ کر پیار آتا تھا۔

"پرانا تعلق ایک لمحے میں توڑنا آسان نہیں۔" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے اس کے نزدیک آئی۔

"ذی... میں ایک بار پھر پاپا مما سے بات کرتی ہوں... تمہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو... ان لوگوں کو بہت دنوں تک روکنا میرے بس کی بات نہیں بعد میں مجھ سے کوئی گلہ نہ کرنا۔" سویرا نے بڑھ کر محبت سے اس کا ہاتھ تھاما اور تلخی ہوا ہو گئی۔

"اچھا بابا میں خود کب تم سے جدا ہونا چاہتا ہوں۔" اونچا لمبا خوبرو سا ذی جاہ اس نازک سی گڑیا کے لمس سے پرسکون ہونے لگا سویرا کی محبت بپھرے ہوئے سمندر جیسی تھی جتنی تیزی سے لہریں ساحل تک آتیں اتنی ہی تیزی سے واپس لوٹنے کو بے تاب ہو جاتیں۔ اسے ابھی تک اس بات کا ادراک ہی نہیں ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بیٹا۔ اگر فری ہو تو مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" آسیہ نے اس کے صوفے پر بیٹھتے ہی بے قراری سے پوچھا۔ وہ ابھی چند لمحوں قبل باپ کے ساتھ واک کر کے واپس آیا تو ماں کو جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر سے ادھر ٹہلتے دیکھ کر تھوڑا حیران ہوا۔

"جی اماں! کیا بات ہے؟" ذی صوفے پر آرام دہ انداز میں لیٹ کر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

"وہ... دیکھو منع نہیں کرنا۔" آسیہ کی جھجک۔ اس نے بغور دیکھا۔

"خیر تو ہے۔ آپ بڑی پریشان لگ رہی ہیں؟" ذی نے ماں کے قریب ہو کر ہاتھ تھپتھپا کر حوصلہ دیا۔

"وہ شاہا۔ بڑی مشکل میں گرفتار ہے... تم ہی اسے بچا سکتے ہو۔" انہوں نے بے قراری سے کہا۔

"اف پھر وہی شاہا... اماں... میں کیا لائف گارڈ ہوں... خیر کیا ہوا؟" وہ پہلے تو چڑا پھر آسیہ کی روہنکی شکل دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"بیٹا... میں نے تو جب سے سنا ہے۔ دل ڈوبا جا رہا ہے۔ اتنی پیاری بچی کو اس کی ماں ناقدروں کے حوالے کر رہی ہے۔ بھلا بتاؤ وہ ایک دوہاجو کی بیوی بننے جا رہی ہے۔ یہ ظلم ہے کہ نہیں؟" انھوں خشک ہوتے گلے کے ساتھ جلدی جلدی بتایا۔

"واٹ ربش! یہ تو بڑی غلط بات ہے۔" ذی جاہ پر افسوس اور غصے کی ملی جلی کیفیت طاری ہوئی، شہاب احمد جو ابھی وضو کر کے لوٹے تھے، بیوی کی بات سننے بیٹھ گئے۔

"وہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں... اگر تم حامی بھر لو تو میں ابھی جا کر فرزانہ سے شاہا کا ہاتھ مانگ لیتی ہوں۔" آسیہ نے ایک بہت بڑا سا بم عین اس کے سر پر لا پھوڑا، وہ منہ دیکھتا رہ گیا۔ شہاب احمد نے الگ حیران ہو کر ان دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔

"بولو بیٹا! تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔" اس کی خاموشی پر آسیہ نے کاندھا ہلا کر پوچھا۔

"میں کیسے ان کی آس توڑوں؟" ماں کے کپکپاتے ہاتھ دیکھ کر اسے شرمندگی نے گھیر لیا، مگر وہ اس بات کے لیے کیسے اقرار کر لیتا، جو اس کے اختیار سے باہر تھی۔

"اماں... مجھے معاف کر دیں، مگر میں کسی اور سے..." ذی کے منہ سے انکار سن کر، آسیہ کا چہرہ سپید پڑ گیا۔

"بانو... ہم اپنے اکلوتے بیٹے کو زور زبردستی کے رشتوں میں نہیں الجھائیں گے۔" شہاب احمد نے ہاتھ اٹھا کر بڑی سنجیدگی سے کہا تو آسیہ بانو نے سر تھام لیا۔

"آپ لوگ ایک بار سویرا سے مل تو لیں۔" ذی جاہ نے مجبوراً" قبل از وقت وہ بات کہہ دی۔ جس کا اس کے حساب سے ابھی وقت نہیں آیا تھا۔

"ٹھیک ہے ہم سویرا بیٹی سے ملنے کو تیار ہیں۔" شہاب احمد نے بیوی کا ہاتھ دبا کر کچھ کہنے سے روکا اور اپنی رضامندی دے دی۔

"شکر ہے یہ مشکل مرحلہ تو حل ہوا۔" اس نے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے خود کلامی کی۔

"شہاب صاحب... آپ نے اچھا نہیں کیا۔" آسیہ شوہر کا ہاتھ تھام کر رو پڑیں، ماں کی سسکیاں سن کر ذی جاہ کے دل پر بھاری بوجھ آن پڑا۔

☆ ☆ ☆

دن اپنے مخصوص تسلسل سے گزر رہے تھے، اس کے جانے میں دن کم رہ گئے تو۔ وہ سویرا کو ضد کر کے والدین سے ملوانے لے آیا۔

اس روز شام کی چائے پر، شہاب احمد اور آسیہ بانو مخصوص ٹیبل پر بیٹھے باتوں میں مصروف تھے، جب سویرا بڑے شاہانہ انداز میں ان کے تین کمروں کے فلیٹ میں داخل ہوئی اور اس ایک ملاقات میں اس نے اپنے بارے میں بہت کچھ باور کروا دیا۔ سویرا کا نخوت بھرا لیا دیا سا انداز، جہاں ان دونوں میاں بیوی کو ناگوار گزرا، وہیں ذی جاہ بھی گڑبڑا گیا، سب کچھ اس کی امیدوں کے برخلاف ہوا تھا۔

"یہ لیں گرما گرم پکوڑے۔ ہاتھ بڑھائیں جلدی سے کھائیں۔" شاہا صورت حال جانے بنا تڑے میں گرما گرم پکوڑوں کی پلیٹ اور سرخ چٹنی رکھ کر کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔

شاہا کے پاس اپنے حالات سے سمجھوتا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، سب کچھ اوپر والے پر چھوڑ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوششوں میں لگ گئی۔

"یہ کون ہے؟" سویرا نے چبھتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"اوہ..." شاہا کی زبان کو بریک لگ گیا، سامنے صوفے پر بیٹھی حسین و جمیل ماڈل ٹائپ لڑکی کو حیرانی سے دیکھا، جو اس ماحول میں خاصی اجنبی لگ رہی تھی۔

"کمال ہے، یہاں پرائیوسی نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔" سویرا نے ناک چڑھا کر شاہا کا مذاق اڑایا تو سب کو بہت برا لگا۔

"بیٹی... گھر والوں کے بیچ میں کیسی پرائیوسی، شاہا کوئی غیر نہیں، ہماری اپنی ہے۔" شہاب احمد نے مسکرا کر سویرا کو جواب دیا۔ خود کو جھٹلانے پر اس کا منہ سوج

گیا۔

"واہ بیٹی مزہ آگیا۔" شہاب احمد سے شاہا کی اتری صورت دیکھی نہ گئی تو گرم پکوڑے کو منہ میں رکھتے ہوئے تعریف کی۔ سویرا کو ایک معمولی لڑکی کے لیے خود کو نظرانداز کیا جانا بہت زیادہ برا لگا۔

"ذی! مجھے اب چلنا چاہیے۔" وہ نازک کلائی پر بندھی سنہری گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوکے چلو۔" ذی جاہ نے بھی رکنے پر اصرار نہیں کیا' ماحول پر چھائی ہوئی کثافت 'اسے یہ بات سمجھا گئی فریقین میں مفاہمت مشکل دکھائی دے رہی ہے۔

"میں 'سویرا کو نیچے تک چھوڑ کر آتا ہوں۔" ذی نے دھیرے سے کہا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔

"یہ لڑکی کافی مغرور لگ رہی ہے۔" آسیہ نے دل کی بھڑاس نکالی۔ ان سب کو سویرا کا تیکھا انداز پسند نہیں آیا تھا۔ شاہا بھی خاموشی سے اپنے گھر کی جانب چل دی۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ذی جاہ' ہمارے لیے ایسی بہو تلاش کرے گا' جس سے بات کرنے سے پہلے ہمیں دس بار سوچنا پڑے۔" آسیہ نے بھیگے لہجے میں کہا اور دکھ سے شوہر کی طرف دیکھا۔

"سویرا اور ہمارے بیچ تا عمر جھجک اور تکلف کا پردہ قائم رہے گا۔۔۔ اس گھر کو تو شاہا جیسی بہو کی ضرورت ہے وہ بالکل ہمارے جیسی ہے۔" آسیہ دل کی بات کہتے ہوئے صوفے پر ڈھے گئیں۔

"سچ کہہ رہی ہو'مگر یہ بھی سوچو' ہماری زندگی کتنے دن کی رہ گئی ہے 'اگر ذی' سویرا کے ساتھ خوش ہے تو پھر ہم اس پر اپنی مرضی کیوں ٹھونسیں۔" بیوی کی حالت دیکھ کر شہاب احمد بھی افسردہ ہو گئے' مگر سمجھانا ضروری تھا۔ ذی جاہ جو سویرا کو چھوڑ کر فلیٹ میں داخل ہو رہا تھا' ماں باپ کی بات سننے لگا۔

"میں نے ایسی لڑکی سے محبت کیسے کرلی' جس کی نگاہ میں پیسہ' انسانوں سے بڑھ کر تھا۔" ذی جاہ کو خود پر حیرت ہوئی' وہ اپنا احتساب کرتا چلا گیا۔ "کیا سویرا کا گزارا میرے والدین کے ساتھ ہو جائے گا۔۔۔؟"

ایک سوال سر اٹھائے اسے پریشان کرنے لگا۔

"اسے مجھ سے سچی محبت ہے۔ وہ میری خاطر ضرور ایڈجسٹ کرلے گی۔" ذی جاہ اس پوری رات اپنے دل کو طفل تسلیاں دینے میں لگا رہا۔ اضطراب حد سے بڑھنے لگا تو اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

"ذی جاہ۔۔۔ میں نے بڑی مشکل سے مما' پاپا کو منایا ہے۔" سویرا نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھاما' ذی جاہ آج اس کے بلاوے پر آیا تھا۔

"اچھا! گڈ' ایک بات کلیر کرو کیا تم شادی کے بعد میرے والدین کے ساتھ رہنے پر تیار ہو؟" ذی جاہ نے پہلے وہ کانٹا نکالا جو بری طرح سے کھٹک رہا تھا۔

"سوری ذی' میرے لیے یہ ممکن نہیں ہو گا۔ دراصل اس ماحول میں میرے لیے بہت دنوں تک خوش رہنا مشکل ہو گا۔" سویرا نے اپنی مخروطی انگلیوں کو مسلتے ہوئے کہا' تو وہ اس کے متضاد بیان پر چونک گیا۔

"اچھا۔۔۔ تو کیا ہماری محبت کا سفر یہیں اختتام پذیر ہوا۔" ذی جاہ نے اس کی آنکھوں میں اپنے پیار کو کھوجا' وہاں سرد مہری کی رمق دکھائی دی۔

"نہیں' ایسا بھی نہیں۔ مگر ہمارے ملنے کی ایک اور راہ ہو سکتی ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"وہ کیا؟" ذی جاہ نے سویرا کو تکتے ہوئے سوال کیا۔

"شادی کے بعد تم میرے گھر میں شفٹ ہو جاؤ' اس کے بعد مجھے بھی اپنے ساتھ دبئی لے جانا۔" سویرا سرخ ہونٹوں کو کچلتے ہوئے بولی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں صرف اپنی پڑی ہے۔۔۔ میرے والدین کی کوئی فکر نہیں۔" ذی جاہ نے بھنویں اچکائیں۔ چہرہ سرخ ہونے لگا۔

"ہاں۔۔۔ میں اس دقیانوسی ماحول میں نہیں رہ سکتی۔" سویرا نے آر یا پار ہونے کا سوچا اور دھڑلے سے سر ہلا دیا۔

"اگر تمہیں میری ذمہ داریوں سے کوئی مطلب نہیں تو پھر میرے ساتھ کی بھی کیا ضرورت ہے؟" اس کے اندر کا اکھڑ مزاج ذی جاہ مکمل طور پر بیدار ہو گیا' یہ وہ ہی لڑکی ہے' جو کبھی کہا کرتی تھی ہماری محبت کے آگے اسٹیٹس' اور کلاس ڈیفرنس کی کوئی اہمیت نہیں' آج کیسے آنکھیں بدل کر بات کر رہی ہے۔ اسے اپنے انتخاب پر شرم محسوس ہوئی۔

"ذی تم کیوں نہیں سمجھ رہے' مما پاپا مجھے کبھی اس دڑبے جیسے گھر میں رہنے نہیں دیں گے اور شاید میں بھی ان لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ نہ کر پاؤں۔" وہ اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر گڑبڑا سی گئی۔

"شٹ اپ سویرا! صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم میرے ساتھ کبھی مخلص تھیں ہی نہیں۔ صرف وقت گزاری کر رہی تھیں' ورنہ میں بھی اس دقیانوسی ماحول اور ان دونوں کا حصہ ہوں۔" ذی جاہ کی آواز غصے سے پھٹ گئی۔

"پلیز مجھ سے اس طرح سے بات نہ کرو۔" سویرا نے کوفت سے اسے دیکھا' وہ ایک مڈل کلاس مرد کا روپ دھار چکا تھا۔

"مس سویرا منصور! افسوس جو لڑکی میری سچی محبت کو نہیں پرکھ سکی۔۔۔ بھلا وہ اس قابل ہو سکتی ہے کہ میں اپنی پوری زندگی اس کے نام کر دوں۔" ذی جاہ نے حتمی انداز اختیار کیا اور وہاں سے اٹھ گیا' سویرا اسے خاموشی سے جاتا دیکھتی رہی' ایک بار بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ فطرتاً" ہرجائی تھی یہ اور بات ہے کہ' ذی جاہ کی پُراثر شخصیت نے کئی برس اسے سحر میں مبتلا رکھا' مگر جب وہ اس کے چھوٹے سے گھر سے باہر نکلی تو آخری نتیجے تک پہنچ گئی کہ زندگی صرف محبت کے سہارے نہیں گزر سکتی' وہ جن آسائشات کی عادی ۔۔۔۔ ہے' ان سب کے بغیر جینا مشکل ہو گا۔

اس ملاقات کے بعد سویرا آخری فیصلے تک جا پہنچی اور مما پاپا کی بات مان کر ہاں کر دی۔

☆ ☆ ☆

"کیا بے وفائی صنف نازک کی فطرت میں بھی شامل ہے؟" وہ ہاتھ میں اخبار تھامے خود سے سوال کرنے لگا۔

"یا یہ سویرا کی فطرت اور اس کی کلاس کا تقاضہ ہے؟" وہ سرد ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا۔ سامنے اخبار کھلا۔ تھا' جس پر "نامور بزنس مین منصور شیخ کی صاحب زادی سویرا منصور کی منگنی' ملک کے مشہور سیاست دان' اکمل علی کے بیٹے فیضان علی کے ساتھ مقامی ہوٹل میں انجام پائی۔" کی خبر جلی حرفوں میں لگی ہوئی تھی۔

وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت گم صم بس ٹکر ٹکر اسی خبر کو دیکھے جا رہا تھا۔ احساسات و جذبات تو جانے کب سے منجمد ہو چکے تھے۔

سویرا منصور۔۔۔ تمہاری محبت کا پول کھل گیا' سارا معاملہ پہلے سے طے تھا' تم تو بس رواداری نبھا رہی تھیں' ورنہ اتنی جلدی یہ سب کیسے انجام پاتا؟ وہ نڈھال ہونے لگا۔

تم جیسی ہرجائی سے بچھڑنے کا غم نہیں۔ بس ساری عمر اس بات کی خلش رہے گی کہ تمہاری وجہ سے میں نے اپنے ماں باپ کو دو سال تک ایک امتحان ایک اذیت میں مبتلا رکھا۔ ذی جاہ نے اخبار توڑ مروڑ کر پھینک دیا' اس کا سانس یوں پھولنے لگا' جیسے میلوں کی مسافت طے کی ہو۔

اتنے سال۔۔۔ نام نہاد محبت کے آکٹوپس میں جکڑے رہنے کے بعد آزادی کا یہ احساس بڑا خوش کن ہے۔ ذی نے آنکھ سے گرنے والے ایک قطرے کو ہتھیلی میں چھپا کر خود کو تسلی دی۔

"بیٹا جی یہ حقیقت ہے کہ ہر چیز کی اپنی جگہ ہوتی ہے اور وہ وہیں پر بھلی لگتی ہے' ردوبدل کرنے سے ان کی حیثیت اور مقام میں فرق آجاتا ہے۔" شہاب احمد نے سمجھاتے ہوئے اخبار اٹھایا' جس میں سویرا اپنے منگیتر فیضان علی کے پہلو میں کھڑی مسکراتی ہوئی بڑی

خوش و خرم دکھائی دے رہی تھی۔ ذی جاہ نے خاموش نظروں سے باپ کو دیکھا۔

"تم نے اپنی خوشی پوری کرلی، ہم نے کچھ نہیں کہا۔ اس کا انجام بھی دیکھ لیا۔ اب ہمارا مان رکھ لو اس بار تمہیں مایوسی نہیں ہوگی" شہاب احمد نے بیٹے کا کاندھا پیار سے تھپتھپایا تو وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

☆ ☆ ☆
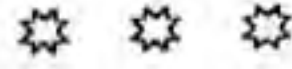
چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی مثال ان پہ صادق آئی اور صرف ایک ہفتے میں شاہا، دلہن بن کر برابر والے فلیٹ میں آگئی۔ سجی سنوری شاہا کو اپنے پہلو میں بیٹھا پا کر ذی جاہ کے من میں پیار بھرے جذبے نہیں ابھرے مگر وجود میں اطمینان کی لہر ضرور دوڑ گئی۔

شہاب احمد کا چہرہ چمک رہا تھا اور آسیہ بانو میں جیسے نئی روح پھونک دی گئی تھی۔ ذی جاہ کو ان دونوں کی خوشی ہی سرشار کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ پرسکون ہو گیا کہ اس کے جانے کے بعد پیچھے سے والدین کا خیال رکھنے والی اس کی بیوی یہاں موجود ہوگی۔

ذی جاہ نے صرف ایک سال اپنے گھر سے مزید دور رہنا تھا۔ کانٹریکٹ مکمل ہوتے ہی وہ واپسی کا ٹکٹ کٹوا کر یہیں آجاتا۔ اسے پتا تھا کہ شاہا کی سوچ کی پرواز اتنی ہی ہے، جتنی اس کے پروں میں اڑنے کی طاقت۔ وہ مسکراتا ہوا بھولی بھالی سی شاہا کو دیکھنے لگا جو مسلسل مسکرا رہی تھی۔

سرخ و سنہری کامدار بھاری سوٹ میں شاہا کا معصوم حسن پھوٹا پڑ رہا تھا۔ وہ یقین نہیں کرپا رہی تھی کہ اچانک قسمت اس پر یوں مہربان ہو جائے گی۔ وہ تو ایک شادی شدہ آدمی کی بیوی بننے کا سوگ منائے بیٹھی تھی، اچانک نصیب نے یاوری کی اور وہ ذی جاہ جیسے شاندار بندے کی شریک زندگی بنادی گئی جو ہمیشہ سے اس کے دل میں براجمان تھا۔

"میں اپنے مالک کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔" آسیہ بانو کا بس نہیں چل رہا تھا بیٹے، بہو کو اپنی آنکھوں میں چھپالیں، تاکہ کسی کی نظر نہ لگ جائے' شہاب احمد نے سب کو خوش دیکھ کر سکون سے آنکھیں موند لیں۔

ذی جاہ بھی مسکراتے ہوئے باپ کی بات پر یقین لے آیا کہ ہمیشہ بے غرض اور بنا مطلب سے قائم ہونے والا تعلق دیرپا ہوتا ہے، غرض اور لالچ کی بنیاد پر استوار کی جانے والی رشتے کی عمارت پائیدار نہیں ہوتی، زیادہ وقت نہیں گزرتا اور وہ زمین بوس ہو کر اپنا وجود کھو دیتی ہے۔

"چلو بانو، بہت رات ہوگئی اب بچوں کو آرام کرنے دو۔" شہاب احمد نے بیوی کو ٹس سے مس ہوتے نہ دیکھا تو تنبیہی نگاہ ڈالی' وہ جیسے زبردستی باہر کی جانب بڑھیں، پھر ایک دم پلٹ کر واپس آئیں۔

"سدا سہاگن رہو۔۔۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔" اپنی بہو کی صبیح پیشانی پر چٹاچٹ بوسے لیتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"شکر ہے' ذی کے دماغ سے اس امیر زادی کا بھوت اتر گیا۔۔۔ ورنہ میں تم جیسی پیاری بہو کہاں سے پاتی۔" آسیہ بانو کی شرارت بھری سرگوشی اتنی بلند تھی کہ سب کے کانوں تک جا پہنچی' شاہا اپنی ایسی پذیرائی پر کھڑے ہو کر آسیہ بانو سے چمٹ گئی۔

ذی جاہ نے ساس بہو کے پیار بھرے انداز پر سر کھجاتے ہوئے باپ کو دیکھا۔ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگانے لگے۔

"بس بانو، باقی دلار صبح اٹھا لینا اب چلو بھی' حد کرتی ہو۔" شہاب احمد' بیوی کا ہاتھ تھام کر زبردستی گھسیٹتے ہوئے باہر نکل گئے تو شاہا شرما کر دوبارہ اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی۔

"اچھا تو اماں کی لاڈلی کے پاس میرے لیے بھی کچھ پیار بچا ہے' یا سب ان پر ہی لٹا دیا۔" وہ شرارت پر آمادہ ہوا۔

شاہا کے گلابی کپکپاتے لب' ذی جاہ اس کی شفاف آنکھوں سے جھلکتے شرم و حیا کے رنگوں میں کھوتا چلا گیا' پھر زندگی مسرتوں سے لبریز ہوگئی' گنگناتی' بہتی ہوئی چاندنی کی طرح رقصاں' قوس قزح و شفق' کہکشاں کی طرح خوب صورت زندگی ان کی ہم قدم ہوگئی۔

☆

نبیلہ عزیز

ماورا مرتضیٰ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔

منزہ' ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی' آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ رضا حیدر' تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔

چوبیسویں قسط

"ولید۔۔۔!" ڈاکٹر شاہنواز نے اسے چپ دیکھ کر آواز دی۔
"ہوں۔۔۔؟" وہ یک دم اپنی سوچ کی گہرائی سے چونکا۔
"کیا ہوا۔۔۔؟" ڈاکٹر شاہنواز نے نرمی سے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔
"بس۔۔۔ سوچ رہا ہوں کہ زندگی بھی کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے انسان کے ساتھ۔۔۔ اور انسان کتنا بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔" ولید نے کہتے ہوئے تاسف سے سر جھٹکا۔
"کیا آپ انہیں جانتے ہیں۔۔۔؟" ڈاکٹر شاہنواز نے اس کا اتنا دکھ اور تاسف نوٹ کرتے ہوئے پوچھا۔
"جی ہاں۔۔۔ جانتا ہوں۔۔۔ اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔ میرے دوست تیمور حیدر اور آفاق یزدانی کزنز ہیں دونوں۔۔۔"
ولید کی ٹیون بدل چکی تھی، تھوڑی دیر پہلے وہ کافی فریش تھا مگر آفاق یزدانی کے بارے میں انکشاف ہوتے ہی ساری شوخی اور شرارت بجھ کے رہ گئی تھی۔
"اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ تو یہ بات ہے؟ لیکن پلیز اس کی بیماری اس کے گھر والوں سے شیئر کرنے سے تھوڑا پرہیز کیجیے گا۔۔۔ ورنہ وہ اور ٹینشن میں آجائے گا۔"
ڈاکٹر شاہنواز کو آفاق یزدانی کی فکر آفاق یزدانی سے بھی زیادہ تھی۔
"ڈونٹ وری۔۔۔! ایسا کچھ نہیں ہوگا، لیکن جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ اچھا نہیں ہے۔ کم از کم اس کی وائف کو تو اس معاملے کا پتا ہونا چاہیے نا؟ اسے مکمل ٹریٹ منٹ کروانی چاہیے۔" ولید کو بھی اچھی خاصی تشویش لاحق ہو چکی تھی۔
"اس کی بیماری کا اب ایک ہی حل ہے۔۔۔ آپریشن۔۔۔ اور وہ ہے کہ آپریشن پہ آمادہ ہی نہیں ہو رہا۔ وہ کہتا ہے میں اپنے بیمار باپ اور اپنی وائف کو یہاں چھوڑ کر اکیلا آپریشن کے لیے امریکا نہیں جا سکتا۔"
ڈاکٹر شاہنواز گویا ہر حربہ آزما چکے تھے اس کو منانے کے لیے۔
"کیوں؟ اکیلا کیوں۔۔۔؟ اپنی وائف کو ساتھ لے جائے۔" ولید کو حیرت ہو رہی تھی وہ آفاق کے مسئلے پہ الجھ رہا تھا اور اپنا کام بھول چکا تھا۔
"وہ تو ہے لیکن اس کی وائف پریگننٹ ہے۔ وہ اس حال میں نہ تو اسے اپنے بارے میں بتا سکتا ہے اور نہ ہی اسے اپنے ساتھ لے کر جا سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں رسک ہے اور ادھر وہ خود ہے کہ دن بہ دن اس کی کنڈیشن سیریس ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بھی اس کی لاپروائی کی وجہ سے۔"
ڈاکٹر شاہنواز بھی اس کیس کو خاصا سنجیدگی سے لے رہے تھے اسی لیے اس طرح ڈسکس کر رہے تھے۔
"ہوں۔۔۔! میرا خیال ہے کہ کچھ کرنا پڑے گا اس کے لیے بھی۔۔۔؟" ولید زیر لب بولا۔
"کیا مطلب۔۔۔؟" ڈاکٹر شاہنواز نے بے ساختہ سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"کچھ سوچتے ہیں ابھی تو۔۔۔" ولید نے اک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سر جھٹکا۔ اور ڈاکٹر شاہنواز بھی محض سر ہلا کر رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

ماورا اپنے بیڈ پہ منہ، سر لپیٹے صبح سے پڑی تھی۔
نہ عافیہ بیگم نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تھی نہ ہی بی گل نے۔ لیکن اب باہر بجی ڈور بیل نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔

پہلے تو وہ یونہی پڑی رہی مگر جب بیل کے جواب میں کوئی رسپانس محسوس نہ ہوا تو وہ چادر پیچھے ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور انتہائی بیزاری سے آ کر دروازہ کھولا
"السلام علیکم۔!" دروازہ پر تیمور کی آواز سن کر وہ بُری طرح سٹپٹا گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس وقت دروازے پہ تیمور حیدر ہو گا۔
"ہیلو۔؟" تیمور نے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔
"ہوں۔ہاں۔؟" وہ چونک کر بولی۔
"راستہ نہیں دیں گی؟" وہ اس کو یونہی دروازے کے بیچوں بیچ سر جھاڑ منہ پھاڑ کھڑے دیکھ کر بول ہی پڑا تھا۔
"ہوں۔! آیئے۔" وہ کھوئے کھوئے سے انداز سے کہتی سامنے سے ہٹ گئی۔
"آنٹی اور بی گل گھر پہ ہیں۔؟" تیمور نے اندر داخل ہوتے ہی پہلے سوال ہی کیا تھا۔
"جی۔! میرا خیال ہے کہ گھر پہ ہی ہیں۔" وہ اپنا دوپٹا درست کرتی یونہی ننگے پاؤں واپس پلٹی تھی اور تیمور اس کی پشت پر نظر ڈالتے ہوئے بے ساختہ مسکراہٹ دبا گیا تھا۔ کیونکہ وہ جب بھی اچانک آیا تھا اسے وہ بہت ہی عام حلیے میں نظر آئی تھی۔ اور اس کا یہ عام سا حلیہ تیمور کو بڑا دلچسپ لگتا تھا۔ بہت اٹریکٹ کرتا تھا اسے۔
"بیٹھیے۔! میں بلاتی ہوں۔" ڈرائنگ روم کے قریب آ کر وہ رک گئی اور تیمور کو بیٹھنے کا کہہ کر آگے بڑھ گئی۔
اور تیمور لاپروائی سے کندھے اچکا کر اندر آ گیا اور ڈرائنگ روم میں ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا اور ٹیبل پہ رکھا میگزین اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ ماورا اس حلیے اور کسی حالت میں اندر گئی ہے۔ اس لیے واپسی میں اب اسے ٹائم لگے گا۔

☆ ☆ ☆

عافیہ بیگم جاء نماز پر بیٹھی عصر کی نماز کے بعد دعا مانگ رہی تھیں جب ماورا نے دروازے پہ دستک دی۔
"امی۔!" وہ دستک کے بعد خود بھی اندر آ گئی۔
عافیہ بیگم نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔
"امی۔ تیمور حیدر آیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"
ماورا کو مجبوراً انہیں متوجہ کرنا ہی پڑا تھا انہوں نے چونک کر گردن موڑی تھی۔
"کیوں آیا ہے وہ۔!" انہوں نے بڑے تیز لہجے میں پوچھا۔
"آئم سوری! مجھے کیا پتا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ آپ خود پوچھ لیں۔" وہ بہت لاپرواہ سے انداز سے کہہ کر پیچھے ہٹ گئی تھی اور عافیہ بیگم جلدی جلدی چہرے پہ ہاتھ پھیر کے جائے نماز سے اٹھ گئیں۔
اور اسی طرح دوپٹہ لیتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئی تھیں۔
"السلام علیکم آنٹی۔!" تیمور انہیں دیکھتے ہی میگزین چھوڑ کر یکدم کھڑا ہو گیا تھا۔
"وعلیکم السلام۔" عافیہ بیگم نے بہت ہی نپے تلے سے انداز میں جواب دیا۔
"کیسی ہیں۔؟" تیمور بہت ہی احترام سے پوچھ رہا تھا۔
"بیٹھیے۔!" عافیہ بیگم نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کا کہا تھا۔
"تھینک یو۔!" وہ ان کی بیزاری اور سرد مہری شاید محسوس ہی نہیں کر سکا تھا۔ یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز کر گیا تھا۔ جو بھی تھا مگر پھر بھی وہ مطمئن ہی تھا۔
"بی گل کہاں ہیں۔؟" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے استفسار کیا۔

"ارے میں نے کہاں ہونا ہے میرے بچے؟ نماز پڑھ رہی تھی۔" بی گل تسبیح ہاتھ میں لیے اس کی آواز سن کر ڈرائنگ روم میں ہی آگئی تھیں۔

"السلام علیکم۔" تیمور نے آگے بڑھ کے انہیں سہارا دیتے ہوئے تھام لیا تھا اور اپنے ساتھ ہی صوفے پہ لے آیا تھا ان کو۔

"جیتے رہو۔ اللہ عمر دراز کرے۔" انہوں نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے اسے دعاؤں سے نوازا

"ماورا۔! کہاں ہو بیٹا۔؟" بی گل کو سنبھلتے ہی اس کی خاطر مدارات کا خیال آیا تھا۔

"نہیں بی گل۔! کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس آپ لوگوں سے ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ ماورا کی ضرورت نہیں ہے یہاں۔"

تیمور نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا اور عافیہ بیگم کے ساتھ ساتھ باہر دیوار سے لگ کے کھڑی تیمور کی آواز سنتی ماورا کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

ایسی کون سی بات ہے؟ جس کے لیے میری بھی ضرورت نہیں ہے؟ ماورا سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"آنٹی۔ آپ بھی بیٹھیے ناں؟" تیمور نے ہنوز ایک ہی جگہ پر کھڑی عافیہ بیگم کو دوبارہ متوجہ کیا تھا۔

"ہوں!" عافیہ بیگم چونکتے ہوئے بولیں اور سر ہلا کر صوفے پہ بیٹھ گئیں۔

"دیکھیے آنٹی۔! ماورا آپ کی بیٹی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ میں ماورا کا ہاتھ آپ سے مانگوں۔ کیونکہ جو حق اور جو اختیار آپ کا ہے وہ کسی اور کا نہیں ہے۔ میرے گھر والے مانیں یا نہ مانیں۔ بس آپ مان جائیں۔ میں سمجھوں گا کہ پوری دنیا مان گئی۔ مجھے اور کسی کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ بس آپ میرے ہاتھ میں ماورا کا ہاتھ دے دیں۔"

تیمور نے بڑے ہی سلیقے اور سبھاؤ سے ان سے بات کی تھی اور ماورا کا دل جیسے مٹھی میں آگیا تھا جبکہ عافیہ بیگم تو چپ کی چپ رہ گئی تھیں۔

"آنٹی۔! آپ چپ کیوں ہیں۔؟ میں آپ کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا رہا ہوں۔ آپ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ ماورا میری زندگی ہے۔ میری محبت ہے اور میں اپنی محبت اور اپنی زندگی کے سامنے بے بس ہوں، ہر طرح سے بے بس ہوں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے بس اس کی ضرورت ہے اور کسی چیز کی نہیں۔ جو وہ چاہے گی میں وہی کروں گا۔ میں اس کی ہر خواہش ہر ضد پوری کرنے کے لیے تیار ہوں، بس وہ مل جائے مجھے۔ میں اسے ہر خوشی دوں گا، ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔ آپ کو شکایت کا موقع بھی نہیں دوں گا۔ بس آپ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔"

تیمور نے بھرپور التجا کی تھی اور ماورا باہر کھڑے کھڑے ریت کے بت کی طرح ڈھے جا رہی تھی۔

"کیا وہ خوش ہے اس رشتے پہ۔؟" عافیہ بیگم نے بیٹی کے بارے میں جاننا چاہا

"وہ خوش ہے یا نہیں ہے لیکن میں اسے خوش رکھ لوں گا۔ میں زمانے بھر کی خوشیاں اس کے قدموں میں لا کر رکھ دوں گا۔ وہ ہمیشہ خوش رہے گی۔" تیمور نے یقین دلانے کی کوشش کی

"اگر وہ خوش نہ رہی تو۔؟" عافیہ بیگم کا سوال خاصا عجیب تھا۔

"تو میں عمر بھر کے لیے خوشیوں سے منہ موڑ لوں گا۔" تیمور کا جواب بھی کچھ کم نہیں تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہاں خاموشی چھا گئی تھی اور بی گل نے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے نظریں اٹھا کر عافیہ بیگم کی طرف دیکھا۔

"مگر میرا خیال ہے کہ اگر آپ کے پیرنٹس اس رشتے سے خوش نہیں ہیں تو آپ بھی پیچھے ہٹ جائیں۔"

"اس طرح کی شادیاں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں۔" عافیہ بیگم نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور

تیمور نرمی سے مسکرا دیا تھا۔
"آنٹی... اب پیچھے ہٹنے کے لیے بھی میرے پاس راستہ نہیں ہے... میں تو پیچھے ہٹنے کے خیال سے بھی دور آ چکا ہوں... میں سب تیاری کر چکا ہوں... مجھے بس آپ کی ہاں کی ضرورت ہے۔"
تیمور نے ایک بار پھر التجا کی تھی۔ عافیہ بیگم نے نیلی گل کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں۔
پھر انہوں نے چند لمحوں کے لیے سوچا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے جیسے فیصلہ کر ہی لیا تھا۔
"ٹھیک ہے، مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم شادی کر سکتے ہو۔"
عافیہ بیگم کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ماورا کے سر پہ بم گرانے کے لیے کافی تھے اور ایسا ہی کچھ نیلی گل کے ساتھ بھی ہوا تھا' انہوں نے بھی ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر عافیہ بیگم کو دیکھا تھا۔ جبکہ تیمور کو تو ایسے لگا تھا جیسے کسی نے اسے ایک نئی زندگی بخش دی ہو۔ اس کے چہرے پہ خوشی کے کئی رنگ بکھر گئے تھے۔
"تھینک یو آنٹی... تھینک یو سو مچ... " تیمور کا دل خوشی سے ناچ اٹھا تھا۔
"کب کرنی ہے شادی... " ان کا اگلا سوال بھی ماورا کے لیے غیر متوقع تھا۔
"دو دن بعد... کیونکہ میری فیملی ایک شادی میں شرکت کے لیے دبئی جا رہی ہے۔ میری طرف سے تمام تیاری کمپلیٹ ہے۔ بس ماورا کے لیے شادی کی شاپنگ باقی ہے اور دو دن میں یہ شاپنگ بھی کمپلیٹ ہو جائے گی۔"
تیمور انہیں تفصیل سے بتا رہا تھا اور عافیہ بیگم سرد و سپاٹ سے انداز میں سب سن ہی رہی تھیں... تھوڑی دیر بعد وہ ان سے اجازت طلب کرتا ہوا... جیسے ہی باہر نکلا ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر کھڑی ماورا کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔
"آپ... " تیمور پہلے ٹھٹکا' پھر مسکرا دیا۔
"آج یقین ہو گیا ہے کہ ہمارے یہاں مشرقی لڑکیاں اپنی شادی کی باتیں ایسے ہی سنتی ہیں' چھپ چھپ کر' دیواروں اور دروازوں کے پیچھے سے... " تیمور نے بڑے ذو معنی اور شرارت بھرے لہجے میں کہا تھا لیکن ماورا اس کی بات کو نظر انداز کرتی اس کے چہرے کو دیکھے گئی
اور تیمور کو اس لمحے اس کے اس طرح بے خود ہو کر دیکھنے پہ بڑا پیار آیا تھا' وہ عین اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
"کیا دیکھ رہی ہیں؟" تیمور کی نظریں اب ڈائریکٹ اس کے چہرے پہ تھیں۔
"تیمور' آپ یہ شادی... " ماورا کے ہونٹ پھڑپھڑائے تھے۔
"انکار نہیں سنوں گا... اب جا کے تو ان ہونٹوں سے میرے لیے اقرار کے موتی پھسلنے والے ہیں... انکار بہت سنا... اب اقرار بھی سننے دو... اب تو حق بنتا ہے میرا... اتنا انتظار کیا ہے میں نے۔"
تیمور نے اس کے لرزتے ہونٹوں کی سمت دیکھا تھا جو مسلسل اک کشمکش میں نظر آ رہے تھے اور اس کی تیکھی آنکھیں اداسیوں سے بھری ہوئی تھیں۔
"تیمور آپ... کیوں... " ماورا نے پھر کوشش کی۔
"ماورا...! اتنا یاد رکھو... اب میری زندگی تمہارے وجود سے ہے... تم ہو تو میں ہوں... تم نہیں ہو تو میں بھی نہیں ہوں۔" تیمور نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا تھا اور ماورا نے یکدم بے بس ہو کر پلکیں جھکا لی تھیں۔
"چلتا ہوں... تھوڑی دیر اور رکا تو دل پہ اختیار نہیں رہے گا... اتنے عام سے حلیے میں بھی دل کو بہت خاص لگ رہی ہو۔" تیمور کے لہجے کی حدت ماورا کی ہتھیلیوں کو پگھلا گئی تھی اور اس نے سر بھی جھکا لیا تھا۔
"اللہ حافظ۔" تیمور کہہ کے آگے بڑھ گیا تھا اور ماورا وہیں فرش پہ بیٹھ گئی تھی۔ جیسے سچ مچ ہار گئی ہو... اور باقی

کچھ بھی نہ بچا ہو۔

☼ ☼ ☼
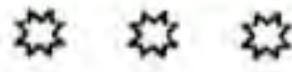
"کہاں ہیں جناب!" تیمور نے پہلی کال ولید کو ہی کی تھی۔
"آپ کے ہجر میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔۔۔ اور کہاں ہونا ہے بھلا؟" ولید نے ایک طویل آہ بھری۔
"مارے مارے پھرنے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ ہم سے آکر مل جائیں۔" تیمور نے مشورہ دیا۔
"جی۔۔۔ ہم تو آکر مل جائیں۔۔۔ لیکن اب آپ سے ملنے پہ بھی لوگ شک کرتے ہیں۔" ولید بھلا کب لگی لپٹی رکھنے والا تھا۔
"آپ کو لوگوں کی فکر کب سے ہونے لگی ولید رحمٰن صاحب۔۔۔" تیمور گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس سے باتیں بھی جاری تھیں۔
"جب سے گھربار والے ہوئے ہیں، فکروں میں پڑ گئے ہیں جناب۔" ولید نے ایک اور آہ بھری۔
"اچھا۔۔۔ اب ایک اور فکر کے لیے تیار ہو جاؤ۔۔۔ اور جلدی پہنچو۔" تیمور نے حکم صادر کیا۔
"ہیں۔۔۔! ایک اور فکر۔۔۔" ولید تو تڑپ اٹھا تھا۔
"ہاں۔۔۔ مجھے اگلے دس منٹ میں میرے آفس میں ملو۔۔۔ میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔" تیمور نے کہہ کے فون بند کر دیا تھا اور ولید فون کو گھورتا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

تیمور اپنی چیئر پہ بیٹھا چند اہم فائلز پہ سائن کر رہا تھا، جب ولید یکدم دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔
"ہاں بولو۔۔۔ کیا پرابلم ہے اب؟" اس نے آگے پیچھے دیکھے بغیر چھوٹتے ہی سوال کیا اور تیمور نے فائلز سے سر اٹھا کر گھور کر اسے دیکھا۔
"یہ کون سا طریقہ ہے پرابلم پوچھنے کا۔۔۔" وہ خفگی سے بولا۔
"میں جلدی میں ہوں۔" ولید نے کی چین گھماتے ہوئے کہا۔
"او کے۔۔۔ جاؤ۔۔۔ پہلے اپنی جلدی پوری کر لو۔ پھر آجانا۔" تیمور نے غصے سے کہا اور ولید بے ساختہ اپنی مسکراہٹ دباتا ہوا اس کے مقابل والی چیئر پہ بیٹھ گیا۔
"اب بتاؤ۔۔۔ کیا مسئلہ ہے۔" اب کی بار اس نے بڑے تحمل سے استفسار کیا۔
"عزت دبئی جا رہی ہے بابا جان کے ساتھ۔" تیمور نے جیسے بم پھوڑا تھا۔
"واٹ۔۔۔ دبئی۔۔۔" ولید کرسی پہ بیٹھا بیٹھا اچھل پڑا تھا اور تیمور کا ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا تھا۔
"اچھا۔۔۔ بڑا کرنٹ لگا ہے اب تو۔۔۔؟" تیمور نے بڑی دلچسپی سے کہا۔
"اوہ۔۔۔ تو بدلہ لے رہے ہو مجھ سے؟"
"بدلہ نہیں لے رہا۔۔۔ سچ بتا رہا ہوں۔۔۔ کل کی فلائٹ ہے ان کی۔" تیمور نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔
"تیمور۔۔۔ پلیز۔۔۔ بی سیریس۔۔۔" ولید کا تو برا حال تھا۔
"یار۔۔۔ سچ بتا رہا ہوں۔۔۔ بے شک عزت سے پوچھ لو۔" تیمور نے اسے یقین دلایا تھا اور ولید کے چہرے پہ بارہ بج گئے تھے۔
"مگر کیوں۔۔۔" اس نے مرے مرے لہجے میں پوچھا۔
"شادی میں شرکت کے لیے۔۔۔ لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ ایک ہفتے میں واپس آجائیں گے۔"

تیمور نے اسے جھٹکا دینے کے بعد اسے تسلی بھی دی تھی۔
"کیا یہ بتانے کے لیے بلایا تھا مجھے۔"
"نہیں۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"تو پھر۔" ولید نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"تو پھر یہ کہ میں شادی کر رہا ہوں۔۔۔ دو دن بعد۔۔۔" ایک اور دھماکا۔۔۔ ولید ایک بار پھر اچھلا تھا۔
"واٹ۔۔۔؟ شادی۔۔۔ دو دن بعد۔۔۔ مگر کس سے۔۔۔؟" ولید کو آج شاک پہ شاک لگ رہا تھا۔
"ماورا مرتضیٰ سے۔۔۔" تیمور بہت مطمئن انداز سے بولا۔
"سچ۔!" ولید کو آج کسی بات پہ یقین ہی نہیں آرہا تھا۔
"تو کیا میں ہر بات جھوٹ بتا رہا ہوں۔" اب تیمور نے پھر اسے گھورا۔
"اوہ گاڈ۔۔۔!" ولید نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔
"کیا ہوا۔۔۔" تیمور مسکرایا۔
"نئے نئے انکشاف ہو رہے ہیں۔۔۔ دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔"
"یار! میرا تو خیال تھا کہ تم میری شادی کا سن کر بھنگڑا ڈالو گے مگر مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ یوں سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ گے۔" تیمور نے افسوس کا اظہار کیا۔
"بھنگڑا آج نہیں ڈالوں گا۔ بھنگڑا دو دن بعد ڈالوں گا۔۔۔ ویسے آپس کی بات ہے۔۔۔ کیا رخصتی بھی ہو گی؟"
ولید کو اب ایک اہم خیال آیا تھا اور تیمور اس کے سوال پہ شرارت سے ہنس پڑا تھا۔
"آف کورس۔۔۔ اسنیپ پڑ کیوں بیل رہا ہوں بھلا؟"
"بڑے کمینے ہو۔" ولید نے دانت کچکچائے۔
"تم سے ذرا کم ہی ہوں۔۔۔ خیر یہ بتاؤ اب پروگرام کہاں سیٹ کرنا ہے؟ پہلے تو آفاق کے گھر میں سب ایزی ہو گیا تھا مگر اب۔۔۔"
تیمور نے بات ادھوری چھوڑ دی، جبکہ ولید کا ذہن بھٹک کر آفاق کی طرف چلا گیا تھا۔
"آفاق کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" ولید نے سنجیدگی کے لبادے میں آتے ہوئے سوال کیا۔
"کیا مطلب۔۔۔ آفاق کے بارے میں کیا؟" تیمور چونکا۔
"آفاق یزدانی کے چھوٹے بھائی کو کیا ہوا تھا؟" ولید کی سنجیدگی حد سے زیادہ تھی۔
"اس کے دل میں سوراخ تھا۔ اس کی ڈیتھ ہو گئی۔" وہ پریشان ہو چکا تھا۔
"آفاق یزدانی کے دل میں بھی سوراخ ہے۔ وہ بھی لاسٹ اسٹیج پہ۔۔۔" ولید کا دیا ہوا شاک تیمور سے بھی زیادہ سنگین ثابت ہوا تھا۔ تیمور یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تمہیں کس نے بتایا؟" تیمور کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔
"ڈاکٹر شاہنواز نے۔۔۔ میری کل ان سے ایک میٹنگ تھی اور آفاق یزدانی بھی ان کے پاس ہی تھا۔ میں بھی سن کر پریشان ہوا۔۔۔ میں تمہارے پاس آنا چاہ رہا تھا، لیکن تم نے خود ہی بلا لیا۔"
ولید کا لہجہ متفکرانہ تھا اور تیمور چند لمحے کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صائمہ اکرم چوہدری

سیاہ حاشیہ

سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ "پچھتاؤ گی۔ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔ عدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔

ناولٹ

عبداللہ پابند صوم وصلوۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔
عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔
شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پر واک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔
ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارحم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل ڈاکٹر حماد کا انتقال ہو چکا ہے۔
نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔
اوریدا اور ارحم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔
عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔
سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔

اوریدا ارصم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارصم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں' آغاجی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔

ارصم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً" شادی کر لے۔ عبداللہ نے فوراً" شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔

عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔

شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ارسل' شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے' وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

ارحم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔

عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

ساتویں قسط

"کہاں تھیں تم؟ ہر جگہ تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں ہم۔؟" بختاور کی والدہ اسے دیکھتے ہی غصے سے برس پڑیں۔

"میں یہ تھی امی۔" وہ ایک دم بوکھلا سی گئی۔ بابا کی جانچتی ہوئی سرد نگاہیں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں۔

"یہاں' کہاں پر؟" وہ ناراضی سے گویا ہوئیں۔ "تمہاری کلاس روم' لیب' ہوسٹل' ہر جگہ تو ہم نے چھان ماری۔"

"کہیں ڈسپنسری تو نہیں چلی گئی تھیں تم۔" نیلم نے مشکل لمحات میں اسے ہمیشہ کی طرح سہارا دیا۔

بختاور نے تشکر آمیز نگاہوں سے اپنی پرخلوص دوست کو دیکھا' جو اس وقت خود بھی خاصی پریشان لگ رہی تھی۔ لگتا تھا اس کے والدین نے اسے بھی خاصا مشکل میں ڈالا تھا۔

"ہاں ہاں میں' وہیں تھی۔" بختاور کی زبان جھوٹ بولتے ہوئے لڑکھڑائی۔

"ٹھیک ہے' ہوسٹل چلو اور اپنا سامان پیک کرو ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔" اس کے والد نے پہلی دفعہ گفتگو میں حصہ لیا۔ بختاور نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا' وہ اس قدر ایمرجنسی دورے کے لیے تیار نہیں

تھی۔

"لیکن میں کیسے جاسکتی ہوں۔؟" وہ بوکھلائی۔ اس کے والد نے ناراض نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کیوں نہیں جاسکتیں۔

"آج کل ہمارے بہت اہم ٹیسٹ اور پریکٹیکل چل رہے ہیں۔" بختاور نے ایک دفعہ پھر جھوٹ بولا۔

"میرا جانا ضروری ہے کیا۔؟" وہ ہلکا سا اٹک کر بولی۔

"ہاں' کیونکہ اس جمعے کو تمہارا نکاح ہے فیصل سے۔" اس کی والدہ نے اس کے اعصاب پر بم گرایا۔

"اس لیے ہمیں آج ہی نکلنا ہوگا یہاں سے۔"

لیکن' کل تو میرا بہت اہم پریکٹیکل ہے۔ وہ تو میں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتی۔" بختاور نے احتجاجی نگاہوں سے اپنے والدین کی طرف دیکھا جو بغیر بتائے ہی اسے لینے کے لیے وہاں پہنچ چکے تھے۔

"ٹھیک ہے' تم کل صبح اپنا پریکٹیکل دو۔ ہم شام میں یہاں سے نکل جائیں گے۔" اس کے والد نے رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تو بختاور کے حلق سے ایک پرسکون سا سانس خارج ہوا۔

"اتنا بھی ضروری نہیں ہے پریکٹیکل۔" اس کی والدہ نے برہم انداز سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ وہ آج ہی واپس جانا چاہتی تھیں۔

"ٹھیک ہے اسے اپنا کام کرنے دو' ہم کل شام میں بھی جاسکتے ہیں۔" اس کے والد فیصلہ کرچکے تھے۔

"میرا تو خیال ہے' ابھی چلتے ہیں۔" اس کی والدہ کی چھٹی حس انہیں کوئی اچھا پیغام نہیں دے رہی تھی۔

"تب ایسی بھی کوئی ایمرجنسی نہیں ہے' مجھے بھی یہاں اپنے ایک دو کام نبٹانے ہیں۔" وہ اپنے مزاج کے مطابق فوراً" ہی بھڑکے۔ تب اس کی والدہ مصلحتاً خاموش ہوگئیں۔

وہ دونوں اسے کچھ ضروری ہدایات دے کر پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے تھے۔ جب کہ وہ دونوں من کھینٹے ٹیریا میں آکر بیٹھ گئیں۔ بختاور بالکل خاموش تھی' اس کے دماغ میں مختلف سوچوں نے ادھم مچار کھا تھا۔

"تم واقعی فیصل سے شادی کرلوگی۔ تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا۔" نیلم کو اس پر غصہ آیا۔

"دماغ ضرور خراب ہوا ہے' لیکن میرا نہیں' میرے والدین کا۔" اس کے لہجے میں کیا تھا' غصہ' نفرت اور شکوہ۔

"ہاں' وہ تو مجھے ان سے مل کر اندازہ ہوگیا ہے۔" نیلم نے صاف گوئی سے کہا' بختاور نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا' وہ کچھ پریشان تھی۔

"ویسے تم ہاشم کے ساتھ گئی کہاں تھیں۔؟" نیلم کو اچانک ہی خیال آیا۔

"ہم لوگ ہاشم کے کسی دوست سے ملنے ایگری کلچر ڈپارٹمنٹ میں گئے تھے۔" بختاور نے اس دفعہ اعتماد سے جھوٹ بولا۔

"تمہارے پیرنٹس کو اچانک ڈیپارٹمنٹ میں دیکھ کر میری تو ہوائیاں ہی اڑ گئیں' میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ایک دم چھاپہ بھی مار سکتے ہیں۔" نیلم

نے پریشان سے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
"ہوں۔" بختاور کا دماغ ابھی تک اپنے نکاح میں الجھا ہوا تھا۔
"میں ان کو لے کر ہوسٹل پہنچی تو تم وہاں بھی نہیں تھیں۔" نیلم نے اسے سارا قصہ شروع سے سنانا شروع کیا۔
"پھر کیا ہوا۔؟" بختاور نے یونہی پوچھا۔
"تمہارے پیرنٹس تو ایک دم ہی گھبرا گئے' اور تمہاری امی نے تمہارے سامان کی تلاشی لینا شروع کردی' پتا نہیں کیوں۔" نیلم کی بات پر وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائی' وہ سمجھ سکتی تھی کہ ان کے ذہن میں کیا چل رہا ہوگا۔
"وہ سوچ رہی ہوں گی کہ کہیں میں وہاں سے بھاگ تو نہیں گئی۔" وہ تلخ انداز سے کہہ کر اپنے ناخنوں سے نیل پالش کھرچنے لگی۔
"استغفراللہ۔ کیسی فضول باتیں کر رہی ہو۔" نیلم برا مان گئی۔
"تم کیوں اتنی حواس باختہ ہو گئی تھیں۔؟" بختاور نے اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کرانے کے لیے پوچھا۔
"مجھے ڈر تھا کہ تم اور ہاشم کیمپس میں اکٹھے ہوں گے اور ایسا نہ ہو تم دونوں کو اکٹھا دیکھ کر تمہارے والد مشتعل ہو جائیں اور یونیورسٹی میں کوئی ہنگامہ ہی کھڑا نہ ہو جائے۔" نیلم نے اپنی اصل پریشانی بتائی۔
"پھر مجھے اکیلا دیکھ کر تو تم نے سکون کا سانس لیا ہوگا۔" وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔
"ایسا ویسا' پورے پچاس نفلوں کی منت بھی مانگ لی تھی میں نے۔" اس نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔
"کاش ہاشم بھی اس وقت میرے ساتھ ہوتا۔" بختاور نے افسردگی سے ٹھنڈا سانس بھرا تو نیلم نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے اس کے دماغ کی خرابی کا یقین آگیا ہو۔

"کیوں' اس بے چارے کی ٹانگیں تڑوانی تھیں۔" نیلم نے منہ بنایا۔
"شاید بابا اس سے ایک دفعہ مل لیتے تو انہیں بھی یقین آجاتا کہ وہ کتنا اچھا لڑکا ہے۔" بختاور کا دل خوش فہمی کی اسی پٹڑی پر کھڑا تھا۔
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" نیلم نے یکسر ہی اس کی بات کو مسترد کیا۔ "تمہارے والد صاحب کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی ہے' مجھے ان کے بات کرنے کے اسٹائل سے ہی پتا چل گیا تھا کہ وہ کسی اور کی کہاں سنتے ہوں گے۔ بہت ہی روکھا پھیکا اور سرد انداز ہے ان کا۔" نیلم کو اس کے والد سے مل کر خاصی مایوسی ہوئی تھی۔
"وہ شروع سے ایسے ہی ہیں۔" بختاور پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔
"تمہاری والدہ کا حوصلہ ہے' جو ایسے غصیلے اور ہٹ دھرم شخص کے ساتھ رہتی ہیں۔"
نیلم کی بات پر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کا دماغ تو کسی اور ہی حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا اس کے پاس ٹائم کم ہے اور اگر یہ وقت اس کے ہاتھ سے پھسل جاتا تو وہ کہیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ نیلم اس سے کچھ پوچھ رہی تھی اور وہ جواب کچھ اور دے رہی تھی۔ اس وقت حقیقتاً" وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ دونوں کیفے ٹیریا سے اٹھ کر ہوسٹل کی طرف چل پڑیں۔
"بختاور! تمہارا دھیان کہاں ہے آخر۔؟" نیلم نے چلتے ہوئے اس کے کندھے کو جھنجھوڑا۔
"ہاں۔ یہیں ہوں۔" وہ فوراً" ہی ہوش کی دنیا میں آئی۔ "تم ہوسٹل جاؤ' مجھے ہاشم سے ملنا ہے۔"
"ابھی تو اس سے مل کر آئی ہو۔" نیلم جھنجلا سی گئی۔
"مجھے اس سے کچھ چیزیں فائنل کرنا ہیں اور اسے بابا جان کی آمد کا بھی بتانا ہے۔" بختاور کے پاس ایک ٹھوس وجہ تھی۔

نیلم نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا' اسے پہلی دفعہ بختاور کے چہرے پر وہی سختی اور ہٹ دھرمی نظر آئی جو اس نے کچھ دیر پہلے اس کے والد کے چہرے پر دیکھی تھی۔ پہلی دفعہ نیلم کو احساس ہوا کہ بختاور بھی اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گی لیکن وہ کیا کرنے والی ہے یا کیا کچھ کر چکی ہے؟ اس چیز کی تو نیلم کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

"یار! بہت ہی نخرا ہے تمہاری بہن کا۔" ماہیر اور سرمد دونوں اس وقت شانزے کے ہوسٹل کے باہر والی سڑک پر گیٹ کے بالکل سامنے کھڑے تھے۔ ماہیر نے ہاتھوں میں ایک بکے اور سوری کا کارڈ اٹھا رکھا تھا اور سرمد بے چینی سے انداز سے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا' جہاں سے شانزے نے برآمد ہونا تھا۔

"تم کون سا کسی سے کم ہو' اس دن کتنا ایٹی ٹیوڈ دکھا رہے تھے اسے۔" سرمد کو بھی اس پر ابھی تک غصہ تھا۔

"مجھے کیا پتا تھا' وہ اتنی نازک مزاج ہے' ذرا سی بات پر منہ پھلا کر بیٹھ جائے گی۔" ماہیر نے لاپروائی سے سر جھٹک کر تبصرہ کیا۔

"بہت حساس لڑکی ہے وہ۔" سرمد نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تو وہ مسکرا دیا۔

"میرا خیال ہے' خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آہی جاتی ہے۔" ماہیر نے سامنے گیٹ سے نکلتی شانزے کو دیکھ کر معنی خیز انداز سے کہا۔

"اب اپنا منہ ذرا بند ہی رکھنا۔" سرمد نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی' جس کے چہرے پر اس وقت خوشگواریت عروج پر تھی۔ شانزے ناراض سے انداز سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے ادھر ہی آرہی تھی جہاں وہ دونوں اپنی گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ان دونوں کے پاس پہنچتی' ماہیر بے تاب سے انداز سے اس کی جانب بڑھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"دس از فار یو۔" اس سے پہلے کہ سرمد شانزے کو مخاطب کرتا' ماہیر نے شرارت بھرے انداز سے پھولوں کا بکے شانزے کی طرف بڑھایا' جس کو اچھا خاصا کرنٹ سا لگا تھا۔ اس نے شکایتی نگاہوں سے سرمد کی طرف دیکھا۔

"شانزے! لے لو' میری طرف سے ہے' اسے اتنی عقل کہاں۔ اس وقت صرف اپنے نمبر بنا رہا ہے۔" سرمد کے شرارتی انداز پر شانزے کے تنے ہوئے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے۔ پھولوں کا گلدستہ تو اس نے ابھی بھی نہیں تھاما تھا۔

"کیسے ہیں بھائی آپ۔؟" شانزے نے ماہیر کو نظر انداز کر کے سرمد کو مخاطب کیا۔

"الحمد للہ فائن' تم کیسی ہو۔" سرمد مسکرایا' تو وہ ہنوز سنجیدہ سے انداز میں گویا ہوئی۔

"ٹھیک ہوں۔"

"ماہیر تم سے ایکسکیوز کرنے آیا ہے۔" سرمد کی بات پر اس نے ایک سرسری سی نگاہ ماہیر پر ڈالی' جو اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"مجھ سے ایکسکیوز' لیکن کس بات پر۔؟" اس نے بھی بے رخی کے ریکارڈ توڑے۔ وہ دونوں دانستہ کھانس کر رہ گئے۔

"بھئی۔ کل جو تم خفا ہو کر آفس سے نکل آئی تھیں۔" سرمد نے اسے وہ بات یاد دلانے کی کوشش کی' جو اسے بالکل بھی نہیں بھولی تھی۔

میں تو اس لیے نکل آئی تھی تاکہ آپ دونوں کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔" شانزے نے سپاٹ انداز سے کہا۔

"حالانکہ فیصلہ تو پہلی ہی نظر میں ہو گیا تھا۔" ماہیر کی مسکراہٹ پر وہ الجھی۔

"بکواس بند کرو' اور مہربانی کر کے خاموش رہو۔" سرمد نے بے تکلفی سے اسے شانزے کے سامنے ہی جھاڑا۔ اس دفعہ شانزے کے چہرے پر بڑی بے ساختہ سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ ماہیر برے برے سے منہ

بتاتا ہوا چپ کر گیا۔ سرمد نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا اور ایک خاکی رنگ کا لفافہ اس میں سے نکال کر شانزے کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے۔؟" وہ حیران ہوئی۔

"تمہارا اپائنٹمنٹ لیٹر ہے' تم نیکسٹ منڈے تک جوائن کر سکتی ہو۔" سرمد کی بات نے اسے ایک دم حیران کیا اور اس نے بے ساختہ نظریں اٹھا کر ماہیر کی طرف دیکھا' جس کے چہرے پر اب سنجیدگی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے سیل فون پر بزی تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اسی کام کے لیے یہاں آیا ہو۔

"لیکن۔" وہ شش و پنج کا شکار ہوئی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں' تم بس جوائن کر رہی ہو نیکسٹ منڈے۔ اوکے۔" سرمد کے دو ٹوک انداز میں قطعاً" کوئی گنجائش نہیں تھی۔ شانزے نے ہلکا سا جھجک کر وہ لفافہ تھام لیا اس کے ساتھ ہی ماہیر کے چہرے پر بڑے طمانیت کے رنگ نمودار ہوئے۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی مان جائے گی۔

"اوکے سسٹر! ہم لوگ چلتے ہیں۔" سرمد نے الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔

"آپ کے ہاں گیسٹس کو چائے وائے پلانے کا کوئی رواج نہیں۔" ماہیر کی ایک دفعہ پھر زبان پھسلی۔ سرمد نے گھور کر اسے دیکھا۔

"وہ! سوری' پاس ہی کیفے ٹیریا ہے' وہیں چلے چلتے ہیں۔ ہوسٹل تو آپ کو لے جا نہیں سکتی۔" شانزے ایک دم ہی شرمندہ ہوئی۔

"ناٹ ایٹ آل شانزے۔ اس کی ضرورت نہیں' یہ ایسے ہی تمہیں تنگ کر رہا ہے۔" سرمد نے اس دفعہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ماہیر کو چپ رہنے کا بڑا واضح اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ دونوں اب سلام دعا کے بعد اپنی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ شانزے بھی اپنے ہوسٹل کی طرف پلٹ آئی۔ اپنے روم کا دروازہ کھولتے ہی اس نے سنجیدگی سے رباب کو یہ خبر سنائی۔

"ارے اتنی اچھی خبر تم کتنے بجھے دل کے ساتھ سنا رہی ہو۔" رباب نے اس کا اپائنٹمنٹ لیٹر کھولتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

"پتا نہیں' ایسا لگتا ہے جیسے دل میں خوشی کا احساس بالکل ختم ہو کر رہ گیا ہے۔" شانزے نے اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"واؤ' امیزنگ۔ بہت زبردست ہے یار۔" رباب کے لہجے سے چھلکتی فطری سی خوشی پر وہ چونکی۔

"اچھا۔ دکھاؤ تو؟"

"پینتیس ہزار۔ کوئی اتنی اچھی بھی سیلری نہیں ہوتی۔" شانزے نے دیکھ کر منہ بنایا۔

"او میرے خدایا! تم کتنی ناشکری ہو شانزے! یہ تمہارے کیریئر کی پہلی جاب ہے اور کبھی بھی انسان کا اسٹارٹ اتنی اچھی تنخواہ سے نہیں ہوتا' ابھی تو یہ آغاز ہے' اور پھر پک اینڈ ڈراپ کے ساتھ بونس بھی تو ہیں۔" رباب دھم کر کے اس کے برابر آن بیٹھی۔

"ہوں۔ ٹھیک کہتی ہو۔" شانزے پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

"یہ اسٹارٹ ہے' انشاء اللہ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہی ہوگا۔" رباب نے اسے مزید تسلی دی۔

"میں اس بات پر افسردہ نہیں ہوں رباب۔" شانزے نے اس کی غلط فہمی دور کرنی چاہی' رباب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے تو یہ سوچ اداس کر رہی ہے کہ میری زندگی کے خواب کیا تھے اور تقدیر نے میری قسمت میں کیا لکھ دیا۔ اس طرح جاب کرنے کا تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔"

"اللہ' انسان کو وہی دیتا ہے جو اس کے لیے بہتر ہو' اللہ کی رضا میں راضی ہونا سیکھو پھر وہ تمہیں وہ بھی دے گا جو تم چاہتی ہو۔" رباب نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"اللہ' انسان کو اس وقت کیوں نہیں دیتا' جب اسے اس کی خواہش ہوتی ہے۔"؟ شانزے عجیب سے انداز سے گویا ہوئی۔

"کچھ خاص چیزوں کے لیے کوئی وقت اور کوئی گھڑی مقرر ہوتی ہے' اور اس سے پہلے کچھ نہیں ملتا' انسان کی کامیابی کا راز اس وقت کا صبر اور شکر کے ساتھ انتظار کرنا ہے۔" رباب نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اللہ کے اختیار میں تو سب کچھ ہے' وہ تو کسی کو بھی کسی بھی وقت پر دے سکتا ہے۔" شانزے نے ضد کی۔

"اللہ کے ساتھ ضد مت کیا کرو شانزے' اس کی خوشی میں خوش ہونا سیکھو' اس سے زندگی آسان ہوجاتی ہے۔" رباب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شانزے کو اپنی زندگی کے سارے اصول اور فلسفے ایک لمحے میں سمجھا دے۔ شانزے نے یوں ہی سر ہلا کر تائید کی' ورنہ وہ دل میں کہاں رباب کی بات سے متفق ہوئی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے یونہی اپائنٹمنٹ لیٹر کھول کر دیکھا اور جیسے ہی اس نے پڑھا' اسے ایک دم جھٹکا سا لگا۔ ماہیر تیمور نے اسے اپنے ساتھ اسسٹنٹ کے طور پر مقرر کیا تھا' وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اسے یقیناً" سرمد کے ساتھ کام کرنا ہوگا لیکن یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ماہیر کے ساتھ کام کرے گی۔ اس کا دل مضطرب سا ہوا۔ عجیب سی بے چینی رگ و پے میں بھر گئی' لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ سرمد کو انکار نہیں کر سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم نے جو اپنے اوپر سستی اور نالائقی کا چولا اوڑھ رکھا ہے ناں' برائے مہربانی اسے اتار پھینکو۔" ماہیر آج کافی دن کے بعد اوریدا کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے اوریدا کی کتابوں کا ڈھیر تھا اور پچھلے دو گھنٹے سے اس کی شامت آئی ہوئی تھی۔ وہ کتابیں کارپٹ پر پھیلائے بڑے مزے سے کوئی ڈرامہ دیکھنے میں مگن تھی جب ماہیر وہاں داخل ہوا' اسے یہ منظر دیکھ کر ایک دم ہی غصہ آگیا۔

"میں نے کیا کیا ہے بھائی۔۔؟" اوریدا نے برا سامنہ بنایا' وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہی تھی جب اس نے ماہیر سے اسٹڈی میں مدد لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ حالانکہ اسے پتا بھی تھا کہ وہ پڑھنے والا کیڑا تھا۔ اس کا تعلیمی کیریئر ہمیشہ سے آؤٹ اسٹینڈنگ رہا تھا۔

"آخر مشکل کیا ہے' کیمسٹری' اور بیالوجی میں۔"

ماہیر نے ناراض نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جو بائیو کی ایک ڈایاگرام میں الجھی ہوئی تھی۔

"مجھے چیزیں۔ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں۔" اوریدا نے بے بسی سے کہا۔

"چیزیں نہیں۔" تیمور نے فوراً" تردید کی۔ "صرف اسٹڈی کہو' ورنہ خاندانی پالیٹکس اور ادھر ادھر کی باتوں میں تو تمہارا دماغ بہت چلتا ہے۔" تیمور نے اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی' دونوں ہی اس بات سے بے خبر تھے کہ بڑے ابا بڑی خاموشی سے ان کی پشت پر رکھے ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر آن بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار تھا۔ ماہیر اب اوریدا کو وہ ڈایاگرام سمجھا رہا تھا۔ جب کہ اوریدا کا سارا دھیان ٹی وی پر چلنے والے ڈرامے کی طرف تھا' جس کی آواز ماہیر نے بند کر رکھی تھی۔ وہ اداکاروں کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ لگا رہی تھی کہ ڈرامہ کس چویشن سے گزر رہا ہوگا۔

"اوریدا! تمہارا دھیان کہاں ہے آخر۔" ماہیر نے بہت جلد اس کی توجہ کا منبع تلاش کرلیا۔ وہ اب ناراضی سے اٹھ کر ٹی وی بند کر رہا تھا۔

"کہیں نہیں بھائی۔" وہ ایک دم شرمندہ ہوئی۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں ایسی حرکتیں کرتے ہوئے' تم ہمیشہ پاپا کو ہر جگہ شرمندہ کرواتی ہو۔" ماہیر کو ایک دم ہی غصہ آیا۔ جب کہ پاپا کے نام پر اوریدا ایک دم ہی حیران ہوئی کہ ان کا ذکر یہاں کیسے آگیا۔

"میں نے تو یونہی ٹی وی کی طرف دیکھا تھا۔" اس کے غصے سے اوریدا کی روح فنا ہوتی تھی۔

"چپ کرجاؤ اور پلیز ایکسکیوز مت دو' تمہیں ڈاکٹر بننے کا شوق نہیں تو چھوڑو سائنس کو اور فائن آرٹس پڑھو۔" ماہیر نے بیزاری سے ہاتھ میں پکڑی

نوٹ بک بند کی۔

"میں نے ایسا تو نہیں کہا۔" اوریدا نے گھبرا کر وضاحت دی۔

"لیکن تمہاری حرکتیں تو چیخ چیخ کر یہی بتاتی ہیں۔ تم پاپا کو نہیں خود کو دھوکا دے رہی ہو، تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے انہوں نے کتنی ٹف لائف گزاری ہے۔" وہ آج اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"آخر میں نے کیا کیا ہے؟" اوریدا جھنجلا سی گئی۔

"یہ تم مجھ سے نہیں اپنے آپ سے پوچھو۔ اپنے اوپر نالائقی کا ٹھپہ لگوا کر اور پاپا کی دوسروں کی نظر میں انسلٹ کروا کر تمہیں ملتا کیا ہے۔" ماہیر غصے سے اٹھا۔

"تمہاری وجہ سے پاپا کو آنٹی بینش کی اتنی باتیں سننا پڑتی ہیں۔" وہ ناراض انداز سے کہہ کر جیسے ہی مڑا، سامنے بیٹھے بڑے ابا کو دیکھ کر سٹ پٹا سا گیا۔ بڑے ابا فوراً" ہی اخبار کے اوپر جھک گئے۔ انہوں نے دونوں بہن بھائیوں کی اس بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اسی دوران بڑی اماں ہاتھ میں چائے کا مگ اٹھائے لاؤنج کی طرف نکل آئیں اور آتے ہی ان کی نظر لاؤنج کے کارپٹ پر بے آواز روتی ہوئی اوریدا پر پڑی۔ وہ ایک دم گھبرا سی گئیں۔

"آئے ہائے، اسے کیا ہوا؟ یہ کیوں ندیا بہا رہی ہے آنسوؤں کی۔" بڑی اماں کی دہائی پر بڑے ابا اور ماہیر دونوں نے ہی بے ساختہ مڑ کر اوریدا کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ ماہیر کی باتوں نے اسے بہت تکلیف دی تھی۔

"بڑی اماں! ہر کوئی میرے ہی پیچھے پڑا رہتا ہے، پڑھو، پڑھو، بس ایک یہی ماٹو ہے ان سب کا۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"تو ٹھیک ہے مت پڑھو، بڑی اماں کوئی ڈھنگ کا رشتہ دیکھ کر جان چھڑائیں اپنی، ہم کیوں ہر وقت کی ٹینشن میں رہیں۔" ماہیر کے ناراض لہجے میں دیے گئے مشورے پر اوریدا کے اندر کوئی بھانبڑ ہی تو جل اٹھا۔

"لو اب تم بھی اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔" بڑی اماں اس کے آنسوؤں سے موم ہو گئیں۔

"اس گھر میں ہی کوئی سایہ ہے، جو بھی یہاں داخل ہوتا ہے، مجھ سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ دل کرتا ہے یہ گھر چھوڑ کر کہیں دور بھاگ جاؤں۔" اوریدا بولی نہیں پھنکاری تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب زور سے زمین پر پھینکی اور روتی ہوئی لاؤنج سے نکل گئی۔ کمرے میں لگتا تھا کسی نے صور پھونک دیا ہو۔ بڑے ابا کا رنگ زرد ہوا اور بڑی اماں اپنے دل پر بے ساختہ ہاتھ رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ماہیر کو ایک دم ہی اپنی جذباتیت پر افسوس ہوا۔

"آئی ایم سوری بڑی اماں! اسے عادت ہے بغیر سوچے سمجھے بولنے کی۔" ماہیر ہلکا سا جھجک کر بولا۔

"جب وہ ڈاکٹر بننا نہیں چاہتی تو کیا گن پوائنٹ پر بنواؤ گے؟" بڑی اماں ماہیر پر برس پڑیں۔

"یہ میرا نہیں اس کا اپنا فیصلہ ہے، اب تو پاپا نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔" ماہیر نے شرمندگی سے صفائی دی۔

"حال پر چھوڑ دیا ہے تو ہر وقت پڑھائی کا ڈنڈا لیے کیوں اس کے پیچھے گھومتے ہو۔" بڑی اماں نے ناراضی سے سر جھٹکا۔

"وہ تو بے وقوف ہے، پاگل ہے، کل کو کہیں اوٹ پٹانگ قدم اٹھا بیٹھی تو ساری زندگی کا رونا تو ہمیں ہی پڑے گا ناں، تم باپ بیٹے تو بوریا بستر اٹھا کر ملک سے بھاگ جاؤ گے۔" بڑی اماں نے بھی کہیں کا غصہ کہیں اتارا تھا۔

"میں پاپا سے کہوں گا۔ اسے واپس بلوا لیں۔" ماہیر کو یہی حل نظر آیا۔

"رہنے دو تم، اپنے مشورے اپنے پاس رکھو، میں خود سنبھال لوں گی اسے۔" بڑی اماں بھی ناراض انداز سے کمرے سے نکل گئیں۔

"بڑے ابا! پلیز ایک بات تو بتائیں۔" ماہیر بے تکلفی سے ان کے سامنے ایسے آن کھڑا ہوا، جیسے دونوں کے درمیان بڑے عمدہ مراسم رہے ہوں۔ بڑے

ابا نے سپاٹ سے انداز سے اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔

"اس گھر کی ساری خواتین ہی اتنی جذباتی اور بے وقوف ہیں یا ہمارے ہی حصے میں کوئی خاص تحفہ آیا ہے اوریدا کی صورت میں۔" اس قدر سرد ماحول میں بھی بڑے ابا کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔

"میں ان غیر ضروری باتوں پر غور نہیں کرتا۔" انہوں نے اپنا دامن صاف بچایا۔ اخبار ایک طرف رکھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"اف... لگتا ہے سب مل کر پاگل کردیں گے مجھے۔" وہ بے بس انداز سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اوریدا کے آنسو۔ اب اسے پریشان کر رہے تھے۔ اسے یقین تھا' وہ اس وقت پاپا یا ارصم کو دل کھول کر اس کی شکایتیں لگا رہی ہوگی۔

"ماہیر نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" وہ اپنے کمرے میں سیل فون پر ارصم سے بات کرتے ہوئے رو پڑی۔

"وہ تمہارا بھائی ہے اوریدا! اور تمہیں کسی اچھے مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔" ارصم نے اس کی طرف سے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"وہ بھی مجھے ساری دنیا کی طرح نکما' نالائق اور کند ذہن سمجھتا ہے۔" اوریدا کی اردو کافی اچھی ہوچکی تھی۔ ارصم اس کی بات پر مسکرایا۔

"بے وقوف لڑکی! تم کیوں دوسروں کو ایسی بات کرنے کا موقع دیتی ہو؟" ارصم نے اپنائیت سے کہا۔

"میں کیا کروں' کوشش کے باوجود بھی زیادہ نہیں پڑھ پاتی۔" اوریدا نے بے بسی سے اعتراف کیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں یہ امید چھوڑ دوں کہ تم میرے کالج میں ایڈمیشن لوگی۔" ارصم نے دانستہ مایوس انداز اپنایا اور دوسری طرف اوریدا کے دل کو کچھ ہوا۔

"نہیں... نہیں' میں نے ایسا تو نہیں کہا۔" یہ خیال ہی اوریدا کی جان نکال دیتا تھا۔

"بس اٹھو' منہ ہاتھ دھو کے فریش ہوجاؤ' مجھے کچھ فرینڈز کے ساتھ صدر کی طرف نکلنا ہے۔" ارصم نے نرمی سے کہا۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے ست انداز سے کمبل اوڑھ لیا۔

"اوریدا... پلیز میری خاطر..." ارصم کے لہجے میں کچھ تھا' اوریدا نے جلدی سے کمبل اتارا اور کھڑی ہوگئی۔ اس کا دل ایک عجیب سی لے میں دھڑکا۔ وہ فون بند کرکے واپس اپنے کمرے میں آئی تو دروازہ ہلکا سا کھٹکھٹا کر کے ماہیر اندر داخل ہوا۔ اوریدا ناراضی کے اظہار کے طور پر ڈریسنگ کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ وہ اسے منانے کے لیے اس کے کمرے میں آیا تھا۔

"کیوں آئے ہیں یہاں...؟" اوریدا جذباتی ہوئی۔

"زیادہ ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں' میرے ساتھ صدر تک چلو' کچھ شاپنگ کرنی ہے اور واپسی پر تمہیں اچھا سا کھانا کھلاؤں گا۔" ماہیر اس سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے کچھ دیر پہلے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

"میرا دل نہیں کر رہا۔" اس نے نخرہ دکھایا' ورنہ جب سے ارصم نے اسے صدر جانے کا کہا تھا اس کا نادان دل تب سے بے چین تھا' پچھلے پانچ دن سے وہ گھر نہیں آیا تھا اور ہوسٹل میں ہی تھا۔ کیا پتا اس بہانے اس سے بھی ملاقات ہوجاتی۔

"میں نے تمہارے دل سے نہیں' تم سے پوچھا ہے' سمجھیں..." ماہیر نے پیچھے سے آکر اس کی پونی کھینچی' یہ اس کا منانے کا مخصوص اسٹائل تھا۔

"کیا مصیبت ہے بھائی! کیوں میرا ہیر اسٹائل خراب کر رہے ہو۔" وہ ایک دم چڑ سی گئی۔

"جب تک ساتھ نہیں چلوگی' ایسے ہی تنگ کرتا رہوں گا۔" وہ اس کی ناک مروڑتے ہوئے اسے مزید چڑانے لگا۔ اوریدا نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ڈھٹائی کے ریکارڈ توڑنے والوں میں سے تھا۔ اوریدا نے منہ بنایا اور جوتے پہننے لگی۔

"قسم سے اب فیل بھی ہوجاؤگی تو کچھ نہیں کہوں گا' جتنی بڑی اماں سے جھاڑ پڑی ہے مجھے۔" وہ گاڑی

ڈرائیونگ کرتے ہوئے مزے سے بولا۔

"بڑی اماں نے بھی میری ہی خامیوں پر ایک طویل لیکچر دیا ہوگا۔" اوریدا کو بالکل بھی یقین نہیں آیا۔

"تم اتنی بدگمان کیوں ہو اوریدا؟" وہ حقیقتاً "حیران ہوا۔

"میں بدگمان نہیں، حقیقت پسند ہوں، مجھے معلوم ہے، ارصم کے علاوہ کوئی بھی مجھے اس گھر میں پسند نہیں کرتا۔" اوریدا کے شکایتی انداز پر وہ ہنسا۔

"اچھا تو ارصم تمہیں پسند کرتا ہے۔" ماہیر کے معنی خیز انداز پر وہ ہلکا سا بوکھلا کر صفائی دینے کے انداز میں بولی۔ "ظاہر ہے، ہم دونوں اچھے دوست جو ہوئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں حیران ہوں کہ آنٹی بینش کی اتنی زیادہ ناپسندیدگی کے باوجود وہ تمہارے ساتھ فرینڈشپ کیسے رکھے ہوئے ہے۔" ماہیر کو واقعی حیرانی ہوئی اور وہ اس کا اظہار کرنے سے خود کو روک نہیں پایا۔

"وہ اور آغا جی تو بالکل بھی آنٹی بینش جیسے نہیں ہیں۔" اوریدا کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، لیکن اس نے ماہیر کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"اصولاً" تو اسے اپنی ماما کی بات ماننی چاہیے، اس کا مطلب ہے کہ وہ ایک اچھا بیٹا بالکل نہیں ہے۔" ماہیر نے اسے چھیڑا۔ اتنا تو اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت صرف ارصم ہی وہ واحد موضوع ہے۔ جس پر اس کی بہن کھل کر بات کر سکتی ہے۔

"ہرگز نہیں۔۔۔ وہ جتنا اچھا دوست ہے، اس سے زیادہ بہترین بیٹا ہے۔" ارصم کو وہ کسی بھی لحاظ سے کم ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

ماہیر اس کی بات پر ہنسا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اوریدا، شام والا واقعہ بھول کر اب اس کے ساتھ باتوں میں مگن ہو چکی تھی۔ اس کی کچھ عادتیں بالکل بچوں جیسی تھیں اور زیادہ دیر تک کوئی بھی بات اپنے دل میں رکھنے کی قائل نہیں تھی۔ دونوں بہن بھائی کافی دیر تک شاپنگ کرتے رہے۔ ماہیر نے آج اسے خود بھی دل کھول کر چیزیں خرید کر دی تھیں۔ دونوں نے اپنی پسند سے پاپا، بڑے ابا اور بڑی اماں کے لیے بھی کچھ گفٹس خریدے تھے۔

"بھائی! یہ ٹائی کیسی ہے۔" پرپل کلر پر سفید لائننگ والی ٹائی، اوریدا کو ایک ہی نظر میں اچھی لگی تھی۔

"اگر ارصم کے لیے لینی ہے تو اچھی ہے۔" وہ ماہیر کی بات پر ایک دم ہی جھینپ سی گئی۔

"اور یہ گرے شرٹ۔۔۔؟" وہ فوراً" ہی اپنے تاثرات چھپانے کے لیے شرٹس والے ریک کی طرف مڑ گئی۔

"پاپا کے لیے نا۔۔۔؟" ماہیر اس کا مزاج آشنا تھا۔ اوریدا نے فوراً" اثبات میں سر ہلایا۔

"ہوں۔۔۔ بہت زبردست ہے، لیکن پلیز اب شاپنگ ختم کرو، میں تھک چکا ہوں۔" ماہیر کے تھکے تھکے سے انداز پر وہ مسکرائی۔ وہ دونوں اب کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دونوں گاڑی میں تھے۔

"بہت بھوک لگی ہے۔" اوریدا نے مسکراتے ہوئے فرمائش کی تو ماہیر نے فوراً" ہی گاڑی کا رخ پی سی کی طرف موڑ لیا، کم از کم آج کے دن تو وہ اوریدا کی کوئی بات ٹالنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اتنی مشکل کے بعد تو اس کا موڈ ٹھیک ہوا تھا۔

دونوں بہن بھائی مسکراتے ہوئے پی سی ہوٹل کے "مارکو پولو" ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے، اندر داخل ہوتے ہی اوریدا کی نظر سامنے بیٹھے ارصم اور اس کی کلاس فیلو زرش پر پڑی۔ اسے دھچکا سا لگا۔ وہ دونوں بڑی بے تکلفی سے کھانا کھانے میں مگن تھے۔ اوریدا کا رنگ فق ہوا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے ماہیر کی طرف دیکھا جو اپنے سیل فون پر آنے والی کال کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے ارصم اور اس کے ساتھ بیٹھی زرش کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ اوریدا کا دل ایک دم ہی خراب ہوا۔ اس کے گمان کی آخری سرحدوں پر بھی

نہیں تھا کہ اس وقت ارصم اور اس کی کلاس فیلو زرش سے سامنا ہو جائے گا۔

"بھائی' بخارا ریسٹورنٹ چلتے ہیں' مجھے چائنیز نہیں کھانا۔" اوریدا نے اپنے حلق میں پھنسے ہوئے آنسوؤں کے گولے کو بمشکل نگلا اور ماہیر کا بازو پکڑ کر باہر کی طرف نکل آئی۔

"سارے رستے تو تم نے چائنیز اور تھائی فوڈ کی رٹ لگا رکھی تھی۔" ماہیر نے مینو پڑھتے ہوئے حیرانی سے کہا۔ اوریدا کا پل پل بدلتا ہوا مزاج اسے پریشان کرنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ جتنی خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھی اب اتنے ہی اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بمشکل کھانا زہر مار کر رہی ہو۔

"زرش نے تو لاہور میں ایڈمیشن لیا تھا' پھر وہ ارصم کے ساتھ یہاں راولپنڈی میں کیسے۔۔۔؟" اوریدا کی سوئی ایک ہی نکتے پر پھنسی ہوئی تھی۔

"کہیں ارصم نے مجھ سے جھوٹ تو نہیں بولا' وہ اس کے ساتھ اسی کالج میں ہو۔" اس سوچ نے اس کی باقی ماندہ بھوک بھی اڑا دی۔ وہ خالی پلیٹ میں چمچ پھیرتی ہوئی ماہیر کو سخت الجھن میں مبتلا کر رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ پاپا نے اوریدا کو پاکستان بھجوا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس کی ساری شخصیت کو ہی مسخ کر دیا' وہ اس موضوع پر اب تیمور سے کھل کر بات کرنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

موسم بدل چکا تھا اور فضا میں خنکی کا اضافہ ہو رہا تھا۔ عدینہ عشاء کی نماز پڑھ کر ہاتھ میں تسبیح اٹھائے صحن کی طرف نکل آئی۔ صحن میں لگے رات کی رانی کے پودے کی مہک چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چھوٹی چارپائی بچھا کر اس پر لیٹ گئی اور آسمان پر موجود تاروں کو گنتے ہوئے تسبیح کرنے لگی۔

"عدینہ باجی! آپ نے تو ماشاء اللہ بہت اسپیڈ پکڑی ہوئی ہے۔" مونا پلیٹ میں سالن اور ہاتھ میں روٹی پکڑے اس کے پاس آن بیٹھی۔

"کس بات کی۔۔۔؟" عدینہ حیران ہوئی۔

"آپا صالحہ بتا رہی تھیں کہ آپ ماشاء اللہ بہت تیزی سے قرآن پاک حفظ کر رہی ہیں۔" مونا نے اصل بات بتائی۔

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔۔۔" عدینہ نے سادگی سے کہا۔ "یہ سب اللہ کے کام ہیں' اس کی دی ہوئی توفیق سے ہی انجام کو پہنچتے ہیں۔"

"ہاں' کہتی تو آپ ٹھیک ہیں' لیکن مجھ سے بعد میں شروع کر کے آپ میرے برابر پہنچ گئی ہیں۔" مونا اس کے پاس بیٹھی بے تکلفی سے کھانا کھا رہی تھی۔

"مجھے تو اگلے سال میڈیکل کالج میں دوبارہ ایڈمیشن لینا ہے' اسی وجہ سے جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔" عدینہ نے یاد دلایا۔

"کیا آپ اس معاملے میں واقعی سیریس ہیں۔۔۔؟" مونا کے لہجے سے جھلکتی بے یقینی پر عدینہ مسکرائی۔

"تو تمہیں کیا لگتا ہے' میں نے آپا۔۔۔ جھوٹ بولا ہے۔" اس نے مونا کے ذہن میں ابھرتی سوچ کو سرعت سے پڑھا تھا۔

"ہاں۔۔۔" مونا ہنسی۔ "میں سمجھی' آپ نے صرف آپا کو خوش کرنے کے لیے جھوٹ بولا ہے۔"

"تمہیں پتا ہے مونا! میں بہت کم جھوٹ بولتی ہوں۔" عدینہ نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی' اسی وقت آپا صالحہ بھی ایک تکیہ اور کھیس اٹھائے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ انہیں اس طرف آتا دیکھ کر عدینہ اور مونا دونوں ہی ایک دم چپ ہو گئیں۔

"آپا! ادھر لیٹ جائیں۔" عدینہ نے تھوڑا سا کھسک کر ان کے لیے جگہ بنائی۔ آپا صالحہ ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں وہاں لیٹ گئیں۔ ان کا بازو عدینہ کے ہاتھ سے ٹکرایا تو عدینہ کو تپش کا احساس ہوا۔

"آپا! آپ کو اکثر ہی بخار کیوں رہنے لگا ہے۔" وہ پریشان ہوئی۔

"پتا نہیں' شاید عمر کا تقاضا ہے یا موسم بدل رہا

ہے۔" انہوں نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔
"ہر وقت ٹمپریچر رہنا تو اچھی بات نہیں۔" عدینہ نے تشویش سے ان کے ماتھے کو چھوا' وہ بھی ٹھیک ٹھاک گرم تھا۔ جب کہ آپا صالحہ حیرانی سے اس کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کو دیکھ رہی تھیں۔
"کیا پڑھ رہی ہو؟" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائیں۔
"ہر روز رات کو ایک تسبیح استغفار کی اور دس کلمہ طیبہ کی کر کے سوتی ہوں۔" عدینہ نے اپنے معمول سے انہیں آگاہ کیا۔ "اس سے نیند بہت اچھی آتی ہے۔" اس نے مزید اضافہ کیا تو آپا صالحہ نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑا۔
"ایک بات تو بتاؤ عدینہ۔" آپا صالحہ کا سنجیدہ انداز عدینہ کا دل دھڑکا گیا۔ اسے ایک دم محسوس ہوا کہ وہ کوئی خاص بات پوچھنے والی ہیں۔
"جی آپا۔"
"اللہ جب ہمیں بے حساب نعمتوں سے نوازتا ہے تو کیا بندے کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ گن گن کر اس کی عبادت کرے؟" آپا صالحہ کی بات پر وہ ایک دم ہی چپ رہ گئی۔ یہ بات تو اس نے کبھی سوچی ہی نہیں تھی۔
"آئی ایم سوری آپا۔" آپا کو اس کی معصومیت پر بے ساختہ ہی پیار آیا' انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ عدینہ ایک لمحے کو ششدر سی رہ گئی' اس نے کب سوچا تھا کہ کبھی آپا صالحہ بھی اس سے محبت کا اظہار کر سکتی ہیں۔
"جھلی نہ ہو تو' بس اللہ کے ساتھ حساب کتاب مت رکھا کرو بیٹا' ہم انسان تو ساری زندگی بھی عبادت کریں تو اس کا احسان نہیں اتار سکتے اور کوشش کیا کرو' اپنی انگلیوں کی پوروں پر اس کا ذکر کرو' یہ قیامت کے دن تمہارے حق میں گواہی دیں گی۔" انہوں نے نرمی سے کہہ کر آنکھیں موند لیں۔ وہ اب سونا چاہتی تھیں۔ اوائل اکتوبر کے دن تھے اور راتیں کافی ٹھنڈی ہو جاتی تھیں' لیکن آپا صالحہ کے اندر نہ جانے کون سا تندور جل رہا تھا جو انہیں سردی کی شدت کو محسوس ہی نہیں ہونے دیتا تھا۔ مونا نے آہستگی سے عدینہ کو اشارہ کیا' وہ دونوں چپکے سے اٹھ کر کمرے میں آ گئیں۔
"مجھے آپا کی باتوں سے خوف آنے لگا ہے مونا۔" عدینہ نے اپنے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔
"وہ کیوں۔" مونا حیران ہوئی۔
"وہ اتنی نرم مزاج' اور محبت کرنے والی تو کبھی بھی نہیں تھیں' انہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔" عدینہ کے تشویش زدہ لہجے پر مونا بے ساختہ مسکرائی۔
"آپ بھی عدینہ باجی پاگل ہیں' جب وہ آپ سے پیار نہیں کرتی تھیں تو تب بھی آپ کو ان سے گلے شکوے تھے اور اب وہ بدل گئی ہیں تو تب بھی آپ پریشان ہو رہی ہیں۔"
"بس انسان پاگل ہے نا' کسی بھی حال میں خوش نہیں رہتا۔" عدینہ نے مسکراتے ہوئے اپنی میز پر رکھی کتابیں سیٹ کرنا شروع کر دیں۔ اس کی سیاہ جلد والی ڈائری وہیں رکھی ہوئی تھی' اس نے یونہی کھول لی' ڈائری کے کور کے سائیڈ پر عبداللہ کی پاسپورٹ سائز رکھی ہوئی تھی۔ یہ تصویر مونا کو اس کے سامان سے ملی تھی۔ عدینہ نے یونہی ایک نظر اس پر ڈالی' پہلی دفعہ اس کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا نہیں ہوا' اور نہ ہی دھکتی ہوئی رگوں نے کوئی دہائی دی تھی۔
"کہیں میں عبداللہ کو بھول تو نہیں گئی؟" وہ بے اختیار پریشان ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔
"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" مونا نے اس کی بڑبڑاہٹ غور سے نہیں سنی تھی۔ وہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔
"کیا ہوا عدینہ باجی۔" اس نے عدینہ کے چہرے پر پھیلے کرب کو محسوس کیا۔
"پہلی دفعہ عبداللہ کی تصویر دیکھ کر دل میں کسی ہلچل کا احساس نہیں ہوا مجھے۔" عدینہ نے اپنی ہم راز کے سامنے اپنے دل کا راز افشا کیا۔
"ایسا نہیں ہے عدینہ باجی۔" مونا مسکرائی تو عدینہ نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"جب انسان کسی دکھ یا غم پر بے تحاشا رو لیتا ہے نا' تو اس کے دل کو صبر آجاتا ہے شاید۔" مونا نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"تم غلط کہہ رہی ہو مونا۔" اس نے فوراً" ہی تردید کی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" مونا نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا' جو عبداللہ کی تصویر ہاتھ میں پکڑے کسی بت کی طرح ساکت تھی۔

"زندگی میں ہر دکھ ہر تکلیف پر صبر آجاتا ہے' لیکن جو شخص آپ کے دل میں زندہ ہو تم اس کی موت کا یقین کبھی نہیں آتا۔ چاہے دنیا میں اس کی کتنی ہی قبریں بنا کر ان پر کتبے سجالو۔ اس کی یاد میں اتنی طاقت اور صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ دل کی بنجر زمین پر لگی کسی ویران شاخ پر بھی کونپل بن کر پھوٹ پڑتی ہے اور اس کو بھلانے کے سارے دعوے فضا میں دھواں بن کر تحلیل ہو جاتے ہیں۔"

عدینہ کا لہجہ سوگوار اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ جو بہت دنوں سے ضبط کا بند باندھے پھر رہی تھی' آج اس دشمن جان کی تصویر دیکھ کر پھر بے چین ہو گئی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ آنے والے پچاس سالوں میں بھی وہ کوشش کرے تو عبداللہ کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ موسم سرما کی سرد اور عجیب سی رات تھی۔ نیلم اپنے گرم لحاف میں گھسی ہوئی بختاور کو پریشان سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی' جو بڑے سنجیدہ انداز میں اپنے بستر پر اپنا اٹیچی کیس رکھے پیکنگ میں مصروف تھی۔ اس کے پاس اس کی چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

"یار! کیا تم واقعی صبح اپنے والدین کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہو۔۔۔؟" نیلم کو نہ جانے کیوں یقین نہیں آرہا تھا۔

"تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا؟" بختاور نے حیران لہجے میں پوچھا۔

"تم کیسے اتنی آسانی کے ساتھ ہاشم کو بھلا کر فیصل سے شادی کر سکتی ہو۔" کم از کم نیلم کو تو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"اس کے علاوہ میرے پاس کوئی آپشن بھی تو نہیں ہے۔" اس نے اپنے ڈاکومنٹس کا لفافہ الماری سے نکالا اور احتیاط سے ساری چیزیں رکھنے لگی۔

"تم اپنے سارے ڈاکومنٹس کیوں لے کر جا رہی ہو۔" نیلم کو اس کی یہ حرکت عجیب لگی تو فوراً" ہی اظہار کر دیا۔

"اب ان کی یہاں ضرورت جو نہیں ہے' سوچا ہے کہ اس دفعہ ساری غیر ضروری چیزیں گھر چھوڑ آؤں گی' ہوسٹل میں سامان دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔" بختاور نے ایک غیر ضروری سی وضاحت دی' جس کی اس وقت قطعاً" کوئی ضرورت نہیں تھی۔

"ہاں' کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔" نیلم نے اس کی بات کا فوراً" ہی یقین کر لیا۔

"تم نے ہاشم کو بتا دیا کہ تم کل اپنے شہر جا رہی ہو۔" نیلم نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ بختاور کے چہرے پر دوڑ گئی۔

"میں تمہیں اتنی ظالم لگتی ہوں کیا؟"

"کیا مطلب۔۔۔؟" نیلم نے جھٹ سے لحاف ایک سائیڈ پر کیا اور فوراً" ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ بختاور اتنے سرد موسم میں بغیر کسی سویٹر اور شال کے اس کے سامنے کھڑی پیکنگ کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ موسموں کی شدت سے بے نیاز ہو چکی ہو۔

"تم اسے بتائے بغیر چلی جاؤ گی کیا؟" نیلم ٹھیک ٹھاک پریشان ہوئی۔

"بتا دوں گی تو وہ جانے تھوڑی دے گا۔" بختاور عجیب سے انداز سے مسکرائی۔

"لیکن یہ تو سخت زیادتی ہے اس کے ساتھ۔" نیلم نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

"ایک بات تو بتاؤ نیلم۔۔۔؟" بختاور نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"ہاں پوچھو۔" نیلم بے تابی سے گویا ہوئی۔
"محبت کے سفر میں سارے خسارے لڑکیوں کے ہی حصے میں کیوں آتے ہیں' ماں باپ کی عزت کا دامن تھامیں تو محبت دہائی دینے لگتی ہے اور چاہت کا ہاتھ تھام کر نئی دنیا بسانے نکل جاؤ تو زمانہ جینے نہیں دیتا' آخر یہ لڑکیاں کیا کریں؟" اس نے اپنا ایک سوٹ گولہ سا بنا کر اٹیچی کیس میں پھینکا۔
"میرے تو خیال میں لڑکیوں کو ان محبتوں کے چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔" نیلم پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔
"اس لیے کہ بعض محبتیں اپنے دامن میں سوائے ذلت اور رسوائی کے کچھ نہیں لاتیں' ماں باپ کی عزتوں کو قربان کرکے بسائے جانے والے گھر کبھی پائیدار نہیں ہوتے۔" نیلم کے نظریات بالکل پختہ اور کسی پتھر پر لکیر کی مانند تھے۔
"چاہے ان عزتوں کا خراج ساری زندگی ہی دینا پڑے' ایک ناپسندہ شخص کو ساری زندگی کے لیے اپنے اوپر مسلط کرنا بھی تو آسان نہیں ہوتا۔" بختاور نے اور تیزی کے ساتھ پیکنگ کرنی شروع کردی تھی۔
"مجھے صرف اتنا پتا ہے بختاور! جن بیٹیوں کے ساتھ ماں باپ کی دعائیں ہوں' ان کی قسمت میں اللہ نے کوئی آزمائش نہ لکھی ہو تو ان کے گھر بس ہی جاتے ہیں' دل کا سکون اور عزت و احترام کی ردا بہت قیمتی اور انمول چیزیں ہیں' جن کا احساس انسان کو زندگی گزارنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔" نیلم نے اس کو اپنی طرف سے سمجھانے کی پوری کوشش کی۔
"میں تمہاری بات سے متفق نہیں ہوں۔" بختاور یہ جملہ صرف دل میں سوچ کر رہ گئی کیونکہ لبوں پر لانے کی صورت میں ایک طویل بحث چھڑنے کا اندیشہ تھا' جو وہ اس وقت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔
"تمہارے کچھ پیسے تھے میرے پاس' اسے رکھ لو۔" بختاور نے ہزار کا نوٹ اپنے پرس سے نکال کر نیلم کی طرف بڑھایا۔
"یار! اتنی جلدی کس بات کی ہے' آکر واپس کردینا۔" نیلم نے بے تکلفی سے کہا تو وہ بے بس انداز میں بولی۔
"میں اپنے سر پر کوئی بھی بوجھ لے کر نہیں جانا چاہتی اور قرض تو جتنی جلدی لوٹا دیا جائے' اچھا ہوتا ہے۔" اس نے اپنی پیکنگ مکمل کرلی تھی۔
"تم تو ایسے سارے معاملات کلیئر کرکے جارہی ہو' جیسے خدانخواستہ واپس آنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔" نیلم کی بات پر اس کا دل بری طرح سے دھڑکا۔
"ایسا ہو بھی تو سکتا ہے۔" بختاور کے ذو معنی انداز پر وہ چونکی۔
"کیا مطلب ہے تمہارا؟" نیلم ٹھیک ٹھاک الجھن کا شکار ہوئی۔
"میرے بابا کا کچھ پتا نہیں' فیصل کے ساتھ نکاح کرنے بعد ہاتھ پکڑ کر اسی وقت رخصت بھی کردیں۔" بختاور نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے ڈرایا۔
"اللہ نہ کرے یار' اس کمرے میں تو میں تمہارے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔"
نیلم کے لہجے کی بے ساختگی اور محبت کسی بھی قسم کے شک و شبے سے بالاتر تھی۔ بختاور کو اپنے دل میں تاسف کا دھواں سا اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ پاؤں میں ایک ان دیکھی سی زنجیر آکر لپٹ گئی۔
"اگر واقعی بابا نے مجھے واپس نہ آنے دیا تو...؟" بختاور نے کسی خیال سے الجھ کر اپنی بہترین دوست کا پیارا سا معصوم چہرہ دیکھا۔
"پلیز بختاور! آدھی رات کو ایسی خوف ناک باتیں تو مت کرو' میرا تو ابھی سے سوچ کر ہی دم گھٹنے لگا ہے۔" نیلم نے برا سا منہ بنا کر اس سے درخواست کی تو وہ دھیرے سے ہنس دی۔
"چلو اب خاموشی سے سو جاؤ' صبح تم نے اتنا لمبا سفر بھی کرنا ہے۔" نیلم نے محبت سے لبریز لہجے میں اسے یاد دلایا تو اس کے چہرے سے ایک دم ہی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ وہ ہلکا سا جھجک کر بولی۔
"نیلم پلیز۔ آج کی رات سونے کا مت کہو' میں آج تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"یار! باتوں کے لیے تو ساری زندگی پڑی ہے' صبح پروفیسر منصور کا ٹیسٹ بھی ہے ہم تو جان چھڑا کر جا رہی ہو۔" نیلم نے اٹھ کر کمرے میں پھیلی چیزوں کو سمیٹا۔

"جو ٹیسٹ اور امتحان میں دینے جا رہی ہوں' دعا کرو' اللہ ایسی آزمائش میں کسی کو نہ ڈالے۔" وہ اداس ہوئی۔

"تم پریشان مت ہو' مجھے یقین ہے۔ فیصل بہت اچھا لڑکا ہوگا' والدین اپنے بچوں کے لیے کبھی غلط فیصلہ نہیں کرتے۔" نیلم نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی تو وہ مزید پریشان ہوگئی۔

"جب والدین نے اپنے سروں پر نام نہاد عزتوں اور انا کے بھاری بھرکم گٹھڑ رکھے ہوئے ہوں تو اس وقت انہیں اولاد کے دل کی خوشی سے زیادہ' اپنی بات منوانے کی دھن ہوتی ہے اور ایسے عالم میں کیے جانے والے فیصلے ضروری نہیں خوش گوار ہی ہوں۔" نیلم کو محسوس ہوا کہ وہ ابھی تک بدگمان تھی۔

"اچھا اچھا۔ فضول مت بولو' کل کو یہی سب کچھ تم اپنی اولاد کے ساتھ بھی کر رہی ہوگی۔" نیلم نے دانستہ ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

"میں اپنی اولاد سے جینے کا حق نہیں چھینوں گی۔" وہ ناراض انداز سے گویا ہوئی۔

"وقت سے پہلے بڑے بڑے دعوے نہیں کرتے' کیونکہ تقدیر کا ہاتھ بہت بے رحم ہوتا ہے' بعض دفعہ انسان اپنے ہی کہے گئے جملوں اور لفظوں کے شکنجے میں ایسا پھنستا ہے کہ ساری زندگی باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔" نیلم نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔۔۔" بختاور پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

"اچھا' اب منہ پر انگلی رکھو اور خاموشی سے سو جاؤ۔" نیلم کے لہجے میں ہلکی سی برہمی چھلکی اور اس نے جلدی سے کمرے کی لائٹ بند کردی۔

"سوچ لو' آج میرا منہ بند کروانے کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی تمہیں۔۔۔" بختاور نے شرارت سے اسے چھیڑا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا۔۔۔" وہ رات کے اندھیرے میں اس کے چہرے کے تاثرات تو نہیں دیکھ سکتی تھی' لیکن اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ اس وقت بالکل بھی سنجیدہ نہیں تھی۔

"ساری زندگی اس بات پر پچھتاؤ گی کہ آج کی رات میرا منہ کیوں بند کروایا تھا۔" بختاور کی آواز میں چھپی پراسراریت نیلم کو اچھی خاصی الجھن میں مبتلا کرگئی۔

"لگتا ہے' فیصل سے شادی کے فیصلے نے تمہارے دماغ پر اثر کیا ہے۔" نیلم نے اپنا تکیہ درست کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"دماغ پر نہیں دل پر' آج کل تو "دماغ" کام ہی نہیں کرتا۔" وہ بے وجہ ہنسی۔

"بس چپ ہو جاؤ۔" نیلم نے محبت بھرے لہجے میں اسے ڈانٹا اور لحاف اوڑھ لیا۔

اور پھر آنے والے اگلے کئی سالوں تک وہ اس بات پر پچھتاتی رہی کہ کاش اس نے بختاور کو اس رات زبردستی چپ نہ کروایا ہوتا تو شاید اس کی قسمت میں لکھی سیاہی کو مزید گہرا کرنے میں اس کا نام نہ ہوتا۔

☼ ☼ ☼

"ارصم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔۔۔؟" پچھلے چار گھنٹوں میں اسی سوچ نے اوریدا کو کئی بار رلایا تھا۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کرتی تو ارصم اور زرش کے ہنستے مسکراتے چہرے اس کے سامنے آجاتے اور اس کے دل کا سارا سکون غارت ہو جاتا۔

وہ تو کہتا تھا کہ اس کا زرش سے کوئی رابطہ نہیں' لیکن دونوں کے درمیان موجود بے تکلفی تو بتا رہی تھی کہ یہ رابطہ تو کبھی منقطع ہی نہیں ہوا تھا۔

وہ ننگے پاؤں باہر نکل آئی تھی۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اس نے لان میں قدم رکھا' رات کے بارہ بج رہے تھے اور سردیوں کی اس رات میں ہو کا عالم تھا۔ ایک بے چینی اور بے قراری نے اوریدا کے وجود کا حصار کر رکھا تھا۔

"میرا تو دعویٰ تھا کہ ساری دنیا مجھ سے جھوٹ بول سکتی ہے لیکن ارصم نہیں۔"

وہ خود سے لڑتی جھگڑتی لان میں رکھے بنچ پر آن بیٹھی۔ کچھ دن کے بعد اس کے سالانہ ایگزام شروع ہونے والے تھے اور اسٹڈی سے اس کی طبیعت اچانک ہی اچاٹ ہو گئی تھی۔ ابھی شام میں ہی ڈیٹ شیٹ دیکھتے ہوئے اس نے خود سے عزم کیا تھا کہ وہ پاپا' ماہیر اور ارصم تینوں کو اچھے مارکس لے کر دکھائے گی۔ اس وقت اس کے سارے ارادے بھربھری ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل گئے تھے۔ دل کسی صورت بھی سنبھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

وہ ایک دفعہ پھر ٹہلنے لگی تھی۔ ہاتھ میں پکڑے سیل فون پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ارصم کو کال کر کے اسے ٹھیک ٹھاک سنائے گی اور جھوٹ بولنے پر اس کی خوب خبر لے گی' لیکن اب اس کا بدگمان دل ارصم کی آواز سننے کو بھی تیار نہیں تھا۔ اسی وقت ٹیکسٹ میسج کی ٹون بجی۔ اس نے بے تابی سے اپنا ان بکس کھولا سامنے ہی ارصم کا اسمائلی کارٹون کے ساتھ چھوٹا سا پیغام اس کا منتظر تھا۔

"ہائے لڑاکا بلی! کیا کر رہی ہو؟"

اس نے دل پر پتھر رکھ کر پہلی دفعہ ارصم کے کسی ٹیکسٹ کو جواب دینے کے بجائے اسے ڈیلیٹ کر دیا تھا' وہ یونہی ننگے پاؤں چلتے ہوئے ارصم کے پورشن کی طرف چلی آئی۔ آنٹی بینش کے ٹیرس کا دروازہ کھلا اور وہ کسی سے سیل فون پر بات کرتے ہوئے باہر نکلی تھیں' شاید کوئی سگنل پرابلم تھا۔

"شاہانہ! کسی اچھی سی ڈاکٹر لڑکی کا رشتہ بتاؤ نا' جو میڈیکل کے پہلے سال میں ہو۔" پرجوش انداز سے ان کی آواز بلند ہوئی۔ رات کے سناٹے میں ان کی آواز اوریدا کی سماعتوں تک بھی پہنچی۔ وہ ٹھٹک کر ان کے ٹیرس کے نیچے ہی کھڑی ہو گئی۔

"ارے بابا! کس کے لیے سے تمہاری کیا مراد ہے' میں ارصم کی بات کر رہی ہوں۔" وہ کھلکھلا کر ہنسیں۔ اوریدا کو اپنے دل پر منوں وزن گرتا ہوا محسوس ہوا۔

"اس کا بھی میڈیکل کا پہلا سال ہے' اچھا ہے نا' اس کی توجہ کہیں اور نہیں بھٹکے گی۔" وہ بڑی بے تکلفی سے بات کر رہی تھیں۔

"ویسے بھی لڑکوں کے پیروں میں جتنی جلدی زنجیریں ڈال دی جائیں' بہتر رہتا ہے۔" دوسری جانب موجود خاتون کی بات سننے کے لیے وہ کچھ لمحے چپ ہوئیں اور اگلے ہی لمحے وہ بلند آواز میں دوبارہ گویا ہوئیں۔

"بس تم فوراً" پاکستان پہنچو اور اس بچی کی والدہ سے بات کر کے مجھے بتاؤ بھئی۔ میرا بیٹا اتنا لائق فائق ہے' اس کے لیے کوئی نالائق اور بی اے پاس لڑکی تو اٹھا کر نہیں لا سکتی نا۔"

اوریدا کو نہ جانے کیوں لگا تھا جیسے انہوں نے اس پر طنز کیا ہو حالانکہ وہ تو رات کے اس پہر اپنے ٹیرس کے نیچے اس کی موجودگی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ اوریدا کا دل بھر آیا۔ پھر پتا نہیں کیا سوچ کر اس نے اپنے آنسو اندر ہی نگل لیے۔

"مجھے اب نہیں رونا..... بس....." سردیوں کی اس رات ننگے پاؤں لان کی گھاس پر چلتے ہوئے پہلی دفعہ اوریدا نے کوئی عہد اپنے آپ سے کیا تھا۔

"مجھے کسی سے محبت کی بھیک بھی نہیں مانگنی۔" دوسرا وعدہ بھی اس نے اپنے آپ سے کیا تھا۔ وہ اب خاموشی سے لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ وہ خود احتسابی کی ایک ایسی کڑی رات تھی' جس کے بعد اوریدا کو ایک نئی شکل کے ساتھ دنیا والوں کا سامنا کرنا تھا۔ آسمان سے گرتی شبنم نے اس کے دل پر لگی بہت سی کائی کو صاف کر دیا تھا۔ اس نے خود ترسی اور بے چارگی کی چادر کو اتار کر شیشم کے درخت کے نیچے دفن کر دیا۔ موسم سرما کی اس سرد رات نے اس کے بہت سے جذبات کو حقیقتاً" سرد کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو' جو چوبیس چوبیس گھنٹے

پڑھتی رہتی ہو۔" بڑی اماں سرسوں کا تیل ایک بڑے پیالے میں ڈال کر اسے دبوچ کر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ آج کافی دنوں کے بعد ان کے ہاتھ لگی تھی۔

"بڑی اماں پلیز! میرا ٹائم مت ضائع کریں۔" وہ بیالوجی کی کتاب پر جھکی ناراضی سے گویا ہوئی۔ اس کا یہ جملہ اندر داخل ہوتے ارصم نے بخوبی سنا تھا۔ وہ پچھلے پندرہ دن سے اس سے دل ہی دل میں خفا تھا کیوں کہ اوریدا کا سیل فون اتنے دن سے پاورڈ آف تھا اور گھر کے پی ٹی سی ایل فون پر پڑھائی کرنے کا بہانا کر کے وہ دو منٹ کے بعد ہی غائب ہو جاتی تھی۔

"بڑی اماں! یہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے' اس کا ٹائم ضائع مت کریں' اس نے بورڈ میں ٹاپ کرنا ہے۔" وہ جتاتے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے بالکل سامنے آن بیٹھا تھا۔ اوریدا نے اپنی نظریں کارپٹ کے ڈیزائن پر جمالیں' وہ اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"جس طرح یہ پاگلوں کی طرح دن رات کتابوں میں سر دیے بیٹھی رہتی ہے' مجھے تو لگتا ہے' اس دفعہ واقعی ہی پوزیشن لے جائے گی۔" بڑی اماں نے خلوص دل سے کہا تھا۔ ارصم ان کی بات پر مسکرایا اور اس کے پیچھے اندر داخل ہوتی آنٹی بینش کے چہرے پر بڑی استہزائیہ سی مسکراہٹ دوڑی۔

"تائی اماں! دن میں خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ جتنے مرضی دیکھ لے انسان۔"

انہوں نے طنزیہ انداز سے اوریدا کی طرف دیکھا اور بڑے ابا کی اسٹڈی کی طرف بڑھ گئیں۔ ارصم اور بڑی اماں نے خوف زدہ انداز سے اوریدا کا چہرہ دیکھا جس پر کوئی تغیر رونما نہیں ہوا تھا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنی کتاب پر جھکی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے آنٹی بینش کی بات کو سنا ہی نہ ہو۔ ارصم کو پہلی دفعہ کچھ عجیب ہونے کا احساس ہوا۔

وہ بڑے ابا سے مل کر اس کے کمرے میں آیا تو وہ اپنی کتابوں میں گم تھی۔ اس نے ایک سرسری سی نگاہ ارصم پر ڈالی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے پاس ہی کارپٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اوریدا نے سر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"تم کچھ بدلی بدلی سی ہو یا مجھے ہی لگ رہی ہو؟" ارصم نے محتاط انداز سے پوچھا۔

"ہاں' بڑی اماں نے تیل بھی تو بہت زیادہ لگا دیا ہے بالوں میں' مجھے تو خود اپنی شکل بہت عجیب سی لگ رہی ہے۔" وہ جلدی سے اٹھ کر ڈریسنگ کے شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ارصم جھنجلا سا گیا۔

"میں تمہارے ظاہری حلیے کی بات نہیں کر رہا ہوں اوریدا۔" اس کی جھنجلاہٹ پر اوریدا نے سنجیدگی سے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا' وہ اسے اپنے سے بہت دور فاصلے پر کھڑا نظر آیا تھا۔

"اچھا' پھر کس چیز کی بات کر رہے ہو؟" اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ جان بوجھ کر انجان بننے میں بھی بڑا لطف ہوتا ہے۔

"تم پندرہ دن سے مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی ہو۔" اس نے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔

"اس لیے کہ میرے ایگزام سر پر ہیں اور مجھے اچھے مارکس لینے ہیں۔" اس نے حتی الامکان اپنے لہجے کو سادہ رکھنے کی کوشش کی۔

"تمہارے ایگزام مجھ سے زیادہ اہم ہیں۔۔۔" وہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ایک نئے امتحان میں ڈال گیا۔

"اس وقت میرے لیے سب سے زیادہ اہم میرے پیپرز ہی ہیں۔" اس نے اب نگاہیں چرانے کا طریقہ اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔

"اٹس اوکے۔۔۔ اس کا مطلب ہے' میں غلط موقع پر آ گیا ہوں۔ تمہیں اپنی اسٹڈی پر فوکس رکھنا چاہیے۔"

وہ جلدی سے اٹھا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا' اسے یقین تھا کہ ابھی اوریدا کی آواز اس کے تعاقب میں آئے گی اور وہ آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گی۔

"پاگل تو نہیں ہو گئے ہو' تم سے زیادہ اہم تو میرے

لیے دنیا کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔"
لیکن اس دفعہ حیران ہونے کی باری ارصم کی تھی۔
اس نے اپنے پیچھے ایک بھید بھری خاموشی کے طوفان کو پوری قوت کے ساتھ محسوس کیا۔ کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے ارصم نے یوں ہی نظر اٹھا کر دیکھا' وہ کیلکولیٹر پر جھکی بڑی لاپروائی سے اپنے کام میں مصروف ہو چکی تھی۔ جیسے ارصم کے آنے یا جانے کا اس پر کوئی فرق نہ پڑا ہو۔ ارصم کے دل میں چھن سے کوئی چیز ٹوٹی۔ اسے پہلی دفعہ لگا کہ ہواؤں نے اپنا رخ بدل لیا ہے۔

☆

"تم بہت انرجیٹک ہو شانزے۔" وہ ایک ایڈ کا کونسیپٹ بنا کر ماہیر کے پاس پہنچی تو اس نے سلائیڈ پر ایک نظر ڈالتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ اس لڑکی کے اندر تخلیقی صلاحیتوں کا ایک سمندر آباد ہے۔ ضرورت صرف اس کے آگے بند باندھ کر اسے بہتر راستہ دینے کی تھی۔
"حالانکہ میں نے زندگی میں یہ کام کرنے کا کبھی نہیں سوچا تھا۔" شانزے کی ماہیر کے ساتھ اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی تھی۔ وہ دونوں اکثر پہلی ملاقات پر ہونے والی غلط فہمی کو انجوائے بھی کرتے تھے۔ شانزے کو بہت جلد احساس ہو گیا تھا کہ وہ ہمدرد طبیعت کا حامل' ایک دوستانہ مزاج رکھنے والا بہت اچھا لڑکا ہے۔
"ڈونٹ وری' میں نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی پاکستان جاؤں گا اور وہاں جا کر ایسے ایجنسی کھول کر بیٹھ جاؤں گا۔" ماہیر نے کافی کا آرڈر دیتے ہوئے مسکرا کر اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔
"اس کا مطلب ہے کہ آپ یہاں آکر پچھتا رہے ہیں۔" شانزے نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے چھیڑا۔
"ہرگز نہیں' میں اپنے پاپا کی خواہش پر یہاں آیا ہوں اور وہ اگر مجھے افغانستان بھی بھجوا دیتے تو میں ان کے سامنے اف نہ کرتا۔" شانزے کو اس کی اپنے باپ سے محبت بہت حیران کرتی تھی۔
"آپ کے پاپا بہت لکی ہیں کہ انہیں آپ جیسی اولاد ملی۔" شانزے نے کھلے دل سے اسے سراہا۔
"ایک بات کہوں شانزے! برا تو نہیں مانو گی۔" ماہیر کی بات پر اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کا بے غرض چہرہ دیکھا۔ زندگی میں اس نے ابھی تک سرمد اور رباب کے بعد یہ تیسرا چہرہ دیکھا تھا جس پر ڈھونڈنے سے بھی اسے ریاکاری نظر نہیں آتی تھی۔
"تمہارے پاپا کی تو ڈیتھ ہو گئی' لیکن ماما تو زندہ ہیں نا' تمہیں ان کو تلاش کرنا چاہیے۔" ماہیر کی بات پر اسے دھچکا سا لگا' وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنی بے تکلفی سے اسے یہ مشورہ دے سکتا ہے۔
"کیا ہوا' میری بات بری لگی ہے تمہیں؟" ماہیر نے بہت تیزی سے اس کے دل میں ابھرنے والی سوچ کو پڑھا۔
"بری تو نہیں' البتہ بہت عجیب لگی ہے۔" شانزے نے بے تکلفی سے کہا۔
"وہ کیوں۔۔۔؟" وہ میز پر رکھا اپنا لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے مسکرایا۔
"اس لیے کہ آج سے پہلے کبھی کسی نے مجھے یہ مشورہ نہیں دیا تھا۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔
"خیر' مشورہ تو ضرور کسی نہ کسی نے دیا ہو گا لیکن یہ اور بات ہے کہ تم اس پر غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتی ہو گی۔" وہ بہت جلد اس کا مزاج آشنا ہو گیا تھا۔ شانزے اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	ماریہ رضوی
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی	موسیٰ رضا

"آپ ٹھیک کہتے ہیں' شاید اس لیے کہ میں نے کبھی اس چیز کی ضرورت محسوس نہیں کی' شروع سے بورڈنگ میں رہی' ساری زندگی ہوسٹلز میں گزار دی' گھریلو لائف اب مجھے بہت عجیب لگتی ہے۔" وہ کھل کر اپنے احساسات اس سے بیان کر رہی تھی۔

"چلو شادی کروگی تو خود سیٹ ہو جاؤ گی۔" ماہیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میری زندگی کی پلاننگ میں اس نام کی کوئی چیز نہیں۔" شانزے کی بات نے ماہیر کو حیران کر دیا۔

"کیا مطلب...؟"

"میری پھوپھو کہتی ہیں کہ میری ماں کے اندر گھر بسانے کے گٹس ہی نہیں تھے اور شاید یہی چیز مجھے بھی جینز میں ان کی جانب سے ملی ہے۔" شانزے کی باتیں ماہیر کو آج تعجب میں مبتلا کر رہی تھیں۔

"بھئی۔ تمہاری پھپھو نے کوئی حدیث تو نہیں بیان کی' جس پر تم نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا۔ ہر انسان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔" ماہیر کو اس کے خیالات جان کر مایوسی ہوئی۔

"ہو سکتا ہے' آپ ٹھیک کہتے ہوں' لیکن ٹرسٹ می' میں نے کبھی عام لڑکیوں کی طرح گھر بسانے کے خواب نہیں دیکھے' میری زندگی کا واحد مقصد اپنا کیریئر بنانا ہے۔" شانزے نے اسے مزید پریشان کیا۔

☆ ☆ ☆

"یار! بہت ہی عجیب لڑکی ہے وہ' جسے تم اپنی بہن بنائے گھوم رہے ہو۔" شام کو سعد اس سے ملنے آیا تو ماہیر کا شکوہ سن کر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"انسان ___ بہت پیچیدہ ہے یار اور جس قسم کے ماحول میں ہم پرورش پاتے ہیں' اس کا اثر زندگی میں کہیں نہ کہیں جھلکتا ضرور ہے۔ جہاں تک بات شانزے کی ہے تو اس نے نارمل ماحول میں زندگی بسر نہیں کی' اس لیے ایسی ہو گئی ہے۔" سعد نے تفصیل سے جواب دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے' لیکن اب تو اسے کچھ انسان بنانے کے بارے میں سوچو۔" ماہیر ابھی تک غیر سنجیدہ تھا۔

"آخر کو میرے مستقبل کا سوال ہے۔"

"کیا تم سیریس ہو اس کے لیے...؟" سعد حیران ہوا۔

"جس قسم کی باتیں اس نے آج کی ہیں' مجھے اپنے سیریس ہونے سے زیادہ اس کی ٹینشن ہو گئی ہے۔ اس میں لڑکیوں والی تو کوئی بات ہی نہیں۔" ماہیر نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا تو سعد بے اختیار ہنس پڑا۔ اسی وقت اوریدا سنجیدہ سے انداز میں وہیں چلی آئی۔

"بھائی! آپ کو بڑے ابا بلا رہے ہیں۔" اوریدا نے اسے بڑے ابا کا پیغام دیا تو سعد خوشگوار حیرت کا شکار ہوا۔

"واہ تم نے آتے ہی بڑے ابا پر کون سا جادو کر دیا ورنہ وہ تو ارحم کے علاوہ کسی کو لفٹ ہی نہیں کرواتے تھے۔"

"وہ بھائی! بڑا لمبا چلہ کاٹا ہے' صبح چھ بجے ان کے ساتھ جاگنگ' شام کو واک اور رات کو شطرنج اور وہ بھی منہ بند کر کے...." ماہیر کے شرارتی انداز پر اوریدا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

"کیا واقعی...؟" سعد کو یقین نہیں آیا۔

"ہاں نا... اتنی لمبی جاگنگ میں بھی... میں ہی بولتا ہوں' وہ تو شکر ہے سن لیتے ہیں اور شطرنج میرے ساتھ کھیلنا بھی ان کی مجبوری ہے' کیونکہ وہ شطرنج کے بغیر رہ نہیں سکتے اور ارحم ہوسٹل میں ہے۔ وہ وہاں سے روزانہ آ نہیں سکتا۔" ماہیر نے اصل بات بتائی تو سعد مسکرا دیا۔

"اوریدا! تم سعد کو کمپنی دو' میں بڑے ابا کے ساتھ ایک بازی لگا کر آتا ہوں۔" ماہیر جلدی سے اندر کی جانب بڑھ گیا تو سعد نے گہری نظروں سے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا' جو بہت عرصے سے اس کے دل کا چین لوٹ کر خود مزے سے اپنی زندگی میں مگن تھی۔

"اوریدا کیسی ہو' پیپرز کیسے ہوئے تمہارے؟"

"ٹھیک ہوں' پیپرز بھی اچھے ہو گئے ہیں۔ آپ سنائیں' طیبہ پھپھو کیسی ہیں؟" اس نے لاپروائی سے

پوچھا۔

"امی ٹھیک ہیں' اکثر تمہیں یاد کرتی ہیں' کسی دن چکر لگاؤ نا۔" سرمد نے خوش دلی سے اسے انوائیٹ کیا۔

اوریدا نے اس کی بات پر مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے پورشن سے اس طرف آتا ہوا ارصم اوریدا کو سرمد کے پاس کھڑا دیکھ کر بے چین ہوا۔ وہ فوراً ہی ان دونوں کے پاس پہنچا تھا۔

"کیسے ہیں سرمد بھائی آپ۔۔۔؟" ارصم کی مضطرب نگاہیں اوریدا کے حد درجہ سنجیدہ چہرے پر تھیں' لیکن وہ پوچھ سرمد سے رہا تھا۔ اوریدا کو اپنے دل پر ایک ٹھنڈی سی پھوار گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"میں ٹھیک ہوں' تم سناؤ' اسٹڈی کیسی چل رہی ہے۔" سرمد' ارصم کے اچانک آنے پر کوفت کا شکار ہوا' لیکن کھل کر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

"ایوری تھنگ از فائن۔۔۔" ارصم نے مختصراً جواب دے کر اوریدا کی طرف دیکھا جو ان دونوں کو نظر انداز کیے گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اوریدا! سنا ہے کل تمہارا رزلٹ آرہا ہے' پھر کتنے ٹشو رول خریدوں؟" اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا۔

"اس دفعہ یہ سوال آپ مجھ سے کرنے کے بجائے اپنی ماما سے کریں' شاید ان کو ضرورت پڑ جائے اس کی۔" اوریدا کے طنزیہ لہجے پر ارصم بوکھلایا اور سرمد نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا جو اپنی بات کہہ کر بے نیازی سے اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

"تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہو اوریدا۔۔۔؟" وہ اس کے پیچھے ہی اس کے کمرے میں پہنچا اور اب غصے سے اس کا بازو پکڑے پوچھ رہا تھا۔

"میں نے کیا۔۔۔ کیا ہے۔۔۔؟" اس نے آہستگی سے اپنا بازو چھڑایا۔

"آخر پرابلم کیا ہے تمہارے ساتھ' تم پچھلے کچھ عرصے سے مجھے بری طرح اگنور کر رہی ہو۔" وہ پریشان انداز سے پوچھ رہا تھا۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔۔۔" اوریدا صاف مکر گئی۔

"تم کسی بات پر مجھ سے خفا ہو گیا۔۔۔؟" ارصم نے الجھ کر اس کا سپاٹ چہرہ دیکھا۔

"میں کیوں آپ سے خفا ہونے لگی' میرا آپ سے تعلق ہی کیا ہے۔" وہ اجنبیت کی آخری دہلیز پر کھڑی تھی۔

"ادھر میری طرف دیکھ کر بتاؤ' کیا تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔" اس نے دونوں بازوؤں سے اسے پکڑ کر غصے سے اپنی طرف کیا۔

"نہیں۔۔۔" اوریدا نے بہت مضبوطی سے اپنے دل پر پاؤں رکھا۔ ارصم کو شاک سا لگا' وہ چند لمحے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتا رہا جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ اوریدا اس سے یہ کہہ سکتی ہے۔ اس کے چہرے پر صدمے کی سی کیفیت تھی۔ پھر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"آر یو شیور۔۔۔؟" اس نے اپنی ڈوبتی نبضوں کو سہارا دینے کی کوشش کی۔

"یس۔ ہنڈرڈ پرسنٹ۔۔۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کا سارا سکون تہس نہس کر گئی۔

"ٹھیک ہے' اب مجھ سے گلہ مت کرنا۔" وہ سرد لہجے میں کہتے ہوئے اس کے کمرے سے نکل گیا۔ پتا نہیں کیوں اوریدا کو پہلی دفعہ ایسا محسوس ہوا کہ وہ شاید اس کے دل سے بھی بہت دور نکل گیا ہے۔

دوسری طرف ارصم کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

"کہیں سرمد بھائی نے تو اسے اپنی طرف مائل نہیں کر لیا۔" اپنے پورشن کی طرف جاتے ہوئے وہ پہلی دفعہ اوریدا سے بدگمان ہوا۔

"تب ہی تو وہ میرے منع کرنے کے باوجود ان سے بات کرنے سے باز نہیں آتی اور اب تو اس کا رویہ مجھ سے بھی بدل گیا ہے۔ یہی بات ہوگی۔" ارصم کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اوریدا اس سے اس انداز سے بات کر سکتی ہے۔ بدگمانی' گلے' شکوؤں کی ایک فصل لمحے میں پک کر تیار

ہو گئی تھی۔ وہ بھی اب اوریدا سے خفا ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن اوریدا کا حیرت انگیز رزلٹ پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑا گیا تھا۔ اس نے نائنٹی پرسنٹ مارکس لے کر سب کو حیران کر دیا تھا۔ پہلی دفعہ اوریدا نے بڑے ابا کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھے تیمور کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر پاکستان آ جائیں۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا' یہ تمہارا ہی رزلٹ کارڈ ہے۔" ماہیر خوشگوار بے یقینی سے اسے اپنے ساتھ لگائے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں نہ کہتی تھی کہ میری پوتی اتنی بھی نالائق نہیں' جتنا تم سب لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔" بڑی اماں نے فوراً" ہی صدقے کا بکرا منگوالیا تھا۔ دوسری جانب ارصم کے پورشن میں ڈاکٹر بینش پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی۔

"آپ مانیں یا نہ مانیں آغا جی! تیمور نے بورڈ میں پیسے دے کر نمبر لگوائے ہیں۔" وہ اس وقت لان میں آغا جی اور ارصم کے سر پر سوار تھیں اور اپنے دل کی جلن نکالنے کا انہیں کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔

"ارے اس نے نمبر لگوانے ہوتے تو میٹرک میں نہ لگوا دیتا' اس دفعہ تو واقعی اوریدا نے محنت کی ہے۔" آغا جی کی بات بینش کو سخت ناگوار گزری تھی۔ انہوں نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے ان کے بالکل برابر خاموش بیٹھے ارصم کو دیکھا۔

"کہیں تم جا جا کر تو اسے نہیں پڑھاتے رہے۔۔؟"

"ماما۔۔۔ میں پچھلے ماہ سے ہوسٹل میں ہوں اور صرف ویک اینڈ پر گھر آتا ہوں۔" ارصم ہلکا سا چڑ کر مزید بولا۔ "اس دفعہ تو نہیں۔۔۔ ہاں میٹرک میں ضرور پڑھایا تھا میں نے اسے' تب تو اس نے کوئی خاص پرفارمنس نہیں دکھائی تھی۔"

"تو اب کیا راتوں رات ذہانت آسمان سے برس پڑی ہے اس پر؟ مجھے تو یقین ہے' اندر خانے کوئی اور ہی گیم ہے۔" بینش حسد کی آگ میں بری طرح جھلس رہی تھیں اور ان کی باتیں ارصم کو ناگوار تو گزر رہی تھیں' لیکن ان کے سامنے اوریدا کی حمایت کرنا' اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ اس لیے وہ دانستہ خاموش ہی رہا۔

"میرا تو خیال ہے' اس دفعہ بچی نے خود کافی محنت کی ہے' میں نے خود اسے گھنٹوں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔" بینش کے سامنے کلمہ حق کہنے کی جرأت آغا جی ہی کر سکتے تھے اور انہوں نے ہی کی تھی۔

"رہنے دیں آغا جی' سب جانتی ہوں میں۔" انہوں نے بے زاری سے ناک سے مکھی اڑائی۔

"تو ماما! آپ کو کیا پرابلم ہے' وہ ٹاپ کرے یا فیل ہو۔۔۔" ارصم نے دانستہ لاپروا انداز اپنایا۔

"تم تو چپ ہی رہو۔" انہوں نے فوراً" ہی اسے جھاڑا' ارصم کا چہرہ سرخ ہوا۔ "ویسے خیر ہے۔ تم آج کامیابی کے جشن میں شریک ہونے نہیں گئے۔ ابھی تک یہیں بیٹھے ہو' اس وقت تو تمہیں وہیں ہونا چاہیے تھا۔"

بینش کا استہزائیہ انداز ارصم کو بہت برا لگا' وہ جھٹکے سے اٹھا اور لان سے نکل کر اپنے پورشن کی طرف بڑھ گیا۔

"بینش تم ہمیشہ ارصم کے ساتھ زیادتی کرتی ہو۔" آغا جی کو بھی اس دفعہ غصہ آ گیا۔

"ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے اسے' جو اتنا زیادہ ری ایکٹ کر رہا ہے وہ۔۔۔" بینش نے اپنی غلطی ماننا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

"تمہارا یہ جذباتی پن کسی دن بہت بڑے نقصان کا باعث بنے گا' آج تم میری یہ بات لکھ لو۔" آغا جی کا لہجہ سرد لیکن لفظوں کا چناؤ پھر بھی بہتر تھا' وہ متحمل انداز سے اوریدا کے پورشن کی طرف بڑھ گئے۔ بینش پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

اوریدا کا آج کا دن بہت ہی اچھا گزر رہا تھا۔ بڑی اماں کے ساتھ ساتھ بڑے ابا نے بھی اسے مبارک باد دے کر حیران کر دیا تھا۔ آغا جی نے تو اسے مبارک باد کے

ساتھ ساتھ انعام فوراً "پانچ ہزار بھی نکال کر تھمادیے تھے۔ طیبہ پھپھو' سرمد کے ساتھ مٹھائی کا بڑا سا ٹوکرا لے کر پہنچ گئی تھیں۔ سب نے ہی اسے وش کیا تھا' لیکن ارصم کی طرف سے ایک چھوٹا سا ٹیکسٹ تک نہیں آیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے میسج کی منتظر تھی' لیکن دوسری جانب اس دفعہ بالکل خاموشی تھی' ایسی خاموشی جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اوریدا نے رات میں کئی دفعہ اٹھ اٹھ کر اپنے سیل فون کی اسکرین کو چیک کیا تھا۔ دنیا جہان کے میسج آچکے تھے' لیکن جس پیغام کی وہ منتظر تھی۔ اسے بھیجنے والا اس سے روٹھ چکا تھا۔ صبح فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی اوریدا نے اٹھ کر نماز پڑھی اور پھر سیل فون اٹھا کر ارصم کا نمبر ڈیلیٹ کر دیا۔ لیکن وہ بھول گئی تھی کہ نمبر ڈیلیٹ کرنے سے دل پر لکھے ہوئے نام بھی نہیں مٹتے۔

☼ ☼ ☼

آپا صالحہ کو مسلسل ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا۔ اس دن عدینہ ضد کر کے انہیں سی ایم ایچ اسپتال لے آئی تھی۔ ایک اچھے فزیشن کو دکھا کر کچھ ٹیسٹ لکھوا لیے تھے اور اب آپا کو ویٹنگ روم میں بٹھا کر عدینہ ان کی رپورٹس لینے کے لیے لیب کی طرف نکلی تھی۔

"آخر آپا کو کیا بیماری ہے؟" وہ اپنی سوچوں میں الجھی کوریڈور مڑتے ہوئے سامنے سے آتے ہوئے ارصم سے بری طرح ٹکرائی' جو اس وقت اپنے بڑے ابا سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ جو صبح چند گھنٹوں کے لیے اس اسپتال میں بھی بیٹھتے تھے۔ وہ جیسے ہی عدینہ سے ٹکرایا۔ عدینہ کے ہاتھوں سے دوائیوں کا لفافہ پھسلا اور کوریڈور پر ٹائلوں کے فرش پر گرا اور ایک سیرپ کی بوتل ٹوٹ گئی۔

"او آئی ایم سو سوری۔" ارصم بری طرح گھبرا سا گیا۔

"مائی گاڈ۔!" عدینہ اسے چھوڑ کر اپنے میڈیسن والے شاپر کی طرف متوجہ ہوئی' سیرپ نے باقی ساری دوائیوں کا بھی بیڑا غرق کر دیا تھا۔

"آپ دھیان سے نہیں چل سکتے تھے۔" وہ اب ارصم پر برس پڑی جو سفید اوور آل پہنے ہوئے شرمندہ سا کھڑا تھا۔

اتنا تو عدینہ کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہے' لیکن اس وقت وہ بری طرح غصے میں آچکی تھی اور کسی بھی قسم کی رعایت دینے کے قطعاً موڈ میں نہیں تھی۔

"رئیلی سوری۔ میں نے واقعی ہی آپ کو نہیں دیکھا۔" ارصم نے خفت زدہ انداز میں وضاحت کی۔

"ایسا کریں' پہلی ہی فرصت میں کسی اچھے آپتھمالوجسٹ (آنکھوں کے ڈاکٹر) کو چیک کروائیں۔" اس نے جھک کر اپنی میڈیسن اکٹھی کرنا شروع کیں۔ ارصم بھی شرمندگی سے اس کا ساتھ دینے لگا۔

"بس رہنے دیں آپ' یہ فارمیلٹی پوری کرنے کی ضرورت نہیں۔" عدینہ کو نہ جانے کیوں غصہ آرہا تھا۔ ارصم بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں' میری وجہ سے آپ کا اتنا نقصان ہو گیا۔ آپ میرے ساتھ چلیں' میں آپ کو یہ سب دوبارہ پرچیز کرواتا ہوں۔" ارصم نے اپنی خفت مٹانے کے لیے کھلے دل سے آفر کی۔

"ایسا کریں آپ او پی ڈی کے باہر چلے جائیں۔ وہاں بہت سے مستحق لوگ بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کسی کی مدد کریں۔ آپ کو زیادہ ثواب ہو گا۔" وہ سر جھٹک کر بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ ارصم کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

آپا صالحہ کی ساری رپورٹس مل چکی تھیں اور اب ایک دفعہ ان کے فزیشن ڈاکٹر کو دکھا چکی تھی' لیکن انہوں نے ایک رپورٹ ڈاکٹر جلال الدین کو دکھانے کا مشورہ دیا تھا۔ جن کا کلینک دوسری جانب تھا۔ جبکہ آپا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ انہیں لے کر جگہ جگہ پھر سکے۔ عدینہ نے انہیں ایک سائیڈ پر بٹھایا اور خود

ڈاکٹر جلال کے کلینک کی تلاش میں نکل پڑی۔ وہ چار لوگوں سے پوچھ کر وہاں تک پہنچ تو گئی تھی، لیکن ان کا ویٹنگ روم مریضوں سے بھرا ہوا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، عدینہ کی تشویش بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اسی وقت ڈاکٹر جلال کے کلینک کا دروازہ کھلا اور اندر سے ارصم بڑے مصروف انداز سے باہر نکلا۔ اپنے سامنے کھڑی عدینہ کو دیکھ کر ٹھٹکا۔

"آپ ڈاکٹر جلال سے ملنا ہے کیا؟" اس کے منہ سے پھسلا، عدینہ نے اثبات میں سرہلایا، وہ بھی اسے پہچان چکی تھی۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو ملوا سکتا ہوں۔" ارصم کی بات پر عدینہ کے حلق سے ایک پرسکون سی سانس خارج ہوئی۔

"جی ضرور۔" اس نے اپنا سارا غصہ اور انا ایک طرف رکھی۔ ویسے بھی اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ سارا قصور اس کا نہیں تھا۔ وہ خود بھی تو آنکھیں بند کیے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔ اس لیے اس کے ساتھ ٹکرا گئی تھی۔

"آجائیں۔" ارصم نے بے تکلفی سے اسے اشارہ کیا۔ وہ ہلکا سا جھجک کر اس کے پیچھے ہی ڈاکٹر جلال کے کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے بڑی پروقار سی شخصیت کے حامل ڈاکٹر جلال کو دیکھ کر عدینہ کو عجیب سا احساس ہوا۔ وہ بھی ارصم کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر ہلکا سا چونکے۔

"بڑے ابا۔ یہ میری ایک کلاس فیلو کی کزن ہیں۔ شاید کچھ کنسلٹیشن کی ضرورت ہے انہیں۔" عدینہ نے جھٹ سے آپا صالحہ کی ایک رپورٹ ان کی طرف بڑھائی۔ انہوں نے میز پر رکھا ایک نفیس سا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگایا اور عدینہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"پیشنٹ خود کہاں ہیں؟" انہوں نے بغور رپورٹ کا جائزہ لے کر عدینہ کی طرف دیکھا، جو اس وقت کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔

"جی۔ وہ ڈاکٹر جواد کے کلینک میں ہیں۔ انہیں ٹمپریچر تھا۔ اس لیے یہاں نہیں آئیں۔" عدینہ نے فوراً" ہی وضاحت کی۔

"ٹھیک ہے۔ میں نے کچھ مزید ٹیسٹ لکھ دیے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ شوکت خانم سے کروالیں اور انہیں کسی اچھے انکالوجسٹ (ماہر سرطان) کو دکھائیں۔" ڈاکٹر جلال کی بات پر عدینہ کے پیروں سے زمین نکلی۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا کوئی خطرے کی بات ہے؟" عدینہ نے بوکھلا کر پوچھا۔

"دیکھیں بیٹا۔ شوکت خانم کی رپورٹس سے پہلے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔ بہتر ہوگا کہ آپ ٹیسٹ کروا کر ایک دفعہ چیک کروالیں۔ پھر آگے کچھ بات ہوسکے گی۔"

ڈاکٹر جلال کے لہجے کی سنجیدگی پر عدینہ کا دل کسی انہونی کے احساس سے دھڑکا۔ اس نے اپنے حلق میں موجود آنسوؤں کے گولے کو بمشکل نگلا اور سرہلاتے ہوئے اٹھی۔ ارصم بھی اس کے پیچھے لپکا۔

"سنیں۔ اگر آپ کہتی ہیں تو میرے ایک فرینڈ کے فادر شوکت خانم میں ہیں، میں وہاں بھی آپ کی ہیلپ کرسکتا ہوں۔" عدینہ نے پہلی دفعہ رک کر اس مہان سی شخصیت کے حامل لڑکے کو دیکھا، اسے پہلی دفعہ یہ احساس ہوا جیسے اللہ نے اسے غیبی مدد کے طور پر اس کے پاس بھیجا ہو۔

"آپ کا نام۔؟" عدینہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس کا نام پوچھا۔ جس سے آج قسمت باربار اسے ملوا رہی تھی۔

"ارصم جاوید۔ میں میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ ابھی آپ جن کے پاس گئی تھیں، یہ میرے بڑے ابا ہیں اور میری مدر بہت اچھی گائناکولوجسٹ ہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

"مجھے عدینہ احمد کہتے ہیں، کچھ ماہ پہلے میں بھی میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی، لیکن پھر کچھ وجوہات کی بنا پر چھوڑ دیا۔ اب نیکسٹ ایئر دوبارہ ایڈمیشن لوں گی۔" عدینہ نے بھی تعارف کی رسم نبھائی تو وہ چونک گیا۔ وہ دونوں چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہوئے اس جانب

بڑھنے لگے جہاں آپا صالحہ موجود تھیں۔

عدینہ کو کسی لڑکے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے آتا دیکھ کر آپا صالحہ ہلکی سی کوفت کا شکار ہوئیں۔ وہ اسے لے کر سیدھی ان ہی کے پاس آئی تھی۔ آپا صالحہ کو اپنا سر ہلکا ہلکا سا گھومتا ہوا محسوس ہوا۔

"امی! یہ ارصم ہیں۔ میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ ان کے بڑے ابا کو آپ کی رپورٹس چیک کروائی ہیں میں نے' وہ بہت اچھے فزیشن ہیں۔" عدینہ نے آپا صالحہ کے چہرے پر پھیلی ناگواری کو محسوس کرتے ہی فوراً"تعارف کروایا۔

"السلام علیکم آنٹی۔" آپا صالحہ نے چونک کر سامنے کھڑے لڑکے کی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی ساخت اور شباہت انہیں کسی سے ملتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انہوں نے صرف سر ہلا کر اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

"عدینہ! گھر کب چلنا ہے۔" آپا صالحہ کو اپنی رپورٹس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"چلتے ہیں امی! لیکن آپ کے ابھی کچھ اور ٹیسٹ بھی ہوں گے۔" عدینہ نے محتاط انداز میں انہیں آگاہ کیا۔

"وہ کہاں ہوں گے؟" آپا صالحہ کوفت کا شکار ہوئیں۔

"اس کے لیے ہمیں لاہور میں شوکت خانم اسپتال جانا ہوگا۔"

عدینہ کی بات پر آپا صالحہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ "کیا ابھی۔۔۔؟"

"نہیں' نہیں آنٹی! ابھی نہیں۔۔۔" وہ عدینہ کے بولنے سے پہلے ہی گویا ہوا۔

"تو کب۔۔۔؟" وہ اچھی خاصی پریشان ہوئیں۔

"میں ایک پروفیسر صاحب سے وہاں ٹائم لے لوں' آپ لوگ تب جائیے گا' وہ میرے بہت اچھے دوست کے فادر ہیں۔" وہ متانت بھرے انداز سے بولتے ہوئے آپا صالحہ کو ہلکا سا متاثر کر ہی گیا۔ انہوں نے پہلی دفعہ اسے غور سے دیکھا' وہ انہیں خاصا سلجھا ہوا اور شریف سا لڑکا لگا تھا۔

"شوکت خانم سے ٹیسٹ کروانے کو کیوں کہا ہے۔"

"آنٹی! ایسی کوئی سیریس بات نہیں ہے' بس ڈاکٹرز اپنی تسلی کے لیے بھی کچھ ٹیسٹ کرواتے ہیں نا' یوں سمجھیں' جسٹ فار فارمیلٹی۔" اس نے اتنی لاپروائی سے آپا صالحہ سے کہا تھا کہ عدینہ کو اپنا آپ بڑا ہلکا پھلکا سا محسوس ہوا ورنہ اس وقت سے اسے اپنی جان سولی پر لٹکی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ آپا کو کس طرح سے مطمئن کرے گی۔

"ڈاکٹر عدینہ! یہ میرا سیل نمبر ہے۔ آپ مجھ سے کانٹیکٹ کر لیجیے گا۔ ان شاء اللہ آپ کا پرابلم حل ہو جائے گا۔" وہ عدینہ سے مخاطب تھا' لیکن آپا صالحہ بڑے چونکنے سے انداز سے اس پر نظریں جمائے وہاں کھڑی تھیں۔ انہوں نے عدینہ کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے نمبر والی چٹ پکڑلی۔ عدینہ اور ارصم دونوں نے ہی حیرانی سے ان کی اس حرکت کو دیکھا۔ ارصم کو احساس ہوا کہ وہ اس کی موجودگی سے خاصی پریشان سی دکھائی دے رہی ہیں۔ تب ہی وہ اختتامی دعائیہ الفاظ کہہ کر فوراً" ہی وہاں سے کھسک گیا۔

"تمہارا کوئی کلاس فیلو تھا کیا۔۔۔؟" آپا صالحہ کا دماغ بخار میں بھی خوب چل رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔" عدینہ نے مصلحتاً" ان سے جھوٹ بولا تو وہ ایک دم چپ سی ہو گئیں۔

"میڈیکل کے پہلے سال میں ہے کیا؟"

"جی۔۔۔" عدینہ نے بھی تکا لگایا' ورنہ اتنے سوال و جواب کی تو نوبت ہی نہیں آئی تھی ارصم سے۔

"تم نے بلایا تھا اسے یا وہ خود ہی آیا ہوا تھا یہاں۔۔۔؟" آپا صالحہ کی نہ جانے کیوں تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔

"میں نے بلایا ہوتا تو میرے پاس پہلے سے اس کا سیل نمبر ہوتا۔ وہ اس وقت آپ کے سامنے نہ دے رہا ہوتا۔" عدینہ کے لہجے میں موجود بے زاری کو محسوس

کر کے آپا صالحہ ایک دم ہی چپ ہو گئیں۔ عدینہ کی بات میں دم تو تھا۔

"اچھا لڑکا تھا۔" آپا صالحہ کے مثبت کمنٹس پر عدینہ حیرانی کے اظہار کے طور پر چلتے چلتے رکی۔ آپا صالحہ نے تعجب انگیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا۔۔؟"

"کچھ نہیں۔۔ کبھی کبھی آپ بہت عجیب باتیں کر جاتی ہیں۔" عدینہ نے اسپتال کے مین گیٹ کی طرف جاتے ہوئے برا سا منہ بنایا۔ آپا صالحہ اس کی ناک چڑھانے پہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیں' لیکن اس دفعہ وہ خاموش رہیں۔ ارصم کی آنکھوں نے انہیں الجھن میں ڈال رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

نیلم تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس رات کے بعد نکلنے والا سورج اس کے لیے مصائب' پریشانیوں اور صدمات کا ایک لامحدود سا طوفان لیے ہوئے طلوع ہوگا۔ صبح اس نے ڈپارٹمنٹ جاتے ہوئے بختاور کو نہیں اٹھایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے شام کو اپنے پیرنٹس کے ساتھ جانا ہے۔ وہ معمول کے مطابق اپنی کلاسز لینے کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ دوپہر کو دو بجے جب وہ کیمپس سے ہاسٹل پہنچی تو کمرے کے دروازے کے باہر ایک چھوٹی سی چٹ لگی ہوئی تھی۔ جس پر بختاور نے بڑی عجلت میں ایک فقرہ لکھا ہوا تھا۔

"میں جا رہی ہوں' تم اپنا بہت سا خیال رکھنا۔" نیلم کو یہ جملہ پڑھ کر عجیب سا احساس ہوا۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی' اسے بختاور کے بغیر کمرہ کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے کیوں آج کھانا کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ شام پانچ بجے کسی نے اس کا دروازہ بجا کر اس کے گیسٹ آنے کی اطلاع دی۔

"بختاور کے پیرنٹس آئے ہیں اسے لینے۔" ساتھ والے کمرے کی فاخرہ اسے اطلاع دے کر آگے بڑھ گئی۔

"بختاور کو لینے۔۔؟" نیلم کا دماغ بھک کر کے اڑا۔

"لیکن وہ تو شاید دوپہر میں ہی چلی گئی تھی۔" نیلم نے جلدی جلدی چپل پہنی اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر گیٹ کے پاس بنے گیسٹ روم میں پہنچی' جہاں بختاور کے والدین کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے اکیلا آتے دیکھ کر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پریشانی سے دیکھا۔

"بیٹا! بختاور کہاں ہے؟ ہم لوگ اسے لینے آئے ہیں۔" اس کی والدہ نے فکرمند انداز سے نیلم کا حواس باختہ چہرہ دیکھا۔

"آنٹی! میں تو کیمپس گئی ہوئی تھی' واپس آئی تو بختاور یہ چٹ دروازے پر لگا کر جا چکی تھی' میں سمجھی آپ لوگوں کے ساتھ گئی ہے۔" نیلم نے بوکھلا کر انہیں اطلاع دی' اس کے منہ سے نکلنے والے اس فقرے کو سن کر بختاور کے والدین کا دماغ بھک کر کے اڑا۔

"کون سی چٹ۔۔؟" بختاور کی والدہ نے نیلم کے ہاتھ سے جھپٹا مار کر کاغذ کا ٹکڑا چھینا' وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی کی ہینڈ رائٹنگ کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھیں۔ یہ بختاور کی ہی لکھائی تھی۔

"اس کا مطلب ہے' تمہاری بیٹی اس خبیث لڑکے کے ساتھ نکل گئی ہے۔" بختاور کے والد بولے نہیں' پھنکارے تھے۔ ان کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں' ایسا لگتا تھا جیسے وہ نیلم کو بھی کھڑے کھڑے جلا کر بھسم کر ڈالیں گے۔

"وہ اسی ہاشم کے ساتھ گئی ہے نا۔" بختاور کی والدہ صدمے بھرے انداز سے گویا ہوئیں۔ نیلم کو پہلی دفعہ اپنے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ

فاخرہ جبیں

بڑے صحن میں جھاڑو دینے کے بعد وہ ڈیوڑھی میں پہنچی تھی جب کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا' اماں برآمدے میں چارپائی ڈالے سبزی بنانے میں مصروف تھیں انہیں متوجہ نہ پاکر اس نے جھاڑو پھینکا اور دروازے تک چلی آئی۔

"کون ہے؟" کنڈی پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے رٹا رٹایا جملہ بولا تھا۔

"ارے زیبی بیٹی! دروازہ کھولوگی یا یوں ہی باہر کھڑا رکھوگی۔" سکینہ خالہ کی جانی پہچانی آواز پر اس نے کھٹ سے کنڈی گرادی۔

"السلام علیکم!"

ناولٹ

"وعلیکم السلام بیٹی' کیسی ہو؟" سکینہ خالہ نے بڑی عجلت میں اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں' آپ سنائیں۔" اس نے اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے پوچھنا چاہا' مگر وہ اپنی ہی دھن میں یہ جا وہ جا۔

"ہونہہ..." اس نے غصے سے پیر پٹخے اور دوبارہ جھاڑو اٹھالی۔ صفائی سے فارغ ہو کر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کچن کی طرف آگئی۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ سکینہ خالہ پوری کی پوری اماں کے کان میں گھسنے کی کوشش کررہی تھیں۔

جبکہ اماں سبزی چھری ایک طرف رکھے ہمہ تن گوش نظر آرہی تھیں۔ دونوں خواتین اسے دیکھتے ہی جھٹ سیدھی ہوگئیں۔

"زیبی خالہ کے لیے چائے بنالاؤ۔" اماں کے لہجے میں چاشنی ہی چاشنی گھلی تھی۔

"ہاں بیٹی چینی ذرا زیادہ ڈال دینا۔" سکینہ خالہ نے عینک کے پیچھے سے سرتاپا اس کا جائزہ لیا تھا۔

"ہونہہ زہر نہ ڈال دوں۔" اس نے دانت کچکچاتے ہوئے ان کے مٹی سے بھرے جوتوں کو گھورا' جو صاف ستھرے سرخ برآمدے میں نقش و نگار بنا گئے تھے۔ وہ اماں کے پاس سے سبزی اٹھا کر کچن میں آگئی۔ چائے کا پانی چولہے پر چڑھا کر اس نے ایک نظر کھڑکی سے باہر ڈالی۔ اماں اور خالہ سکینہ کی کھسر پھسر دوبارہ شروع ہوگئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے پھر کوئی چکر شروع ہوگیا

ہے۔" اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا' پھر سر جھٹک کر چائے کپوں میں ڈال کر اماں اور خالہ سکینہ کو دی۔

"دوپہر کے کھانے میں تو ابھی وقت ہے' میرا خیال ہے پہلے وہ رسالہ پورا پڑھ لوں' ورنہ اسد آج شام کو یوں ہی واپس لائبریری میں دے آئے گا۔" وہ چائے لے کر کمرے میں آگئی اور ادھوری کہانی مکمل کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

ہلکے سے کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے یوں ہی گردن گھما کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔

ننھا شیراز آنکھیں جھپکا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ارے تم کب آئے۔" وہ جھٹ اٹھ بیٹھی۔

"مما بھی ساتھ آئی ہیں؟" اس نے شیراز کو پیار کرتے ہوئے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اسے یوں ہی اٹھائے باہر آگئی' کچن میں کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ وہ فوراً" اس طرف بڑھی۔

"السلام علیکم بھابی!" اتنے دنوں سے وہ اکیلی بور ہو رہی تھی۔ بھابی کو دیکھ کر ایک دم ہی اس کے چہرے رونق آگئی تھی۔ وہ کوئی دو ہفتے بعد میکے سے واپس آئی تھیں۔

"تو یہ پہنچ گیا اپنی پھپھو کے پاس۔" شیراز کو اس کی گود میں دیکھ کر وہ مسکرائیں۔

"پھپھو نائیں لالہ۔" شیراز فوراً" خفا ہونے لگا تھا۔

"ہاں بھئی لالہ ہی سہی۔" بھابی نے ایک ہاتھ میں فیڈر پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے شیراز کو اس سے لے لیا۔

"میں نے تو کہا تھا چلو اب کچھ دیر سونے دیتے ہیں لالہ کو' مگر یہ تو وہاں بھی سارے کمروں میں تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔" بھابی اپنے کمرے کی طرف بڑھیں تو وہ بھی ان کے پیچھے ہی چلی آئی۔

"ہاں بھئی کیوں نہ ڈھونڈتا۔ آخر کو اس کی اکلوتی پھپھو ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ اماں کہاں گئی ہیں؟" اس نے ایک نظر باہر دوڑائی۔

"جب میں آئی تھی' تب تو ادھر ہی تھیں' میرا خیال ہے مرغیوں کو دانہ ڈالنے گئی ہیں۔" بھابی نے شیراز کو لٹا کر فیڈر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"اچھا۔ پھر میں دیکھتی ہوں اماں نے ہنڈیا بنائی ہے کہ نہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"رہنے دو۔ میں دیکھ لیتی ہوں شیراز ابھی سو جائے گا۔ تم اپنی نیند پوری کرلو۔" بھابی کو معلوم تھا وہ نیند کی کتنی شیدائی ہے۔

"ارے بھابی وہ تو رسالہ پڑھتے ہوئے یوں ہی آنکھ لگ گئی تھی' کھانا وانا کھا کر بعد میں نیند پوری کروں گی۔" وہ کہتے ہوئے کچن میں آگئی۔ اماں ہنڈیا پکا چکی تھیں۔

"کمال ہے۔ میں اتنی دیر سوتی رہی۔" اسے خود پہ حیرت ہوئی۔

وہ فریج سے آٹا نکالنے لگی کہ ابھی کچھ دیر بعد اسد وغیرہ نے آکر شور مچانا شروع کر دینا تھا۔

"اٹھ گئی ہے میری بنو۔" اماں نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو وہ خجل سی ہو گئی۔

"اماں میری تو بس یوں ہی ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ آپ نے اٹھایا ہی نہیں مجھے۔"

"اچھا روٹیاں بنا کر انڈوں کا حلوہ بھی ساتھ بنا لینا۔" اماں نے دیسی انڈے باسکٹ میں رکھتے ہوئے کہا اور خود فریج سے دھنیا' ہری مرچ نکالنے لگیں۔

"یہ لیں اماں! منہ میٹھا کریں۔" بھابی مٹھائی کا ڈبا لیے کچن میں آئیں تو اماں کے ساتھ ساتھ وہ بھی چونک گئی۔

"یہ کس بات کی ہے بھئی۔" اماں نے برفی کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"سہیل کی بات پکی کر دی ہے اماں۔" بھابی نے کن انکھیوں سے اماں کو دیکھا اور پلیٹ میں مٹھائی

نکالنے لگیں۔

زیبی نے ایک نظر اماں کو دیکھا' منہ کی طرف جاتا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکا تھا۔

"کس کے ساتھ۔۔۔؟" اماں کے لہجے میں اشتیاق مفقود تھا۔

"ابو کے جاننے والے ہیں۔ لڑکی کا باپ انسپکٹر ہے' پورے علاقے میں دھاک جما رکھی ہے انہوں نے۔۔۔" بھابھی خوشی خوشی بتانے لگیں۔

"لڑکی بھی اتنی پیاری ہے گوری چٹی' لمبا قد۔۔۔" بھابھی بتارہی تھیں اور وہ چپ چاپ اماں کا بجھا بجھا چہرہ دیکھتی رہی۔

دوپہر کھانے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو اماں منہ سر لپیٹے پڑی تھیں۔ بھابھی بھی اپنے کمرے میں آرام کرنے جاچکی تھیں۔

"اماں ایسے کیوں لیٹی ہیں؟" اس نے پاس بیٹھتے ہوئے ان کا دوپٹا ذرا سا ہلایا۔

"ویسے ہی۔۔۔" اماں کے کہنے پر وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ جانتی تھی وجہ کیا ہے۔

"مجھے معلوم ہے آپ کو کیا ہوا ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ اماں کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ جھنجلا گئی۔

"اماں! اسہیل کوئی دنیا کا آخری لڑکا تو نہیں نا۔ جو آپ اس کی منگنی پر اس طرح افسردہ نظر آرہی ہیں۔" اماں نے چہرے سے دوپٹا اتار کر اسے دیکھا۔

"یہ بات نہیں ہے زیبی' مجھے تو دنیا کے چلن پہ حیرت ہو رہی ہے۔ ارے جس دن میرا شاہد نوکری پہ لگا تھا میں فوراً" بھائی کے در پہ جھولی پھیلائے چلی گئی کہ چار چار جوان بیٹیاں ہیں۔ چلو کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ مگر انہیں دیکھو۔ ادھر بیٹا برسر روزگار ہوا' ادھر جھٹ غیروں سے میل ملاپ شروع۔۔۔ ارے انہیں ذرا بھی خیال نہ آیا کہ جوان بھانجی گھر میں بیٹھی ہے۔" اماں اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

زیبی جواباً" کیا کہتی' خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی اور اماں دل کے پھپھولے پھوڑتی رہیں۔

"کہنے کو یہ اپنے ہیں' ارے کیا فائدہ ایسے اپنوں کا جو اپنی جوان بچیوں کو چھوڑ چھاڑ باہر جھانکتے پھریں۔"

"ادھر وہ سکینہ ہے' ہزار رشتے بتاتی ہے' مگر ذرا جو ڈھنگ کے ہوں' جو ذرا اچھے رشتے لاتی ہے وہ درمیان میں ہی کہیں رہ جاتے ہیں۔" اماں اکتائی ہوئی تھیں۔

"اماں۔۔۔ کوئی رشتہ وغیرہ نہیں ہوتا ان کے پاس' خوامخواہ آپ سے پیسے بٹورنے کے چکر میں رہتی ہیں اور آپ بھی ہر دفعہ ان کے جھانسے میں آجاتی ہیں۔" اس نے اپنی دانست میں اماں کو حقیقت بتانی چاہی مگر اماں ایک دم ہی تاؤ کھا گئیں۔

"ارے تو اور کیا کروں میں' ساری عمر یوں ہی گھر میں بٹھائے رکھوں تمہیں۔"

"ہاں تو کس نے کہا تھا' بٹھالیں گھر میں۔" وہ بھی چڑ گئی۔

"اچھا بھلا کہا تھا ایم۔ اے میں ایڈمیشن کروادیں' دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہم ابھی تک بی اے کے بعد بیاہ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی' جبکہ اماں اپنا سر تھام کر رہ گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"بدتمیز' الو' کمینے۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے جتنی بھی گالیاں ازبر تھیں' اس نے سب دے ڈالی تھیں۔

"شرم نہیں آتی ان لوگوں کو' صبح سے کمر ٹوٹ گئی صفائی کرتے کرتے۔ مگر۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہ کمرہ صاف کرکے دروازہ بند کرکے گئی تھی۔ مگر اب پھر وہاں چیزیں بکھری دیکھ کر پارہ آسمان تک جا پہنچا تھا۔

"نواب زادے کچن میں بیٹھ کر ناشتا نہیں کرسکتے۔" اس نے ناشتے والے جھوٹے برتن میز سے اٹھائے اور پھر کتابوں والی الماری کی طرف بڑھی۔ نہ جانے کس کتاب کی تلاش میں ڈھیروں کتابیں الماری سے باہر آچکی تھیں۔

"لگتا ہے بی ایس سی نہیں' پی ایچ ڈی کرنے جاتے

ہیں۔" یہ ساری کارستانی اسد کی تھی' سو اسے ہی کوسا گیا تھا۔ موبن اپنے گندے کپڑے اور سلیپریوں ہی چھوڑ گیا تھا۔ لہٰذا اسے بھی بے بھاؤ کی سنائیں۔ اماں چپ چاپ اس کی بڑبڑاہٹ سنتی رہیں۔ جانتی تھیں کہ اصل غصہ بھابھی کے رویے پر ہے۔ جو جانتی تھیں کہ آج زیبی کو کچھ لوگ دیکھنے آرہے ہیں' مگر اس کے باوجود صبح سے وہ اپنے کمرے میں بند تھیں۔ زیبی نے دبے دبے لفظوں میں اماں سے کہا بھی' مگر انہوں نے حسب عادت اسے خاموش رہنے کا اشارہ کردیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ خوامخواہ بدمزگی پیدا ہو۔

"ہاں بھئی وہ کب چاہتی ہوں گی کہ یہ نند کم 'ملازمہ گھر سے رخصت ہو' اتنا کام کرنے پر تو نوکرانیاں ہزاروں روپے بٹور لیتی ہیں۔" وہ اندر ہی اندر جلتی بھنتی رہی۔

"آگے پیچھے تو میری گڑیا' ہماری لالہ' کہتے کہتے منہ نہیں سوکھتا اور آج ایک بار نہیں پوچھا کہ اگر کوئی کام ہے تو مجھے بتاؤ' میں تمہاری بڑی بہن کی طرح ہوں۔"

زیبی نے الماری کے پٹ زور سے بند کیے۔

"بے وقوفوں کی طرح میں ہی صبح سے بھاگی پھر رہی ہوں' جیسے مجھے بہت شوق ہے رشتہ کروانے کا۔" اس نے تمام کام نپٹایا اور نہانے چلی گئی۔ اسد نے اماں کو مطلوبہ سامان لا کر دیا اور خود کالج روانہ ہوگیا۔ ابا اور بڑے بھیا کو اماں نے خود کام پر بھجوایا تھا' کیونکہ زیبی نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"میں' ابا اور بڑے بھیا کے سامنے بن ٹھن کر مہمانوں کے سامنے پیش نہیں ہوسکتی۔"

سو اماں نے سکینہ خالہ سے کہہ دیا تھا' فی الحال خواتین کو ساتھ لے آئیں۔ لڑکی پسند ہو تو بعد میں بقیہ فیملی کو انوائیٹ کرلیا جائے گا۔

نہا کر اس نے ذرا بہتر کپڑے پہنے' کریم چہرے پر لگا کر نیچرل پنک لپ اسٹک ہونٹوں پہ پھیری اور گیلے بال سوکھنے کے لیے یوں ہی پشت پر کھلے چھوڑ دیے۔ کچن میں آئی تو اماں نے فوراً" سرتاپا اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ سادہ سا روپ تھا' وہ مطمئن ہوگئیں۔ لڑکوں کا میک اپ کرنا انہیں ویسے بھی زیادہ پسند نہیں تھا۔

وہ لفافے کھول کھول کر بازار سے منگوائی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ اسی دوران بھابھی شیراز کو گود میں لیے آگئیں۔

"توبہ ہے۔۔۔ صبح سے یہ لڑکا تو مجھے اٹھنے ہی نہیں دے رہا تھا' ابھی بھی اتنی مشکل سے بہلا کر لائی ہوں۔" بھابھی نے آتے ہی وضاحت کی۔

"ہاں بھئی بچہ جو ہوا جو من میں آئے گا وہی کرے گا۔" اماں نے مسکراتے ہوئے شیراز کو دیکھا۔ جبکہ وہ چپ چاپ پلیٹوں پہ کپڑا پھیر کر انہیں خشک کرتی رہی۔

"اماں کیک بھی ساتھ منگوالیتیں۔" بھابھی نے ایک نظر سامنے رکھی چیزوں کو دیکھا۔

"ہاں کیک بھی ہے ساتھ۔ فریج میں رکھ دیا ہے۔" اماں نے کہا تو بھابھی سر ہلا کر مطمئن ہو کر واپس پلٹ گئیں۔

"ارے کوئی ہے گھر میں۔" سکینہ خالہ کی چہکتی ہوئی آواز صحن میں گونجی۔ ادھر اماں فوراً" کچن سے نکلیں' ادھر ٹھک سے بھابھی کے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ تین خواتین تھیں' اماں کا تعارف خالہ سکینہ نے کروایا اور بھابھی کا تعارف اماں نے۔

"ماشاء اللہ۔۔۔" وہ خواتین بھابھی کو ستائشی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ فل میک اپ میں ان کی صاف رنگت مزید نکھر گئی تھی۔ میرون لپ اسٹک میں موتیوں جیسے دانت چمک رہے تھے۔

"آیئے نا آپ لوگ ادھر آجایئے؟" بھابھی جھٹ انہیں لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھیں۔

اماں کے چہرے پہ خوشی کا عکس لہرا گیا۔ دوسرے کمرے میں بس ایویں سا فرنیچر تھا' جبکہ اس کمرے میں بھابھی کے جہیز کا سامان سیٹ کیا ہوا تھا۔

"اچھا ہوا نائمہ کو خود ہی عقل آگئی' ورنہ دوسرے کمرے کو دیکھ کر ان مہمانوں پر کوئی اچھا تاثر نہ پڑتا۔"

بھولی بھالی اماں' بہو کی اس حرکت پر نہال ہوگئیں۔ ذرا دیر بعد انہوں نے کچن میں آکر زیبی کو چائے لانے کے

لیے کہا۔ سلیقے سے دوپٹا اوڑھ کر چائے کی ٹرے اٹھا کر وہ اماں کے پیچھے ہی چل دی۔

"توبہ ہے، کتنی ہونق لگ رہی ہوں گی میں اس وقت۔" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سوچا اور اگلے ہی لمحے وہ ٹھٹک گئی۔

نئے کورز، نئی بیڈ شیٹ، ٹیوب لائٹ کی روشنی میں بھابھی کی طرح ان کا کمرہ بھی چمک رہا تھا۔

"یہ ہے ہماری زہی۔" بھابھی نے اسے دیکھ کر فوراً کہا۔ اس نے میز پر ٹرے رکھتے ہوئے مہمانوں کو سلام کیا۔

"بھئی یہی بات ہے۔ ہمارے درمیان نند، بھاوج والا رشتہ ہے ہی نہیں۔ بہنوں کی طرح رکھتی ہوں میں اسے۔"

بھابھی انہیں بتارہی تھیں۔ زہی چائے سرو کرنے کے بعد اٹھنے لگی تو نوجوان لڑکی نے جو غالباً لڑکے کی بہن تھی فوراً "اسے اپنے پاس بلالیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس صوفے پہ جا بیٹھی۔

"میرا نام نویدہ ہے۔" اس نے اپنا تعارف کروایا اور ہلکے پھلکے انداز میں زہی کی تعلیم، مشاغل کے بارے میں پوچھنے لگی۔

"مجھ سے چھوٹی نے حال ہی میں ایف۔ اے کیا ہے۔" بھابھی کی بات سن کر وہ ایک دم چونک گئی۔ بھابھی سے چھوٹی صائمہ تو عرصہ تین سال سے ایف۔ اے کرکے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔

"ایک سے ایک رشتہ آرہا ہے اس کے لیے، ابو نے تو ابھی سے ٹی وی اور فریج خرید کر رکھ لیا ہے۔ کہتے ہیں، جہیز میں کسی چیز کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔" مہمان خواتین پوری طرح بھابھی کی طرف متوجہ تھیں۔ اس نے ایک نظر اماں کی طرف دیکھا جو اسے اٹھنے کا اشارہ کررہی تھیں۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر باہر نکل آئی۔ بھابھی کی اتنی تیاری کی وجہ اب ہی سمجھ میں آئی تھی۔

ابھی اسے باہر آئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ خالہ سکینہ جوتا گھسیٹتی اس کے پیچھے چلی آئیں۔

"اے زہی یہ تمہاری بھابھی کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" وہ ایک دم چونک گئی۔

"کیوں کیا ہوا خالہ؟" وہ جان بوجھ کر بے نیاز بن گئی۔

"ارے کوئی گھنٹہ بھر سے۔ میرا میکا، میری بہنیں یہ تقریر کیے جارہی ہے۔ یہ کوئی طریقہ ہے بھلا۔ اسے تو چاہیے تھا، تمہاری تعریفوں کے پل باندھ دیتی، اپنی ساس کے گن گاتی، مگر یہاں تو الٹا ہی چکر چلا ہوا ہے۔" اس نے دیکھا سکینہ خالہ اچھے خاصے غصے میں تھیں۔

"میں تو کہتی ہوں زہی! مہمانوں کو اس وقت بلایا کرو، جب تمہاری بھاوج اپنے میکے گئی ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں خالہ، بھابھی میرے بارے میں برا نہیں سوچتیں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"آئے ہائے جیسے تیری ماں سیدھی ہے ویسی تو ہے۔" انہوں نے چڑ کر کہا۔

"اچھا چل جو تیری قسمت ہوگا وہ کوئی تجھ سے چھین نہیں سکتا، خواہ کتنے ہی پاپڑ کیوں نہ بیل لے۔" سکینہ خالہ کہتی ہوئی دوبارہ کمرے میں چلی گئیں تو وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

"سب معلوم ہے خالہ! لیکن دوسروں کی خامیوں پر پردہ ڈالنا میں نے اماں سے سیکھا ہے۔" اس نے اٹھ کر فریج کا دروازہ کھولا۔

"اور تم نے ہی تو کہا ہے کہ میری قسمت میں جو ہوگا وہ مجھے مل کر رہے گا۔" اس نے سوچا اور اطمینان سے پانی پینے لگی۔

"زہی جا برتن سمیٹ لے۔" کچھ دیر بعد اماں نے آکر کہا۔

"مہمان چلے گئے۔"

"ہاں۔"

اس نے ایک نظر اماں کے اترے اترے چہرے کو دیکھا اور برتن اٹھانے چلی گئی۔

بھابھی شاید مہمانوں کو رخصت کرنے دروازے تک گئی تھیں۔ وہ سب چیزیں سمیٹ کر کچن میں آئی تو

اماں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"اماں! اب آپ یقیناً" دنیا کے چلن پر حیران ہو رہی ہوں گی۔" اس نے چائے کا کپ اماں کے سامنے رکھا اور خود بھی وہیں دھرنا مار کر بیٹھ گئی۔

"یہ سامان سمیٹ لو پہلے ' ابھی بچے آگئے تو سارا کچھ چٹ کر جائیں گے۔"

اس نے اماں کے کہنے پر ایک نظر انہیں دیکھا اور بڑے اطمینان سے بسکٹ چائے میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگی۔

ایک ' دو ' تیسرے بسکٹ پر اماں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"میں کہہ رہی ہوں انہیں سنبھال کر رکھ لو آئندہ کام آئیں گے۔"

"کس کے کام آئیں گے اماں! ہمارے یا بھابھی کے؟" اس نے تلخی سے کہا تو اماں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ جانتی تھیں وہ بھابھی سے کتنا پیار کرتی ہے۔ اب ان کے خود غرضانہ رویے پر یقیناً" اسے دکھ تو پہنچنا ہی تھا۔

"میں تو خود حیران ہوں زہی! سارا وقت بس اپنی بہنوں کی تعریف میں رطب اللسان رہی اور تو اور لڑکے کی اماں بھی کہہ رہی تھیں ہمیں تو تمہارے جیسی لڑکی کی تلاش تھی۔ میرا خیال ہے۔ انہوں نے نائمہ کے گھر کا پتا بھی لیا ہے اس سے۔" اچھا بھلا رشتہ تھا' اماں دکھی ہو رہی تھیں۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں اماں جن لوگوں نے رشتے کرنے ہیں وہ لوگوں کو اپنے گھر میں بلوائیں اور اپنا خرچہ کریں۔ میں تو اب اس گھر میں یہ اتنے مہنگے والے بسکٹ نہیں رکھنے دوں گی۔" اس نے بسکٹ اٹھا کر اماں کے سامنے لہرایا اور منہ میں ڈال لیا۔ اماں کو محسوس ہوا وہ ان سے زیادہ خود کو بہلا رہی ہے۔

"ارے یہ اکیلے اکیلے دعوت اڑائی جا رہی ہے۔" اسد نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"نہیں میرے بھائی! تم خوشی سے اس دعوت میں شریک ہو سکتے ہو۔" اس کی فراخدلانہ پیش کش پر وہ وہیں پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"ویسے کیا میں پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ یہ ساری چیزیں اماں کی تحویل میں جانے کے بجائے ہماری منتظر کیوں ہیں۔" اسد کے ذہن میں یہ ہی خیال ابھرا تھا کہ شاید مہمانوں کی طرف سے کوئی مثبت جواب ملا ہے اور وہ اسی خیال کی تصدیق چاہ رہا تھا۔

"ارے تمہیں معلوم ہی نہیں؟" اس کی شدید حیرت پر اس کو اپنی کم علمی پر خاصی شرمندگی ہوئی تھی۔

"بھئی تمہاری یہ بہن بہت بھاگوان ہو گئی ہے۔" اس نے بھابھی کو کچن میں آتے دیکھ کر قصداً" بلند آواز میں کہا تھا۔

"تمہاری بدولت لوگوں کے برسوں سے رکے ہوئے کام پایہ تکمیل تک پہنچ رہے ہیں۔"

"کیوں ہے نا خوشی کی خبر۔" اس نے ہنستے ہوئے اسد کی تائید چاہی۔ جبکہ بھابھی کچن کے دروازے سے ہی واپس چلی گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اماں کتنے ہی دن گم صم سی رہی تھیں۔ اس رشتے کے ختم ہونے کا انہیں بہت قلق تھا اور اس کا اظہار وہ وقتاً" فوقتاً" ابا کے سامنے کرتی رہی تھیں۔ ابا درویش صفت آدمی تھے۔ اس قسم کی فکریں نہیں پالتے تھے' سو ہر دفعہ اماں کو تسلی دینے لگتے۔

"خدا پر بھروسا رکھو زہی کی ماں۔ خدا بہت کارساز ہے۔ دیکھنا وقت آنے پر سارے کام خود بخود ہوتے چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہی تو کہتے ہیں ابا۔ اماں تو اس طرح فکر مند رہتی ہیں جیسے میں اس دنیا کی آخری کنواری لڑکی ہوں۔" اس نے کتاب کا صفحہ پلٹتے ہوئے سوچا۔

"اور کتنا پڑھنا ہے تم نے؟" اسد آنکھوں میں نیند کی سرخی لیے اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"کیوں تم نے کیا کرنا ہے؟"

"یہ بلب کی روشنی سیدھی برآمدے میں میری

چارپائی پہ پڑ رہی ہے۔ روشنی میں نیند نہیں آرہی مجھے۔" اس نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"پھر تم چادر لپیٹ کر سو جاؤ' کیونکہ ابھی میں نے یہ پوری کتاب پڑھنی ہے۔" اس نے "راجہ گدھ" اس کے سامنے لہرائی۔

"اچھا۔ پھر جلدی پڑھ لو؟" وہ بٹن پر انگلی رکھ کر اطمینان سے کھڑا ہو گیا۔

"بھئی تم پڑھ لو تو میں بھی لائٹ بند کر کے سونے جاؤں۔" اس کی حیرت بھری نظروں کے جواب میں اسد نے وضاحت کی تو اس کی بے اختیار ہنسی نکل گئی۔

"میرا خیال ہے تم اب بھی سوئے ہوئے ہو' اچھا پھر میں صبح پڑھ لوں گی۔" وہ کتاب رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ تو اسد بھی لائٹ بند کر کے بستر پہ چلا گیا۔

☼ ☼ ☼
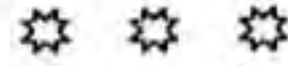
"شی از اے پریٹی گرل۔ شی از اے پریٹی گرل۔" مون گردن اوپر کیے آسمان پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ زہی نے حیرت سے پہلے مون کو دیکھا اور پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں آسمان کو دیکھا۔

"یہ تمہیں آسمان پہ کون سی پریٹی گرل نظر آرہی ہے۔" اس نے مون کے سر پہ چپت لگائی اور وہ نہ جانے کس انداز میں بیٹھا تھا کہ کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری' مون نے بوکھلا کر اسے دیکھا اور پھر فوراً" جھک کر کتاب اٹھائی۔

"دھیان سے سبق یاد کرو۔" اس نے سختی سے کہا۔ وہ کوئی گھنٹے بھر سے اس کے ساتھ سر کھپا رہی تھی۔

"کر تو رہا ہوں آپی۔۔۔" مون نے پھر کتاب کھول لی تو وہ قمیص کی سلائی میں مصروف ہو گئی۔ مون نے اسے مصروف دیکھ کر دوبارہ آسمان پہ نظر دوڑائی۔

"آگیا۔ آگیا۔" مون ایک دم ہی چیخ اٹھا۔

"ہائے میں مر گئی۔۔۔ کون آگیا۔" اس کے چیخنے پر زہی کا دل سو میل فی منٹ کی رفتار سے بھاگنے لگا تھا۔

"وہ دیکھیں آپی! کوئی گھنٹے بھر سے وہ آسمان پہ گھوم رہا تھا۔ مجھے یقین تھا یہ ضرور آئے گا۔" مون کا جوش دیدنی تھا۔

"یا خدا کون آئے گا؟"

"کمال ہے آپ کو نظر نہیں آرہا وہ دیکھیں نا۔۔۔ سامنے چھت پہ۔" مون نے جھنجلا کر اسے سمجھایا۔

زہی نے مون کے اشارے پر نظر دوڑائی تو گہری سانس لے کر رہ گئی' وہ سفید رنگ کا کبوتر تھا۔ جو چھت پہ بیٹھا غٹرغوں غٹرغوں کر رہا تھا۔

"آپی چلیں' ہم اسے پکڑتے ہیں۔" مون جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھے رہو آرام سے۔" زہی نے اسے ڈپٹ دیا۔

"آپی پلیز پکڑ دیں نا اتنا خوب صورت ہے۔" مون نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"کمال کرتے ہو مون! نہ جانے کس کا ہو ہم ایسے ہی پکڑ لیں۔" اس نے مون کو ٹالنا چاہا۔

"جس کا بھی ہو اب تو ہماری چھت پر بیٹھا ہے نال۔" مون نے ڈرتے ڈرتے اسے قائل کرنا چاہا۔ زہی نے غصیلی نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپی پلیز۔" دنیا جہاں کی معصومیت مون کے چہرے پہ براجمان تھی۔

"چلو مرو۔" وہ با دل نخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچ گئے۔ زہی نے دوپٹہ اتار کر ہاتھ میں لے لیا اور جھکے جھکے انداز میں کبوتر کی طرف بڑھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے دوپٹہ کبوتر پہ پھینک کر اسے قابو میں کر لیا تھا۔

"ہرا یہ بات ہوئی نال۔" مون کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا تھا۔ نیچے آکر اس نے کبوتر کو پانی پلایا۔ مون بڑے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

"آپی اسے رکھیں گے کہاں؟" مون اسے اپنی ملکیت سمجھ بیٹھا تھا زہی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ اسی دوران دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ مون بھاگ کر دروازے تک گیا اور پھر واپس آیا تو منہ لٹکا ہوا تھا۔

"آپی وہ لوگ کبوتر لینے آئے ہیں۔"

"لو ہم نے اتنی محنت سے پکڑا ہے تو اب لینے آ گئے ہیں۔" اس کا اپنا دل نہ چاہا کبوتر واپس کرنے کو۔ ابھی وہ بڑی افسردگی سے کبوتر کو دیکھ رہے تھے جب دوبارہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"اُفوہ۔" اس نے گھبرا کر بھابھی کے کمرے کی طرف دیکھا۔ "ابھی اٹھ کر آجائیں گی اور اچھی خاصی ڈانٹ پڑ جائے گی۔" اسے ان بے صبرے لوگوں پہ غصہ آنے لگا۔

"کیا بات ہے بھئی۔" اس نے دروازے تک آکر غصے سے پوچھا۔

"وہ جی ہمارا کبوتر آپ کے گھر آیا ہے۔" آنے والے نے مودب ہو کر جواب دیا۔

"کون سا کبوتر؟ ہمارے گھر کوئی کبوتر نہیں آیا۔" اس نے کبوتر دوپٹے کے نیچے چھپا لیا۔ مون اس حکمت عملی پہ جھوم جھوم گیا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ ہم نے خود دیکھا ہے آپ کی چھت پر بیٹھا تھا۔" کسی دوسرے نے تنگ کر کہا تھا زہی نے غصے سے بند دروازے کو گھورا۔

"ہاں آیا ہے پھر کیا کرلیں گے آپ۔" مون سر پہ ہاتھ گرا کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا اس کی آپی غصے میں سارا کام خراب کردیں گی۔

"کرنا کیا ہے خاتون! آپ ہمیں ہمارا کبوتر واپس کریں۔"

"خاتون" زہی کے تو پتنگے ہی لگ گئے تھے۔

"دماغ تو ٹھیک ہے آپ کا 'یہ خاتون کسے کہا ہے آپ نے؟" اس نے چیخ کر کہا۔

"دیکھیے بی بی۔" جواباً کسی نے کچھ کہنا چاہا۔

"بی بی۔" زہی کا تو بی پی لو ہونے لگا تھا بی بی کے نام پر۔ سو فوراً دروازہ کھولا اور کبوتر تقریباً ان کے منہ پہ مار کر اس نے ٹھک سے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔

"ارے آپی یہ کیا کیا ہے آپ نے؟" مون اپنا حیرت سے کھلا منہ بند کر کے اس کے پیچھے لپکا۔

"ہاں تو اور کیا کرتی وہ کمبخت بھی تو خاتون اور بی بی پر اتر آیا تھا۔ ایک تو پہلے ہی رشتہ نہیں ملتا اوپر سے یہ خاتون اور بی بی مشہور کروادیں گے مجھے۔" وہ اپنی ہی دھن میں جل بھن کر کہتی گئی جبکہ مون نا سمجھی کے عالم میں بس اسے دیکھے گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے کمرے میں جھانکا۔ اسد بڑی محویت سے پڑھنے میں مصروف تھا۔ وہ فوراً کچن میں آگئی۔ اسد کی سابقہ ہدایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے دودھ زیادہ پتی تیز اور چینی کم ڈال کر چائے تیار کی۔ پھر کپ لا کر اسد کے سامنے میز پہ رکھا تو اسد نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر کتاب میں گم ہو گیا۔ زہی نے پہلے تو اس بے توجہی پر اسے گھورا مگر پھر فوراً منہ کا زاویہ درست کرلیا۔

"اسد! تم میرے اچھے سے بھائی ہو ناں۔" اس نے پیچھے سے جا کر دونوں بازو اس کے گلے میں ڈال کر بڑے پیار سے پوچھا تھا۔

"بالکل اس میں کیا شک ہے۔" اسد کی نظریں ہنوز کتاب پر جمی تھیں۔

"پھر میرا ایک کام کردو ناں۔"

"کون سا؟"

"مستنصر حسین تارڑ کی "کے ٹو کہانی" لادو۔ سچ بڑی تعریفیں سنی ہیں اس کی۔" جواب اسد کی توقع کے عین مطابق آیا تھا۔

"چھوڑو بھی کیا رکھا ہے ان کتابوں میں 'گھر کے کام وام کیا کرو۔" اسد کے کہنے پر وہ چڑ گئی۔

"کرتی تو ہوں۔ سارا وقت گھر کے کاموں میں ہی گزرتا ہے۔"

"سوری بھئی لائبریری بہت دور ہے' آنے جانے میں اچھا خاصا وقت نکل جاتا ہے۔" اسد نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"شرم تو نہیں آتی۔" اس نے غصے میں اسد کے بال کھینچ ڈالے۔

"اپنی دفعہ تو بڑے چکر لگتے ہیں۔ میری باری میں

لائبریری دور بہت ہے۔" اس نے اسد کی نقل اتاری۔

"ارے میرے بال تو چھوڑو۔ کیا بدتمیزی ہے یہ۔" وہ جھنجلا گیا۔

"نہیں چھوڑوں گی پہلے کتاب لانے کا وعدہ کرو۔"

"نہیں لا کر دوں گا۔" اسد بھی ضد میں آگیا۔

"کیا؟" وہ چیخ ہی تو پڑی تھی۔ غصے میں اس کے بال مزید زور سے کھینچ ڈالے۔

"ہائے مر گیا۔" اس کے ہاتھ سے گرم چائے چھلک گئی تو اس نے فوراً" گھبرا کر اس کے بال چھوڑ دیے۔

"انتہائی جاہل لڑکی ہو تم۔" وہ اٹھ کر اپنی قمیص جھاڑنے لگا۔

"اماں تمہارے بارے میں بالکل ٹھیک پریشان ہوتی ہیں۔ کب جاؤ گی تم اس گھر سے اور کب تم سے جان چھوٹے گی۔" وہ جانتا تھا زبی اس بات سے چڑتی ہے 'سو فوراً" ہی بدلہ لینے کے لیے کہہ دیا۔

زبی کو تو پہلے ہی اماں نے اٹھتے بیٹھتے ٹھنڈی آہیں بھر بھر کے احساس کمتری میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اسد کے اس جملے نے اسے مزید تپا دیا۔

"اتنی جلدی ہے جان چھڑانے کی تو انتظار کس بات کا ہے۔ کہیں کنویں میں دھکا دے دو یا زہر کی پڑیا لا دو کھا کر اپنی بھی جان چھڑاؤں اور تم لوگوں کی بھی۔"

وہ غصے میں سرخ ہوتی کہہ کر دوسرے کمرے میں گھس گئی۔ اسد حیران پریشان کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر فوراً" اس کے پیچھے لپکا۔

"ارے زبی میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"اچھا یار دروازہ تو کھولو مجھے بتاؤ کون سی کتاب لانی ہے۔" وہ بند دروازے کے باہر کھڑا ہو کر پکارنے لگا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"کیا ہوا؟" بھابھی نے اسے باہر کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں زبی ناراض ہو گئی ہے۔" اسد نے منہ بنا کر کہا۔

"ایسی کیا بات ہے بھئی ہم ابھی منا لیتے ہیں اپنی لالہ کو۔" انہوں نے مسکرا کر کہا اور شیراز کو دروازے کے پاس کھڑا کر دیا۔ وہ توتلی آواز میں اسے پکارنے لگا۔

اسد کو یقین تھا اب دروازہ کھل کر رہے گا۔ سو وہ اطمینان سے وہاں سے پلٹ آیا ہاتھ میں پکڑا قلم قمیص کی جیب میں ڈالا اور سائیکل لے کر باہر نکل گیا۔

تقریباً" ایک گھنٹے بعد واپسی ہوئی۔ تو زبی شیراز کو لیے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اس نے کتابیں لا کر اس کے پاس رکھ دیں مگر زبی کا موڈ ویسا ہی رہا۔ کتابوں پر اس نے ایک نظر بھی نہ ڈالی تھی۔

اسد نے اس کا سر پکڑ کر چہرہ اوپر کیا۔

"بے وقوف لڑکی! میں صرف مذاق کر رہا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارے بارے میں ایسا سوچ سکتا ہوں۔"

زبی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ باہر سے آنے کی وجہ سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

ماتھے پہ ہلکا ہلکا پسینہ ابھرا ہوا تھا۔ وہ صرف ڈیڑھ سال چھوٹا تھا زبی سے مگر اس کا خیال ہمیشہ بڑوں کی طرح رکھتا تھا۔ زبی کو ایک دم ہی اس پر ٹوٹ کر پیار آ گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس کی مسکراہٹ سے جیسے اسد کی جان میں جان آ گئی تھی کہ اس کی خفگی برداشت کرنا کم از کم اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا تھا۔

"جتنے سفرنامے ملے ہیں وہ میں لے آیا ہوں۔" اسد نے کتابوں کی طرف اشارہ کر کے کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

"اسد۔" اس کی آواز پر اسد پلٹا۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے بڑی معصومیت سے کہا تو اسد مسکراتا ہوا دوبارہ کمرے میں آگیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ ہی تو المیہ ہے۔ لڑکیوں کی شادی کی عمر ہونے لگے تو ہم انہیں اسکول، کالجز سے ہٹا کر گھروں میں بٹھا لیتے ہیں اور انہیں مجبور کرتے ہیں اس بات پر کہ وہ

اچھے رشتوں کا انتظار کریں اور جب ایسا نہیں ہوتا تو نہ صرف ہم لوگوں کے رویے بدل جاتے ہیں' بلکہ لڑکیاں بھی خود کو ہر لحاظ سے کمتر سمجھنے لگتی ہیں۔" اسد اس ایک واقعے سے ہی جان گیا تھا کہ اماں جو بار بار زہی کے سامنے اس کی شادی نہ ہونے کا رونا روتی رہتی ہیں تو اس بات نے زہی کو بھی احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا کہ شاید اس میں ہی کوئی خرابی ہے۔ لہٰذا اس نے ایک بار اماں کے پاس بیٹھ کر انہیں سمجھایا اور سختی سے منع بھی کر دیا کہ آئندہ زہی کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کی جائے۔ چند دن یوں ہی سکون سے گزر گئے تھے' خود زہی حیران تھی کہ اماں پر اس کی شادی کا جو بھوت سوار ہوا تھا وہ کیا ہوا؟ مگر بہرحال یہ نئی صورت حال اس کے لیے خاصی اطمینان بخش تھی کہ اب اماں اس کے ہنسنے' کھیلنے پر بار بار نہیں ٹوکتی تھیں۔

محض اتفاق تھا کہ انہی دنوں بڑی پھپھو کی بیٹی رابعہ کی شادی کا کارڈ آگیا۔ کارڈ کیا آیا اماں کی دبی دبی خواہشات پھر سے جاگ اٹھیں۔

"رابعہ! زہی سے سال بھر چھوٹی ہے۔" اماں برآمدے میں بیٹھی ابا سے محو کلام تھیں۔

تو اس میں میرا کیا قصور؟ زہی کمرے میں اوندھی لیٹی ٹانگیں ہلا رہی تھی۔

"لڑکا بینک منیجر ہے۔"

اماں جی! رابعہ کا بڑا بھائی امریکہ میں برسر روزگار ہے اور چھوٹا بھائی انجینئر۔ بینک منیجر کا رشتہ آگیا تو اس میں حیرت کس بات کی؟ زہی نے کروٹ لی۔

"ایک ہماری زہی ہے۔ کبھی کسی اسکول ماسٹر کا رشتہ آگیا تو کبھی کسی کلرک کا۔" اماں کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

ظاہر ہے ہمارے ابا محکمہ مال میں کلرک' بڑے بھیا واپڈا میں کلرک' اس پانچ مرلے کے مکان میں کوئی انیسویں گریڈ کا افسر تو بارات لانے سے رہا۔ زہی نے چٹیا سے نکلے بالوں کو کس کر پن لگائی۔

"ارے اب بس بھی کرو تمہاری کون سی چھ سات بیٹیاں ہیں' جو ہر وقت یہ ہی فکر سر پہ سوار رکھتی ہو۔" ابا ان کی باتیں سن سن کر اکتا گئے تھے۔

"ارے فکر نہ کروں تو اور کیا کروں" اماں' ابا سے الجھنے لگی تھیں۔

"واقعی اماں! تم گھر بیٹھ کر سوائے فکر کے اور کچھ نہیں کر سکتیں' میرا خیال ہے اب مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔" اس نے اطمینان سے اٹھ کر ہاتھوں سے قمیص کی شکنیں دور کیں اور اٹھ کر آئینے کے سامنے آگئی اور بڑی تنقیدی نگاہوں سے اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ نقوش غیر معمولی نہ سہی بے حد معمولی بھی نہ تھے۔ آنکھیں تو اچھی خاصی ہیں میری بس آئی بروز کو ذرا سی شیپ دے لینی چاہیے۔ رنگت ہے تو گندمی' مگر شکر ہے کیل مہاسوں سے بچی ہوئی ہے۔ ہاں سب سے ناگوار چیز چہرے پہ چھائی پژمردگی ہے۔ بندے کو ذرا فریش ہونا چاہیے۔

اس نے بڑے غور سے اپنے چہرے کو دیکھا تھا اور پھر اگلے ہی روز اس نے پرانے رسالے نکال نکال کر اپنی جلد کے مطابق ٹوٹکے نوٹ کیے اور بھابھی 'لالی' سے چوری سب نسخے خود پہ آزمانے لگی' پانی پہلے دن میں بوقت ضرورت پیتی تھی اب جب تھوڑی دیر ہو جاتی غٹاغٹ پانی کا گلاس چڑھا جاتی۔ بال پہلے بھی کندھوں تک تھے مگر ذرا اونچے نیچے تھے' ہمسائے کی لڑکی سے کہہ کر برابر ترشوا لیے۔ ذرا سے دودھ میں دیسی انڈا ملا کر ہفتے میں دو بار لگائے تو بالوں کا سیاہ رنگ مزید چمک اٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اماں میں نے رابعہ کی شادی پر جانا ہے" وہ کتنے ہی دن اماں کے پیچھے پڑی رہی' آخر کار بڑی منتوں سے اماں راضی ہوئیں۔ پھر ایک روز بڑی پھپھو نے ہمسائیوں کے گھر فون کیا اور اماں کو خاص تاکید کی۔

"زہی کو دیکھے عرصہ ہو گیا ہے' میں اپنی بیماری کی وجہ سے آنے سے مجبور ہوں ورنہ خود لینے آجاتی۔ لیکن اب تم اسے کم از کم دس پندرہ دن پہلے بھجواؤ۔"

یہ پھپھو سب سے بڑی تھیں۔ دادا، دادی کی وفات کے بعد ابا انہیں ماں کی جگہ ہی سمجھتے تھے، سو ابا سے اجازت کا مرحلہ خود بخود طے ہو گیا کہ وہ پھپھو کے حکم سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔

اماں کے ساتھ جا کر اس نے شادی میں پہننے کے لیے کپڑے خریدے۔ میک اپ کے نام پر اس کے پاس سوائے ایک لپ اسٹک کے کچھ نہیں تھا، سو اب ضرورت کے مطابق کچھ چیزیں خرید لی تھیں۔

جس روز صبح اسد نے اسے بڑی پھپھو کے ہاں چھوڑنے جانا تھا وہ بے حد خوش تھی اور پرجوش بھی۔ ایک طویل عرصہ ہو گیا تھا خاندان بھر کے لوگوں سے ملے ہوئے۔ باقی سب رشتے دار تو ایک ہی شہر میں تھے بس ان کا گھرانہ ہی دوسرے شہر میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تمام کزنز سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔

اسے بڑی پھپھو کی طرف آئے ہوئے دو روز ہو گئے تھے اور اس عرصے میں اس نے کوئی کام نہیں کیا تھا سوائے اس گھر کے مکینوں کو تاڑنے کے۔ وہ ہر کسی کی عادات کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

بڑی پھپھو جوڑوں کے درد کی وجہ سے بس اپنے کمرے تک محدود تھیں۔ مگر اس کے باوجود گھر کے تمام معاملات پر ان کی نظر تھی۔ کون آرہا، کون جا رہا ہے کیا لین دین ہو رہا ہے۔ انہیں خوب خبر تھی۔ ایک ہی کمرے میں محدود ہونے کے باوجود وہ پورے گھر کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھیں۔ ان کے مشورے کے بغیر گھر میں کوئی کام نہ ہوتا تھا اور ان کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

ان کے بعد گھر میں جس فرد کی حیثیت مستحکم تھی وہ صفیہ بھابھی تھیں۔ پھپھو کے بڑے بیٹے کی زوجہ محترمہ، ان کے چار بچے تھے۔ گھر کے تمام کاموں کا بوجھ انہی کے کندھوں پر تھا اور آج کل شادی کی وجہ سے کام اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ وہ گھن چکر بن کر رہ گئی تھیں۔ ان کے بعد رضوان تھا پھپھو کا چھوٹا بیٹا انجینئر تھا اور غیر شادی شدہ، ماں اور بھابھی کے حکم پر ہی چلتا تھا۔ زبی نے بھی اسے ان کی مخالفت کرتے یا جھگڑتے نہیں دیکھا۔

اس گھر میں سب سے بے ضرر شخصیت پھوپھا جان کی تھی جو انتہائی مرنجان مرنج قسم کی شخصیت رکھتے تھے۔ رابعہ ان دنوں اپنے کمرے میں کبھی اپنے ہاتھوں، پاؤں اور چہرے کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی۔ اسی گھر کے دوسری طرف رابعہ کے چچا کا گھر تھا۔ درمیان میں صرف ایک باڑھ تھی، جسے پھلانگ کر وقتاً"فوقتاً" رابعہ کی کزنز رابعہ کے پاس آجاتی تھیں اور زبی نے نوٹ کیا تھا کہ ان کے آنے پر صفیہ بھابھی کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ رابعہ اپنی کزنز کے ساتھ مل کر اپنے کپڑے وغیرہ سمیٹ لے، مگر ان لوگوں کے درمیان صرف رابعہ کا عروسی جوڑا، رابعہ کا میک اپ اور ہیئر اسٹائل موضوع گفتگو بنا رہتا تھا جس سے بھابھی کافی چڑتی تھی۔

غرض اس نے خوب دیدہ ریزی سے کام لے کر جانچ لیا تھا کہ کس فرد کو کس طرح ٹریٹ کرنا ہے۔

لوگوں کے چلن پہ حیران ہونا چھوڑیں زبی جی.... لوگوں کے رنگ میں رنگ جائیں بہتری اسی میں ہے۔ اس نے خود کو ہدایت دی اور اگلے ہی روز وہ کمر کس کر میدان میں کود پڑی تھی۔

رات دیر تک کاموں میں الجھے رہنے کی وجہ سے صبح صفیہ بھابھی کی آنکھ کھلی تو باہر ہر طرف اجالا پھیل چکا تھا وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئیں۔

"اتنی دیر ہو گئی یہاں تو ابھی ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔" انہوں نے دوپٹہ کھینچ کر گلے میں ڈالا، پاؤں چپل میں پھنسائے، باتھ روم میں جا کر پانی کے چند چھینٹے منہ پر مارے اور پھر کچن کی طرف بھاگیں۔

"ارے۔" کچن میں زبی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔ ان کی آواز پر زبی چونک کر پلٹی۔

"آئی ایم سوری بھابھی! اصل میں میری آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ بھوک کا احساس ہوا تو میں کچن میں آگئی۔" اس نے شرمندہ سے لہجے میں وضاحت کی۔

"ارے نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں رات دیر سے سوئی تھی اس لیے میری بھی آنکھ نہیں

کھلی" چائے پکتے دیکھ کر انہیں قدرے سکون ہوا تھا۔

"اگر چائے بن گئی ہو تو جلدی سے کپ میں ڈال دو میں امی کو دے آؤں وہ ذرا جلدی ناشتا کرتی ہیں" بھابھی نے پھپھو کا ذکر کیا۔

"انہیں میں ناشتہ دے آئی ہوں بھابھی۔" زیبی نے کن انکھیوں سے دیکھا ان کے چہرے پر یکلخت ہی اطمینان ابھر آیا تھا۔

"بہت اچھا کیا تم نے' ناشتے میں ذرا دیر ہو جائے تو ان کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔" بھابھی آٹا گوندھنے کی تیاری کرنے لگیں۔

"اچھا اب تم جاؤ باقی میں خود کر لیتی ہوں۔" انہوں نے نرمی سے اسے چولہے کے پاس سے ہٹایا۔

"کوئی بات نہیں بھابھی! مجھے کون سا کوئی اور کام ہے۔ یوں بھی فارغ رہنے کی عادی نہیں اس لیے ان دو دنوں میں خاصی اکتا گئی ہوں میں۔" اس کی بات پر بھابھی بے اختیار مسکرا دیں۔

"ارے بھئی یہاں تو لڑکیاں کاموں سے بچنے کے ہزار بہانے ڈھونڈ لیتی ہیں اور تم ہو کہ کام کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہو۔" بھابھی کی بات پر وہ صرف کندھے اچکا کر رہ گئی۔

"اپنی اپنی عادت ہے بھابھی۔"

"اچھا پھر یوں کرو تم آملیٹ بنا دو میں آٹا گوندھ کر پراٹھے بناتی ہوں۔" بھابھی کو تو ہر وقت کسی ہیلپر کی تلاش رہتی تھی' سو فوراً" بے تکلفی اختیار کر گئیں اور وہ مسکرا مسکرا کر سارے کام نبٹاتی چلی گئی۔

"توبہ ہے پھپھو... آپ کے بال کس قدر روکھے ہو رہے ہیں' سر بھی خشکی سے بھرا پڑا ہے۔"

بھابھی اور رابعہ بازار چلی گئی تھیں۔ وہ جھٹ تیل کی بوتل اٹھائے پھپھو کے پاس چلی آئی۔

"ارے بیٹی! کتنے ہی دن ہو گئے تیل بالوں کے قریب بھی نہیں پھٹکا' ہر کوئی اپنے دھندے میں الجھا ہوا ہے۔ اتنی توفیق کہاں کہ کوئی دو بوندیں تیل کی میرے سر میں ڈال دے۔" پھپھو خاصی بے زار بیٹھی تھیں۔

"ایک ہمارا زمانہ تھا ہر روز اپنی ساس کے سر میں تیل کی مالش کرتے' کپڑے بدلواتے' بال بناتے' وہ ہماری خدمت سے خوش ہوتیں اور ہم ان کی دعاؤں سے۔" زیبی دلچسپی سے پھپھو کی باتیں سننے لگی۔

"مگر آج کل تو بزرگوں کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ جیسے تیسے ہم لوگ اپنا وقت پورا کر رہے ہیں اور ہمارے بچے بھی بڑے صبر سے ہمیں برداشت کر رہے ہیں۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں پھپھو۔" اس نے تیل ان کے سر میں انڈیل کر مساج شروع کیا۔

"آپ کے بچے تو آپ سے بے حد پیار کرتے ہیں اور تو اور صفیہ بھابھی آپ کی تعریف کرتے نہیں تھکتیں۔" اس نے ذرا مبالغے سے کام لیا۔ بڑھاپے میں قدم رکھتے ہی انسان خود کو دوسروں پر بوجھ تصور کرنے لگتا ہے۔ وقتا" فوقتا" انہیں یہ احساس دلاتے رہنا چاہیے کہ وہ ہمارے لیے کس قدر اہم ہیں' یہ زیبی کا اپنا نظریہ تھا سو وہ پھپھو کو پوری طرح یہ احساس دلا رہی تھی۔

"میری تو ہمیشہ سے خواہش رہی ہے بزرگوں کی دعائیں سمیٹنے کی مگر بدقسمتی سے ہوش سنبھالتے ہی دادا' دادی وفات پا گئے۔ نانا وغیرہ کی طرف ویسے بھی کبھی کبھار ہی جاتے تھے۔" پھپھو اس کی باتوں پہ ہنکارا دے رہی تھیں۔

"ویسے زیبی بیٹی! تمہارے ہاتھوں میں نرمی بہت ہے۔" پھپھو کو نیند کے جھونکے آنے لگے تھے۔ اس نے مساج کرنے کے بعد ان کے بال بنائے اور جب وہ تیل کی شیشی اٹھا کر کمرے سے باہر نکلی تو پھپھو اسے دعائیں دیتے دیتے باقاعدہ اونگھنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

زیبی اور بھابھی ڈھیر سارے کپڑے ادھر ادھر پھیلائے لاؤنج میں بیٹھی تھیں' بھابھی تمام جوڑے استری کر کے انہیں تہ کر کے ڈبوں میں پیک کرتی جا رہی تھیں کچھ کپڑے جن پر کڑھائی کا کافی کام کیا ہوا تھا

انہیں ہینگر میں لٹکا کر پنوں کی مدد سے سیٹ کرتی جارہی تھیں۔ وہ صوفے پر بیٹھی قیمص کی ترپائی کے ساتھ ساتھ بھابھی کی بڑبڑاہٹ بھی سنتی جارہی تھی۔

"پہلی دفعہ دیکھی ہے ایسی لڑکی جہیز کا سارا سامان یہاں سے وہاں بکھرا پڑا ہے اور محترمہ خود چوبیس گھنٹے کبھی کھیرا چہرے پہ سجائی بیٹھی رہتی ہیں اور کبھی کوئی ماسک" وہ رابعہ کی سستی سے سخت نالاں تھیں۔

"یہ تم یہاں کیا کررہے ہو؟" اچانک ہی وہ پلٹیں تو چھوٹے کاشف کو جھڑک دیا جو بڑے مزے سے کامن پنوں کا ڈبہ کھولے بیٹھا تھا۔

"ہزار دفعہ کہا ہے مت چھیڑا کرو چیزوں کو" انہوں نے اس کے ہاتھ سے جھپٹا۔

"چلو اٹھو یہاں سے" آؤ تمہارے باپ کے پاس چھوڑ کے آؤں تمہیں۔" انہوں نے اسے ایک بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔

"سارا سال باہر عیش کرتے ہیں' اب چار دن کے لیے آئے ہیں تو بچوں کو بھی نہیں سنبھال سکتے۔" وہ سخت جھنجلائی ہوئی تھیں۔ بولتی ہوئی باہر نکل گئیں اور وہ مسکراہٹ چھپا کر اپنے کام میں مصروف رہی۔

"السلام علیکم" کسی بھاری مردانہ آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

کوئی اجنبی ہی تھا اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے دوپٹہ کاندھوں پر پھیلایا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"صفیہ بھابھی کہاں ہیں" آنے والے نے پوچھا تو وہ سمجھ گئی کہ یہ یقیناً بھابھی کے جاننے والے ہوں گے۔

"آپ بیٹھیں پلیز میں دیکھتی ہوں" اس نے قمیص ایک طرف رکھی اور پاؤں صوفے سے نیچے اتارے۔

"ہائے۔۔۔" کوئی چیز بڑے زور سے اس کے پاؤں میں چبھی تو اس نے برق رفتاری سے پاؤں واپس کھینچ لیا۔ جبکہ اس کی "ہائے" پر وہ اجنبی بیٹھتے بیٹھتے رک گیا تھا۔

"ہائے میں مرگئی" زینی کے پاؤں میں کامن پن آدھی سے زیادہ گھسی ہوئی تھی اور یہ دیکھتے ہی زینی کی آدھی سے زیادہ جان ہوا ہوگئی تھی۔

"اسے نکال لیجیے ناں" آنے والے نے اسے آنکھیں پھاڑ کر اپنے پاؤں کی طرف تکتے دیکھ کر کہا۔

"کیسے نکالوں؟" زینی نے اسے ایسے گھورا جیسے اس کی دماغی حالت پہ شبہ ہو۔

"ہاتھ سے" جواباً اس کی آنکھوں میں ابھرنے والا تاثر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

"ہائے اماں جی۔۔۔" دو موٹے موٹے آنسو خود بخود اس کی آنکھوں میں آگئے۔ ڈرتے ڈرتے ہاتھ پن کی طرف بڑھایا۔ دانت سختی سے ایک دوسرے پر جما کر پن کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ ذرا سے ہلنے پر درد کی تیز لہر پاؤں میں دوڑ گئی اس نے جھٹ ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"افوہ بھئی معمولی سی تو پن ہے لائیں میں نکال دیتا ہوں۔" وہ صوفے سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں ہاتھ مت لگائیے گا درد ہوتا ہے۔ میں خود ہی نکال لوں گی۔" اسے اٹھتے دیکھ کر اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پاؤں پکڑ لیا۔

"ارے کیا ہوا؟" بھابھی اسی دوران آئیں اور اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"بھابھی یہ" اس نے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

"افوہ تو بھئی ان کو نکالو ناں یونہی پاؤں پکڑ کر کیوں بیٹھی ہو۔"

وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھیں اور اس کے "نہیں نہیں" کرنے کے باوجود انہوں نے سختی سے اس کا پاؤں پکڑ کر ایک جھٹکے سے پن باہر نکال دی خون کا سرخ قطرہ وہاں ابھر آیا تھا۔

"یہ سب اس کاشی کی کارستانی ہے ساری پنیں یہاں بکھیر گیا ہے۔" بھابھی نے جھک کر ساری پنیں دوبارہ ڈبے میں بند کیں۔

"ہاں بھئی حماد تم سناؤ' کیسے ہو؟" بھابھی آنے والے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"بالکل ٹھیک ہوں یہ ممانے کچھ ساڑھیاں بھجوائی

ہیں۔ رابعہ کو دکھادیں جو پسند ہوں وہ الگ کر دیں۔"
اس نے بڑا سا شاپر بھابھی کی طرف بڑھایا۔
"ہاں۔۔۔ یہ لے جاؤ زیبی۔۔۔ رابعہ اپنے کمرے میں ہوگی۔" بھابھی نے شاپر اس کے ہاتھ میں تھمادیا اور اس دفعہ اس نے بڑے احتیاط سے پاؤں نیچے رکھا تھا۔
"بھابھی۔۔۔ یہ۔۔۔؟" حماد نے سوالیہ نظروں سے زیبی کو دیکھا۔
"ارے ہاں بھئی میں نے تعارف تو کروایا ہی نہیں۔" بھابھی خوامخواہ ہی ہنس دیں۔
"یہ ماہ زیب ہے، رابعہ کے ماموں کی بیٹی۔"
"اور زیبی یہ حماد حسن ہے۔ میرے چھوٹے تایا کی سالی کی دیورانی کے بیٹے ہیں۔"
"ہائیں" زیبی نے حیرت سے بھابھی کو دیکھا۔ اسے اتنے لمبے چوڑے رشتے کی کچھ سمجھ نہیں آئی تھی مگر چونکہ بھابھی اسے بتا کر دوبارہ حماد کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں اس لیے وہ کندھے اچکا کر رابعہ کے پاس آگئی تھی۔

✡ ✡ ✡

رابعہ کی مایوں کی رسم ادا ہو گئی تھی سارا گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا، ہر کمرے میں خوش گپیوں، قہقہوں، سرگوشیوں کی آوازیں ہمہ وقت گونجتی رہتی تھیں۔ ہر کوئی بے فکری کے مزے لوٹ رہا تھا۔ وقت پر کھانا، وقت پر چائے، کبھی کسی کو موضوع گفتگو بنا لیا جاتا، کبھی کسی نئی تازی خاندانی خبر پر گھنٹوں بات چیت ہوتی رہتی تو جوان لڑکیوں کو نت نئے کپڑے دکھانے کا ایک سنہری موقع مل گیا تھا۔
زیبی نے پھرتی اور ہوشیاری کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ کسی مہمان خاتون کا بچہ رو رہا ہو تو وہ جھٹ بچے کو پچکارتی ہوئی وہاں سے لے جاتی، کوئی کھلونا دیتی، گدگدی کرتی اور ذرا سی دیر میں ہنستا کھلکھلاتا بچہ ماں کی گود میں واپس دے جاتی۔ کوئی خاتون سر درد کی شکایت کرتی تو وہ دو منٹ میں چائے کا کپ اور سر درد کی گولی ان کے ہاتھ میں تھما جاتی۔ کھانا کھلاتے وقت وہ مسلسل دھیان رکھتی کہ کسی کے پاس سالن ختم تو نہیں ہوا، چاولوں کی ڈش خالی تو نہیں۔ کون بچہ پانی کے لیے رو رہا ہے وہ ہر ایک کی ضرورت کا بخوبی خیال رکھتی۔ پھپھو کا کھانا خود ان کے کمرے میں لے کر جاتی۔
صفیہ بھابھی کے ساتھ مل کر اس نے رابعہ کے جہیز کا سارا سامان سیٹ کر کے ایک کمرے میں بند کروا دیا تھا، رات کو مہمانوں کے لیے سونے کے انتظام کی ذمہ داری بھی اسی کے سر تھی اور وہ اپنا چین آرام، کھانا پینا پس پشت ڈال کر یہ سب کام کر رہی تھی کہ یہ سب کام اسے کرنے تھے، بلکہ اسے کرنے پر مجبور کیا تھا۔ سکینہ خالہ کی ترحم آمیز نظروں نے، اماں کے ہمہ وقت واویلوں نے اور بھابھی نائمہ کے لبوں پہ چھپے چھپے تبسم نے، سو وہ یہ سب کر رہی تھی۔
اس روز بھی وہ کچن میں تمام بچے ہوئے کھانے فریزر میں محفوظ کر رہی تھی۔ جب رضوان چلا آیا۔ اس نے ایک نظر مصروف سی زیبی پر ڈالی پھر ادھر ادھر دیکھ کر واپس پلٹنے کو تھا جب زیبی کی نظر اس پر پڑی۔
"کچھ چاہیے تھا؟" اس نے بے اختیار پوچھا تھا۔
"چائے بنوانی تھی مگر آپ تو پہلے ہی خاصی مصروف ہیں۔" اس نے ذرا توقف سے کہا۔
"کوئی بات نہیں میں بنا دیتی ہوں۔" وہ مڑ کر دیگچی اٹھانے لگی۔
"میں اپنے کمرے میں ہوں۔" رضوان ایک نظر اسے دیکھ کر چلا گیا۔ زیبی نے چائے کا کپ تیار کیا۔ مگر کچن کے دروازے سے نکلتے نکلتے رک گئی۔
"کیا مجھے خود جانا چاہیے؟" اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔
پھر اس نے وہیں سے کسی بچے کو آواز دی اور چائے رضوان کے کمرے میں بھجوا دی۔
"یہاں تو ذرا سی بات کا جھٹ افسانہ بن جائے گا۔" اس نے سوچا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔
"ارے تربیت تو کی ہے ہماری بھاوج نے زیبی کی"

پھپھو کے کمرے میں جاتے ہوئے وہ ٹھٹک گئی۔ اپنا نام سنتے ہی فطری سا تجسس اس کے دل میں ابھرا تو اس نے وہیں رک کر کان دروازے سے لگا دیے۔

"ادھر سے ادھر پھرکی کی طرح گھومتی رہتی ہے، مجال ہے جو کبھی کمر سیدھی کرتے دیکھا ہو اسے۔ جب سے آئی ہے میری خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی" آتے جاتے کھڑے کھڑے پوچھ جاتی ہے کہ پھپھو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ارے میں کہتی ہوں میری اپنی رابعہ نے کبھی میرا اتنا خیال نہیں رکھا۔" پھپھو کے لہجے میں اس کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

"یہ بات تو آپ نے بالکل ٹھیک کہی آپا! لڑکی واقعی بڑے گنوں والی ہے اور پھر ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی ہے کبھی ماتھے پہ بل نہیں دیکھا نہ کبھی چڑ کر بولتے سنا ہے۔" کوئی اور خاتون بھی پھپھو کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔

"جب سے زیبی آئی ہے سچ میرا تو بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔" بھابھی کی آواز پر وہ ایک دم چونک گئی۔ اپنی تعریف سنتے سنتے وہ بھول گئی تھی کہ وہ یہاں بھابھی کو بلانے آئی تھی سو فوراً" قدموں کی چاپ پیدا کرتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔

"بھابھی! آپ کو صفدر بھائی بلا رہے ہیں۔" اس نے سر اندر کر کے بھابھی کو پیغام دیا اور ان کے سر ہلانے پر واپس پلٹ گئی۔

وہ اس وقت "میں بن پتنگ اڑی جاؤں رے" کی عملی تفسیر نظر آ رہی تھی۔

گویا میرا مسئلہ تھوڑا تھوڑا حل ہو رہا ہے۔ یہاں تو سب لوگ میرے گرویدہ نظر آ رہے ہیں لیکن صرف گرویدہ ہونے سے کیا حاصل؟ بات کچھ آگے بھی تو بڑھنی چاہیے۔ وہ کمرے میں آ کر بیڈ پر گر گئی۔

اماں نجانے کب آئیں گی۔ آخر انہیں بھی تو معلوم ہو ان کی بیٹی کتنے گنوں والی ہے۔ اسے اماں کا شدت سے انتظار تھا۔

کھانا لگنے میں ابھی کافی وقت تھا سو زیبی بھی ڈھولک بجاتی لڑکیوں کے پاس آ گئی۔ ہر گھر میں ڈش ٹی وی سی آر کی سہولت موجود تھی اسی لیے تمام لڑکیاں نئے نئے گانے گا کر ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہی تھیں وہ بس چپ چاپ ان کے ساتھ بیٹھی تالیاں بجاتی رہی۔

"اے ثناء ذرا مجھے پانی تو پلاؤ" ڈھولک ذرا دیر کے لیے رکی تو رابعہ کی چچی نے اپنی بیٹی کو پکارا۔

"زیبی پلیز؟" ثناء ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ارے وہ بھی تو مہمان ہے اس گھر میں۔ اسے بھی دو گھڑی بیٹھے رہنے دیا کرو۔" انہوں نے زیبی کو اٹھتے دیکھ کر فوراً" بیٹی کو ٹوک دیا۔

"مہمان کہاں امی! زیبی تو گھر والی ہی لگتی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں بمشکل دس روز ہوئے ہیں اسے یہاں آئے ہوئے اور ہر زبان پر اسی کا نام ہے۔" ثناء کے کہنے پر زیبی نے چونک کر اسے دیکھا وہ بڑی گہری نگاہوں سے زیبی کو دیکھ رہی تھی۔ زیبی اس کے تاثرات کو کچھ سمجھ نہ پائی تھی۔

"ارے لڑکیو۔ جلدی اٹھو یہاں سے۔" صفیہ بھابھی بوکھلائی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔

"سارا آسمان گرد آلود ہو رہا ہے۔ بس آندھی شروع ہونے والی ہے، آندھی کیا طوفان آئے گا۔" وہ مسلسل بولتی ہوئی نیچے آ گئیں۔

"میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی گھٹن سی ہے ماحول میں، کچھ نہ کچھ آئے گا ضرور" پھپھو نے اپنا اندازہ ظاہر کیا۔

آندھی کا لفظ سنتے ہی زیبی ایک دم ہی گھبرا گئی تھی۔ گھر میں آسمان ذرا رنگ بدلتا تو اماں ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھیں۔ فلاں چیز اٹھا لو، فلاں چیز ڈھانپ دو، دروازے کھڑکیاں بند کر دو۔ اماں ہدایت دیتی رہتیں اور وہ کبھی ادھر کبھی ادھر بھاگ بھاگ کر ہلکان ہو جاتی تھی۔

اور اب یہاں تو اتنا سامان بکھرا ہوا تھا اس نے ایک نظر صحن میں دوڑائی۔

"آپ سب لوگ اٹھ کر کمروں میں چلیں تاکہ چارپائی یہاں سے اٹھا لیں۔" بھابھی کے کہنے پر سب

خواتین اٹھنا شروع ہو گئیں۔

زیبی نے فوراً "ادھر ادھر دوڑتے بچوں کو قابو میں کرنا شروع کیا۔

"طوفان آنے والا ہے ساری مٹی آنکھوں میں چلی جائے گی بھاگ جاؤ کمرے میں۔"

وہ بچوں کو ڈرا ڈرا کر کمرے میں بھیجنے لگی پھر صحن سے چارپائیاں اٹھا اٹھا کر برآمدے میں کھڑی کرنے لگی۔ رابعہ کی کزن ثمینہ اس کی مدد کروانے لگی۔ ہوا میں تیزی آنے لگی تھی' زیبی نے بھاگ کر تمام کمروں کے دروازے' کھڑکیاں بند کرنے شروع کر دیے۔

"زیبی بہن ادھر آؤ ذرا۔" بھابھی صفیہ نے عجلت میں اسے پکارا کہ کاشی ان کی گود میں رو رہا تھا۔

"کچن میں ساری چیزیں یونہی کھلی پڑی ہیں انہیں اچھی طرح ڈھانپ کر اوپر کوئی کپڑا ڈال دو کھانے میں مٹی نہ چلی جائے اور مٹھائی کے ڈبے بھی وہاں میز کے نیچے رکھے ہیں انہیں وہاں سے اٹھا کر الماری میں رکھ دو مگر تالا یاد سے لگا دینا۔ یہ لو چابی سنبھال کر مجھے واپس پکڑا دینا۔" بھابھی اسے ہدایت دے کر کمرے میں چلی گئیں اور وہ کچن میں آ گئی اور پھر تمام کام کر کے جب وہ کچن کا دروازہ بند کر رہی تھی اسی وقت بجلی چلی گئی۔

"لو یہ ایک اور مصیبت ابھی بچوں کی بھاں بھاں سے پورا گھر گونجنے لگے گا۔" اس نے جھنجلا کر سوچا۔ باہر واقعی طوفان کی ہی صورت حال تھی۔ بارش نام کو نہیں تھی بس آندھی زور پکڑتی جا رہی تھی۔ وہ اندازے سے ہی ٹٹول ٹٹول کر کمرے میں داخل ہو گئی اور دروازے کے پاس ہی کھڑی ہو گئی۔

"آگے معلوم نہیں گزرنے کی جگہ ہے بھی کہ نہیں" اس نے سوچا۔

اسی دوران گھپ اندھیرے میں بچے کے رونے کی آواز آنے لگی تھی۔ زیبی حیران ہو گئی کمرے میں موجود سب بچے ماؤں کی گھرکیوں سے ڈر کر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ یہ آواز یقیناً "باہر سے آ رہی تھی۔

"یہ کوئی بچہ رو رہا ہے اسے پکڑ لیں۔" بچے کی روتی آواز کے ساتھ کوئی مردانہ آواز ابھری تھی۔

"کہاں ہے بچہ؟" زیبی نے وہیں کھڑے کھڑے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہاں ہے دروازے کے پاس۔"

زیبی نے ہاتھ آگے بڑھا کر انداز "بچے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

"رونے کی آواز تو یہیں سے آ رہی ہے۔" اچانک اس کے ہاتھ میں بچے کا بازو آیا تو اس نے اسے شرٹ سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

"باقی سب لوگ تو یہاں ہیں تم کہاں رہ گئے تھے۔" زیبی نے بھنا کر پوچھا۔

"ارے یہ کیا کر رہی ہیں آپ" اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی اچانک ہی اس کی کلائی مردانہ ہاتھ کی گرفت میں چلی گئی تھی۔

"یہ لیجیے بچہ۔" بچے کا ہاتھ باقاعدہ اس کے ہاتھ میں دے کر کہا گیا تھا۔

وہ شرمندگی سے اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ قدموں کے جانے کی آواز ابھری تو اس میں حرکت ہوئی۔

"امی... امی۔" بچہ سسک رہا تھا۔

"بھئی یہ کس بچے کی امی ہے' افوہ میرا مطلب ہے یہ کس امی کا بچہ ہے۔" اس کا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا۔

"ارے میرا ہے۔ محسن اپنے ابا کے پاس تھا۔ آندھی سے ڈر کے رو رہا ہو گا۔"

کسی کونے سے مطلوبہ امی بولیں تو اس نے سکون کا سانس لے کر بچہ آگے پارسل کر دیا۔

"معلوم نہیں یہاں کہیں بیٹھنے کی بھی جگہ ہے کہ نہیں۔" اس نے آہستگی سے آگے بڑھ کر بیٹھنے کو جگہ تلاش کی۔

"یہ غالباً "بیڈ ہے۔" اس نے ہاتھ سے محسوس کیا اور پھر وہیں کنارے پہ ٹک جانا چاہا۔

"آ... ہائے میرا پاؤں گیا۔" کوئی نسوانی چیخ بلند ہوئی اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یا اللہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔" اس نے منہ پہ دوپٹہ رکھ کر بمشکل ہنسی ضبط کی۔

"کون ہے یہاں پر؟" اسی پاؤں والی نے کھا جانے والے لہجے میں پوچھا تھا۔ زیبی چپ چاپ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔

"کیا ہو رہا ہے، بھئی کوئی موم بتی وغیرہ ہی منگوالو۔" کسی اور خاتون نے مشورہ دیا۔

"رضوان ایمرجنسی لائٹ کا بندوبست کر رہا ہو گا۔ اتنی دیر میں کلثوم بتی منگوا لیتے ہیں۔ زیبی کہاں ہو بھئی تم؟" بھابھی نے اسے پکارا مگر وہ چپ چاپ جہاں کھڑی تھی وہیں قالین پر بیٹھ گئی۔

"ہم... کون ہے؟" کپکپاتی ہوئی سرگوشی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ چند لمحے آواز پہچاننے کی کوشش کرتی رہی اور پھر چونک گئی۔

"ثمینہ یہ تم ہو؟"

"اوہ زیبی" اس کی سرگوشی کے جواب میں ثمینہ نے چہکنا چاہا مگر اس کی "شش" پر وہ بھی دبک گئی۔

"چپ رہو دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر موم بتی لانا میرے لیے ممکن نہیں۔" زیبی نے ثمینہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"تو کیا ہم دونوں یہیں...؟" ثمینہ کی ہنسی کا فوارہ ابلنے لگا تو وہ بھی اپنا قہقہہ روکنے کی کوشش میں بے حال ہو گئی۔

صبح وہ اٹھی تو بھابھی پہلے ہی کچن میں ناشتا تیار کر رہی تھیں۔ زیادہ تر لوگ ابھی بستروں میں ہی تھے کہ رات کو بجلی آتے اور پھر کھانا کھاتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ وہ باہر نکلی تو منہ بسور کر رہ گئی۔ برآمدوں اور صحن میں جیسے کسی نے منوں مٹی لا پھینکی ہو۔ اسے سخت چڑ تھی آندھی کے ان رہ جانے والے اثرات سے سو اب بھی اس سے رہا نہ گیا تو پائپ لگا کر برآمدے دھونے شروع کر دیے۔ پانی کی موٹی دھار سے چکنا فرش ایک دم صاف ستھرا ہو گیا۔ اسے اس کام میں بے حد لطف آ رہا تھا کہ اس کے اپنے گھر میں اینٹوں کا فرش تھا جس کو دھوتے وقت خاصی مشقت کرنی پڑی تھی۔

برآمدوں کے بعد صحن کی باری آئی تھی۔ وہ بڑے مگن سے انداز میں گرد آلود دیواروں پہ پانی بہا رہی تھی جب اسے اپنے آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ رضوان تولیہ کندھے پہ رکھے حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بھئی یہ اتنی صبح صبح آپ کو کیا سوجھی؟"

"صبح؟" زیبی نے برآمدے میں لگے کلاک پر نظر دوڑائی پورے نو بج رہے تھے۔

"میرا مطلب ہے بھابھی نے کسی عورت کو کام کے لیے بلوایا تھا وہ کر لیتی یہ سب۔" رضوان نے اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر دوبارہ کہا۔

"فی الحال تو وہ عورت آئی نہیں اور نجانے کب تک آئے گی۔ میرا تو اس وقت تک بُرا حال ہو جاتا اتنی مٹی دیکھ کر۔" اس نے پانی کی پھوار اپنے پاؤں پر ڈالی اور بعد میں پانی بند کر دیا۔

رضوان جواباً کچھ نہیں بولا تھا بس ایک نظر اس کے دھلے دھلائے، صاف ستھرے پیروں پر ڈالی اور باتھ روم میں گھس گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج مہندی کی رسم ہونی تھی اور پروگرام کے مطابق آج ہی اماں ابا کو بھی آنا تھا لہٰذا وہ بڑی بے چینی سے ان کی منتظر تھی۔ دھیرے دھیرے شام ہونے لگی تھی وہ اکتا سی گئی، دور دراز کے مہمان بھی آ چکے تھے اور اس وقت وہ چائے کا کپ لیے کچن سے نکلی تھی جب اچانک دروازے پر ابا اور مون کا چہرہ نظر آیا۔ مون بھاگ کر اس سے لپٹ گیا تھا۔

"اماں کیوں نہیں آئیں؟" اس نے چائے کا کپ مہمان خاتون کو دے کر ابا سے پوچھا۔

"ہاں وہ تمہاری ممانی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، نائمہ وہاں چلی گئی تھی اس لیے تمہاری اماں کو گھر پہ رکنا پڑا۔" ابا نے اسے بتایا۔ ابا بہت کم کہیں آتے جاتے تھے اس لیے ان کی تینوں بہنیں انہیں گھیرے میں لیے گلے شکوے کرنے لگی تھیں اور وہ ثمینہ کو ابا کی آمد کا بتانے کمرے میں بھاگ گئی تھی۔

ثمینہ نے اسے دیکھتے ہی "ہیلپ می" کا نعرہ لگایا تھا

کہ وہ گملے بھرے مہندی کے تھال سجا رہی تھی۔

"ارے تم یہاں اکیلی پھنسی ہوئی ہو۔" زیبی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور خود بھی اس کی مدد کرنے لگی۔

بارات دوسرے شہر سے آئی تھی اس لیے ظاہر ہے وہ دوسرے شہر سے مہندی لگانے تو نہیں آسکتے تھے۔ البتہ سب کزنز نے مہندی سجا کر ہلا گلا کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔

"ویسے میرا خیال ہے تمہارے یہاں قیام کا مستقل پروگرام بنایا جا رہا ہے۔" باتوں کے دوران اچانک ہی ثمینہ نے کہا تو وہ ایک دم چونک گئی۔

"کیا مطلب؟" وہ بات سمجھ گئی تھی مگر دانستہ انجان بن گئی۔

"کل تائی اماں، تایا جی سے بات کر رہی تھیں کہ مجھے زیبی بے حد پسند ہے۔ رابعہ کی شادی کے بعد بھائی علوج کے کانوں میں بات ڈال دوں گی۔" ثمینہ بتا رہی تھی اور زیبی کے آس پاس پھلجھڑیاں چھوٹنے لگی تھیں۔

ارے واہ اماں! تم خوامخواہ مجھے اتنا عرصہ بدقسمت قرار دیتی رہیں۔ ساری عمر تو گھر میں بند رکھا مجھے، نہ کسی نے دیکھا بھالا، نہ پسند کیا اب دیکھنا ایک نہیں کئی پتھر آئیں گے تمہارے گھر میں۔" اس کی نظروں کے سامنے وہ خواتین گھوم گئیں جن کی آنکھوں میں بارہا اس نے اپنے لیے پسندیدگی کے آثار دیکھے تھے۔

"کیا بات ہے بہت خوش ہو رہی ہو۔" ثمینہ نے اس کے لبوں پہ ہلکا سا تبسم دیکھ کر چھیڑا۔

"قبل از وقت کسی بات پر کیا خوش ہونا؟" اس نے فوراً سنجیدگی اختیار کی۔

"میں تو اس موم بتی پہ ہنس رہی ہوں جسے میں ہر بار تھال میں لگاتی ہوں اور یہ ہر بار کسی بوڑھی عورت کی طرح جھکنے لگتی ہے۔" اس نے موم بتی ثمینہ کے سامنے لہرائی تو وہ بے اختیار ہنس دی۔

"تم کب تک یونہی مائیوں والے حلیے میں گھومتی رہو گی۔" وہ خالی برتن لیے کچن میں داخل ہی ہوئی تھی، جب ثمینہ نے برتن اس کے ہاتھ سے جھٹ کر سنک میں رکھے اور پھر بازو سے گھسیٹتی باہر لے گئی۔

"بھئی صبر تو کرو میں چل رہی ہوں تمہارے ساتھ۔"

"تمہاری وجہ سے ابھی تک میں نے کپڑے نہیں بدلے۔۔۔ اور میرا خیال ہے اگر تمہیں دیکھتی رہی تو اسی حلیے میں سونا پڑے گا مجھے۔" ثمینہ نے اسے کمرے میں دھکیلا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔

"سنو۔ کون سا پہنوں ان میں سے۔" زیبی نے دو سوٹ نکال کر ثمینہ کے سامنے لہرائے۔

"میرا خیال ہے یہ ٹھیک رہے گا" ثمینہ نے سیاہ جارجٹ کے کرتے کو منتخب کیا جس پر گولڈن دبکے کا نازک سا کام کیا ہوا تھا۔ ساتھ میں گولڈن شلوار اور بلیک ہی دوپٹہ تھا۔ کپڑے بدل کر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آئی تو وہاں ہر قسم کا میک اپ کا سامان بکھرا ہوا تھا۔

"لگتا ہے خوب تیاری کی گئی ہے۔" اس نے فاؤنڈیشن کریم اٹھالی۔

"ارے کوئی ایسی ویسی۔۔۔ تم ثناء کو دیکھو تو حیران رہ جاؤ گی۔ میرون گھاگرا پہنا ہے اس نے، فل میک اپ کے ساتھ بڑی زبردست لگ رہی ہے۔" ثمینہ نے بال برش کرتے ہوئے کہا۔ فاؤنڈیشن کریم لگانے کے بعد اس نے ہلکا سا فیس پاؤڈر لگایا اور براؤن لپ اسٹک کم لپ لائنر سے ہونٹوں کو خوب صورت شیپ دے کر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

"بس؟" ثمینہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"نہ کوئی آئی لائنر، نہ بلش آن، نہ مسکارا۔۔۔"

"بس یار اتنا ہی ٹھیک ہے" وہ بیٹھ کر ثمینہ کو میک اپ کرتے دیکھنے لگی۔

"ویسے بھی اماں نے خاص تاکید کی تھی کہ میک اپ چہرے پہ تھوپنے کی ضرورت نہیں شادی شدہ اور کنواری لڑکیوں میں فرق نظر آنا چاہیے۔"

"اوہو تو اماں کی نصیحت پر عمل کر رہی ہو۔ واہ بھئی تم تو واقعی بہت "بی بی" ہو۔" ثمینہ نے لپ گلوس

ہونٹوں پر لگا کر آخری بار آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔
تیار ہو کر وہ دونوں باہر نکلیں تو اس حصے میں خاصی خاموشی تھی گھر کے پچھلی طرف بنے بڑے سے باغ سے ڈھولک کی آواز آرہی تھی اور لڑکیوں کے گانے کی بھی۔ وہ سیدھی وہیں چلی گئیں۔ روشنی کا خوب انتظام کیا ہوا تھا۔ رابعہ پیلے سوٹ میں سر جھکائے سب لڑکیوں کے درمیان بیٹھی تھی۔

"زیبی۔۔۔ پلیز۔۔۔ میں کیمو وہیں ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں بھول آئی ہوں وہ اٹھالاؤ۔"
بھابھی اسے دیکھتے ہی بولی تھیں۔

"چلو ایک یہ مصیبت رہتی تھی ابھی۔" ثمینہ کے منہ بنانے پر اسے ہنسی آگئی۔

وہ دونوں راہداری سے مڑیں تو اچانک ہی کوئی سامنے آگیا۔

"واہ بھئی آج تو لوگ پہچانے ہی نہیں جارہے۔"
وہ حماد حسن تھا اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتا ہوا۔

زیبی نے اس بے تکلفی پر خاصی ناگواری سے اسے گھورا تھا۔

"وہ مجھے صفیہ بھابھی سے کچھ کام تھا کہاں ہوں گی وہ؟" حماد نے فوراً" سنجیدگی سے پوچھا۔

"معلوم نہیں ہم ہر وقت انہیں جیب میں تو نہیں رکھے پھرتے۔" اس کے چڑ کر جواب دینے پر ثمینہ نے اسے کہنی ماری۔

"وہ پیچھے باغ میں ہیں۔" ثمینہ نے کہا تو وہ ایک طرف ہو کر آگے گزر گیا۔

"بے وقوف لڑکی یہ اس گھر کے خاص مہمانوں میں سے ہے۔ سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے انہیں۔"

"کیوں گھر میں صوفے کرسیاں نہیں ہیں؟" اس کے سوال کو ثمینہ نے نظر انداز کر دیا تھا۔

"اتنا بڑا گھر ہے ان کا کیمو تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔"

"ہو گا ہمارے کس کام کا" اس نے دراز کھول کر کیمو نکالا۔

"بہن کوئی نہیں ان کی۔۔۔ دو بڑے بھائی ہیں، لاکھوں کا جہیز لائی ہیں ان کی بھابیاں۔" ثمینہ پوری طرح متاثر نظر آرہی تھی۔

"ہماری طرف سے اربوں کھربوں کا لے آئیں۔"

ثمینہ نے اس کی بے زاری دیکھی تو مزید معلومات دینے کا ارادہ مسترد کر دیا۔ کیمو لے کر وہ واپس آئیں تو رضوان انہی کے انتظار میں تھا۔ کیمو اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے زیبی نے نوٹ کیا کہ اسے دیکھتے ہوئے رضوان کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت سی ابھری تھی۔

☼ ☼ ☼

"دولہا بھائی۔۔۔ دودھ پی لیجیے۔"

"ہم نہیں پیتے" دولہا کے کورے جواب پر سب کزنز نے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھا تھا۔

"کیوں دولہا بھائی؟"

"ہم جانتے ہیں دودھ کا یہ گلاس ہمیں بہت مہنگا پڑے گا۔" انہوں نے طائرانہ نظر حسینوں کے جم غفیر پر ڈالی۔

"اف۔۔۔ دولہا بھائی تو بہت کنجوس ہیں" زارا کا صدمے سے برا حال ہو گیا۔

"دولہا بھائی ذرا حوصلے سے کام لیجیے۔ فی بندی ایک ہزار روپیہ دے دیجیے گا۔"

"صرف پندرہ سولہ ہزار نکلیں گے آپ کی جیب سے" ثناء نے سارا زور "صرف" پر دیا تھا۔

"پندرہ سولہ ہزار۔۔۔ اور وہ بھی صرف" دولہا کے دوستوں کی حیرت کے مارے آنکھیں پھٹ گئیں۔

"میں بے ہوش ہونے والا ہوں۔" دولہا کا چھوٹا بھائی زیادہ ہی کمزور دل واقع ہوا تھا۔

"کوئی بات نہیں ہم آپ کو آپ کے ہی موزے سونگھا کر ہوش میں لائیں گے۔"
ثنا ان کی ایکٹنگ پر چڑ گئی تھی۔

"دیکھیں جی میں واقعی دودھ نہیں پیتا" دولہا بھائی نے بیچارگی سے انہیں یقین دلانا چاہا۔

"اب ہم دودھ پلائی کی رسم میں آپ کو پیپسی تو پلا نہیں سکتے۔" ثمینہ بھنا اٹھی۔

"ارے بیٹا ذرا سا چکھ لو' رسم ہی تو پوری کرنی ہے ناں۔" کسی بزرگ خاتون نے بڑا مفید مشورہ دیا تھا۔ دولہا نے جیسے تیسے گھونٹ بھر کر گلاس واپس کیا اور جیب کی طرف ہاتھ بڑھادیا۔

"خدا کا شکر ہے؟" سب لڑکیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ہائیں؟" ان کا اطمینان بھرا سانس درمیان میں ہی دم توڑ گیا تھا۔

دولہا صاحب نے نہایت اطمینان سے جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا' رومال دوبارہ جیب میں گھسایا اور ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ لڑکوں کی دبی دبی ہنسی پر لڑکیاں روہانسی ہو گئی تھیں۔

"بھائی! مزید تنگ مت کریں ان کے اترے چہرے دیکھ کر ہمارے دل کو کچھ ہونے لگا ہے۔" دولہا کا بھائی واقعی بہت کمزور دل رکھتا تھا۔ سو اس کی سفارش پر دولہا نے ہاتھ دوبارہ جیب میں ڈالا اور اس دفعہ اس کے ہاتھ میں ہرے ہرے نوٹ دیکھ کر لڑکیاں خوشی سے جھوم گئی تھیں۔

رابعہ کی رخصتی کے بعد ہر ایک پر جیسے ایک دم ہی تھکن آن وارد ہوئی تھی۔ خواتین ایک دوسرے کے کانوں میں منہ دیے رابعہ کے سسرال والوں پر تبصرہ فرما رہی تھیں۔ لڑکیاں ایک کمرے میں اپنی تھکن اتار رہی تھیں' ساتھ ساتھ بری کے جوڑوں پر بات چیت چل رہی تھی۔

"ہائے خدا کے لیے کوئی مجھے کھانے کو کچھ لادے۔" زارا قالین پہ پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔

"میں کپڑے بدلنے جارہی ہوں واپسی پر تمہارے لیے کچھ لیتی آؤں گی۔" زہی کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں ہیں آپ کی وزیر خاص؟" وہ باغ میں موتی کو دیکھنے آئی تھی' جب کچن کی کھڑکی سے رضوان کی آواز سن کر ٹھٹک گئی۔

"کون۔۔۔ زہی۔۔۔؟" بھابھی بھی کچن میں موجود تھیں۔

"جی ہاں وہی انہیں دیکھ کر ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ ساری دنیا انہی کے کندھوں پر چل رہی ہے۔" رضوان کا لہجہ اسے مضحکہ خیز لگا تھا۔

"بھئی اس میں کوئی شک نہیں' وہ واقعی بہت ذمہ دار لڑکی ہے۔" بھابھی نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے تو پسند ہے ہی' امی بھی اسے بہو بنانے کے لیے تیار بیٹھی ہیں۔"

"واٹ؟" رضوان اس انکشاف پر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

"ایسی کیا بات نظر آگئی ہے اس میں جو آپ لوگوں نے جھٹ پٹ یہ فیصلہ کرلیا۔"

"بھئی اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک لڑکی میں ہونی چاہئیں' گھرداری میں ماہر ہے' خوش اخلاق ہے' خدمت گزار ہے' شکل و صورت کی بھی اچھی ہے اور کیا چاہیے؟" بھابھی نے حیرت سے پوچھا تھا۔ زہی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑکی کے قریب کھسک گئی تھی۔

"اس کی خدمت گزاری امی کو اور گھرداری آپ کو متاثر کرسکتی ہے بھابھی۔ میں اپنی بیوی میں جو خوبیاں دیکھنا چاہتا ہوں ان میں سے کوئی ایک خوبی بھی زہی میں موجود نہیں ہے۔" رضوان کے تلخ لہجے پر باہر کھڑی زہی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

"کیوں ایسی کون سی خوبیاں چاہتے ہیں آپ اپنی بیوی میں؟" بھابھی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"دیکھیں بھابھی! آج میں صرف ایک انجینئر ہوں لیکن صرف چند ماہ بعد میں اپنی کمپنی کی طرف سے کینیڈا جارہا ہوں اور اس کے بعد آپ جانتی ہیں میرا اسٹیٹس کتنا ہائی ہو جائے گا اس زہی جیسی لڑکیاں ہائی سوسائٹی میں موو نہیں کرسکتیں۔ یہ صرف ہانڈی چولہا یا گھر کی صفائی ستھرائی کرسکتی ہیں اور بس۔" زہی کو لگا اس کے آس پاس کی زمین ہل رہی ہے۔

"اور آپ خود سوچیں بھابھی! یہ سب کام تو چند سو

روپے کے عوض ملازم بھی کر سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا نوکری اور گھرداری میں کوئی فرق ہی نہیں؟" بھابھی کے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی تھی کہ وہ خود بھی مکمل طور پر ہاؤس وائف تھیں۔

"مجھے معلوم ہے آپ کو اچھا نہیں لگے گا مگر میں بہرحال ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ میں ایسی بیوی چاہتا ہوں جو ویل ڈریس ہو' ہرنئے فیشن سے آگاہ ہو' خود کو سنوارنا جانتی ہوں۔ کسی محفل میں میرے ساتھ جائے تو میں سر جھکا کر نہیں سر اٹھا کر اس کے ساتھ چلوں اور کل دیکھا تھا آپ نے زیبی کو لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ شادی کے فنکشن کے لیے تیار ہوئی ہے۔"

"اس کے والدین زیادہ فیشن پسند نہیں کرتے اس لیے وہ اس قدر سادہ نظر آرہی تھی۔" بھابھی نے کمزور لہجے میں اس کا دفاع کیا تھا۔

"یہ ہی تو میں سمجھا رہا ہوں آپ کو.... متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں مسلسل والدین کے دباؤ میں رہتی ہیں۔ انہیں نہ شخصی آزادی حاصل ہوتی ہے' نہ مالی اور جب انہیں یہ سب ملتا ہے تو وہ توازن برقرار نہیں رکھ سکتیں یا تو اپنے خول میں سمٹ کر رہ جاتی ہیں یا پھر ان کی عیاشیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں۔"

"بس کرو رضوان! تم متوسط گھرانے کی لڑکیوں میں اس طرح عیب نکال رہے ہو جیسے تم کوئی جدی پشتی لینڈ لارڈ ہو۔" بھابھی کے لہجہ میں غصہ چھلک رہا تھا۔

"جدی پشتی تو نہیں البتہ مستقبل کا لینڈ لارڈ ضرور ہوں۔ آپ امی سے کہہ دیں زیبی کو چھوڑیں ثناء کے بارے میں سوچیں۔ اس میں نہ صرف میرے مطلوبہ اوصاف ہیں بلکہ مالی لحاظ سے بھی مضبوط بیک گراؤنڈ رکھتی ہے۔" رضوان بول رہا تھا مگر زیبی کے صبر کی حد یہیں تک تھی۔ وہ سرپٹ بھاگتی ہوئی کمرے میں آکر بند ہوگئی تھی۔

"اتنی ذلت" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"کیا سمجھتی تھی میں پھپھو اور بھابھی کی خدمتیں کر کر کے انہیں رام کرلوں گی اور رضوان ان کی مرضی پہ فوراً" سر جھکا دے گا۔... نہیں یہ کوئی ناپسند کھانا نہیں تھا کہ جسے بھابھی کے کہنے پر وہ فوراً" کھالیتا' نہ ہی یہ پھپھو کا بے وقت بازار جانے کا آرڈر تھا کہ وہ اپنے موڈ کی پروا کیے بغیر بازار چل دیتا۔ یہ اس کی پوری زندگی کا معاملہ تھا اسے پورا حق تھا فیصلہ کرنے کا مگر اس نے یہ سب کیوں کہا؟" وہ تکیے میں منہ دیے پھوٹ پھوٹ کر رودی تھی۔

"میرے ماں باپ کی جائز پابندیوں کو میرا عیب بنادیا" ہاں میں ثناء کی طرح ڈیکوریشن پیس بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ میں صرف ہانڈی چولہا کرسکتی ہوں صرف جھاڑو پوچھا کر سکتی ہوں... کہ میری تربیت میں بس یہ ہی کچھ شامل ہے۔

پاگل تھی میں... یہ بھول گئی تھی کہ یہ دولت اور حسن پہ مرنے والی دنیا ہے۔ میری جیسی متوسط گھرانے کی لڑکیاں کلرک اور اسکول ماسٹروں کے گھر جا سکتی ہیں اور بس۔" اس کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

"یہ سب میرے اپنے اعمال کی سزا ہے۔ میں نے سب کے ساتھ کھیل کھیلا تھا' نتائج کی پروا کیے بغیر' میں نے بچوں کے بہتے آنسو صاف کیے کیونکہ اس میں میری اپنی غرض شامل تھی۔ میں نے بزرگوں کی خدمت کی تو اپنے مفاد کی خاطر' جب نیت ہی کھوٹی تھی تو یہ ہی حاصل ہونا تھا۔ کیا ہوتا اگر خود کو سپر ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتی؟ اماں کچھ راتیں اور جاگ کر گزار لیتیں۔ سکینہ خالہ "بیچاری" کہہ کر میری خراب قسمت پر اظہار افسوس کرلیتیں' کیا ہوتا اگر میری ہم عمر تمام لڑکیاں بیاہی جاتیں' کم از کم آج خود سے شرم تو نہ آرہی ہوتی' خدا کی ناراضگی تو نہ سہنی پڑتی۔" اس نے دوپٹے سے آنکھیں اور چہرہ خشک کیا۔

اس روز جب چھوٹی پھپھو نے سر دبانے کو کہا تھا تو میں ہنستے مسکراتے ان کا سر دبانے لگی تھی پر دل میں تو ایک ہی خواہش ابھر رہی تھی کہ گلا نہ دبا دوں۔

اور جب صفیہ بھابھی کے بیٹے نے میرے سامنے سے سالن کی پلیٹ اپنی طرف کھسکا لی تھی' جبکہ مجھے بے تحاشا بھوک بھی لگی تھی تو میں نے مسکرا کر کہا تھا "چلو تم کھالو۔" جبکہ دل میں تاؤ کھا کر چیخی تھی۔

"موٹا' پیٹو' اللہ کرے ہضم نہ ہو۔"

ہائے اب کیا ایک ایک سے جا کر معافی مانگوں اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ بے چین ہو گئی تھی۔

لیکن سب لوگ کیا سوچیں گے اور میں کیا کہہ کر معافی مانگوں گی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چکر کاٹنے لگی۔

"اللہ میاں جی! بس ایک بار معاف کر دیں آئندہ کبھی ایسا دوغلا پن نہیں کروں گی' بھلے ساری عمر کنواری بیٹھی رہوں۔" وہ فوراً" سجدے میں گر گئی تھی۔

رضوان کی باتیں اس کے ذہن سے ایک دم ہی غائب ہو گئی تھیں' بس یہ احساس دل میں جاگزیں تھا کہ وہ گناہ گار ہے' کتنا کتنی ہی دیر وہ سجدے میں گری آنسو بہا کر اپنے گناہ کی معافی مانگتی رہی اور اس وقت چونکی جب مون دھڑ دھڑ دروازہ بجا رہا تھا۔

"کیا ہے؟" اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

"آپی لائٹ تو جلائیں" مون کے کہنے پر اسے اندازہ ہوا رات ہو چکی تھی اور کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اس نے آگے بڑھ کر لائٹ جلادی۔

"ابا کہہ رہے ہیں اپنا سامان پیک کرلیں ہم لوگ صبح روانہ ہو جائیں گے۔" مون اسے پیغام دے کر بھاگ گیا تھا۔ اس نے باتھ روم میں جا کر چہرے کو خوب دھویا کہ رونے کے سب آثار مٹ جائیں اور پھر تولیے سے چہرہ خشک کر کے باہر نکل آئی۔ راہداری سے مڑتے ہوئے وہ کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ اس نے ایک طرف ہو کر گزرنا چاہا' سامنے والا کھسک کر سامنے آگیا تھا۔ وہ دوسری طرف بڑھی مگر وہ دیوار بنا جوں کا توں پھر سامنے کھڑا تھا۔

"کون بدتمیز ہے یہ۔" اس نے راہداری کے آخری سرے پہ لگے بلب کی روشنی میں سامنے والے کو پہچاننا چاہا۔ وہ حملو حسن تھا۔ صفیہ بھابھی کے تایا کی سالی کا نجانے کیا کیا۔؟

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم صفیہ بھابھی کہاں ہیں۔" وہ گردن موڑ کر باغ کی طرف دیکھنے لگی۔

"جی... میں نے کچھ اور پوچھنا تھا۔"

"پھر کبھی پوچھ لیجیے گا' مجھے ذرا کام ہے۔" اس نے مصروف سے انداز میں کہہ کر آگے بڑھنا چاہا مگر راستہ ابھی بھی بلاک تھا۔

"پلیز' بہت ضروری بات ہے۔" وہ ستون پر ہاتھ ٹکا کر مزید پھیل گیا تھا۔

"جی... پوچھیے۔" اس نے جان چھڑانی تھی سو فوراً" کہہ دیا۔

"ول یو میری می؟"

(مجھ سے شادی کرو گی؟) اس کا سوال ٹھک سے اس کے کانوں سے ٹکرایا تھا۔

"جی...؟" زیبی نے اسے نیم تاریکی میں گھورنا چاہا۔

"کیا ہوا انگلش سمجھ میں نہیں آتی۔"

"نہیں۔" اس کے مسکراتے لہجے پر وہ جل گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں نکاح اردو میں پڑھوا لیں گے۔" اس نے گویا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

"دیکھیے میں واقعی آپ کے بارے میں سنجیدہ ہوں" اس کی خاموشی پر حملو نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"یہ مل اونر" اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو بڑی ایمانداری سے اس کے سامنے کھڑا اپنے جذبوں کا اظہار کر رہا تھا۔

"حملو صاحب میں ایک معمولی سے کلرک کی بیٹی ہوں اور میرا پانچ مرلے کا گھر تنگ و تاریک گلیوں میں واقع ہے۔" اس کا سر اٹھا ہوا اور لہجہ ہر قسم کی محرومی سے پاک تھا۔

"میں نے بیاہ کر آپ کے گھر نہیں جانا' آپ بیاہ کر میرے گھر آئیں گی۔" حملو کو اس کی ناقص معلومات پر افسوس ہوا۔

"میں لاکھوں کا جہیز لے کر نہیں آؤں گی۔"
"تو گویا آپ ہمارے ہاں آنے پر رضامند ہو رہی ہیں۔" حماد اس کے جملے کو ہنسی میں اڑا گیا تھا۔
"میں گھر کے سب کام اپنے ہاتھوں سے کرتی ہوں۔"

"جی ہاں میری بھی یہ ہی مجبوری ہے کوئی دوسرا اپنے ہاتھ دینے پہ راضی ہی نہیں ہوتا۔" وہ کسی طور سنجیدہ نہیں ہو رہا تھا۔ زیبی کی آنکھیں بھر آئیں۔
"میں اپر کلاس لڑکیوں کی طرح الٹا سیدھا فیشن کر کے محفلوں میں نہیں جاسکتی۔" حماد نے دیکھا آنسو ایک لکیر کی صورت اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔
"ماہ زیب آپ صرف میرے دل میں رہیں گی یا میرے گھر میں، ہماری سوسائٹی میں ہر لڑکی شمع محفل بن سکتی ہے مگر مجھے ایک گھر والی کی ضرورت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کھانا پکائے اور اپنے ہاتھوں سے کھلائے، جب میں باہر کی دوغلی دنیا سے نکل کر گھر میں قدم رکھوں تو اس کی بے ریا مسکراہٹ میری ساری تھکن سمیٹ لے۔ جو خود کو سنوارے تو میرے لیے۔" وہ کہتا رہا اور زیبی رخ موڑ کر ستون کے پاس آکھڑی ہوئی۔
"کیا میری توبہ اتنی جلدی قبول ہو گئی" اس نے تاروں بھرے سیاہ آسمان کو دیکھا۔
آنسوؤں سے طاقت ور چیز اور کوئی نہیں کوئی بھی موقع ہو سارے بند توڑ دیتے ہیں۔ اس کا چہرہ بھی آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ کیوں۔۔۔؟ یہ تو وہ بھی نہیں جانتی تھی۔ شاید خدا کے حضور توبہ قبول ہو جانے کی خوشی تھی۔
یا پھر یہ خوش کن احساس اسے رلا گیا تھا کہ اس دنیا میں کوئی ہے جو اپنے جذبوں کی سچائی کے ساتھ اس کا طلب گار ہے۔
"آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی۔" وہ عین اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ زیبی نے فوراً" آنسو پونچھ ڈالے۔
"کچھ تو بولیے یا پھر میں یہ سمجھ لوں کہ خاموشی اقرار کا دوسرا نام ہوتی ہے۔" اب کے زیبی دانستہ طور پر خاموش رہی تھی۔ البتہ اس کے لبوں کی دھیمی مسکان نے حماد کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ اس نے اطمینان بھرا سانس لے کر آسمان پہ ادھورے چاند کو دیکھا۔
"یہ چاند ادھورا ہے۔" اس کے کہنے پر زیبی نے سر اٹھا کر ادھورے چاند پہ نظریں گاڑ دیں۔
"پورا چاند انشاء اللہ ہم اپنے گھر میں دیکھیں گے۔" حماد کے لہجے میں یقین تھا۔
"چاند ادھورا کب ہے۔ یہ تو پورا ہو گیا ہے ابھی اسی لمحے" اس نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑے اس شخص کو دیکھا جو اس کے خوابوں کا امین تھا۔

تمہیں مل کر بہت جی بولتا ہے
جُدائی اس سے اگلا مرحلہ ہے

وہ چڑیاں، چہچہے، چہکار چپ ہیں
مگر آنگن ابھی تک بولتا ہے

رُتوں کے رنگ کیوں مرجھا گئے ہیں
پرندہ کون سا اُڑ کر گیا ہے

جہاں پل بھر سفر میں تم رُکے تھے
وہاں اک پھول تنہا اب کھڑا ہے

ہوا تھی موجِ خوشبو تھی کہ تم تھے
مجھے یہ وہم سا کیا ہو گیا ہے

مسافر کس پڑاؤ پر رُکیں گے
میرِ کارواں سویا ہوا ہے

غلام جیلانی اصغر

کام کچھ بھی نہیں ہے کرنے کو
زخم اک چاہیے ہے بھرنے کو

اک سمندر سے لڑنا پڑتا ہے
ایک دریا کے پار اُترنے کو

خود فریبی ہے آئینے کا ہنر
آگہی چاہیے سنورنے کو

ہر طرف ہے غبارِ تنہائی
راستہ تک نہیں گزرنے کو

ایک میں تھا سو ریزہ ریزہ ہوا
اور کیا وہ گیا بکھرنے کو

ٹھوکروں نے بچا لیا ورنہ
مجھ پہ دُنیا تھی پاؤں دھرنے کو

موت کو بھی ہے زندگی درکار
زندگی چاہیے تھی مرنے کو

سلیم کوثر

دیپک راگ ہے چاہت اپنی، کاہے سنائیں تمہیں
ہم تو سلگتے ہی رہتے ہیں، کاہے سلگائیں تمہیں

جن باتوں نے پیار تمہارا نفرت میں بدلا
ڈر لگتا ہے، وہ باتیں بھی بھول نہ جائیں تمہیں

رنگ برنگے گیت تمہارے ہجر میں ہاتھ کٹے
پھر بھی یہ کیسے چاہیں کہ ساری عمر نہ پائیں تمہیں

اڑتے پنچھی، ڈھلتے سائے، جاتے پل اور ہم
بیرن شام کا دامن تھام کے روز بلائیں تمہیں

دور گگن پہ رہنے والے نرمل کومل چاند
بے کل من کہتا ہے، آؤ ہاتھ لگائیں تمہیں

ترکِ محبت، ترکِ تمنا کر چکنے کے بعد
ہم پہ یہ مشکل آن پڑی ہے کیسے بلائیں تمہیں

انہونی کی چنتا، ہونی کا انیائے نظر
دونوں بیری ہیں جیون کے، ہم سمجھائیں تمہیں

ظہور نظر

عید

عید بھی آئے گی اور آ کے گزر جائے گی
مندمل زخم مگر پھر سے لگیں گے رِسنے
یاد بے ساختہ آئے گا کوئی جانِ حیات
اک اداسی مرے ماحول پہ چھا جائے گی
دل بھی ایامِ گزشتہ کی نئی یاد لیے
یاد کر کے اسے روئے گا بہت دیر تلک

فیضان عارف

قدردان

ایک صاحب فلم دیکھنے پہنچے تو ان کا بلا بھی ساتھ تھا۔ فلم کے دوران بلے کی حرکتوں سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے فلم دیکھنے میں بہت لطف آرہا ہو۔ مزاحیہ سین پر اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ ولن کو دیکھتے ہی غرانے لگتا اور ہیروئن کو دیکھ کر دم ہلاتا۔

قریب بیٹھے ایک صاحب نے کہا۔ "لگتا ہے آپ کے بلے کو فلم بہت، بہت پسند آئی ہے۔ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے۔"

وہ صاحب بولے۔ "حیرت تو مجھے ہو رہی ہے۔۔۔ کیونکہ فلم جس ناول پر بنی ہے وہ تو اسے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔"

یسریٰ ندیم۔۔۔ میرپور خاص

عزت

گاؤں سے عامر اپنے رشتے دار شاہد کے گھر بڑے شہر آئے ہوئے تھے۔ رات کو گپ شپ کے دوران نوکروں کا ذکر چلا تو گاؤں سے آئے ہوئے عامر بولے۔

"بھئی۔۔۔ گاؤں میں اول تو عام طور سے لوگوں میں نوکر رکھنے کا رواج نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی گھر میں نوکر یا نوکرانی رکھ بھی لی جائے تو اس کے ساتھ گھر کے فرد جیسا سلوک کرنا پڑتا ہے۔"

"اچھا۔۔۔؟" بڑے شہر میں رہنے والے شاہد صاحب قدرے حیرت سے بولے۔ "بھئی۔۔۔ یہاں نوکر رکھو تو اس کی بڑی عزت کرنی پڑتی ہے۔"

ہری مرچیں

لڑکا۔۔۔ "کیا تم پاکیزہ محبت پر یقین رکھتی ہو؟"

لڑکی۔۔۔ "ہاں! شروعات اسی طرح کرنی پڑتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"ہیلو شبانہ! کیا میں آج تمہارے گھر آجاؤں؟"

"ہاں رضوان آجاؤ۔"

"لیکن میں رضوان تو نہیں بول رہا ہوں۔"

"میں بھی شبانہ بات نہیں کر رہی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

میاں بیوی مارکیٹ جا رہے تھے تو ایک فقیر نے کہا۔ "شہزادی دس روپے دے دو میں اندھا ہوں۔" شوہر نے کہا۔ "بیگم پیسے ضرور دے دو، تمہیں شہزادی کہہ رہا ہے تو یقیناً اندھا ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

پولیس والے نے موٹر سائیکل پر سوار چار نوجوانوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ موٹر سائیکل چلانے والے نے بڑی عاجزی اور اپنائیت سے کہا۔ "ہم پہلے ہی بڑی مشکل سے بیٹھے ہیں، ورنہ آپ کو ضرور بٹھا لیتے۔"

☼ ☼ ☼

ایک عورت سے کہیے۔ "تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" وہ آپ کے بقیہ جھوٹ بھی ہنسی خوشی قبول کرلے گی۔

نذرانہ شاہین۔۔۔ ملتان

جواب

ہری چند اختر جوش صاحب سے ملنے گئے۔ جاتے ہی پوچھا۔ "جناب آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

جوش صاحب نے فرمایا۔ "آپ تو غلط اردو بولتے

ہیں' یہ آپ نے کیسے کہا کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں۔ جبکہ میرا تو ایک مزاج ہے۔ نا کہ بہت سے مزاج۔"
کچھ دن بعد اختر کی پھر جوش سے ملاقات ہوئی۔
جوش نے فرمایا۔ "ابھی ابھی جگن ناتھ آزاد صاحب کے والد تشریف لائے تھے۔"
اس پر اختر صاحب نے فرمایا۔ "کتنے؟"

شازیہ پروین۔۔۔ کورنگی' کراچی

اعتراف

ٹیکساس جرائم کے لیے کافی مشہور ہے۔ وہاں کا بچہ بھی کسی نہ کسی جرم یا بری عادت میں ملوث ملے گا۔
ایک ماں نے اپنے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
"بیٹے! اب تم پندرہ سال کے ہو چکے ہو' جب تم سگریٹ نوشی شروع کرو تو مجھے ضرور بتانا' وعدہ کرو۔۔۔"
بچے نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں ممی! مگر پہلے ایک اعتراف کرلوں۔"
"وہ کیا بیٹے؟" ماں نے حیرت سے پوچھا۔
"یہی کہ ایک سال ہوا' میں سگریٹ نوشی ترک کر چکا ہوں۔" بیٹے نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

رعنا عبداللہ۔۔۔ ملتان

انعام یافتہ شخص

موٹر وے پر پولیس نے کار چلاتے ایک شخص کو روک کر کہا۔
"آپ بیلٹ باندھ کر کار چلا رہے ہیں۔ اس لیے آپ کو ایک ہزار روپے انعام میں دیے جاتے ہیں۔ آپ اس انعام کا کیا کریں گے؟"
اس شخص نے خوشی سے جواب دیا۔ "میں اس انعام سے اپنا ڈرائیونگ لائسنس بنواؤں گا۔" ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی اس کی ماں بولی۔
"اس کی بات کا یقین نہ کرنا' یہ شراب پی کر فضول بولنے لگتا ہے۔" اس کا باپ نیند سے جاگا اور پولیس والے کو دیکھ کر کہنے لگا۔
"مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ چوری کی کار میں ہم زیادہ دور نہیں جا سکتے۔" اتنے میں اچانک ڈگی سے آواز آئی۔ "بھائی ہم نے بارڈر پار کرلیا ہے کیا؟"

زہرہ جبین

بے نیازی

ایک صاحب مجسٹریٹ کے پاس کچھ کاغذات تصدیق کرانے گئے۔ مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔
"سکونت کہاں ہے؟"
ان صاحب نے کہا۔ "کس کی' میری۔۔۔؟"
مجسٹریٹ نے کہا۔ "ہاں! آپ کی۔"
صاحب نے جواب دیا۔ "میری رہائش کورنگی میں ہے۔"
مجسٹریٹ نے پھر پوچھا۔ کیا کام کرتے ہو؟ ان صاحب نے پوچھا۔ "کون۔۔۔ میں۔۔۔؟"
مجسٹریٹ نے کہا۔ "ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ آپ۔"
صاحب نے جواب دیا۔ "ایک سرکاری ادارے میں ملازم ہوں۔"
مجسٹریٹ نے پوچھا۔ "عمر کیا ہے؟"
صاحب نے فوراً" کہا۔ "کس کی۔۔۔ میری۔۔۔؟"
"نہیں میری!" مجسٹریٹ نے جھلا کر کہا۔
"میرا خیال ہے کہ آپ کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔" صاحب نے اطمینان سے کہا۔

عائشہ۔۔۔ گوجرہ

سنہری موقع

ایک شوہر اپنی بیوی کو ڈرائیونگ سکھا رہے تھے۔ سامنے سے ایک تیز رفتار ٹرک کو آتا دیکھ کر بیوی گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ وحشت زدہ لہجے میں بولی۔ "اب کیا کروں؟"
"بس۔۔۔ تم یہ سمجھو کہ گاڑی میں چلا رہا ہوں۔ ایسے موقعوں پر تم مجھے جو ہدایات دیتی تھیں ان پر عمل کرو۔" شوہر نے جواب دیا۔

حمیدہ سیف الدین۔۔۔ حیدر آباد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ربیع جو معوذ بن عفرا کی بیٹی تھی، وہ کہتی تھی۔
جب میری رخصتی کی گئی تھی تو (اس سے دوسری صبح) نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ہماری چند بچیاں اس وقت دف بجا رہی تھیں۔ ہمارے بزرگوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ جو بدر کی لڑائی میں مارے گئے تھے۔ اتنے میں ایک بچی یہ مصرعہ گانے لگی۔
"ایک پیغمبر ہم میں ہیں جو جانتے ہیں کل کی بات۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے روکا اور کہا۔
"یہ مت گا۔ جو تو پہلے گا رہی تھی وہ گا۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا،

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر رنج و مصیبت کی ایک انتہا ہوتی ہے اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو وہ ضرور اپنی انتہا تک پہنچتی ہے۔ اس لیے عقل مند کو چاہیے کہ جب وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اسے دور کرنے کی کوشش نہ کرے حتیٰ کہ اس کی مصیبت ختم ہو جائے۔ ورنہ مدت کے ختم ہونے سے پہلے اسے دور کرنے کی کوششیں اپنے ساتھ مزید مصیبتیں لے آتی ہیں۔
(تاریخ خلفاء)

تدبر،

ایک روز کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ احبار نے کہا۔
"آسمان کا بادشاہ زمین کے بادشاہ پر افسوس کرتا ہے۔"
حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "مگر اس بادشاہ پر نہیں جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا۔"
اس کو سن کر کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ "واللہ تورات میں بھی الفاظ موجود ہیں۔"
یہ سن کر حضرت عمرؓ سجدہ میں گر گئے۔

ایک مختصر نصیحت،

کہتے ہیں کہ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو سالم سعدی جو اپنے عہد کے بہت بڑے زاہد اور عمر بن عبدالعزیز کے گہرے دوست تھے، ان سے ملنے آئے۔
عمر نے کہا۔ "یا سالم! میری خلافت سے تمہیں خوشی ہوئی یا غم؟"
سالم نے جواب دیا۔ "مخلوق کے لحاظ سے خوشی ہوئی اور تمہاری خاطر غم۔"
عمر بن عبدالعزیز نے کہا۔ "مجھے کچھ نصیحت کرو۔"
سالم نے پوچھا۔ "نصیحت لمبی چوڑی ہو یا مختصر؟"
عمر بن عبدالعزیز نے کہا۔ "مختصر۔"
سالم نے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو کہ آدم تمام مخلوق کا باپ تھا مگر اسے ایک غلطی پر بہشت سے نکال دیا گیا۔"
عمر بن عبدالعزیز نے کہا۔ "کافی ہے۔ بہت مختصر نصیحت کی۔"
اور انہوں نے اپنی خلافت کے زمانے میں تمام غلطیوں سے پرہیز کیا۔

دعا،

شہزاد بن اوس کعب روایت کرتے ہیں۔
بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ گزرا ہے۔ حضرت عمرؓ کے خصائل اس سے بہت ملتے جلتے تھے۔ جب ہم اس بادشاہ کا ذکر کرتے تھے تو ہمیں حضرت عمرؓ یاد آ جاتے تھے اور جب حضرت عمرؓ کا ذکر ہوتا تو وہ یاد آ جاتا تھا۔
اس بادشاہ کے زمانے میں ایک نبی علیہ السلام تھے۔ ان نبی علیہ السلام کو ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے بتایا کہ اس بادشاہ کو بتا دو کہ تیری عمر

کے تین دن باقی ہیں اگر کچھ وصیت کرنا ہو تو کر دے۔"

جب اس بادشاہ نے یہ سنا تو سجدے میں گر کر دُعا کی: "اے اللہ! مجھے اتنی مہلت دے دے کہ میرا لڑکا جوان ہو جائے۔ تو خوب جانتا ہے کہ میں نے تیرے حکم کی کہاں تک تعمیل کی ہے اور اپنی رعایا سے حتی الامکان کتنا عدل کیا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ دُعا قبول کی اور ان نبیؑ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے بتایا۔ اس بادشاہ نے ایسی دُعا کی ہے اور اس نے دُعا میں جو کچھ واسطہ دے کر کہا ہے، سچ کہا ہے۔ ہم اس کی عمر میں پندرہ سال کا اضافہ کرتے ہیں۔ تاکہ اس مدت میں اس کا بیٹا جوان ہو جائے۔

جس وقت حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور آپ زخمی ہو گئے تو کعب احبار نے یہ قصہ بیان کر کے کہا۔

"اگر حضرت عمرؓ بھی اللہ تعالیٰ سے یہی سوال کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں ابھی اور باقی رکھیں گے۔" جس وقت اس کی خبر عمرؓ کو ہوئی تو آپ نے دُعا کی۔

"اے اللہ مجھے بغیر عاجز کیے اور بغیر رنج دیے اٹھا لے۔"

سوچ کا دروا ہوا،

- مقصد سے انسان کو وہ نظر حاصل ہوتی ہے جو تاریکی میں بھی مثبت پہلو ڈھونڈ لیتی ہے۔
- جس طرح درختوں کی دُنیا سے کانٹے دار جھاڑیاں ختم نہیں کی جا سکتیں اسی طرح سماجی دُنیا سے بھی کانٹے دار انسان ختم نہیں کیے جا سکتے۔
- سب سے بڑی قربانی یہ ہے کہ آدمی کے سینے میں غصے کی آگ بھڑکے۔ مگر وہ سینے کے اندر ہی اُسے بجھا دے۔
- ناکام وہ ہے جو اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال میں ناکام رہا ہو اور کامیاب وہ ہے جو اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال میں کامیاب رہا ہو۔
- اس دُنیا میں بڑی کامیابی وہ حاصل کرتے ہیں جو ہر ایک سے سیکھتے ہیں خواہ وہ دشمن ہو یا دوست

قرۃ العین بدر۔ جھنڈو

بہترین جملے،

- جو چیز اللہ نہ دے، اسے انسانوں سے نہیں مانگنا چاہیے ورنہ انسان بڑا خوار ہوتا ہے۔
- اللہ کے ساتھ وابستہ ہونا زندگی ہے اور اس سے غافل ہونا موت ہے۔
- کچھ لوگ گلابوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا نام لیتے ہی ہمارے اردگرد خوشبو پھیل جاتی ہے۔
- رشتے جب اذیت کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے کنارہ کشی بہتر ہے۔ خواہ وقتی ہی سہی۔
- کسی کے خلق کا اندازہ نہ کرو جب تک کہ اسے غصے میں نہ دیکھ لو۔

فرحانہ۔ سرگودھا

اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور اس کا نتیجہ،

عبدالرحمٰن اشعث کی جماعت کے بہت سے قیدیوں کو حجاج کے سامنے لایا گیا اور وہ ان کو سزا کے احکام دینے لگا۔

قیدیوں میں ایک بہت عقل مند، عالم، فصیح اور سمجھ دار شخص بھی تھا۔ حجاج کے وزیر یزید بن مسلم نے اس کی سفارش کی کہ یہ میرا دوست ہے اور بہت بزرگ شخص ہے۔ لیکن حجاج نے ایک نہ سنی اور اسے بھی قتل کی سزا دے دی۔

جب اسے قتل کے لیے لے جانے لگے تو اس نے مڑ کر دیکھا اور ہنس دیا۔ حجاج نے حکم دیا کہ اسے واپس لاؤ۔ قریب آیا تو پوچھا۔

"یہ ہنسی کا کون سا موقع تھا، تم ہنسے کیوں؟"

اس نے جواب دیا۔ "آپ کے وزیر کی نادانی پر کہ آپ سے اس چیز کی درخواست کر رہا ہے جو آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ دوسرے آپ کے انکار پر کہ آپ اس چیز سے انکار کر رہے تھے۔ جو آپ کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے۔ کیوں کہ میری اور میرے ساتھیوں کی زندگی اور موت خدائے عزوجل کے قبضے میں ہے۔"

یہ سن کر حجاج نے کہا۔ "بہت خوب کہا۔ میں تمہارے حسن اعتقاد کی وجہ سے تمہاری جان بخشی کرتا ہوں۔"

عائشہ۔ گوجرہ

گوہرِ آبدار

- بہت سارے سوالات سے نکل کر انسان جب ایک سوال میں داخل ہوتا ہے تو اس کا سفر واضح ہو جاتا ہے۔
- ایک اچھے عمل کی یاد کو ایک برا الفاظ ہمیشہ کے لیے تباہ کر سکتا ہے۔
- رشتے ناتے بھی کچے دھاگے کی طرح ہوتے ہیں۔ ٹوٹ جائیں تو انہیں جوڑا جا سکتا ہے لیکن گرہ ضرور لگ جاتی ہے۔
- مخلص کی تعریف یہ ہے کہ وہ آپ کے ساتھ اپنے آپ سے زیادہ مہربان ہو۔
- خود شناسی نہ ہو تو خدا شناسی کا عمل ممکن نہیں ہوتا۔
- مصنفین اپنی کتابوں کی شکل میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے چاہنے والوں کی لائبریری میں محفوظ رہتے ہیں۔
- جب تک کوشش کی ناکامیاں سمجھ میں نہ آئیں نصیب کو سمجھا نہیں جا سکتا۔
- اگر دل میں محبت آ جائے تو زبان میں شائستگی آنا شروع ہو جاتی ہے۔
- زندگی کے جواز تلاش نہیں کیے جاتے، صرف زندہ رہا جاتا ہے، زندگی گزارتے چلے جاؤ، جواز مل جائے گا۔
- کسی چیز کو روکنے کے لیے خود رکنا پڑتا ہے۔
- موت سانس ختم ہونے کا نام نہیں بلکہ موت تو یہ ہے کہ ہمیں یاد کرنے والا کوئی نہ ہو۔
- آنکھیں بولتی نہیں صرف دیکھتی ہیں لیکن آنکھوں کے اندازِ نظر پر سب گویائی نثار ہو جاتی ہے۔
- محبت کے مسافر راستے میں نفرت کا پڑاؤ نہیں ڈالتے۔
- آواز انسان کو دوسروں سے متعارف کراتی ہے اور خاموشی انسان کو اپنے آپ سے متعارف کراتی ہے۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑپکا

اللہ تعالیٰ کی تین پسندیدہ باتیں

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں۔ تین چیزیں اللہ تعالیٰ کو بہت اور بے حد پسند ہیں۔

1. اللہ کے بندوں پر رحم کرنا۔
2. بدلہ کی قدرت کے باوجود معاف کرنا۔
3. میانہ روی اختیار کرنا۔

نوال افضل گھمن۔ لاہور

بددعا

سلجوقیوں کے عہد میں مجدالملک نیشاپور کا وزیر تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک عالی شان محل بنانا چاہا۔ تعمیر کی جگہ ایک غریب بڑھیا کا گھر تھا۔ مجدالملک نے اسے گرا دیا اور اپنا محل تعمیر کر لیا۔ بڑھیا گھر سے بے گھر ہو کر صدمے کے مارے پاگل ہو گئی۔ قبرستان میں گھومتی اور بددعا کرتی۔

"الٰہی! مجدالملک نے میرا گھر اجاڑا ہے تو اس کا گھر اجاڑ۔ اسے بھی محل میں رہنا بسنا نصیب نہ ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے بڑھیا کی دعا سن لی۔ مجدالملک کو اس محل میں رہنا نصیب نہ ہوا اور وہ مر گیا۔

ایک مدت بعد بڑھیا نے اس محل کا حصہ خرید لیا اور اس میں رہنے لگی۔

ایک آدمی نے اس سے پوچھا۔ "جب تجھے اپنے گھر کی قیمت نہیں ملی تھی تو تو نے یہ حصہ کیوں کر خرید لیا؟"

بڑھیا نے بتایا۔ "ایک دن میں جنگل میں پھر رہی تھی اور مجدالملک کو بددعا دے رہی تھی کہ ایک شخص میرے پاس آیا اور اشرفیوں کی ایک تھیلی دے کر بولا۔

"یہ تھیلی سلطان ابراہیم نے غزنین سے بھیجی ہے تاکہ تو اس رقم سے اپنا گھر خرید سکے۔ اور آئندہ مسلمانوں کے حق میں بددعا نہ کر سکے۔ میں نے اس سے تھیلی لے لی اور گھر خرید لیا۔"

ثنا عبدالقیوم۔ بنکہ چیمہ

سیدہ نسبت زہرا ___ کہروڑ پکا

صبح کی ہوا تجھ سے ملے تو کہہ دینا
شام کی منڈیروں پر دیے ہم جلائیں گے
ہم تیری محبت کے جگنوؤں کی آمد پر
تتلیوں کے رنگ سے راستے سجائیں گے

گیلانی سسٹرز ___ کہروڑ پکا

عید کا چاند نظر آئے گا جس دم مجھ کو
میں تیرے وصل کی اے دوست دعا مانگوں گا
میں جو برسوں سے ہوں تنہائی کے صحرا میں مقیم
اب تیرے عہد رفاقت کی گھٹا مانگوں گا

گڑیا شاہ ___ کہروڑ پکا

یہ اک آنسو جو ٹھہرا ہے تیری ویران آنکھوں میں
کسی کا نام لکھا ہے تیری ویران آنکھوں میں
خلا کی وسعتیں بھی پوچھتی رہتی ہیں یہ مجھ سے
نہ جانے کس کا چہرہ ہے، تیری ویران آنکھوں میں

اقصیٰ ناصر ___ کراچی

وہ جن کے کاسۂ دل میں درد مسلسل ہے
بتاؤ تو سہی وہ عید کا مفہوم کیا جانیں

نمرہ، اقرا ___ کراچی

آؤ مل کر مانگیں دعائیں ہم عید کے دن
باقی نہ رہے کوئی بھی غم عید کے دن
ہر آنگن میں خوشیوں بھرا سورج اترے
اور چمکتا رہے ہر آنگن عید کے دن

حورین زینب ___ کہروڑ پکا

کچھ مسرت مزید ہو جائے
اس بہانے سے عید ہو جائے
عید ملنے جو آپ آ جائیں
میری بھی عید، عید ہو جائے

ارم کمال ___ فیصل آباد

ہر ایک نے کہا کیوں تجھے آرام نہ آیا
ہنستے رہے لب پہ تیرا نام نہ آیا
مت پوچھ کہ ہم ضبط کی کس راہ سے گزرے
یہ دیکھ کہ تجھ پہ کوئی الزام نہ آیا

طاہرہ ملک ___ جلال پور پیر والا

یقیں مانو کوئی مجبوریاں نہیں ہوتیں
لوگ بس عادتاً وفا نہیں کرتے

حمیرا نوشین ___ منڈی بہاؤالدین

اس سے پہلے کہ ثابت ہو جرم خاموشی
ہم اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتے ہیں
کسی کو کیسے بتلائیں بھلا، کہ ہم خود بھی
تیرے بچھڑنے کے اسباب کم ہی جانتے ہیں

سدرہ بتول ___ ملتان

بساط دل پہ عجب ہے شکست ذات کا لطف
جہاں پہ جیت اٹل ہو، وہ بازی ہار کے دیکھو

کوثر خالد ___ جڑانوالہ

ضبط غم آساں نہیں عالی
آگ ہوتے ہیں وہ آنسو جو پیے جاتے ہیں

مہوش ڈوگر ___ گوجرانوالہ

ملا تو اور بھی تقسیم کر گیا مجھ کو
سمیٹنا تھیں جسے میری کرچیاں محسن

ثمرہ جاوید ___ بسم اللہ پور

ہم نے خیرات میں پھول نہیں پائے ہیں
خون دل صرف کیا ہے تو بہار آئی ہے

ملائکہ کوثر ___ بسم اللہ پور

دستور قیصری کے نتائج کے باوجود
ہم لطف شہریار کے دھوکے میں آگئے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی -
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو ہمارے پیارے وطن کو سلامت رکھے۔ آمین۔

پہلا خط بھکر سے بنت سحر کا ہے لکھتی ہیں

ہمیشہ خوش رہیں.... خوشیاں بانٹیں، میرے خط لکھنے کی ایک خاص وجہ ہے۔
شکریہ، آج میں مصنفات کی تعریف نہیں کروں گی.... کیونکہ ان کی تعریف بہرحال سب ہی کرتے ہیں.... میں "شکریہ" ادا کرنا چاہتی ہوں تہہ دل سے شعاع ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کا جو اسے بناتی ہے.... سنوارتی ہے۔ ادارے کا ہر فرد جو کسی بھی حوالہ سے ادارے سے وابستہ ہے.... آپ سب کا بہت شکریہ....
ضلع بھکر کے ایک پسماندہ سے گاؤں کی لڑکی ہوں.... میں گاؤں "بستی کھوکھر" میں رہتی ہوں.... گیارہویں جماعت کے نتیجہ کی منتظر ہوں.... 13 سالہ زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ مجھے تو میرے رب نے "الفاظ" جیسی امانت سے نوازا ہے.... رات کے دم توڑتے پہر میں میرے کردار میرے ذہن میں ابھرتے ہیں، جنہیں میں اوراق پر اتارتی ہوں.... مصنفہ بننا میرا شوق ہے۔ ڈاکٹر بننا میرا خواب ہے.... کچے گھر کے آنگن میں ٹہلتے ہوئے سوچتی ہوں کہ کس طرح اپنے ابو کی پریشانیاں کم کروں.... زمانہ اس دور سے کب کا گزر چکا، جب لڑکیاں کچھ نہیں کر سکتی تھیں.... آج کی عورت سب کچھ کر سکتی ہے۔
اپنی کہانیاں بھیجنے سے پہلے میں آپ سے بات کرنا چاہتی تھی مگر ہمارے ہاں فون کی اجازت نہیں.... ہم گاؤں کے باسی ہیں.... آپ سے بات کرنے کا واحد یہی حل نظر آیا۔ ابو نے لکھنے کی اجازت مشکل سے دی ہے اور وہ بھی میری ٹیچر کے کہنے پر.... میں عمیرہ احمد نہیں ہوں۔ نمرہ احمد بھی نہیں ہوں بلکہ ایک غریب کسان کی بیٹی ہوں جو مستقبل کی بنت سحر ہے۔ ہم زندگی میں کسی سے اس کی دولت چھین سکتے ہیں، عزت چھین سکتے ہیں مگر "ذہانت" نہیں چھین سکتے۔ میں اس نعمت کے لیے اپنے رب کی شکر گزار ہوں۔

کچھ سوالات، (1) اماوس کا چاند کب آیا تھا؟ کتابی شکل میں آگیا....؟
(2) پلیز... ناقابل اشاعت کا صفحہ مقرر کریں۔
(3) نئی مصنفین جن کی پہلی تحریر لگے، ضرور آگاہ کریں۔
(4) فارحہ ارشد کیوں نہیں لکھتیں؟

ج بنت سحر! شعاع کی بزم میں خوش آمدید، آپ کا خط آپ کی ذہانت اور حساسیت کا آئینہ دار ہے۔ آپ کے قلمی سفر میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کو ہمارا پورا تعاون حاصل رہے گا ان شاء اللہ۔ آپ کا ایک افسانہ اس ماہ یا آئندہ ماہ شائع ہو جائے گا۔
ناقابل اشاعت کا صفحہ ہم مقرر نہیں کر سکتے۔ اگر کسی کی ایک کہانی ناقابل اشاعت ہے تو اس کی تشہیر مناسب بات نہیں ۔وہ اپنی دوستوں اور گھر والوں کے سامنے شرمندہ ہوں گی۔
نئی مصنفہ کی پہلی تحریر شائع ہو تو اس کے بارے میں آگاہ کرنے والی تجویز اچھی ہے۔ ضرور عمل کریں گے۔

بشریٰ سعید کا ناول اماوس کا چاند کتابی شکل میں آچکا ہے آپ 200 روپے اس ایڈریس پہ منی آرڈر کردیں گھر بیٹھے مل جائے گا۔

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37۔ اردو بازار کراچی۔

فارحہ ارشد کیوں نہیں لکھتیں؟ اس کا جواب تو ہمیں بھی نہیں معلوم فارحہ! آپ ہی جواب دیں۔ آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔

یاسمین، حوریم فاطمہ، جنت اور روزینہ نعیم نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

اس بار شعاع کا ٹائٹل کافی اچھا تھا "پیارے نبی کی پیاری باتیں" ہر دفعہ کی طرح بہت اچھی تھیں۔ شکر ہے شاہین جی کہ آپ نے کسی نئے آرٹسٹ سے بھی متعارف کروایا۔

میمونہ صدف کا افسانہ بازی لے گیا۔ شکر ہے کہ ورنایاب کو بھی عقل آہی گئی قانتہ رابعہ نے بھی بہت ہی اچھا لکھا "زندگی تیرے تعاقب" میں بلیک اینجل واہ کیا بات ہے کتنا انوسینٹ تھا ناکافی مزہ آیا پڑھ کر۔ نادیہ احمد نے بھی اچھا لکھا۔ اب بات کرتے ہیں سیاہ حاشیہ کی ماہیر کی آمد بہت پسند آئی۔ مہوش جی کا "جام آرزو" تو گڈ تھا "رقص بسمل" کے چار صفحے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت تھی نبیلہ جی۔ پلیز FM.106 کے آرجے سلمان صدیقی کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

اور اور اس دفعہ از میروٹ کو ضرور شامل اشاعت کیجیے۔

ج یاسمین، حوریم، جنت اور روزینہ! آپ کی فرمائش ہم نے عفت سحر طاہر تک پہنچادی ہے اور انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد از میرٹ کے ساتھ شعاع میں شرکت کریں گی سچ پوچھیے تو یہ ہے کہ ہم بھی از میروٹ کو بہت یاد کررہے ہیں۔ اس طرح کی ہلکی پھلکی تحریریں ذہن پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہیں۔

بی اے میں اچھے نمبروں سے کامیابی پر دلی مبارک باد اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیاب کرے۔ آمین۔

پلوشہ برکی نے ٹانک سے لکھا ہے

شعاع اور خواتین کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور میرے کافی سارے ناول فیورٹ رہے لیکن "جنت کے پتے" اور "یارم" میرے موسٹ فیورٹ تھے۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ نمرہ کی ایج کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آئزہ خان اور دانش تیمور کا انٹرویو لیا جائے۔

ج آپ نے سنا نہیں کہ مرد سے اس کی تنخواہ اور عورت سے اس کی عمر نہیں پوچھنا چاہیے ہم نے نمرہ سے کبھی ان کی ایج کے متعلق سوال نہیں کیا۔ البتہ اندازہ ہے کہ وہ ابھی کافی کم عمر ہیں۔ آپ کو سالگرہ مبارک اور ہماری ڈھیروں دعائیں۔ آئندہ خط میں شمارے پر تبصرہ ضرور کیجیے گا۔

ستارہ امین کومل نے پیر محل سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

کوثر خالد، حمد بہت پیاری لکھی آپ نے، نعت رسول پاک کی تو کیا بات ہے۔ سیاہ حاشیہ مائی سوئیٹ ہارٹ صائمہ اکرم چوہدری بہت خوب لکھا، قانتہ رابعہ جیسے لکھاری ہوتے ہیں جو بس چپکے چپکے اپنے قارئین کی تربیت کرتے چلے جاتے ہیں۔ بہت پیاری قابل صد احترام عنیزہ سید کہاں مصروف ہیں؟ کنیز نبوی ادی آپ کہاں ہیں؟ دستک میں منی بیگم اور ماوراحسین مزہ آگیا ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے لوگ ہی تو بڑے لوگ کہلاتے ہیں۔ ایک انٹرویو ان کا لازمی ہونا چاہیے۔

ج پیاری ستارہ! شرکت کا شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی تعریف اور فرمائشیں پہنچا رہے ہیں۔ عنیزہ نے وعدہ تو

اعتذار

پچھلے ماہ ستمبر کے شمارے میں سلسلہ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" پر سہوا ـــــ میاء علی کا نام لگ گیا جبکہ یہ سلسلہ بہن الفہ۔ی نے لکھا تھا۔

اس سہو کے لیے ہم بہن میاء علی اور الفہ۔ی سے معذرت خواہ ہیں۔

کیا تھا کہ جلد ناول لکھیں گی پر آپ تو جانتی ہیں' محبوبوں کے وعدے کب ایفا ہوتے ہیں۔

مہناز یوسف نے کراچی سے لکھا ہے

"تجھ سے ناتا" بہت اچھا سلسلہ ہے۔ بہنوں میں اس سلسلے کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ یہ سلسلہ خدانخواستہ سسرال والوں کی "ڈھیر ساری غیبتوں" اور دل کی "بھڑاس" نکالنے کا سلسلہ ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ ہماری قارئین بہنوں میں بہت سی بہنوں کی سسرال اچھی بھی ہو گی اور وہ اپنے سسرال کے بارے میں تعریفی کلمات لکھیں گی۔

وہ خواتین جن کے ساتھ سسرال میں بہت زیادہ برا سلوک ہوا ہے' وہ خواتین اس سلسلے میں نہ ہی حصہ لیں تو بہتر ہے' کیونکہ کچھ معاملوں میں خاموشی ہی مناسب ہوتی ہے۔

اور ویسے بھی کچھ خواتین سسرال والوں کی برائیوں میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیتی ہیں' کیوں نہ شعاع کے پلیٹ فارم کو دلوں کے ملانے کا ذریعہ بنایا جائے۔

ج: مہناز! آپ نے لکھا ہے کہ ہم کراچی والوں کے خط کم شائع کرتے ہیں تو ایک دلچسپ بات آپ کو بتائیں کہ دو کروڑ کے شہر کراچی سے ہمیں بہت کم خطوط موصول ہوتے ہیں۔ جبکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں' دیہات سے ہمیں بہنیں بہت اچھے تفصیلی خط لکھتی ہیں' اسی لیے ان کے خط جگہ بھی پاتے ہیں۔ اسی طرح ناول افسانے بھی ہمیں چھوٹے شہروں سے زیادہ ملتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ بڑے شہروں میں سہولیات اور تعلیم کی شرح زیادہ ہے۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" سسرال والوں کی برائی یا غیبت کا سلسلہ نہیں ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی کے ساتھ زیادتی کر جاتے ہیں اور ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا۔ یہ سلسلہ ایسے ہی لوگوں کو احساس دلانے کے لیے شروع کیا گیا ہے کہ وہ جان سکیں ایک لڑکی رخصت ہو کر ان کے گھر آتی ہے تو کیا کیا خواب' امیدیں اور توقعات لے کر آتی ہے اور ان کے بدصورت رویے کس طرح اسے توڑتے ہیں۔ ایک لڑکی جو شادی ہو کر آتی ہے۔ کم عمر' ناتجربہ کار ہوتی ہے اس لیے سسرال والوں کو زیادہ بردباری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

مقدس اور حنا صدف لکھنوال کلاں تحصیل و ضلع گجرات سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

نعت اور حمد تو اپنے نام ہی کی وجہ سے بہت پیاری ہو جاتی ہیں۔ ناولوں میں سب سے پہلے بات کروں گی "سیاہ حاشیہ" میرا موسٹ فیورٹ۔ "رقص بسمل" بس تین صفحات۔ کہانی شروع ہوتے ہی ختم۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کافی اچھا سلسلہ ہے۔ محترمہ الف' ب میرا سیلوٹ ہے آپ کو کہ اتنے مشکل وقت کو صبر و حوصلے سے گزارا "اب اور نہیں۔" "زندگی تیرے تعاقب میں" زبردست کہانی تھی' لیکن کچھ کچھ فلمی ٹچ نظر آیا۔ افسانہ "محبت سے آگے" کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ نادیہ احمد "محبت روشنی ہے" ویل ڈن "ریت کی دیوار" زبردست تھی۔

مقدس اور حنا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

ثمینہ اکرم لیاری کراچی

"خط آپ کے" پڑھا پھر تو جیسے چاروں طرف پھول مہکنے لگے۔ اتنی زیادہ خوشی ملی کہ الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ آپ نے میری کمی کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ میری خیریت کی جانب سے تشویش کا اظہار بھی کیا۔ اکرم اور غنویٰ نے بھی آپ کا جواب پڑھا اور بہت خوش ہوئے' اکرم آپ کو عقیدت بھرا اسلام کہہ رہے ہیں وہ آپ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اللہ سائیں آپ کو ہمیشہ خوش رکھے (آمین) 2012ء سے مجھے ہیپاٹائٹس کا مرض لاحق ہے اور پچھلے دنوں میری طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ میں نے ویکسی نیشن کروائی ہیں' مگر پھر بھی میرا ٹیسٹ PRC پوزیٹو آیا ہے اب حیدر آباد بھیجا ہے مجھے ڈاکٹر بدر فیاض زبیری نے' وہاں سے اس کی HCV میڈیسن ملیں گی۔ بس اسی چکر میں کئی ماہ سے میں شعاع سے دور رہی۔ مجھے اب کمزوری بہت ہو گئی ہے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے بیماری دی ہے مگر مجھے محتاجگی اور اذیت سے بچایا ہے۔ میں ابھی بھی اپنی ڈیلی روٹین کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی ہوں غنویٰ UNI جاتی ہے۔ شام میں بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے۔ دو چھوٹے بیٹے اسود اور مومن ہیں۔ اسود 5th کلاس میں ہے اور مومن قرآن پاک حفظ کر رہا ہے۔ مدرسہ میں زیر تعلیم ہے۔ اکرم میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہے میرے مالک نے اوقات

سے بڑھ کر مجھے دیا ہے۔

تبصرہ۔ ستمبر کا ٹائیٹل بہت جاذب نظر لگا۔۔۔ منفرد سی ماڈل گرل اس بار غنویٰ کو بھی بہت پسند آئی۔ 2 ستمبر کو غنویٰ کی انیسویں سالگرہ منائی گئی اس بار کافی زیادہ اہتمام کیا تھا میں نے۔۔۔ تحائف بھی بہت زیادہ ملے۔ جی۔ حمد باری تعالیٰ (کوثر خالد) کی پڑھی۔۔۔ بہت خوب لفظ لفظ جیسے دل میں اتر گیا۔ سبحان اللہ' ماشاء اللہ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" اس دفعہ یہ احادیث میں نے اکرم اور اپنے بچوں کو بھی پڑھ کر سنائیں۔ مصنوعی بال لگانا' سیاہ خضاب' آئی برو بنوانا۔ یہ سب کام خلاف شرع ہیں۔ اس دفعہ کا شعاع افسانہ نمبر لگا۔ (7) عدد افسانے مگر جب پڑھے تو سب کے سب بہترین لگے۔ سب سے زیادہ مجھے "منصب ولایت" (قانتہ رابعہ) کا اچھا لگا۔ "تجھ سے ناتا جوڑا ہے" اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے۔ قارئین اپنی دلی رضامندی سے اس میں اپنے تجربات شیئر کر رہی ہیں۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔۔۔ "زندگی تیرے تعاقب میں" عتیقہ ایوب نے کہانی سے بہت انصاف کیا۔ کراچی کے بدترین حالات کی عکاسی کرتی ہوئی کہانی ہے "سیاہ حاشیہ" دلچسپ سے دلچسپ ترین ہوتی جا رہی ہے۔ تین مکمل ناولز' تینوں ایک سے بڑھ کر ایک لگے۔ جام آرزو "مہوش افتخار" بہت اچھا اسٹارٹ دیا۔ مصباح خادم کا ناول "ریت کی دیوار" بھی بہت خوب لگا۔ "محبت روشنی ہے" نادیہ احمد کا ناول بہترین رہا۔

ج: پیاری ثمینہ! اکتوبر کا شمارہ عید نمبر ہو گا جو بقر عید سے پہلے آ جائے گا۔ اس میں تمام گوشت کی تراکیب ہوں گی۔

شعاع پر تبصرہ معمول کی طرح بہترین ہے۔ صفحات کی مجبوری کے باعث پورا تبصرہ شائع نہیں کر سکے۔ اس کے لیے معذرت۔ آپ کی بیماری کے بارے میں جان کر دل بہت دکھی ہے' ثمینہ آپ اتنے اچھے خط لکھتی ہیں کہ آپ کی کمی ہم ہی نہیں ہماری قارئین بھی محسوس کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ آپ کے ساتھ بہت ساری دعائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نیک بندوں کی آزمائش کرتا ہے' ان شاء اللہ آپ جلد صحت یاب ہو جائیں گی' آپ کے شوہر بہت اچھے ہیں۔ ان تک ہمارا سلام پہنچا دیں۔

ثناء زہرا نے ڈھلیال سے لکھا ہے

قلم کو ہاتھوں میں لیے الجھن بھرے دماغ کے ساتھ خط تحریر کر رہی ہوں۔ پہلے تو سرورق پر فرینہ اعجاز پیرٹ گرین سوٹ میں اتنی تر و تازہ لگیں کہ بس۔ گرمی کی تھکن اتر گئی۔ حمد و نعت دونوں خوب صورت الفاظ کا مظہر تھیں۔

آمنہ مفتی کا مشاعرہ پڑھ کر دل بے اختیار ایسے کسی مشاعرے کی چاہ میں لپکا میٹھا اور ٹھنڈا طنز عامر قریشی سے ملاقات اور ان کے شب و روز کی مصروفیات جان کر اچھا لگا۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ اچھا سلسلہ مگر تکلیف دہ بھی' بہت سی میٹھی اور کڑوی یادیں اکٹھی یلغار کرتی ہیں بروقت ملا تو شرکت ضرور کروں گی "اب اور نہیں" بہت خوب صورت افسانہ' "گرامی منش" بہت اچھا افسانہ' سیکھنے کی کوئی قید نہیں۔ عتیقہ ایوب کا ناولٹ بے حد اچھوتے الفاظ کا جامہ پہنے ہوئے تھا۔ الفاظ ایسے جو دل کے بند کواڑ پر دستک دیتے تھے۔ ثمرہ شکور اور تنزیلہ زہرا نے اچھے موضوع کو چنا۔ ناول دونوں اچھے تھے۔ "آئینہ خانہ" ہمیشہ اچھا لگتا ہے شاید جو باتیں دنیا نہیں بتا سکتی' وہ آئینہ بتاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان پاکستان کی تاریخ کا سنہری باب جن کی بدقسمتی سے ہم نے قدر نہ کی۔ تاریخ کے جھونکوں سے میں جھانکتے رہنے کا دل کرتا ہے۔ تاریخ ایک دلی سکون دیتی ہے۔

ج۔ ثناء! اتنے دل سے شکریہ۔

اعتذار

پچھلے ماہ افسانہ "محبت سے آگے" شائع ہوا تھا۔ اس کی مصنفہ بہن تنزیلہ زاہرہ افضل ہیں۔ افسانہ پر سہوا "تنزیلہ زاہدہ" شائع ہو گیا تھا۔

اس سہو کے لیے بہن تنزیلہ زاہرہ افضل سے معذرت خواہ ہیں۔

کومل فاطمہ چک ڈھلو نمبر 1 ضلع گجرات سے لکھتی ہیں

میں آج پچیس سال کا قرض اتارنے کے لیے قلم اٹھا رہی ہوں' میں شعاع' کرن اور خواتین اس وقت سے پڑھ رہی ہوں' جب میں نے اردو اچھے سے پڑھنی سیکھی۔ لیکن آج میں اپنی بات کرنے نہیں آئی۔ آج تو میں اس شخص کی محبتوں کو آپ تک پہنچانے آئی ہوں جو 1990ء سے یہ محبتیں دل میں چھپائے بیٹھے ہیں۔ جی ہاں! میرے پیارے ماموں جان نام قیصر نذیر وڑائچ ہے' ٹیچر سے تعلق ہے اور ساتویں کلاس سے خود پاکٹ منی جمع کر کے تینوں ڈائجسٹ خرید اور پڑھ رہے ہیں۔ میرے ہاتھ میں پہلی دفعہ شعاع انہوں نے پکڑایا جو آج تک میرے پاس ہے۔ 1990ء سے لے کر اور اس سے پہلے کے بھی جتنے ڈائجسٹ وہ حاصل کر چکے ہیں۔ آج تک محفوظ ہیں دونوں بیٹیوں کو رائٹر بنا میں گے ایک کا نام نمرہ نذیر تو دوسری ماہا وڑائچ۔ بھئی رائٹر بہنوں کے نام پہ۔

جون کے شعاع میں سائرہ رضا کا ناول انہیں بہت پسند آیا' تبصرہ پچیس سالوں میں آپ تک نہیں پہنچا مگر وہ کرتے ضرور رہے۔ اب فوراً مجھے کال کی جاتی ہے بٹیا جی فلاں ناول تو بہت زبردست ہے فلاں میں یہ کمی ہے وغیرہ۔ آج کل خواتین میں آنے والے نمرہ اور عمیرہ آپی کے ناول بہت پسند ہیں۔ فرمائش ہے سعدی یوسف کو کچھ نہیں ہونا چاہیے اور شکوہ یہ ہے اچھی لکھنے والی وہ رائٹرز جو ٹی وی کی طرف جا چکی ہیں یا لکھنا چھوڑ چکی ہیں انہیں واپس بلایا جائے۔ مجھے شازیہ چوہدری بہت یاد آتی ہیں اور ان کا وہ ادھورا رہ جانے والا ناول پلیز وہ شائع کیجیے ناں اور ایک جو میری سب سے بڑی شکایت ہے یہ رائٹر ہر زینی کو مار کیوں دیتی ہیں۔ نہیں یاد آرہا تو ہم کروا دیتے ہیں کہ ہم جو ماہا ملک کے "میرے خواب ریزہ ریزہ" کی زینی کی موت کے غم میں تھے تو جناب عمیرہ آپی نے "من و سلویٰ" میں وہی کارنامہ سرانجام دے ڈالا اور اب اب ایک بار پھر سحر ساجد نے "غریق رحمت" کی زینب کو اور ایک مکمل ناول پہ تو ابھی مبارک باد بھی دینی تھی نمرہ آپی کا "جنت کے پتے" اور نمیرہ احمد کا یارم۔ یہ دونوں صدیوں یاد رہنے والے ہیں۔ میں نے بھی قرآن عظیم کو ترجمے سے پڑھا ہوا ہے مگر جب نمرہ آپی کے ناول پڑھنے کے بعد قرآن کھولتے ہیں ناتو وہی آیتیں بہت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں بلکہ دل میں اتر جاتی ہیں۔

ج پیاری کومل! آپ کے گاؤں سے موصول ہونے والا یہ پہلا خط ہے اور ہمیں واقعی بہت خوشی ہوئی ہے آپ کے ماموں کے بارے میں جان کر۔ ہم جانتے ہیں کہ شعاع اور خواتین مرد حضرات بھی پڑھتے ہیں اور پسند بھی کرتے ہیں۔ بہت شکریہ آپ نے ان کی پسندیدگی اور رائے ہم تک پہنچائی۔ زینی کو مارنے والی بات دلچسپ ہے' اسے محض اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں۔

ابرش علی کورنگی کراچی سے لکھتی ہیں

آپ کے تینوں ڈائجسٹ بہت زبردست ہیں اور "ایک تھی مثال" کی کیا ہی بات ہے' واقعی بہت زبردست لکھ رہی ہیں اور شاہین رشید کا بھی انٹرویو کریں۔ ان کی تصویر شائع کریں اور نازیہ کنول نازی اللہ آپ کی جوڑی ہمیشہ سلامت رکھے۔

ج ابرش! آپ جو لکھنا چاہتی ہیں ضرور لکھیں اگر قابل اشاعت ہوا تو ہم آپ سے پورا تعاون کریں گے۔ آپ کا پیغام نازیہ کنول نازی تک اور فرمائش شاہین تک پہنچا رہے ہیں۔

حیا بنگش' کوہاٹ سے شرکت کر رہی ہیں' لکھا ہے

خط لکھنے کی وجہ سیاہ حاشیہ ہے۔ بختاور عرف ڈیزی ہی صالحہ آپا ہیں اور شانزے کی ماں بھی ہے بختاور' ہاشم کے ساتھ اس کے والدین نے اس لیے تعلق ختم کیا تھا کیوں کہ اس نے دین بدل لیا تھا۔ ماہیر کی پاکستان آمد پر ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ یہ شانزے کا ہیرو ہے۔

ایک تھی مثال' اچھا ہوا مثال کی شادی واثق سے ہوئی' رقص بسمل چار صفحات پر مشتمل بالکل پسند نہیں آ رہا۔ امی کا کہنا ہے' اس میں سارے کردار روبوٹ نما لگتے ہیں۔ جبکہ ہیروئنیں انتہائی مغرور۔ آپی نبیلہ آپی سے کہنا اپنی پھپھو پر یا اللہ پڑھ کر دم کریں۔ جس مریض کے علاج سے اطبا عاجز آ گئے ہوں اس پر پڑھا جائے تو اچھا ہو جاتا ہے۔

آمنہ مفتی کا سفرنامہ بہت دلچسپ ہے۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا' میں الف' یے کے جوابات بے حد دلچسپ تھے۔ مسرت الطاف احمد کے لطائف پسند آئے۔

ج پیاری حیا! شعاع میں آپ کے پچھلے خط تاخیر سے موصول ہونے کے باعث شامل نہیں ہو سکے۔ نبیلہ عزیز ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں لیکن پریشانیوں کا شکار ہیں۔ آپ ان کے لیے دعا کریں۔ ان کی پریشانی دور ہو جائے۔ وہ بہت اچھا لکھیں گی۔ آپ کی دعا ہم ان تک پہنچا رہے ہیں۔

مہوش قدیر، جمال چھیری اڈہ ضلع لیہ سے لکھتی ہیں

جیسے ہی مہینہ شروع ہوتا ہے بڑی بہن جو ہریرہ کی کال آتی ہے۔ مہوش ڈائجسٹ نہیں منگوایا آج اتنی تاریخ ہو گئی ہے۔ سرورق تو مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ ہاں اس مرتبہ ماڈل کے کپڑوں کا رنگ پسند آیا۔ پھر پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں سے دل کو منور کیا۔ بہت اچھی احادیث منتخب کی تھیں۔

جی جناب مجھے جس چیز نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ایمل رضا کے افسانے در نایاب کا ایک پیراگراف ہے کہ جس میں در نایاب راحیل سے کہتی ہے کہ تم اوسط درجے کے آدمی ہو تم کبھی اول درجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اوسط درجے کے آدمی کی سوچ ایک خاص رفتار سے آگے نہیں جاتی۔ ہرن کتنا مرضی صحت مند ہو جائے زرافے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

مجھے اس پیراگراف نے بہت ڈسٹرب کیا۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ صرف امیر آدمی کی سوچ ہی بلند ہوتی ہے۔ سلسلے میں نہیں پڑھتی۔ پڑھا ہی نہیں جاتا۔ اب میں نے تاریخ کے جھروکے اس مرتبہ ضرور پڑھا تھا۔ اور "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" ایک بہت اچھا سلسلہ ہے اسے ضرور جاری رکھا جائے۔

ج پیاری مہوش! ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے خط لکھا، مہوش ایمل رضا کے افسانے کی جس بات پر آپ کو اعتراض ہے۔ وہ ایمل کی سوچ نہیں ہے۔ وہ اس لڑکی کی سوچ ہے جو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی ہے، غربت کے مسائل سے ناآشنا ہے جب ان مسائل سے گزرتی ہے تو اسے اپنا محبوب کمتر نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی سوچ پست اور سطحی لگتی ہے۔ ذہانت کہیں بھی ہو سکتی ہے اور قسمت کبھی بھی دستک دے سکتی ہے، خواہ تعلق مڈل کلاس سے ہو یا لوئر کلاس سے اور سوچ غریب آدمی کی بھی بلند ہو سکتی ہے۔

آپ شعاع کے سلسلے بھی پڑھا کریں۔ زندگی کے بہت سے پہلو سامنے آئیں گے۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہر گز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہو گی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37-اردو بازار کراچی

تو نبہ وجلا ای نا

آمنہ مفتی

مسالہ ڈوسا اور جانوروں کا فلسفہ حیات :۔

ہوٹل واپس آئے تو نبیل بدستور تھانے والوں کے نرغے میں "اگلے روز ہماری روانگی تھی اور اگر نبیل کا معاملہ حل نہ ہوتا تو ہمیں پھر یہیں ٹھہرنا پڑتا۔ آج "ملاپ" ہال میں شادی تھی اور "ملن" میں منگنی ہم لوگ لابی میں بیٹھے شادی میں شرکت کرنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ لپ اسٹک کے رنگوں اور کاجل کی ڈنڈی کی لمبائی تک کا فرق نہ تھا۔ سب اپنے ہاں کی شادیوں جیسا، دلہن اپنی بہنوں اور کزنز کے ساتھ اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پہ پریشان ہو رہی تھی۔

رات کے کھانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے ساؤتھ انڈین کھانوں کا رواج بڑھتا جا رہا ہے جیسے ہمارے ہاں، نمک منڈی کا چرسی تکہ فروغ پا رہا ہے۔ انڈیا میں اڈلی، سانبھر، ڈوسا، ڈھوکلا وغیرہ بہت مقبول ہو رہے ہیں۔

سب کو اڈلی کھانا تھی۔ پہلے ارادہ ہوا، جوپاٹی چلیں پھر ڈاکٹر صاحب نے "ساگر رتنا ریسٹورنٹ" جانے کا ارادہ کیا۔ کل رات بھر بڑنے والے اولوں نے ہوا میں ایک برفانی ٹھنڈک پیدا کر دی تھی، زکام بڑھتا جا رہا تھا اور چھینک پہ چھینک چلی آ رہی تھی۔

ریسٹورنٹ بہت خوب صورت تھا۔ نقرئی دھات سے بنے کرشن کنہیا، سر پہ مکٹ سنوارے، بنسی ہونٹوں سے لگائے لاپروائی سے کھڑے تھے دیوتاؤں کو عام انسانوں کی زیادہ پروا نہیں ہوتی۔

پہلے دہی بڑے منگائے گئے۔ یہ ہمارے دہی بھلوں سے مختلف تھے میٹھا دہی اور سونٹھ کے پانی میں ڈال کے نکالے گئے سادہ بڑے کوئی اور مسالہ نہ تھا۔

مینو کارڈ پہ سوائے 'اڈلی ڈوسا کے سب اجنبی چیزیں' چنانچہ سب نے ہی ڈوسا اور سانبھر کا آرڈر دیا۔ چراغ نے اڈلی منگائی اور صاحب نے اڈلی پلینٹر اڈلی کے ساتھ ویجی ٹیبل قرما تھا شاید یہ قورمے کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

بات کھانوں اور مسالوں کی نکل آئی چونکہ چند رعایات سے دلی بھی میرا وطن ہے۔ چنانچہ مسالوں کی افادیت ان کے استعمال وغیرہ پہ بات ہوئی چراغ کا کہنا تھا کہ مسلمان جو اتنا گوشت کھا کے ہضم کر لیتے ہیں ما اس کے پیچھے مسالوں کی ایک مکمل کیمسٹری ہے جب میں نے ان کو تمہاری کی ترکیب بتائی تو باقاعدہ کانپ گئے۔

ذکر ڈاکٹر ابدال بیلا کا بھی نکل آیا اور میں نے اپنی اگلی کتاب کے لیے جن جگہوں کا دورہ کرنا تھا ان کا ذکر بھی کیا۔ فرحت پروین کا جملہ کان میں پڑا۔

"دیکھیے سفر کتنی پیاری چیز ہوتا ہے 'میں آپ کا نام بھی نہیں جانتی' لیکن ہم کھانا بھی شیئر کر رہے ہیں اور کس کس موضوع پہ بات بھی کر رہے ہیں۔"

فرحت آپا کے خوب صورت جملے ان کی شخصیت کی طرح سحر طراز ہیں۔ میں نے اتنی ذہین اور اتنی عاجز طبیعت کی خواتین کم ہی دیکھی ہیں سادہ مزاج لیکن 'شاعری' افسانہ نگاری' ترجمہ' ہر فن مولا۔

"آخر یہ اتنی روحیں کہاں سے پیدا ہوتی ہیں؟" ڈاکٹر کیول نے پوچھا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب! اتنی روحیں کہاں؟ ہم سب تو ایک کل کے جزو ہیں وہی ایک روح ازل ہے اور سارا فساد تو جسم کا ہے یہ ہی بندش ہے 'قید ہے' سب مصیبتوں کی جڑ، جسم سے نکل کے روح تو پھر اسی روح ازل کا حصہ بن جاتی ہے۔ آزاد اور پھر دیکھیے صاحب! یہ تو ہم ہیں جو ابھی تک الفاظ کے چکر میں پڑے ہیں۔ الفاظ سے زیادہ miscommunicate کرنے والی کوئی چیز ہو گی؟ اسی لیے تو دیکھیے۔ نئے سیل فونز میں الفاظ کے ساتھ تاثرات بھی دیے جاتے ہیں۔ لفظ تو متروک ہو جانے چاہئیں ذرا غور فرمائیں کہ جانور بالکل نہیں بولتے۔ وہ ہم اور آپ سے پہلے اس دنیا میں موجود تھے۔ ارتقا کی منزل میں ہم سمجھتے ہیں وہ پیچھے رہ گئے 'لیکن میرے خیال میں انہیں نروان حاصل ہو گیا اور اس نروان ہی نے انہیں سمجھا دیا کہ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں وہ اتنے مہذب ہیں کہ بغیر بولے ہی سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔"

چراغ نے حیرت سے مجھے دیکھا لیکن میں اب جانوروں کی فلسفہ حیات پر غور کرنے کے موڈ میں تھی باقی کھانا۔ یعنی مسالہ ڈوسا اور سانبھر خاموشی سے کھایا گیا کافی حد تک ہم بھی الفاظ کے چکر سے نکل آئے تھے۔

لدھیانے کا میٹھا پان : ۔

کھانے کے بعد باہر نکلے تو ایک بارات ہوٹل میں داخل ہو رہی تھی' دولہا گھوڑے پہ ساتھ چمکتے دمکتے راجستھانی چھتر اور "مہاراجہ بینڈ" یہاں مجھے وہ لاہور والے ڈھولیے نظر نہ آئے جو ڈھول بجا بجا کے نہ صرف کانوں کے پردے پھاڑ دیتے ہیں بلکہ سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیتیں بھی سلب کر لیتے ہیں۔

میزبانوں میں سے کسی نے سرگوشی کی کہ "یہ شادی ایک بڑی خطرناک برادری کی ہے۔ "بھیا برادری"

چونکہ چند رعایات سے میں "بھیا" بھی ہوں فی الفور براماں گئی اور منہ تھتھا کے کھڑی ہو گئی۔

نبیل نے جو خالی گھوڑا دیکھا تو لپک کے سوار ہو گیا اب ہم سارے شاعر ادیب لدھیانے کی ٹھٹھرتی رات میں کھڑے باجماعت گھوڑیاں گا رہے تھے اور پیچھے رہ جانے والے اکادکا باراتی ہماری دماغی صحت کے بارے میں قیافے لگا رہے تھے۔

یہاں سے پان کھانے کا ارادہ کیا گیا میں نے کہا۔

"بھئی مجھے حلوہ پوری نمایاں نہیں کھانا۔"

چراغ نے پوچھا تو بتایئے پتہ کون سا ہو؟"

میں نے کہا "بنگلہ" بولے۔

"کلکتہ کا چلے گا؟"

میں نے کہا "ہاں چلے گا اور کتھا پھول ہو' چونا بہت ہلکا اور چھالیہ بھنی ہوئی ہو۔"

خیر "چورسیا پان پارلر" پہ پہنچے ایک کاغذی پلیٹ میں فریج میں ٹھنڈے کیے۔ لگے لگائے میٹھے پانوں کی گلوریاں حاضر ہو گئیں گل قند پیپر منٹ اور دانے دار خوشبو پان کیا تھا چھوٹا موٹا معجون تھا۔ ناز نے پان کی تھالی کی تصویر لی اور ہم واپس ہوٹل روانہ ہوئے۔

رخسانہ آپا کی بیٹی نے "نیکسوڈرم" منگا یا یہ انڈیا کا مشہور جلدی مرہم ہے۔ بڑی ڈبیا 22 ہندوستانی یعنی لگ بھگ 44 پاکستانی روپوں کی آپا نے چار ڈبیاں مجھے عنایت کیں۔

صبح کا پروگرام بنا۔ نبیل کا معاملہ اگر جلدی حل ہو جاتا تو ہم نو بجے یہاں سے نکل کر تین بجے سے پہلے پہلے اٹاری پہنچ جاتے۔ ورنہ ہمیں رات امرتسر میں ٹھہرنا پڑتا۔ میرے پاس امرتسر کا ویزا تھا۔ لیکن باقیوں کے لیے یہ آسانی تھی کہ امرتسر سرحدی شہر ہونے کی وجہ سے ٹرانزٹ شمار ہوتا ہے۔ رات بھر قیام کیا جا سکتا ہے۔

رخسانہ آپا کی والدہ امرتسر کی تھیں۔ انہیں کمپنی باغ کی کئی سنی سنائی باتیں یاد تھیں۔ قاسمی صاحب تو خیر تھے ہی امرتسر سے۔

صبح ہوئی سامان اٹھایا۔ ناشتے کے بعد لابی میں ڈاکٹر کیول دھیر منتظر تھے۔ کتابوں کے بنڈل' جن میں منٹو میرا دوست' خاص میرے اور فرحت آپا کے لیے تھیں۔ "ٹرائی ڈینٹ" کے دیسی روئی کے بنے ہوئے تولیوں کا بھاری ڈبا۔

یہاں ایک بات کا ذکر کرتی چلوں کہ پچاس کی دہائی تک ہمارے ہاں دیسی کپاس کاشت کی جاتی تھی جو مقامی نسل تھی۔ اس کا رنگ ہلکا بادامی سا ہوتا ہے۔ اسی روئی سے سوت کاتا جاتا تھا اور کھدر بنتا تھا۔ اسی سے کھیس بنے جاتے تھے۔ لحافوں اور بنڈلوں میں بھی یہ ہی روئی استعمال ہوتی تھی۔ اس روئی کا ریشہ نسبتاً" کم لمبا ہوتا ہے' لیکن یہ ایک اعلا نسل کی روئی ہے' پھر امریکہ ہمارا دوست بنا بیج اور کھاد کے تحفے ملنے شروع ہوئے۔ ان ہی تحفوں میں ایک تحفہ نرما تھا۔ یہ امریکن لمبے ریشے کی روئی ہے۔ ٹیکسٹائل انڈسٹری میں جو مشین استعمال ہوتی ہے اس کا نکلا نرمے کے ریشے کے حساب سے بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ وطن عزیز میں دیسن کی کاشت بین کر دی گئی اور ہر جگہ نرما اگایا جانے لگا۔ کھیسوں اور کھدر کی دستی کھڈیوں پہ ضرب پڑتی رہی۔ پولیسٹر کی رضائیاں آئیں۔ نئی نئی انرجیز اور جلدی بیماریاں ساتھ لائی۔ سوائے چند شوقین لوگوں کے جو آج بھی چھپ چھپا کے لگائی گئی دیسی روئی کی رضائیاں استعمال کرتے ہیں۔ باقی سب مصنوعی ریشے اور نرمے کا شکار ہو گئے۔

حال ہی میں انڈیا میں ایسی مشینیں لگائی گئی ہیں جن کا تکلا۔ دیسی روئی کا ریشہ پکڑ سکتا ہے۔ وہاں دیسی روئی کی کاشت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

یہ تولیے بھی دیسی روئی کے بنے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی آہ

بھری کہ یہ خیال ہمارے ہاں کب آئے گا؟
جانے کا وقت قریب تھا۔ باتیں ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔ سب کو ایک ہی شکوہ تھا — کہ کم سے کم ادیبوں، شاعروں، اداکاروں وغیرہ کے لیے ویزے میں اتنی سختی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر امن، محبت، دوستی اور بھائی چارے کو بڑھانا ہے تو پھر یہ قدم اٹھانا ہی پڑے گا اور اگر ریاست یہ قدم نہیں اٹھاتی تو ہم لوگ خواہ کچھ بھی کرلیں، نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہے گا۔ انڈین ہائی کمیشن کو اس بات کا نوٹس لینا چاہیے اور بارڈر کو ختم کرنے کی بجائے ایک اچھے ہمسائے کی طرح سوفٹ بارڈر رکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب سے وعدہ لیا گیا کہ جلد ہی پاکستان آئیں۔ ان کے پاس سال بھر کا ویزہ تھا اور غالباً "انڈیا کی طرح ہر شہر کا ویزہ الگ نہیں لکھوانا پڑتا۔

گولڈن ٹمپل کی چوری

ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہوئے۔ لدھیانہ نے ترقی کی، بہت ترقی یہاں تک کہ انڈیا کا مانچسٹر بن گیا۔ لیکن ایک سگنل پہ سائیکل رکشہ کھینچتا کالا بھجنگ آدمی آج بھی روٹی کے چار حرف لیے کھڑا ہے۔ زرد زرد اندر کو دھنسی آنکھوں میں ویرانی ہے اور پچکے ہوئے گالوں کی ہڈیاں سیاہ جلد سے باہر نکلی پڑ رہی ہیں۔ ایک ایک انسان تین تین کا بوجھ ڈھو رہا ہے۔ بھئی معاف کیجیے گا۔ آپ دونوں ملک ایک ہی جیسے ہیں۔ جھوٹے، مکار، فریبی، استحصالی طبقے کے ہاتھوں میں کھیلتے ہوئے۔

منسٹر صاحب کو پاکستان کے ساتھ تجارت کھلنے کی بڑی فکر تھی۔ ہم لوگوں کی تکلیف اور توانائی کا بحران ان سے دیکھا نہیں جارہا تھا۔ لیکن ان ہی کے شہر میں یہ غریب فقط چند ٹکوں کے لیے اپنی ہڈیوں کا گودا بیچ رہا تھا۔ کارخانے لگنے سے غریب کی حالت نہیں سدھرتی اور زرعی اصلاحات کرنے سے صرف زمین داروں اور جاگیرداروں کی کمر ٹوٹتی ہے۔ انڈیا کے افق پہ صنعت کار آنے والے زمانے کے آمروں کی طرح ابھر رہے ہیں۔ لیکن انڈیا میں جمہوریت بظاہر بہت مضبوط ہے۔ دیکھیے آنے والا وقت اس کے غریب اور پسے ہوئے طبقوں کے لیے کیا لے کر آتا ہے۔
"عام آدمی" کے غبارے میں سے بھی بہت سی ہوا نکل چکی ہے اور ایک الگ ترنگ۔

ستلج کناروں سے چھلک چھلک پڑتا ہے۔ اس کا پاٹ بہت چوڑا ہے۔ آگے جاکے تو یہ بیاس کو بھی اپنی آغوش میں سمولیتا ہے۔ ستلج میرے میکے کے پاس سے بہتا ہے۔ میکہ رہے نہ رہے، ستلج تو ہے نا۔ چنانچہ یہ بھی اپنا وطن قرار پایا۔

راستہ بھر چراغ سے گفتگو ہوئی۔ چراغ مذہب کے لحاظ سے سکھ ہیں لیکن خیالات کے حساب سے چوں چوں کا مربہ، ہر مذہب کا علم ہے۔ آج کل قرآن پڑھ رہے ہیں۔ ہم سے حدیث کی کچھ کتابیں لانے کی فرمائش کی تھی۔ فخریہ بتایا کہ آج کل چھٹے پارے پر ہوں اور جلد ہی قرآن پاک مکمل کرلوں گا۔

اس "موٹے" سکھ کو دیکھ کے میرے دل میں دکھ کی ایک لہر اٹھی۔ گو اورنگ زیب کو اتنا کوسا پیٹا جاچکا ہے کہ اب مزید کوئی گنجائش نہیں بچتی لیکن میں یہ کہنے سے باز نہ آئی کہ آپ لوگ تو مسلمان ہی تھے "آپ کے بابا گرونانک، شیخ ابراہیم فریدالدین کے مرید تھے لیکن مجذوب تھے۔ اس لیے شریعت کی پابندیوں سے مبرا تھے۔ ان کے چیلے بھی مبرا ٹھہرے۔ چونکہ دارالشکوہ کو صوفیوں کی امداد حاصل تھی اور سکھ دراصل صوفیوں کی ملیشیا تھے۔ اس لیے سرکاری وشاہی عتاب کا نشانہ بنے اور سکھ پنتھی مسلمانوں سے جدا ہوگئی۔ ورنہ آپ مسلمان ہوتی۔

کلدیپ کی آنکھ میں ستلج چھلکا۔ دریا کا پاٹ کتنا ہی چوڑا کیوں نہ ہو، جب چھل مارتا ہے تو بڑی دور جانکلتا ہے۔ خاص طور پہ جب دریا بعض رعایت سے آپ کے میکے کا دریا بھی ہو۔

جذبات کے اسی ریلے میں ہم نے کلدیپ کو اس بات پہ اکسالیا کہ کھانا وانا چھوڑو، وہ تو کھاتے ہی رہتے ہیں۔ ذرا سی ذرا ہمیں گولڈن ٹمپل کی زیارت تو کرادیں۔ حالانکہ ڈاکٹر کیول دھیر نے سختی سے منع کیا تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ خریداری کی شوقین یہ عورتیں اگر امرتسر میں نکل گئیں تو بارڈر کا پھاٹک بند ہوجائے گا اور یہ یہیں رہ جائیں گی۔

لیکن تازہ تازہ بھائی چارے نے کار ڈرائیور کے ہاتھوں میں بجلیاں سی بھردیں اور ہم امرتسر میں داخل ہوگئے۔

امرتسر کی گلیاں اور ہمارے چاند چہرے

ایک عظیم الشان پارکنگ پلازہ کی تیسری منزل پہ گاڑی

روکی گئی۔ پان کی پیلوں سے سنے زینے طے کرتے ہم سڑک پہ آئے۔ ایک موٹر سائیکل رکشہ روکا گیا۔ رخسانہ آپا نے ٹھیٹ امرتسری لہجے میں اسے گولڈن ٹمپل چلنے کو کہا۔ رکشہ ایک دم اڑن کھٹولا بن گیا اور بھرر بھرر کرتا امرتسر کی ان جادوئی گلیوں میں نکل گیا جن کی سیر' اے حمید صاحب ہمیں ایک عمر کراتے رہے۔ وہ گلیاں جن میں چلمنوں کے پیچھے چاند چہرے دمکتے تھے۔ جہاں ڈیوڑھیوں میں اندھیرے سویرے' ادھوری ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ سماوار میں چائے ابلتی تھی اور کمپنی باغ کو جانے والی سڑک پہ لگے املتاسوں کے زرد فانوس چپکے چپکے جھولتے تھے۔

امرتسر کی گلیاں وہی تھیں یا اے حمید صاحب کی محبت میں ویسی ہی چھوڑ دی گئی تھیں۔ مجال ہے۔ جو ایک اینٹ بھی بدل گئی ہو۔ ہر پرانے شہر کی طرح' پرانی حویلیوں کے دروازے' منقش محرابیں' لکڑی کی نازک بالکونیاں' دکانوں کے کھلے دروازے' آہنی ترازو' چوبی تخت جن پہ وقت' میل اور گرد بن کے جم گیا تھا۔ پرنالوں میں اگتے پیپل اور پرانے شہر کے سیوریج کی باس۔

دو تین موڑ مڑ کے رکشہ رکا تو دل دھک سے رہ گیا۔ ادھر ادھر سفید محرابیں' سنگ مرمر کا فرش اور رنگ برنگی اوڑھنیوں اور پگڑیوں والی صوفی ملیشیا۔ یہ گولڈن ٹمپل تھا۔ سکھوں کا سب سے مقدس مقام' بچپن میں جب لاہور کی تاریخی عمارتیں دیکھنے جاتے تھے تو امی ہر برباد شدہ دیوار اور بگڑے ہوئے نقش کو دیکھ کے تاسف سے کہتی تھیں۔ ارے یہاں اصل پتھر اور نگینے لگے تھے۔ سونے چاندی کے پترے لگے تھے اور سنگ مرمر کی سلیں ہوتی تھیں۔ سکھ لے گئے سب اکھاڑ کے' گولڈن ٹمپل میں لگالیں۔

پھر وہ وحشت خیز دن جب اندرا گاندھی نے گولڈن ٹمپل پہ بلڈوزر چلوادیے تھے۔ پنجاب کو قلعہ بند کردیا تھا۔ بجلی' پانی' ٹرانسپورٹ انٹرنیشنل بارڈر' میڈیا' سب سیل کردیا گیا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب گرو ارجن کا جنم دن منایا جاتا ہے اور پوری دنیا سے سکھ برادری گولڈن ٹمپل اور خاص طور پر ہرمندر صاحب پہ ماتھا ٹیکنے آتی ہے۔ ہرمندر صاحب کو تباہ کردیا گیا۔ گرو ارجن آج بھی مصلوب تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ طاقت اور اقتدار دو اندھی بلائیں ہیں۔ ان کا کوئی مذہب ہوتا ہے' نہ رنگ و نسل' چاہے وہ اندرا گاندھی ہو۔ چاہے اورنگ زیب' چاہے جنرل ڈائر' نہتے' غریب' اپنے معصوم تصورات اور چھوٹے چھوٹے نظریات کو سینے سے لگائے لوگوں کو سنگین کی نوک میں پرونے اور گولیوں کی باڑھ سے چھلنی کرتے میں انہیں بہت لطف آتا ہے۔ جلیانوالہ باغ میں تو گولی کے ایک ایک نشان کو سنبھال سنبھال کے دنیا کے آگے پیش کیا جاتا ہے' لیکن جو کچھ گولڈن ٹمپل میں ہوا۔ اسے آہنی ہاتھ سے کچل دیا گیا اور یہ ایک فرد واحد کی ضد تھی۔ جس نے اس سرخی کو فخر کے ساتھ قبول کیا تھا۔

"یہ بنگلہ دیش کی فتح سے بھی بڑی جے ہے۔" تُف ہے تُف ہے' تُف ہے۔

انسانی خون جہاں بھی بہتا ہے' طاقت کے زعم میں' جو بھی بہاتا ہے' قابل نفرین ہے' قابل صد نفرین۔

ہمارے پاس چند منٹ تھے۔ بائیں جانب جلیانوالہ باغ کا راستہ تھا۔ لیکن اپنوں کے ستم اتنے تھے کہ انگریزوں کی لیے زخموں پہ انگور سا آگیا تھا۔

کلدیپ نے کہا کہ جوتے یہاں میرے پاس اتار جائیں۔ ٹوکن کے چکر میں پڑے تو دیر ہوجائے گی۔

فوارے کے چبوترے کے پاس جوتے اتارے۔ پائینچے اڑسے' کیونکہ دربار میں جانے کے لیے صاف بہتے پانی کی پانچ فٹ چوڑی اور قریباً" چار انچ گہری نہر سے گزرنا پڑتا ہے' یہ ایک طرح کا وضو ہے۔

امرتسر کا شہر' سکھوں کے چوتھے گرو' رام داس جی نے بسایا تھا اور ہرمندر صاحب گرو ارجن' پانچویں گرو جی نے بنایا۔ اس گردوارے کا سنگ بنیاد' حضرت میاں میر نے 28 دسمبر 1588ء کو رکھا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس عمارت پہ سونا چڑھوایا اور یہ ہی اس کی وجہ تسمیہ ٹھہری۔

"امرت سار" کا مطلب ہوا۔ "آب حیات کا تالاب" بہتے پانی سے گزر کے اور سر ڈھانک کے آگے بڑھیے تو ایک محرابی داخلی دروازہ اور سامنے "امرت سار" یہ تالاب چوتھے گرو' رام داس جی نے کھدوایا تھا اور تب ہی سے اس کا نام امرت سار پڑا جو بعد ازاں امرتسر اور روزمرہ میں امرسر ہوگیا۔

اس تالاب کے دائیں طرف سے ایک راستہ پانی کے بیچوں بیچ چلتا ہوا مرکزی عمارت تک جاتا ہے۔ جو پانی کے

درمیان ایک سنہرے تاج کی طرح چمکتی ہے۔ عقیدہ انسان کو بڑا پیارا ہوتا ہے۔ "موراں" سے بھی زیادہ سب جھوٹ بکتے ہیں۔ انسان صرف خدا سے عشق کرتا ہے۔ ہر محض عشق حقیقی میں فنا ہے۔ مندروں مسجدوں گرجا گھروں گردواروں کو دیکھ لیں۔ بھوکے ننگے کالے پیلے حقیر انسان ننگے پیر لرزتے کانپتے اپنی اپنی پونجیاں مٹھیوں میں دبائے اپنے اپنے خداؤں کے پاس چلے آتے ہیں اور وہ بے نیاز ہے۔ اسے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ بزرگ گرامی شعیب بن عزیز صاحب کا شعر ہے۔

مسجدوں مندروں میں رہتا ہے
کیسے کیسے گھروں میں رہتا ہے

اسے تو یہ سونا چاندی نہیں چاہیے۔ اپنے بھائی بندوں کے ننگے جسموں کو ڈھانپ لو اور اس کے نام پہ ایک دوسرے کی پشت میں چھرا گھونپنا بند کردو۔

سیڑھیاں اتر کے تالاب کے کنارے گئے ہزاروں زائرین کوئی ماتھا ٹیک رہا تھا۔ کوئی مالا پھیر رہا تھا۔ کوئی دعا میں مشغول تھا۔ تالاب میں تیرتی ایک بڑی سی سنہری مچھلی میرے سامنے سطح آب تک آئی۔ اپنی حیران آنکھوں سے مجھے دیکھا اور یا گئی کہ اگر جلدی سے نظر پھیر کے نہ بھاگی تو یہ کوئی رشتہ قائم کرلے گی اور اس رعایت سے دربار صاحب بھی اس کا وطن ٹھہر جائے گا۔ مچل کے مڑی اور یہ خبر آگے سے آگے اپنے جیسی جل پریوں کو سناتی تالاب کے مرکز کی طرف تیر گئی۔ جہاں اپریل کی دھوپ میں سونے کے پنوں میں لپٹا ہر مندر چمک رہا تھا۔ پر شکوہ عظیم بڑی عبادت گاہیں مجھے خوف زدہ کردیتی ہیں۔ یوں لگتا ہے ہم زمین سے چپکے حقیر کینچوے ہیں اور اتنی بھی اوقات نہیں کہ سلیقے سے دعا ہی مانگ لیں۔

گرو ارجن داس جنھوں نے اس گردوارے کا نقشہ بنوایا۔ شاید اس خوف کو پاگئے تھے۔ باقی عبادت گاہیں اکثر سیڑھیاں چڑھ کے آتی ہیں۔ لیکن ہر مندر تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں اترنی پڑتی ہیں۔ یہ سفر ذات کے اندر بھی ہوتا ہے۔ اپنے تئیں جس چبوترے پہ اپنی ذات کا بت دھرے ہم اس کی آرتی اتارتے ہیں۔ اس بت کو وہاں سے اتار کے گھسیٹ کے "سرور" "تالاب" کے کنارے لانا پڑتا ہے، لیکن برا ہو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا، سارے اہتمام میں

کھنڈت ڈال گیا۔ خدا کو بھی ملفوف کرگیا۔ سونے کا نقاب تان گیا۔ بادشاہ کیا جانیں فقیروں کے معاملات؟

وقت کم تھا۔ فٹافٹ تصاویر کھینچی گئیں۔ دربار صاحب میں ہر مذہب کا انسان آکے دعا کرسکتا ہے۔ صرف شرط، سر ڈھانکنے کی ہے۔

تو نبہ وجدا ای ناں

باہر نکلے کلدیپ جوتوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ آدھے پونے جوتے پہنے اور رکشے پہ سوار ہوکے دوبارہ ان جادوئی گلیوں سے گزرے اور پارکنگ پلازہ پہنچے۔ ابھی تک میں نے خود کو پتا نہیں کیسے روک کے رکھا تھا لیکن یہاں ایک تونی دیکھ کے مچل گئی، پرس میں صرف ڈالر تھے اور وہ بھی سو، سو کے نوٹ۔

رخسانہ آپا کی ماما عود کر آئی، کہنے لگیں۔

"میرے پاس انڈین کرنسی ہے، لے لو۔"

دو تونبے لیے اور مڑ کے دیکھا تو فرحت اور ناز وغیرہ غائب بھاگم بھاگ پلازہ میں پہنچے گاڑی نظر نہ آئی۔ ایک نوجوان سے فون مانگا کہ کلدیپ کو اپنا پتا بتائیں۔ وہ صاحب ہمارے حلیوں سے خوف زدہ ہو کے بھاگ لیے۔ ایک دوسرے صاحب نے اپنا فون دیا۔ بارے کلدیپ سے رابطہ ہوا اور ہم گاڑی تک پہنچے۔

اب وقت کم تھا۔ سرحد پہ جھنڈا اتارنے کی پریڈ آج کل ساڑھے چار بجے شروع ہوتی ہے اور گیٹ بند کردیے جاتے ہیں۔ تین بجے تک جو پار جاسکتا ہے چلا جائے۔ ورنہ امرتسر میں ٹرانزٹ لے۔ آفتی نسیم مرحوم جب جشن ساحر میں آئے تھے تو ان کے پہنچتے پہنچتے گیٹ بند ہوگئے تھے۔

اب گھبراہٹ سوار ہوئی۔ گھر، بچے، بلیاں سب یاد آنے لگے۔ امرتسر لاکھ حسین سہی، ہزار رومان اس کی گلیوں سے وابستہ سہی، لیکن۔۔۔ "اٹھاؤ پان دان اپنا" میں باز آیا محبت سے" حقیقت یہ ہے کہ بھونچاؤں اور سیلابوں کے بعد جو جہاں پہنچ گیا، جڑ پکڑ گیا، وہی وطن ہے اور ہمارا تو وہی حال کہ۔۔۔

کیا کاشی، کیا اوسر مگھر، رام ہردے بس مورا
جو کاسی تن تجے کبیرا، رامے کون ہورا

تو اب اپنے مگھر کی فکر تھی۔ ڈرائیور کو دو ایک بار کہا کہ۔۔۔

"بھائی تیز چلاؤ' تم سے تیز تو ہمارے ہوخان کے ڈرائیور ہوتے ہیں۔ منٹوں میں میلوں کا فاصلہ پاٹ جاتے ہیں۔"

ہم نے تو ابھی سے آنکھیں ماتھے پہ رکھ لی تھیں۔ گھر پیغام بھی کرا دیا تھا کہ......

"حاجی کی نہاری منگالیں' چار روز سے دالیں' سبزیاں کھا رہے ہیں۔"

پیغام کرنے والے باظرف میزبان' ہنس کے چپ کر گئے۔

لاکھ کہنے پہ بھی ڈرائیور نے حد رفتار سے ایک انچ تجاوز نہ کیا۔ بھئی یہ ہندوستان اپنے عوام کے بل پہ چند سالوں میں سپر پاور بن سکتا ہے' لیکن سیاست دان ان کا ہمارے ہاں جیسا ہی نکما اور پاجی ہے' معذرت کے ساتھ۔

اٹاری کی حدود میں داخل ہوئے تو تین بج رہے تھے۔ انہوں نے مژدہ سنایا کہ ساڑھے تین بجے تک وقت ہے اور یہ کہ بس ابھی نہیں پہنچی۔ بھارت پاکستان کے درمیان یہ بس کچھ برسوں سے چل رہی ہے۔ قنافٹ اندر پہنچے۔ چراغ سے رخصت لی۔ دوبارہ ملنے کی خواہش' پاکستان آنے کی دعوت اور حدیث کی کتابیں بھیجنے کا وعدہ' تلاشی' کسٹم گیٹ پاس سب دوڑ دوڑ کے کیا۔ بس پہنچ چکی تھی۔ چینی' ازبک شکلوں کے بہت سے لڑکے' لمبی عبائیں' سر پہ نمازی گول ٹوپیاں' جانے کون تھے' کہاں سے آرہے تھے اور پاکستان سے آگے کہاں تک جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

کسٹم پہ کالے برقعے میں ایک غریب بیوہ' ایک بڑھیا اور تین جوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ کسٹم والا ان سے جھگڑ رہا تھا۔ سامان کی چھ ٹرالیاں تھیں۔ دس ہزار ادا ہوتے تو کلیئرنس ملتی۔ غریب رو' رو کے اپنے شوہر کی جواں مرگی' تینوں لڑکیوں کی کم عمری اور جانے کس کس کا واسطہ دے رہی تھی۔ لیکن اس ظالم کا دل ذرا نہ پسیجا' بڑھیا نے تو پاکستان جانے کا ارادہ ہی منسوخ کر دیا اور بکتی جھکتی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی واپس ہو گئی۔

یہ بے چاری ابھی کھڑی بات کر رہی تھیں کہ ہم اٹاری کی چوکی سے نکل کے واہگہ کے لیے بس میں بیٹھ گئے۔

بس سے اترے' سامنے باب آزادی' فون کے سگنل آنے شروع ہوئے اور کھٹا کھٹ پیغامات کی بوچھاڑ' پاسپورٹ وغیرہ دکھاکے بے اعتنائی سے آگے بڑھنے ہی والے تھے کہ ایک فوجی نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

"یہ کیا لے جا رہی ہیں۔"

منہ چھپا کے جواب دیا۔ "تونبی ہے۔"

"بجائیں گی؟"

"ہاں تو اور کیا؟ جلانے کے لیے تو لے جا نہیں رہی۔"

سرحد سامنے تھی اور سرخ و سفید لمبے چوڑے' ایرانی اور ترکی نقوش والے پاکستانی فوجی بہت ہی بھلے لگ رہے تھے۔

گہرے جامنی ہونٹوں پہ مسکراہٹ کا پر تو پڑا۔ سانولی رنگت ایک شرارتی مسکراہٹ میں چمکی۔

"ارے کیسے بجائیں گی؟ وہ سنا نہیں آپ نے' تونبہ وجد اناں' یا رہنا۔"

میں نے حیرت سے دیکھا اور تونبہ چھین کے تقریباً" بھاگتی ہوئی باب آزادی میں داخل ہو گئی۔ مڑ کے دیکھا تو وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ وہیں کھڑا مسکرا رہا تھا' لاحول پڑھی۔

سامنے پنجروں میں مور ناچ رہے تھے اور ہرن چوکڑیاں بھر رہے تھے۔ پریڈ دیکھنے کے شائقین کو لانے کے لیے چلائی گئی' منی منی الیکٹرک ٹرینز اور بگھیاں چل رہی تھیں۔ کئی دنوں کی بارش نے سبزے کو اور بھی نکھار دیا تھا۔

کسٹم آفیسر واقف تھے یوں بھی ہمارے پاس تھا کیا "حسرت تعمیر" کے سوا۔

واہگہ سے پارکنگ تک پہنچے۔ سامان اپنی اپنی گاڑیوں میں رکھا۔ لاہور میں ملتے رہنے کا وعدہ کیا اور اپنے اپنے گھروں کا رخ کیا۔

باٹا پور کی یادگار کے پاس سے گزرتے ہوئے عاصم نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے۔"

"یہ تونبی ہے' گولڈن ٹمپل کے سامنے سے خریدی ہے۔"

"اچھا بجتی ہے؟"

"ہاں.... ہاں.... خوب آواز ہے۔"

"تو پھر بجاؤ نا۔"

میں نے اکتارے کی تار میں پھنسی لکڑی کی گنڈیری سی نکالی اور ناخن سے تار کو چھیڑا تو تار بالکل مردہ' کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ دوبارہ بجایا تو بھی خاموشی۔

سرحد کے پار کوئی زور سے ہنسا' اتنے زور سے کہ واہگہ کے پیپل پہ بیٹھے گدھوں کے ہیولے گھبرا کے کہیں اڑ گئے اور الاپا۔

"تونبہ وجد اای ناں یا رہنا"

امت الصبور

کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا
کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پر جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یوں ہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یوں ہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

(مسدس حالی)

مسدس حالی کے ان اشعار میں مولانا الطاف حسین حالی نے اسلام کی آمد سے قبل عربوں کی حالت زار کا بیان کرتے ہوئے جس لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ وہ جنگ داحس والغبرا کہلاتی ہے۔

جنگ بسوس کے کچھ ہی عرصے بعد "عبس" اور "ذبیان" کے عم زاد قبیلوں کے مابین ایک اور اتنی ہی طویل جنگ کا آغاز ہو گیا۔ داحس اور غبرا گھوڑوں کے نام تھے۔ "داحس" بنو عبس کے سردار قیس بن زہیر کا گھوڑا تھا اور "غبرا" بنو ذبیان کے حمل بن بدر کی گھوڑی کا نام تھا۔

دونوں نے باہم گھڑ دوڑ کی شرط باندھی۔ دوڑ کا فاصلہ سو تیر پرتاپ طے ہوا اور جیتنے والے کو سو اونٹ دینا قرار پایا۔ چالیس دن کی مشق اور ریاضت کے بعد مقابلہ شروع ہوا۔ جس راستے پر دوڑ ہونے والی تھی۔ اس میں کئی ایک گھاٹیاں پڑتی تھیں۔

حمل بن بدر نے ان میں اپنے آدمی بٹھادیے کہ اگر "داحس" کو بڑھتا ہوا دیکھیں تو اسے بدکا کر راہ سے ہٹا دیں۔

دوڑ شروع ہوئی تو پہلے "غبرا" آگے نکل گئی۔ حمل بن بدر پکار اٹھا۔ "اے قیس! میں جیت گیا۔"

قیس نے کہا۔ "ذرا صبر کرو' گھاٹیاں گزر کر صاف میدان آنے دو۔"

یہی ہوا' صاف میدان میں داحس' غبرا کو پیچھے چھوڑ گیا۔ مگر جب دوڑ کی حد قریب آپہنچی اور داحس "تعین ذات الاصاد" کے مقام پر پہنچا تو حمل بن بدر کے چھپائے ہوئے آدمیوں نے اسے بدکا دیا اور اس طرح غبرا کو فاتح قرار دے دیا گیا۔

قیس فطری طور پر بہت غم و غصے میں مبتلا ہوا اور چند اشعار کہے۔ جن میں اس بددیانتی کا ذکر کیا۔

"انہوں نے بغیر کسی فخر کے مجھ پر فخر کیا
اور میرے گھوڑے کو منزل پر پہنچنے سے پہلے ہٹا دیا۔"

ستم بالائے ستم یہ کہ حمل کے بھائی اور سردار قبیلہ ذبیان' حذیفہ بن بدر نے اپنے بیٹے مالک کو قیس بن زہیر کے پاس دوڑ جیتنے کے سو اونٹ طلب کرنے کے لیے بھیجا۔

قیس پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا' کہنے لگا۔

"تمہو ہم بھی ادا کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر ایسا نیزہ مارا کہ مالک کا کام تمام کردیا۔ اس کا گھوڑا بدک کر بھاگا اور خالی زین گھر واپس پہنچ گیا۔

بس پھر کیا تھا' جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور رفتہ رفتہ دونوں گھرانوں کی مختلف شاخیں اس میں ملوث ہوتی چلی گئیں۔ موقع پا کر ایک گروہ کا آدمی دوسرے گروہ کے کسی نہ کسی فرد کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا۔

باہمی عداوت اور قتل و غارت کا یہ سلسلہ بھی حرب بسوس کی طرح چالیس برس جاری رہا۔

اس جنگ کا انجام بھی بالآخر ندامت و تلخ کامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ قیس بن زہیر کے اپنے دو شعر تمام تر صورت حال کی بہت اچھی عکاسی کرتے ہیں۔

ترجمہ:
"میں نے حمل بن بدر کو مار کر اپنے جی کی بھڑاس نکال لی
اگرچہ میں نے ان لوگوں (کے قتل) سے اپنی تشنگی انتقام کو سرد کرلیا ہے
تاہم انہیں کاٹ کر میں نے خود اپنے ہی ہاتھ کاٹے ہیں۔"

ذبیان کی ایک شاخ "غیظ بن مرہ" کے دو نیک دل سرداروں "حارث بن عوف" اور "ہرم بن سنان" نے اس نحوست کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس امر پر صلح کرادی کہ دونوں طرف کے مقتولین کا حساب کرلیا جائے۔ ایک روایت کے مطابق حارث بن عوف کو اس صلح کاری پر آمادہ کرنے والی اس کی بیوی تھی۔

جس قبیلے کے جتنے افراد زاید مارے گئے ہوں ان کا خون بہا یہ دونوں صلح کار اپنے پاس سے ادا کریں گے۔ چنانچہ جانبین کے مقتولین کو ایک دوسرے کے بالمقابل شمار کرنے کے بعد بنو عبس کو تین ہزار اونٹ دیا جانا قرار پایا اور دونوں مصلح اس بات کے ضامن بنے کہ یہ دیت زیادہ سے زیادہ تین سال کی مدت میں ادا کردی جائے گی۔

اس پر سب مطمئن ہو گئے اور آپس میں مل بیٹھے۔ تاہم ایک شخص حصین بن ضمضم کی کینہ پروری کے باعث جنگ کی یہ آگ ایک مرتبہ پھر بھڑک اٹھنے کے قریب ہو گئی۔

اس شخص کے باپ ضمضم کو مشہور شاعرو شہسوار عنترہ بن شداد نے اور اس کے بھائی ہرم بن ضمضم کو ورد بن حابس نے مار ڈالا تھا۔ یہ دونوں بنو عبس کی شاخ بنو غالب سے تھے۔

حصین بن ضمضم نے عربوں کی مخصوص روایت کے مطابق یہ قسم کھائی تھی۔

"جب تک وہ ورد بن حابس یا اس کے قبیلے کے کسی اور شخص کو قتل نہ کرے گا اپنا سر نہیں دھوئے گا۔"

چنانچہ اس نے صلح کے معاہدے کے باوجود اپنے ارادے کو دل میں پوشیدہ رکھا۔ زہیر نے اپنے اشعار میں اسی کے بارے میں کہا۔

"اور اس نے دل میں ایک پوشیدہ ارادہ چھپا رکھا تھا۔ سو نہ تو اس نے اس کا اظہار کیا اور نہ.... (قبل از وقت) پیش قدمی کی۔

اتفاقاً" ایک روز ایک مہمان، جس کا تعلق بنو غالب سے تھا۔ حصین کے ہاں ٹھہرا۔ حصین نے اس کا نسب معلوم ہونے پر فی الفور اسے قتل کر ڈالا اور اپنی قسم پوری کرلی۔

بنو عبس کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ آمادہ جنگ ہو کر حارث بن عوف کی طرف چلے اور صورت حال بہت تشویش ناک ہو گئی۔

اس کے جواب میں حارث نے جو رویہ اختیار کیا وہ بلند نگاہی اور عالی ظرفی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس نے ایک سو اونٹ اور اپنا بیٹا ان کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا۔

"تم قصاص میں میرے بیٹے کا قتل چاہتے ہو یا دیت کے اونٹ پسند کرتے ہو؟ نیز تمہارے نزدیک اونٹوں کی عزت زیادہ ہے یا اپنی جانوں کی؟"

یعنی اصل میں ہم تم ایک ہی ہیں۔ اگر آپس میں لڑیں تو جانیں تلف ہوں گی اور اگر اونٹ قبول کرلو تو جانیں بچ سکتی ہیں۔

بنو عبس کا سردار ربیع بن زیاد، حارث کے اس رویے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اپنی قوم سے کہا۔

"تمہارے بھائی حارث نے اپنا بیٹا اور اونٹ دونوں بھیج دیے ہیں۔ اب تمہیں اختیار ہے، چاہو تو قصاص میں اس کے بیٹے کو قتل کرلو اور چاہو تو اونٹ قبول کرکے اسے اپنا مرہون احسان بنالو۔"

یہ سن کر بنو عبس کا غصہ فرو ہو گیا اور انہوں نے خون بہا قبول کرکے صلح کو برقرار رکھا اور اس طرح یہ طویل جنگ ختم ہو گئی۔

(خورشید رضوی... عربی ادب قبل از اسلام)

گوشت کے پکوان

خالدہ جیلانی

فرائی مسالا چانپیں

ضروری اشیاء :

چانپیں	دس عدد
پیاز (گرائنڈ کرلیں)	ایک عدد
ٹماٹر کا پیسٹ	آدھا کپ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی رائی	ایک چائے کا چمچہ
تکہ مسالا	ایک چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا (کٹا ہوا)	حسب ذائقہ
تیل	ایک چوتھائی کپ

ترکیب :

ساس پین میں تیل گرم کرکے اس میں پیاز' لہسن ادرک پیسٹ' ٹماٹر کا پیسٹ' مسٹرڈ پاؤڈر' تکہ مسالا' لال مرچ پاؤڈر' ثابت دھنیا اور نمک ڈال کر پندرہ منٹ ہلکی آنچ پر پکائیں' اس کے بعد اس میں چانپیں ڈال کر ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ چانپیں گل جائیں تو چولہا بند کردیں۔ مزیدار فرائی مسالا چانپیں تیار ہیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

باربی کیو بوٹی کباب

ضروری اشیاء :

گائے کی بوٹی	ایک کلو
بیف بوٹی مسالا	چار کھانے کے چمچے
دہی (پھینٹ لیں)	آدھا کپ
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
کچا پپیتا پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
تیل	ایک چوتھائی کپ
ہری مرچوں کا پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
باربی کیو مسالا	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

بوٹیوں میں بیف بوٹی مسالا' دہی' لہسن ادرک پیسٹ' کچا پپیتا پیسٹ' تیل' ہری مرچوں کا پیسٹ اور باربی کیو مسالا لگا کر دو' تین گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ سیخوں پر بوٹیاں لگا کر باربی کیو کریں۔ حسب ضرورت تیل کا برش لگاتی رہیں۔ سلاد' ہری چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

کٹا مسالا کلیجی کڑاہی

ضروری اشیاء :

کلیجی	آدھا کلو
لال مرچیں (کٹی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت دھنیا (کٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ (کٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا مکس	ایک چائے کا چمچہ (کٹا ہوا)
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	تین کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا	گارنش کے لیے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

کڑاہی میں تیل ڈال کر اس میں سفید زیرہ' کٹی لال مرچ' ادرک' لہسن پیسٹ' ثابت دھنیا' گرم مسالا اور نمک ڈال کر تھوڑا فرائی کریں۔ مسالا بھن جائے تو

کلیجی ڈال کر بھون لیں۔ تیل اوپر آجائے تو تھوڑا پانی ڈال دیں۔

جب کلیجی گل جائے تو اوپر سے لیموں کا رس اور ہرا دھنیا ڈال کر پانچ منٹ دم پر رکھ دیں۔

مزیدار کٹا مسالا کڑاہی کلیجی سرونگ ڈش میں نکال کر پیاز سلائس اور تندوری روٹی کے ساتھ سرو کریں۔

بیف حیدر آبادی بریانی

ضروری اشیاء :

گائے کا گوشت	آدھا کلو
چاول (بھگو دیں)	آدھا کلو
آلو	تین سے چار عدد
دہی	آدھا کپ
پیاز (سلائس کاٹ لیں)	دو عدد
لال مرچ پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت سیاہ مرچیں	چھ سے آٹھ عدد
دھنیا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
لونگ	چار سے چھ عدد
بادیان کے پھول	دو عدد
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
دودھ	ایک چوتھائی کپ
زرد رنگ	ایک چٹکی
بریانی ایسنس	تین قطرے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

دیگچی میں تیل گرم کرکے پیاز ہلکی براؤن کرلیں۔ تھوڑی سی پیاز الگ نکال لیں۔ اس تیل میں گوشت، لہسن، ادرک پیسٹ، دہی، نمک، لال مرچ پاؤڈر، بادیان کے پھول، سفید زیرہ، لونگ، ثابت سیاہ مرچ اور دھنیا پاؤڈر ڈال کر گوشت گلنے تک درمیانی آنچ پر ڈھکن ڈھک کر پکائیں۔ گوشت آدھا گل جائے تو آلو شامل کردیں۔ آلو اور ہری مرچیں کھلے منہ کی دیگچی میں پانی ڈال کر چاول اور ایک کھانے کا چمچہ نمک ڈال کر ابالنے کو رکھ دیں۔ ایک کنی باقی ہو تو چھلنی میں ڈال کر چھان لیں۔ ایک بڑی دیگچی میں پہلے گوشت کی تہ لگائیں۔ اور چاولوں کی تہ لگا کر اوپر سے دودھ میں زرد رنگ گھول کر چاولوں پر ڈال دیں یہ عمل ایک سے دو بار دہرائیں، بریانی ایسنس ڈال کر بریانی کو دھیمی آنچ پر آٹھ سے دس منٹ دم پر رکھیں۔ الگ کی ہوئی براؤن پیاز اوپر سے چھڑک کر سرونگ ڈش میں سلاد اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

ہانڈی تکے

ضروری اشیاء :

انڈر کٹ گوشت (چھوٹی بوٹی کرلیں)	آدھا کلو
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
کچا پپیتا (پسا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
براؤن پیاز (کوٹ لیں)	آدھا کپ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
تیل	تین کھانے کے چمچے

ترکیب :

انڈر کٹ گوشت میں سرخ مرچ، نمک، گرم مسالا پاؤڈر، ادرک لہسن پیسٹ، کچا پپیتا، لیموں کا رس، براؤن پیاز، زردے کا رنگ مکس کرکے دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ہانڈی میں تیل گرم کرکے گوشت ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ (یہ گوشت اپنے پانی میں ہی گل جائے گا۔) جب گل جائے تو خوب اچھی طرح بھون لیں کہ مسالا بوٹیوں پر لگ جائے۔ کوئلہ گرم کرکے ہانڈی میں رکھ کر اس کے اوپر تھوڑا تیل ڈال کر ڈھکن اچھی طرح ڈھک دیں۔ دس منٹ کے بعد اتار لیں،

ہانڈی تکے تیار ہیں۔ چپاتی، سلاد، رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

اسٹیشن والے قیمے کے کباب نان کے ساتھ

ضروری اشیاء :

قیمہ	آدھا کلو (باریک پسا ہوا)
پیاز (باریک چوپ کرلیں)	ایک عدد
ٹماٹر (چوپ کرلیں)	ایک عدد
ہرا دھنیا (چوپ کرلیں)	آدھا کپ
پودینہ	آدھا کپ
ہری مرچیں (چوپ کرلیں)	چار عدد
انار دانہ	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچیں (کٹی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ذائقہ
بیسن	دو کھانے کے چمچے
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
نان	سرونگ کے لیے

ترکیب :

قیمے میں پیاز، ٹماٹر، ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچیں، انار دانہ، کٹی ہوئی لال مرچیں، نمک، بیسن، زیرہ پاؤڈر اور انڈا اچھی طرح مکس کردیں اور آدھا گھنٹہ رکھ دیں۔ کسی بھی شیپ میں کباب بنا کر گرم تیل میں شیلو فرائی کریں اور نان، سلاد اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

کھویا ملائی کھیر

ضروری اشیاء :

چاول (ابال لیں)	چوتھائی کپ
کھویا	آدھا کپ
بادام	دس سے بارہ عدد
کریم	ایک کپ
دودھ	ایک لیٹر
بادام (کاٹ لیں گارنش کے لیے)	
چینی	حسب ذائقہ

ترکیب :

ساس پین میں دودھ ڈال کر پکائیں ابال آجائے تو اس میں چاول ڈال کر مزید پکائیں اتنی دیر تک پکائیں کہ دودھ کی مقدار آدھی رہ جائے۔ اس میں کھویا، بادام کا پیسٹ اور چینی ڈال کر پکائیں۔ کھیر گاڑھی ہوجائے تو چولہے سے اتار لیں ٹھنڈی ہوجائے تو کریم مکس کرکے سرونگ باؤل میں نکال کر فریج میں رکھ دیں مزے دار کھویا ملائی کھیر تیار ہے۔ ٹھنڈی ہوجائے تو بادام سے گارنش کرکے پیش کریں۔

رس ملائی

اجزا :

خشک دودھ	1 کپ
انڈا	1 عدد (پھینٹ کر رکھ لیں)
تیل	3-4 کھانے کے چمچے
بیکنگ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
دودھ	1 لیٹر
چینی	1 کپ
پستہ، بادام	حسب منشا

ترکیب :

خشک دودھ میں انڈا، بیکنگ پاؤڈر اور تیل ڈال کر اچھی طرح گوندھ لیں، پھر اس کی چھوٹی چھوٹی بالز بنالیں۔ ایک دیگچی میں الگ سے دودھ ابال لیں پھر اس میں چینی شامل کرکے خوب اچھی طرح پکائیں اور گاڑھا کرلیں۔ اس کے بعد وہ بالز شامل کریں اور پانچ منٹ تک پکائیں اور پھر ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھ دیں۔ ایک پیالی میں پستہ بادام کے ساتھ گارنش کرکے سرو کریں۔

جواب

کترینہ اور سیف علی خان کی فلم "فینٹم" میں پاکستان مخالف جذبات کو ہوا دی گئی ہے۔ اس لیے پاکستان میں اس کی نمائش پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ پابندی کا سنتے ہی فلم کے ہیرو سیف علی خان نے پاکستان کے خلاف بولنا شروع کردیا۔ اپنے ایک بیان میں انہوں نے کہا کہ "ہمیں پاکستان پر اعتماد نہیں۔ (ہمیں آپ کے اعتماد کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے کیا آپ کو۔۔۔ ہے؟ بھئی ضرورت!) سیف کے اس بیان کے آتے ہی چاروں طرف سے ان کو منہ توڑ (کاش حقیقت میں بھی۔۔۔؟) جواب دیے جانے لگے۔ سب سے اچھے الفاظ میں شان نے سیف کو جواب دیا۔ شان کا کہنا تھا کہ۔۔۔ "سیف! اعتماد انسان کے اندر ہوتا ہے اور چار مسلسل فلاپ فلموں کے بعد تمہارے اندر کا اعتماد ختم ہوگیا ہے۔ (کیا کبھی تھا بھئی اعتماد؟) اب تم اپنی ناکامی چھپانے کے لیے پاکستان کے خلاف نفرت انگیز باتیں کرکے بھارتیوں کے دل جیتنے کی ناکام کوشش کررہے ہو' ان کے دل اپنی صلاحیتوں سے جیتو۔ (اب ہو ہی نہ۔۔۔ بھئی صلاحیت۔۔۔ تو۔۔۔؟) جھوٹی باتوں سے نہیں۔ (تسی گریٹ ہو شان!) یاد رکھو! سپرمین صرف فلموں میں اڑ سکتا ہے۔ اس لیے کبھی اپنے دل میں نفرت بھر کر ہمارا بارڈر عبور کرنے کا سوچنا بھی نہیں۔ (ورنہ۔۔۔؟) ہاں اپنی سوچ' عمل اور فلموں میں برابری اور عزت پیدا کرو۔ تمہیں پاکستان میں ولن ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے' تمہارے اپنے گھر میں ولن بہت ہیں۔" (او جی شان جی! تسی تے دل خوش کردیا جی۔۔۔)
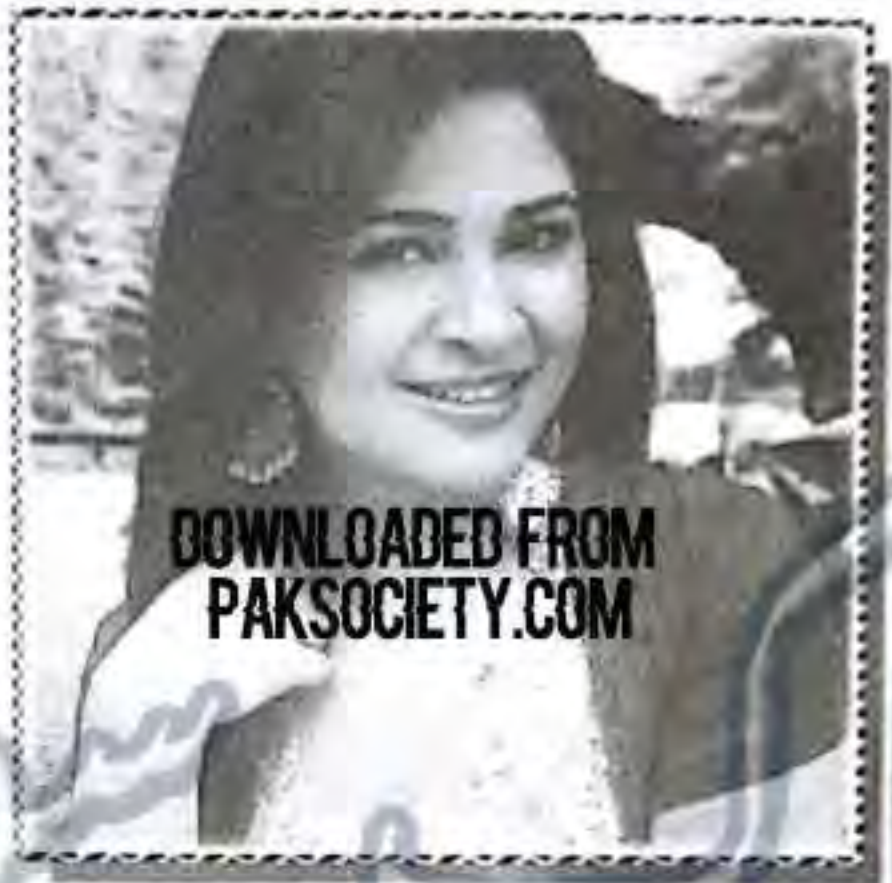
مقام

شرارتی آنکھوں' گوری رنگت اور بوٹے قد والی عائشہ عمر نے ان تھک محنت کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ آٹھ سال کی عمر سے ٹی وی پروگرام کرتی عائشہ ماڈلنگ' میزبانی اور اداکاری کے علاوہ گلوکاری کا بھی شوق رکھتی ہیں۔ (بھئی شوق تو بہت سے لوگ رکھتے ہیں' مگر موقع اور ایوارڈ۔۔۔ کسی کسی کو ملتا ہے۔) آج کل ان کی آواز مختلف ڈراموں کے پس پردہ چلنے والے گانوں کے لیے بہت موزوں سمجھی جانے لگی ہے۔ ان کی میوزک ویڈیوز' خاموشی' آؤ' تو ہی تو ہے' چلتے چلتے اور گمی گمی نے (کیا گانے کے سر گم گئے۔) بھی زبردست شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی ویڈیو "خاموشی" کو تو بہترین ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ جی ہاں! مقابلے پر سجاد علی' ذیشان' ساجد اور عثمان ریاض تھے۔ (بھئی اتنے سریلے لوگوں میں ایک اچھے گلوکار کو ایوارڈ دینا مشکل تھا تو۔۔۔ یہ ایوارڈ عائشہ کو دے دیا گیا کیونکہ عائشہ۔۔۔۔)
عائشہ عمر کو اب فلموں میں بھی کام ملنے لگا ہے۔ فلم "لو میں گم" اور "میں ہوں شاہد فریدی" میں انہوں

نے مہمان اداکارہ کے طور پر کام کیا، لیکن شہزاد شیخ کے ساتھ "کراچی سے لاہور" میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ ٹی وی ناظرین انہیں "بلبلے" کی "خوب صورت" کی حیثیت سے بھی جانتے ہیں۔

ہنر

عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی ایک منفرد گلوکاری کے انداز کا نام ہے۔ جنہوں نے اپنی منفرد فوک گلوکاری سے شہرت پائی۔ اب ان کے بیٹے سانول عطا تو اپنے ابا کے نقش قدم پر ہی چل رہے ہیں، مگر ان کی بیٹی لاریب عطا وژوئل ایفیکٹ کی مشکل ترین فیلڈ میں نام کما رہی ہیں۔ لاریب عطا پاکستان کی کم عمر ترین وژوئل ایفیکٹ ڈیزائنر کے طور پر ہالی ووڈ جا پہنچی ہیں۔ وہ سولہ سال کی عمر سے جارج مائیکل، رولنگ اسٹون اور ڈزنی جیسے اداروں کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ (ذرا نم ہو تو یہ مٹی۔۔۔) ان دنوں لاریب عطا ایک برطانوی نشریاتی ادارے کے ساتھ وابستہ ہو کر گوڈ زیلا، پرنس آف پرشیا، سوینی ٹوڈ اور گریویٹی جیسے پروجیکٹس میں وژوئل ایفکٹس دے چکی ہیں۔

اعزاز

علی ظفر نے ان دنوں ایک مشہور میوزک پروگرام میں راک اسٹار گا کر دھوم مچا دی ہے۔ علی ظفر کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ گیت اپنے اوپر ہی لکھا ہے۔ اداکار شان سے اپنے اختلاف کے بارے میں وہ کہتے ہیں "شان سے میرا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ وہ ہمارے سینئر ہیں، ان کی بہت عزت کرتا ہوں، کرتا رہوں گا۔ ہم ان کے بچے ہیں۔ (ہائیں شان! اتنے بڑے۔۔۔ بچے۔۔۔؟) ان سے سیکھتے ہیں، وہ ہماری حوصلہ افزائی کریں، ہمیں سراہیں، نئے آنے والے لوگوں کو اور ہمیں ان کی گائیڈ لنس کی ضرورت ہے۔"

انہوں نے مزید کہا کہ میری خواہش ہے کہ شان میری فلموں میں ہوں، یہ بات میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ ہوگی۔ (علی ظفر صاحب! شان کو اپنی فلم میں

آپ کاسٹ کر سکتے ہیں۔ اب شان آپ کے پاس آکر تو کام مانگنے سے رہے؟) اور جہاں تک شان کی فلموں میں کام کرنے کا تعلق ہے تو کریکٹر پسند آیا تو ضرور کروں گا، لیکن معاوضہ منہ مانگا لوں گا۔ (یعنی کام نہیں کروں گا۔)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ ڈاکٹر عاصم خود جیل میں ہیں، خاندان سڑکوں پر رُل رہا ہے۔ مستقبل میں بھی عدالتیں ہوں گی اور وکیل اور مقدمے ہوں گے اور جیل کی کوٹھڑیاں ہوں گی۔ چنانچہ اس ساری بے ایمانی کا کیا فائدہ ہوا؟

آپ ایک لحہ کے لیے سوچیے، آپ حراست میں ہیں۔ دوست بھاگ گئے ہیں، دولت باہر پڑی ہے اور سابق کولیگ آپ کی گرفتاری پر خوش ہیں۔ چنانچہ آپ نے کیا پایا۔۔۔ آپ نے کیا کمایا؟ کاش آپ یہ جان پاتے، دنیا میں اقتدار اور دولت سے بڑا سراب کوئی نہیں اور اختیار سے بڑا کوئی بے وفا نہیں۔

(جاوید چوہدری۔۔۔ زیرو پوائنٹ)

☆ لطیفہ یہ ہے خورشید شاہ فرماتے ہیں، اگر زرداری صاحب پر ہاتھ ڈالا گیا تو جنگ ہوگی۔ بھٹو جیسے مقبول لیڈر کو راتوں رات پھانسی دے دی گئی اور یہی پارٹی لیڈرز باہر نہ نکلے، وہ اب زرداری صاحب کو بچانے نکلیں گے۔ یہ لطیفہ بھی سننا باقی تھا۔

(رؤف کلاسرا۔۔۔ آخر کیوں)

ادارہ

خوبصورتی کے نسخے

آپ کا کچن.... بہترین بیوٹی پارلر

اگر آپ مہنگی اور قیمتی کاسمیٹکس پروڈکٹس نہیں خرید سکتیں تو جلد کو تروتازہ اور دلکش رکھنے کے لیے قدرتی اشیا کی مدد سے جو آپ کے کچن میں موجود ہوتی ہیں۔ نہایت آسانی سے فیس پیکس اور ماسک تیار کر سکتی ہیں اور اس کی سب سے بڑی افادیت ہے کہ ان کے کوئی مضر اثرات بھی نہیں ہوتے۔ جبکہ رنگ گورا کرنے کے لیے جو کریمیں استعمال کی جاتی ہیں، ان سے جلد بعد میں بے حد خراب ہو جاتی ہے اور رنگ بھی جل جاتا ہے۔ آج ہم آپ کو ایسے نسخے بتا رہے ہیں جو آپ اپنے کچن میں موجود اشیا سے تیار کر سکتی ہیں اور نہایت کم قیمت میں دلکشی اور شادابی بھی حاصل کر سکتی ہیں۔

1 ۔ کینو کا موسم آنے والا ہے۔ اورنج جوس میں روئی ڈبو کر چہرے پر لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔ ہفتہ میں صرف ایک بار یہ عمل کرنے سے آپ کی جلد نرم اور ملائم ہو جائے گی۔

2 ۔ کچے دودھ اور شہد کا ایک ایک چمچہ لے لیں۔ اس میں ایک انڈے کی سفیدی پھینٹ کر ملالیں۔ پھر اسے چہرے اور گردن پر لگائیں۔ اس سے جلد پر جھریاں نہیں پڑتیں اور کھلے مسام بھی بند ہو جاتے ہیں۔

3 ۔ موسم سرما میں ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں۔ آپ عرق گلاب اور گلیسرین برابر مقدار میں لے کر آمیزہ بنالیں اور اسے کسی شیشی میں محفوظ کرلیں۔ حسب ضرورت پیروں پر لگائیں۔ پیر پھٹنے سے محفوظ رہیں گے۔

4 ۔ ٹماٹر کا رس رنگت صاف کرنے کے لیے بہترین ہے۔ دھوپ سے چہرہ جھلس جائے یا مسامات کھل جائیں تو ٹماٹر کا رس لگانے سے بہترین نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ تین چمچے ٹماٹر کے رس میں ایک چمچہ لیموں کا رس ملا کر روئی کی مدد سے لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد دھولیں۔ جلد کا قدرتی نکھار اور چمک دیکھ کر آپ خود حیران رہ جائیں گی۔

5 ۔ جلد روکھی اور بے جان محسوس ہو رہی ہو تو کیلے کو دودھ یا دہی میں میش کر کے پیسٹ بنالیں اور چہرے پر لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد چہرہ صاف کریں۔ اعلا کوالٹی کا بہترین موئسچرائزر بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جلد نرم ہموار اور شاداب ہو جائے گی۔

6 ۔ چہرے پر ہلدی اور لیموں کا رس ملا کر لگائیں۔ جلد کا رنگ کندن کی طرح دمکے گا۔

7 ۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہوں تو باقاعدگی سے کھیرے کے قتلے اور آلو کے باریک قتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھیں۔ حلقے آہستہ آہستہ غائب ہو جائیں گے۔

8 ۔ موسم سرما میں اگر جلد خشک اور بے رونق ہو تو کھیرے کے رس میں لیموں کا عرق ملا کر لگائیں۔

9 ۔ سیب کی طرح اس کا چھلکا بھی مفید ہے، اسے چہرے پر آہستہ آہستہ رگڑیں۔ سارا میل کچیل نکل جائے گا۔

10 ۔ استعمال شدہ لیموں کے چھلکے ضائع نہ کریں۔ انہیں اپنی سیاہ اور بدنما کہنیاں صاف کرنے کے لیے استعمال کریں، لیموں کے چھلکے کہنیوں پر رگڑیں۔ دھبے اور سیاہی غائب ہو جائے گی۔

یہ ساری ترکیبیں بے حد آسان ہیں اور ان کے لوازمات آپ کے کچن سے ہی مہیا ہو سکتے ہیں لیکن ان کی افادیت اتنی زیادہ ہے کہ اعلا سے اعلا بیوٹی پروڈکٹس ان کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ انہیں آزما کر دیکھیں۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا۔